

خوبصورت لکسانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

دسمبر 2012

نگران اعلیٰ
معراج رفیق

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

www.paksociety.com

11 انشائیہ

جون ایلیا

غم حالات پر ایک
صاحب دل کا نوحہ الم

20 بے شک

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ اختیار اور بے اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

80 کیشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تھیر کے پردے میں
لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

124 پہاڑ اوجھل

ملک صفدر حیات

زندگی کے نازک دور ہے پر مجرماً کو محرم
بنانے والے پولیس انسپکٹر کی فرض شناسی

12 آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپنس کی محاشا ورت قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں گلشنوں اور پر خلوص مشورے

63 منتقم مزاج

کاشف زبید

آستین مسیں چھپے سانپوں
کی بدلتی کروٹوں کا احوال

109 بلی کی چوڑی

اقبال کاظمی

اصول پسندی کو حقیقت پسندی کے قلعہ میں
ڈھالنے والے تنک دیلوں کا ایک اور کارنامہ

149 خونے نہاں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وڈیرا شاہی نظم آکا
ایک لرزہ خیز منظر

158 محفل شعرون

قارئین

آپ کے ہاتھوں ہی ایک نغمہ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

168 مسافر

ناصر ملک

گل دگل سے راہ پر چنار تک ایک
مسافر بے نوا کی روداد حیات

215 سرمہ شہید

ضیاء تسنیم بلگرامی

دنیاوی تجارت کی نفی کرنے
والے ایک ملی کی سچی اور کھری باتیں

230 چار سمت ایک چوراہا

احمد اقبال

رشتوں کی بگڑتی صورت حال..... جذبات کے
بھونچال اور مقدس کی انکھڑی چالوں کا احوال

161 گوشہ عافیت

تنویر ریاض

کیوتر کے مانند آنکھ بند کر کے مشکلات سے
فرار حاصل کرنے والوں کا قصہ

211 پیش عقل

مریم کے خان

ایک ایسے مہمان کی روداد جس
سے کتنے ضمیر جھنجھٹا اٹھے

227 کمائی دہائی

منظر امام

محبت کے دم اکھڑے کرنے والی
ایک معصوم حینہ کی چالاکیاں

000 کترین

ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے
اقتباسات، سکرابین اور تہنیت بکچہ آپ کے لیے

ایک آرزو

انشائیہ
جون ایلیا

میں جگہ کرتا ہوں، میں بوئیں تھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بُری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے اُن جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے لٹا ڈالا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اجاڑا ہے۔

”جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔“
”ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہونے جارہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ چھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔“
”ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پچھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں۔ اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزیہ طلب کروں گا؟“

”تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجیب ہے۔“
”ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجیب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پاسکتا۔“
”تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پاسکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟“

”ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقصوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہ میری بود و بود ہے۔ ہماری بود و بود ہے۔“
”لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت ٹاکی کے ساتھ تڑپا یا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!“

”میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرہ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرفروشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رو یا جائے؟“
”ہاں، تمہاری سرفروشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رو یا جائے۔“
ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمہارا ہونا، ہر لمحہ ہونا بہت ہی اولوا و لو لگتا ہے، بہت ہی اولوا و لو کہہ دو اور ہر گز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلیا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا کٹن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نواگرا میر خسرو اس کٹن اور اس آہنگ کو سنتے تو کتنے چاؤ سے سرد جھپٹے!

”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیار دار کون؟“
”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیار دار کون..... یہی تو کہا تا تو نے؟“
”ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔“

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیار دار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پرس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادر یوں کی برادری کا شہر ہے۔

”اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے بچے بھی سوچ گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے تھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟“
”میں تجھے۔ تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سنتا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت پارا مارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو کسی نہ پارنا۔“

پاکستان

دلچسپ و منفرد زبان و بیان لیے

دسمبر 2012ء کے شمارے کی گرماتی جھلکیاں

عکس..... عمیرہ احمد

عکس در عکس پھیلے سلسلہ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا دلکش اختتام

زندگی..... ناہید سلطانہ اختر

زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کرانا منفرد ناول

کھیں دیپ جلے کھیں دل..... قیصرہ حیات

زمانے کے سرد و گرم سے نبرد آزما ہوتے کرداروں کی دلکش داستان

مجھے رنگ دے..... شوکت رانا الطاف

راہ زیست کے پُر پیچ راستوں سے گزرتی حسینہ کا دلفریب احوال

فیصلے کی صلیب..... اسما قادری

اشرف المخلوقات ہونے کا زعم کچھ ایسے ہی حالات پیدا کرتا ہے

وہ آئے بزم میں..... نزہت اصغر

”سوائے دعاؤں کے قارئین کی محبتوں کا کوئی صلہ نہیں دیا جاسکتا“ نامور و ہرولعزیز مصنفہ رفعت سراج سے پُر کیف گفتگو

ادبیات

شیریں حیدر، صائمہ اکرم، عقیلہ حق، رضوانہ پرنس و دیگر مصنفات کی منفرد کاوشیں مستقل سلسلوں کا خوب صورت امتزاج لیے سرما کے دنوں کو گرماتا خصوصی شمارہ صرف آپ کے لیے

تسلیمات!

✽ قصیر اقبال کللول، ضلع بھکر سے تہرہ کر رہے ہیں "میرا پہلا خط ہے، امید ہے کہ خوش آمدید ضرور کہا جائے گا (خوش آمدید..... خوش آمدید) سرورق کی حسینہ کو دیکھا تو اسے کچھ پریشان سا پایا۔ سوچوں میں غرق پتا نہیں کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ سو اسے اس کے حال پر چھوڑا اور سیدھی انٹری ماری انشائیہ میں۔ جون ایلیا کا پُر مغز انشائیہ دل کو لگا اور پھر ہم اگلی انٹری خطوط کی محفل میں مار چکے تھے جہاں صنف و جاہت اور صنف نازک کے درمیان سستی خیز بیچ کا آغاز ہو چکا تھا۔ دو سینئر کپتان اپنی اپنی مہم کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے۔ صنف و جاہت کی کپتانی تفسیر عباس بابر کے ہاتھ میں تھی تو صنف نازک کی قیادت ماہا ایمان کے ہاتھ میں تھی۔ قیادت ماہا ایمان کے ہاتھ میں ہونے سے امید کی جارہی تھی کہ کانٹے کا مقابلہ ہوگا لیکن یہ مقابلہ یکطرفہ رہا اور اکیس گول (خطوط) میں سے چودہ گول (خطوط) صنف و جاہت نے داغے اور صنف نازک صرف سات گول (خطوط) داغ سکے اور یوں ماہا ایمان کی ٹیم سات کے مقابلے میں چودہ گول (خطوط) کے بڑے مارچن سے ہار کر اپنا سامنہ لے کر میدان سے باہر نکلے۔ خطوط کے بیچ میں پہلا گول (خطوط) داغ کر مین آف دی بیچ کا ایوارڈ لینے والے شیر علی خان کا جامع تہرہ پسند آیا، مبارکباد۔ محمد عمار کشف عرف ساحر ناز نے حکیم سلامت پوری سے دو مافی کشتے کھا کر ایسا گاڑا تہرہ لکھا کہ بندے کا داغ چکرا جائے، سو اس تہرے سے فوراً نکل کر بھاگے اور تفسیر عباس بابر کے پہلو میں جا کر پناہ لی، لیکن تفسیر صاحب نے کہا کہ حکیم سلامت پوری کے کشتے صرف محمد عمار کشف نے ہی نہیں کھائے میں بھی اسی کے زیر علاج رہا ہوں۔ اس تہرے کو چھوڑو، میرا تہرہ پڑھو، تو ہم آسمان سے گرے، بھگور میں اٹکے کے مصداق تفسیر صاحب کے تہرے میں اٹک گئے۔ یہاں سے آگے نگاہ کی تو اپنے ہمایوں سعید نظر آئے۔ جنہوں نے جیسے ہی راج گیری چھوڑی، تو ان کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ان آندھیوں کو ایسا ہی چلتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے اور عبدالغفور، سارہ، قصیر عباس اور حافظ شاہد عمران سے پہلو ہائے کرتے ہوئے جا کر کر کے محمد جاوید بلوچ کے پاس، لیکن بلوچ صاحب سجدہ یہ بخاری کی جو بیس گنتے میں اتنے غرق تھے کہ ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چودھری احمد خان سے ہاتھ ملا کر طاہرہ گلزار کے پاس جار کے مگر موصوفہ کو کسی کے غم میں گھلتا دیکھ کر ہم نے آگے بڑھ کر پہلو کہا ابراہارث کو، آگے دیکھا تو ماریہ فاروق اور ساجدہ راجا مسافر کی کسی پچھلی قسط کا رونا رورہی تھیں۔ سو انہیں تسلی دی۔ ماہا ایمان میدان میں ڈٹ کر کھیل رہی تھیں، سو ہم آگے بڑھ کر ادیس احمد خان، رمضان پاشا اور عباسہ منٹل سے سلام دعا کرتے ہوئے محمد قدرت اللہ نیازی حکیم کے پاس جا ٹھہرے اور ان سے ان کی حکمت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے میاں صاحب زادے، میں حکیم نہیں ہوں۔ یہ خیالِ اہل میں جگہ کا نام حکیم ناؤن ہے اور ہم تو (Natural) نیچرل خان ہیں۔ اس سے پہلے کہ نیچرل (قدرتی) صاحب کچھ اور فرماتے۔ ہم سرپنٹ ووڈ سے اور بلال اصغر کو فقط ہاتھ ملا کر ہائے کہا اور سیدھا جا کر پناہ لی، محترمہ تصویر العین کے پاس اور تصویر العین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے ہمیں یہ کہہ کر آگے جانے سے روکا، اب یہاں سے مت ہلو، آگے سوانے کالی اسٹ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ سو آگے کوئی جائے پناہ نہ پا کر اسی پناہ کو غنیمت سمجھا۔ تصویر العین صاحب، آپ کو ہمارا آپ کے پاس ٹھہرنا برا تو نہیں لگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے فارغ کو اختتام تک لے کر گئے۔ صلاح الدین ایوبی کے کارنامے پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ! آج بھی کوئی صلاح الدین ایوبی پیدا کر دے جو امت مسلمہ کی درست کمانڈ کر سکے، انوکھا ملاط میں دو محبت کرنے والوں نے اپنا خون پلا کر اپنی محبت کو امر کیا۔ مشکول میں بیچ حامد کے گرد و خیر اٹھک ہوتا جا رہا ہے اور اب تو لیاقت حسین بھی گاؤں سے واپس آ گیا ہے۔ سیاسی محبت میں لیڈی گورڈن آخر میں سرخرو ٹھہری اور لارڈ اسٹھ گورڈن کی وارث ٹھہری۔ دینی نجات میں مرزا احمد بیگ نے تو فرزانہ کو چھڑا کر اولاد یا تھا لیکن اینڈ میں فرزانہ کا انجام پڑھ کر دکھ ہوا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جو کیڑی سوکائی میں ایک صحیح حقیقت لے کر آئے۔ اس فرسودہ نظام سے پتا نہیں کب تک جاگیر دار اور ہاری کی کہانیاں جنم لیتی رہیں گی۔ شمسفر ادیب کا بوڑھا درخت ان لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جو محبت میں ناکامی کے بعد اپنے آپ کو بھلا کر جینے کا حوصلہ کھودیتے ہیں۔ تو یہ ریاض کی خطرناک عشق میں یہ جان کر چھٹکا سا لگا کہ روڈی لڑکی نہیں لڑکا تھا، اچھی کہانی تھی۔ مگ گزیدہ میں نرس کے سوالنامے نے اچھے خاصے بندے کو

۱۹ محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور سے چلے آ رہے ہیں۔ ”صفحوں پر موجود مابا ایمان کی صورت یہ سوچ سوچ کر، رورو کر بوسیدہ ہو رہی ہے کہ ان کا اصل اسل پکٹن سر فار روز بہ روز کمزور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ عقب میں ہمایوں سعید صانع سے خالی پیٹ، بنا کھائے پیسے سعدیہ بخاری کے گھر کے سامنے قربانی کے گوشت کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور آج سعدیہ بخاری نے بھی باہر نہ نکلنے کی ٹھان رکھی ہے۔ مابا ایمان کی ایٹنی ٹائن (نواسی) طاہرہ بھگزار ہماری اطلاع کے مطابق ہمایوں سعید کو تو قربانی کے لیے اپنی پسند کی گائے مل گئی ہے۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟ آپ خواتین میں کوئی قدر مشترک ہونہ ہو مگر یہ جگہ جگہ کی خبریں سونگھنے کی قدر ضرور مشترک ہے۔ سب سے زیادہ خوشی محمد ہمایوں سعید کے نام میں مثبت تبدیلی سے ہوئی۔ سارہ فرام کراچی اینڈ عباس مغل ویکل ٹو سپنس۔۔۔۔۔ سپنس کلب میں آپ سب نوآموز کا سواگت (سواگت الگتا ہے کہ آپ بھی ہندوستانی ڈرامے دیکھ دیکھ کر ہندی سیکھ رہے ہیں۔ سواگت کے بجائے اگر آپ استقبال لکھتے تو ہمیں خوشی ہوتی) کیا جاتا ہے بس ذرا ٹھنڈی ہو کر رہتا ورنہ مابا ایمان اور سعدیہ بخاری کی طرح ہائے کر کے بیٹھو گی اور امی کے اشوک۔ رمضان پاشا چونکہ چپکے چپکے کوزہ تفسیر عباس سے اڑے تھے لہذا بے سبب مجبوری ہمیں لوٹے پر گزارہ کرنا پڑا۔ حافظ شاہد عمران کا تبصرہ چربہ سازی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ مابا ایمان چشم آسمان بھی دیکھتی ہے ٹھکارے کے کیسے، ایک وقت تھا کہ آپ اپنی زبان کی غیر معمولی طوالت کی مدد سے ناک پر پینچی ہر کسی اڑا دیا کرتی تھیں آج تو بت یہاں تک آپ پہنچی ہے کہ ہمایوں کے مسلسل تازہ توڑ ڈرون حملوں کے کارن دست بستہ جواب۔۔۔۔۔ عرض کرنے پر مجبور ہیں۔ رائے قیصر عباس کھل۔۔۔۔۔ آپ نے تبصرہ تو اچھا کیا۔۔۔۔۔ مگر مابا ایمان نامی جڑی بوٹی کا اضافہ کر کے اپنی محنت پر آپ نے جھاڑو پھیر دی۔ نیازی صاحب بھینس کالی ہوا بھوری سعدیہ بخاری سے رجوع کریں۔ مشترکہ چاچو جی ٹی ٹی آنے والی آفتیوں کو کہا نیوں پر قدرے چھوٹ دی جائے ورنہ محدودے چند گویا کج عقل آفتیوں کے سب صنف نزاکت کے سر سے سینکوں کی طرح غائب کا افسرہ عمل جاری و ساری رہے گا۔ تفسیر عباس اگر آپ اور مابا کے ٹاکل پر ریمارکس درست مان لیے جائیں تو گویا۔۔۔۔۔ مابا ایمان نے بائیں پھیلی کوشیش بنا کر اپنا فیصلہ خود کیا۔ جو یہ یہ نعیم۔۔۔۔۔ مانسہرہ آپ کے نام کے معنی کیا ہیں؟ اور یس احمد خان آپ کی بڑھتی ہوئی توانائی کا جان کر کسکھ کی سانس خارج ہوئی یقیناً ملک پاکستان کا لائیکل مسئلہ توانائی آپ کی توانائی کی بدولت حل ہو کے رہے گا۔ خدا خدا کر کے مغلیہ دور کی رذیلی تاریخ سے جان چھوٹی، اسلامی معرکوں پر مشتمل طویل داستان پڑھنے کو ملی کہ دل گاڑ ڈن گاڑ ڈن ہو گیا۔ طاہرہ جاوید مغل نے ایک سائنس دان کے پیٹ اور جنس کی بھوک پر کیے گئے تجربے کو قدرے رد و بدل کے بعد سیرمی بنا کر رقم کی جانے والی تخلیق انوکھا ملاپ اچھی کہانی رقم کی۔ نامحرم عورت اور مرد کا ملاپ جسے دنیا عشق عشق کی گردان کرتے نہیں سمجھتی نے کتنے فتنہ و فساد جنم دیے۔ کسی بھی چشم سے پوشیدہ نہیں اس جذبہ نفس نے ان گنت گھر اور دل خاکستر کیے ان کا شمار تو نامکن۔۔۔۔۔ مگر ممنوعہ سے اس کے رذیل رذیل نتائج کا جائزہ لکھا جاسکتا ہے۔ دو نامحرم جنسوں کے ملاپ، بیشتر اشیطان ہوتا ہے اور اس تیسرے کو جیسے ہی موقع ملتا ہے اپنا وار کر کر رہتا ہے۔ بلاشبہ ناہید اختر سلطانہ کا شمار سپنس ڈائجسٹ کے ادب کے پرانے خدمت گاروں میں ہوتا ہے محض قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر عہد و پیمان کر کے اگر از دو ادبی تعلقات قائم کیے جائیں تو معاشرے میں اخلاقیات کا توازن ڈالنا ڈول ہو جائے پھر ہر تیسری عورت کی گود آفاق کا ناجائز بوجھ اٹھائے ہوگی۔ جو کیری سوکانی دل پر سچ کے تازیانے برسا گئی جس کے اختتام پر آنکھوں کے سامنے روانے دردی تن گئی۔ انوار صدیقی کا قلم اس بار بھی بن برساتا رہا، شیخ حامد کی واپسی ایشوری میں جان ڈال گئی اور پھر بات ہو جائے مسافر کی تو۔۔۔۔۔ پھر مسافر کے کیا ہی کہنے بہت زبردست جارہی ہے، کہانی کے اختتام نے پھر بے چینی پیدا کر دی۔ شمسیر ادیب صاحب بوڑھا درخت ویری ٹائٹس ہوئی قل تیسری تحریر ثابت ہوئی۔ سگ گزیدہ میں روسی مصنف نے کچھ زیادہ ہی لمبی چھٹی ہے۔“

طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے چلے آ رہے ہیں ”نومبر کا شمارہ اس کے بعد دسمبر پھر جنوری 2013ء دن ہیں کے پر لگا کر اڑ رہے ہیں۔ ہم سارے پاکستانی بقول تفسیر عباس بابر اور شیر علی خان کیا خوب لکھا ہے اسی طرح کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کراچی میں ہر روز دس بارہ خون ناحق روز کا معمول ہے۔ اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ سارے ہی کام سپریم کورٹ کو کرنے پڑیں گے۔ جاوید بلوچ صاحب، طاہرہ گلزار اور ماہا ایمان صاحبہ اپنے اپنے خوب صورت اور زبردست تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ جوئے ستارے اس مرتبہ محفل کی رونق بنے انہیں ہم بھی خوش آمدید کہتے ہیں۔ فاتح پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کافی عرصے سے صلاح الدین ایوبی پڑا اکثر صاحب کی تحریر کا انتظار تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور رنگ رچھڑ تاریخ کے بہت خوب صورت کردار ہیں۔ صلاح الدین ایوبی مسلمانوں کا ایک عظیم جنرل جس پر جتنا فخر کریں کم ہیں۔ سلاطینوں کے تصرف میں بے شمار دولت اور زرو و جواہرات ہوتے ہیں لیکن جب یہ عظیم مسلمان سلطان فوت ہوا تو اس کا اتنا صرف سینا کیس (47) درہم اور اشرفی تھا۔ کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ کشمور اور مسافر آہستہ آہستہ اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ افضل اور شبنم کے کردار آگے چل کر کیا رنگ دکھائیں گے یہی دیکھنا ہے۔ اور گلزیب کا اٹھارہ ماہ کی لڑکی کیس لگتا ہے؟ موجودہ قسط میں لیاقت علی کا ذکر نہیں تھا۔ افضل خان، شبنم اور شیخ حامد بہت خوب کردار ہیں۔ کہانی رنگ بدلتی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شہادت سے انتظار رہے گا۔ مسافر کی یہ قسط بڑی ہی تیز تر رہی، یقین جانیں کہ تمام صفحات ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے اور پھر سوچنے لگے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ چھاؤں اور وہ بھی جلی ہوئی، کیا خوب عنوان ہے۔ نیسہ کی مشکلات، کہانی بڑی ڈرامائی انداز سے آگے بڑھتی ہے اور آخر میں ماہی بے آب کی طرح تر پتی ہوئی ہمیں بھی تر پائی گئی۔ محی الدین نواب بڑے ہی عرصے بعد نظر آئے اور چھما گئے۔ سچے کار کردار بہت خوب صورت کردار تھا۔“



عادل خان، چارسدہ سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں۔ پہلی دفعہ سسٹنس میں شرکت کر رہا ہوں (خوش آمدید محفل میں شکل دکھا کر غائب نہ ہو جائیے گا) سرورق انتہائی دید و زیب تھا۔ جون صاحب کا انشائیہ بڑی مشکل سے سمجھا آیا۔ محفل میں پہنچے تو شیر علی خان اپنے خوب صورت تہنہ کے ساتھ سرگرم تھے۔ ملا لکھنوی نے فریادیں اٹھائی تھیں۔ ہمایوں سعید صاحب نے مجھے ہم محفل میں حاضر ہوئے۔ سب کے تہنہ بڑے خوب صورت اور جاندار تھے جن میں ہمایوں سعید صاحب، قدرت اللہ نیازی، مایا ایمان اور طاہرہ گلزار سرگرم تھیں۔ طاہرہ جی، آپ کو کہیں پتا کہ ہمایوں سعید نے اپنا پیار لایا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی داستان پر مبنی، طاہرہ جاوید محفل کی تحریر نے توجہ کی دھڑکن تیز کر دی۔ وائی آئی اور حامد کا ملاپ انوکھا تھا۔ مشکوٰۃ میں لیاقت کا کردار پسند ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر انوس ناک تھی۔ مسافر میں شہر یار پھر پھنس گیا۔ جلتی چھاؤں ایک فکر انگیز داستان تھی۔ اصغر نے سید کے ساتھ بڑی بے وفائی کی۔ کاش وہ آفاق کو کہہ پاتی کہ میں ہی تو تیری ماں ہوں۔ حضرت یحییٰ کی تحریر سے ایمان تازہ کیا۔ آخری صفحات پر ممنوعہ ایک بہترین اور فکر انگیز داستان تھی۔ شعر و سخن میں، ہنسان دل اور مایا ایمان کے اشعار پسند آئے۔

محمد ہمایوں سعید، بنوں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ "سیلے سے کیے گئے ایک آپ کے ساتھ نائل گرل کافی سے زیادہ پیاری لگی۔ انکل بھی ہماری طرح ملا لکھنوی سے کہیں گے۔ بزدلانہ حملے پر افسردہ نظر آئے۔ شیر و برادر! پھر تو آپ یہ عمریں ماضی والے جادوئی کیکو لیکر قدرت اللہ کو گفت کر دیجئے۔ ہر آتی جاتی خاتون سے عمر پوچھنے اور اس کے خوفناک نتائج سمجھنے سے توجہ جانے کا میرا دوست۔ تفسیر صاحب! یہ جو آپ ہر کسی کے نام کے ساتھ اس کا عارضی و مستقل پتا لکھتے ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کریں تو آپ کتنے پیسوں میں مان جاؤ گے؟ جاوید بلوچ صاحب! قابل احترام انکل اور آئی سے آپ کے پوچھنے گئے جاہلانہ سوال اور بد تمیزانہ انداز نے ہمیں بے تحاشا غصہ دلایا۔ کئی گلی، محفل محلے مسافر کی تیسری قسط کا دواویہ ڈراما اسٹیج کرنے کو ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اگر وہ حالیہ قسط کو پڑھ کر اس پر تبصرہ لکھ لیتی تو اس ڈرامے پر کچھ نہ کچھ تو یقین آتی جاتا۔ مصروفیت کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر امپریشن جمانے والی مایا ایمان صاحب! آپ جیسا اعلیٰ کو الٹی ڈانیا لگ، بہت ساری بوٹی نظر سے گزری ہے مگر آج تک کسی کو بھی معمولی شکل و صورت اور غریب مسکین قسم کے بندے سے محبت نہیں ہوئی جبکہ خوش حال، خوش شکل، خوش لباس، خوش گفتار، خوش تعلیم اور خوش روزگار بندے سے ترجیحی بنیادوں پر محبت فرمائی جاتی ہے۔ محترمہ سارہ! اس کا دوری کی آخری صفحات پر سچی کہانی سسٹنس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ مسافر حسب معمول کافی تیز رفتار رہی۔ میڈم نے جس ذہانت سے ان دو بد معاشوں کو زیر کیا بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ مگر ان کا بار بار ہنسنے بیٹھے پانی کے کنوئیں میں ڈبکیاں لگا لگا کر پیسا لٹکانا کنوئیں کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی باعث حیرت ہے۔ طاہرہ جاوید محفل کی کہانی ہمیشہ کی طرح دلچسپ ترین اور عجیب ترین رہی۔ مختصر کہانی ہے شک محفل صاحب کی طرح کوئی بھی نہیں لکھ سکتا۔ بیگ صاحب اس بار عدالتی مناظر اور جارحانہ جرح سے عاری مگر دلچسپ کس لیے حاضر ہوئے۔ اختر بیگ کی سگ گزیدہ کا مقصد سمجھ نہ آ سکا۔ منظر امام کی جناب عالی بالکل حقیقی لگی۔ ناہید سلطانہ آخر کی جلتی چھاؤں بہت افسردہ کردینے والی کہانی تھی۔ حضرت یحییٰ کے متعلق اتنی معلومات فراہم کرنے پر ہم رضوانہ ساجد صاحبہ کے مشکور ہیں، آخری صفحات پر ہمارے پسندیدہ محی الدین نواب خوب صورت منہج کی خوب صورت کہانی لیے حاضر تھے۔ اسلامی قیود سے باہر نکلنے کو بے تاب بنی نسل کے لیے ایک فکر انگیز مثال دی۔ بے شک اسلام کا قائم کردہ حدود کے اندر رہنا ہی ہمارے لیے باعث خیر اور رحمت ہے۔"

حسنین عباس بلوچ، سرگودھا جیل سے جیل آرہے ہیں۔ "اس ماہ کا شمار ملا، نائل پر موجود دو شیرہ عید مبارک کا پیغام بڑے خوب صورت انداز میں دے رہی تھی۔ دو ماہ کی مسلسل غیر حاضری کے بعد محفل میں واپسی یقینی بنائی۔ غیر حاضری کی وجہ بس اتنی سی ہے کہ اس جیل میں بھی ایک جیل ہے جہاں کوئی قیدی غلط کام مثلاً موبائل، منشیات اور دیگر قیدی کے ساتھ لڑائی جھگڑا کریں تو پھانسی کے طور پر بند کر دیا جاتا ہے اور مجھے بھی ایک معمولی خطا کرنے پر دو ماہ کے لیے بند کر دیا گیا اور قیدی کی تمام سہولیات ختم کر دی جاتی ہیں اور میری سہولیات بھی بند کر دی گئیں اور اس وجہ سے محفل میں شریک نہ ہو سکا۔ دو ماہ بعد مجھے پھر اپنے وارڈ میں واپس بھیجا گیا کسی ٹھنڈی سفارش یا باہر حرم قائد اعظم کی بدولت، خیر برا وقت بتا کر نہیں آتا مگر جب آتا ہے تو اچھا سبق دیتا ہے۔ محفل میں کرسی سے لے کر بیچ تک تمام قارئین نے سرگودھا جیل کے تمام اسیروں کو شاید بھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور ذکر بھی کرنا گوارا نہ کیا اور میرے بھائی عمران حیدر بلوچ جو اس وقت جیل کے اسپتال میں داخل ہیں اور دونوں گروے تباہ ہو گئے ہیں اور تمام قارئین سے التماس ہے کہ عمران حیدر بلوچ کی صحت یابی کے لیے خدائے بزرگ و برتر کے حضور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ عمران حیدر بھائی کو صحت و تندرستی دے (آمین)۔ اللہ جلد از جلد اس مشکل کھڑی کو آسان کرے) میرے کس کی اکتوبر کی 22 تاریخ تھی لیکن اب نومبر کی پانچ تاریخ ہے اور انشا اللہ میں بری ہو جاؤں گا کیونکہ میری مدھی فریق سے صلح ہو گئی ہے۔ امید ہے آئندہ شمارے میں آزاد قضاؤں اور ماں باپ کے قدموں میں ٹھنڈی چھاؤں میں ہوں گا۔ یہ سب قارئین کی دعائیں ہیں جو ہم اسیران کو خدا نے ان مشکلات سے نجات دی ہے۔ کہانیوں میں مسافر سے ابتدا کی، میڈم کی چالاکی اور شہر یار کی بد بختی میرے اندازے کے مطابق شہر یار کے چچا چچی اور بھائی نے ان میں میڈم خود انوالو ہے یہ اسی کا کیا دھرا ہے، ویسے بھی شہر یار سے دلی ہمدردی ہے کیونکہ وہ بھی خان برادری سے ہے دیگر تمام سسٹنس کی جان اسٹوریز زیر مطالعہ ہیں ابھی تک مطالعہ نہ کر سکے کیونکہ آج عید الاضحیٰ کا دوسرا روز ہے اور بکرا (میں میں) کر رہا ہے۔ آہو جی بیٹ میں بکرے نے شور مچایا ہوا ہے۔ مایا ایمان صاحبہ نے تم بیک کیا اور نا تو دلچسپین صاحبہ اور بہن حمیرا صاحبہ آئیں۔ کیا حمیرا بہن آپ کو بھی اپنے بھائی کی آزادی کی خوشی نہیں ہوئی؟ تمام قارئین کا دل سے مشکور اور ادارے کے اراکین کی دعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول کیں اور... سات برس سے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد آخر کار زندگی جیت گئی۔"

انجم فاروق ساحلی، لاہور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ "سسٹنس کا مطالعہ جاری ہے، بعض اوقات خط لکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس مرحلہ "فارح" ماضی کا اچھا سبق تھا۔ "انوکھا ملاپ" معمول سے ہٹ کے خاصی منفرد کاوش تھی۔ سیاسی محبت متاثر نہ کر سکی۔ بزرگ افسانہ نگار شمس مینوادی



اس مرتبہ اچھی اور متاثر کن تحریر کے ساتھ آئے۔ جلتے خوب صورت اور دلکش تھے۔ ان کا افسانہ قتل شفا کی کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتا تھا۔ ہم سے بدل گیا وہ نگاہیں تو کیا ہو زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کے بغیر

جناب عالی دلچسپ تھی۔ دائمی غفلت، خطرناک عشق، سنگ گزیدہ متاثر نہ کر سکیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بیان ایمان افزہ تھا۔ جلتی چھاؤں اور ممنوعہ دونوں اچھی معاشرتی کاوشیں تھیں۔ مسافر اچھی ہنگامہ خیز تھی۔ ممنوعہ میں نواب صاحب کی معاشرتی جرات خوب تھی۔ سانپ اور سیرم جی والی مثال بھی دلچسپ تھی۔

تصویر العین، اوکاڑہ سٹی سے جلی آرہی ہیں۔ "عید الاضحیٰ کے حوالے سے نائل زبردست تھا، خاص طور پر شیرہ کی آنکھیں۔ مجھے تو بہت پسند آیا۔ آپ کے خط میں انکل جی نے ملا لکھنوی سے بات کی۔ واقعی یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ملا لکھنوی نے ہوش میں آگئیں اور صحت یاب ہو رہی ہیں۔ جب تک خدا کی طرف سے حکم نہ ہو، کوئی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔ انیس دسمبر کو میری سالگرہ ہے۔ آپ سب مجھے ضرور دوش کریں۔ (مبارک ہو، مبارک ہو...) محفل میں یہ کیسا شور ہو رہا ہے (پہلے نمبر پر شیر علی خان موجود تھے، مبارک ہو۔ صرف پہلے نمبر آنے پر ہی نہیں بلکہ عید الاضحیٰ کی بھی) محمد عمار کشف آپ کہیں مرزا غالب کے جانشین تو نہیں۔ پلیز سسٹنس اردو میں بات کریں نا۔ تفسیر عباس بھائی اب پوچھنے کا کیا فائدہ آپ تو FM ہی نہیں سنتے۔ عبدالغفور خان مہنگائی تو مجبوری ہے جس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑا ہے ڈائجسٹ کی۔ اس میں ادارے کی کوئی غلطی نہیں۔ سارہ آپ کو نام پسند آیا شکر ہے، اب خود نہ رکھ لیتا یہ نام۔ رائے قصیر عباس کھرل ضروری تو نہیں کہ مسافر آپ کو پسند ہے تو سب کو پسند ہو۔ حافظ شاہد عمران۔ آپ عباس سے آخر ایک ہی جگہ ہیں آپ بھی ہوتا ہوگا، ہے نا۔ ضرور بتائیے پاکستان میں مردم شماری میں رکھا ہوگا ہے نا۔ طاہرہ گلزار جویم بار نیوز آپ دے دیتیں آپ۔ ویسے اگر خبر گئی ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمایوں سعید ایمان کا آنا بہت بہت اچھا لگا۔ سب دیے۔ رمضان پاشا اگر آپ شادی شدہ ہو کر گھبرا نا! عباس محفل خوش

پسند ہو۔ حافظ شاہد عمران۔ آپ عباس سے آخر ایک ہی جگہ ہیں آپ بھی ہوتا ہوگا، ہے نا۔ ضرور بتائیے پاکستان میں مردم شماری میں رکھا ہوگا ہے نا۔ طاہرہ گلزار جویم بار نیوز آپ دے دیتیں آپ۔ ویسے اگر خبر گئی ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمایوں سعید ایمان کا آنا بہت بہت اچھا لگا۔ سب دیے۔ رمضان پاشا اگر آپ شادی شدہ ہو کر گھبرا نا! عباس محفل خوش

پسند ہو۔ حافظ شاہد عمران۔ آپ عباس سے آخر ایک ہی جگہ ہیں آپ بھی ہوتا ہوگا، ہے نا۔ ضرور بتائیے پاکستان میں مردم شماری میں رکھا ہوگا ہے نا۔ طاہرہ گلزار جویم بار نیوز آپ دے دیتیں آپ۔ ویسے اگر خبر گئی ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمایوں سعید ایمان کا آنا بہت بہت اچھا لگا۔ سب دیے۔ رمضان پاشا اگر آپ شادی شدہ ہو کر گھبرا نا! عباس محفل خوش

محمد رمضان پاشا، بکراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ "اس بار سرورق کی، مردانہ ناک والی حیدر اچھی نہیں لگی، البتہ وہ منظر بہت

سالگرہ نمبر
جنوری 2013ء
سسٹنس ڈائجسٹ
ماہنامہ

محی الدین نواب

کے سحر انگیز قلم سے ایک خوبصورت کہانی جو ابتدا سے اختتام تک آپ کو اپنی گرفت میں رکھے گی



بجلا کہ جس میں ایک ناکام عاشق اپنی محبوبہ کی قبر پر نوحہ کرناں نظر آ رہا تھا، بابا ہا۔ اشتہارات اور انٹائیپ سے کئی کاٹ کر محفل میں پہنچا۔ وہاں شیر علی خان پہلے نمبر پر نظر آئے، مبارکباد۔ شیر علی نے جس خون کا ذکر کیا ہے وہ مجھ سے والا خون تھا۔ حقیقی خون تو آپ کی فرمائش پڑھ کر گرم ہو گیا۔ تفسیر عباس باہر صاحب میرے بارے میں آپ کا جملہ کچھ شامل تھا۔ بابا ایمان جی آپ کی خشکی مبارکباد وصول۔ جواباً آپ کو بھی قربانی کی ایک ایک بوٹی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بھائی ابراہار وارث آپ نے اپنے پسندیدہ تمبر نگاروں میں مجھ تاجپز کا بھی نام شامل کر لیا، اس کے لیے میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ فارغ، اس مشہور معروف اور محترم کہ آرا داستان پر تمبرہ میں گزشتہ ماہ کرچکا ہوں اس ماہ بھی میرا وہی موقف ہے۔ انوکھا ملاپ، ایسی انوکھی اور منفرد کہانی پہلے بھی نہیں پڑھی تھی۔ اختتام پر راز قاش ہوا تو لطف دو بالا ہو گیا۔ ماہ بہ ماہ مشکور اور مسافر کا ٹیپو تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک خوش آمد عمل ہے، دونوں قلم کاروں کو بے شمار داد۔ جلتی چھاؤں، یہ تو خالص غور توں والی کہانی ہے، ہمارے سسٹمز میں کیوں لگا یا۔ سیاسی محبت بہت ہی عمدہ کہانی تھی، مزہ آگیا۔ ویسے ہمارے وطن عزیز میں بھی ایک سیاسی محبت پر دان چڑھ رہی ہے، الا ماشاء اللہ۔ دائمی نجات، اس دفعہ بیٹ صاحب نے مایوس کیا، نہ عدالتی کارروائی نہ کوئی سسٹمز، لطف نہیں آیا۔ محترم جناب شیر شاہ سید کی کہانی پسند نہیں آئی۔ معذرت ایوڑ حاد رخت، عشق میں ناکام ہونے والے نوجوانوں کے لیے ایک بہترین سبق آموز کہانی۔ خطرناک عشق، کہانی بہت عمدہ تھی لیکن اتنے پھیلاؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ سگ گزیدہ میں مزہ نہیں آیا۔ البتہ جناب عالی نے خوب لطف ہم پہنچایا، اختتام پر خوب ہنسی آئی۔ ممنوعہ اس کہانی کے مصنف کا نام ہی کافی ہے، یعنی جی الدین نواب ممنوعہ اس ماہ کی بہترین کہانی، دی اسٹوری آف دی منٹھ۔ مقدس اور اق انجی زیر مطالعہ ہیں۔ اشعار کی محفل میں محمد افتخار کا انتخاب اچھا تھا، کاسران خالد کا چناؤ بھی پسند آیا، بابا ایمان کا قلعہ بھی لا جواب تھا۔

✽ قصیر اقبال کلول، ضلع بکھر سے تشریف لائے ہیں "میں جاسوسی اور سسٹمز کا عرصہ دراز سے قاری ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) میں ایک اسکول میں پرنسپل ہوں۔ بہت مصروفیت ہوتی ہے۔ عمر 32 سال ہے، شادی شدہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرا خط ضرور شائع کریں۔ میں نے وقت نکال کر ایک بھر پور خط لکھا ہے۔ میری طرف سے سسٹمز کی ایڈیٹر یعنی احمد کو بہت بہت سلام۔ آخر میں میری طرف سے آپ کی ساری نیچ کے لیے نیک تمنائیں اور سلام اور سب کو عید کی مبارکباد۔" (محترم آپ کے اس بھر پور خط میں سسٹمز کے حلق کوئی رائے و حوصلہ نہ سے بھی نہ ملی۔ امید ہے آئندہ کہانیوں پر بھی تمبرہ شامل ہوگا)

✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ناؤن خانوالہ سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "سرورق کافی اچھا تھا۔ محفل میں اپنے خانیہ لیے کوکری صدارت پر دیکھا تو ہم نے بھی کارا کڑا لیے مبارک ہو جناب! ایک نصیحت ہماری یاد رکھیں بزرگوں پر تحقیر مت کیا کریں اور ہمایوں سید کو جو مشورہ آپ نے دیا قابل عمل نہیں کیونکہ یونیورسٹی کی ساری لڑکیوں نے ہمایوں کو بھائی بنا رکھا ہے۔ محمد عمار کشف! اف یا آپ نے تو تفسیر عباس کی اردو دانی کو بھی مات دے دی، کچھ پتلا کریں گا ڈمی اردو کو۔ تفسیر عباس جناب آپ کا تمبرہ ہمیشہ کی طرح بہترین لگا اور آپ نے اور جاوید بلوچ نے بھی بابا کے بارے میں جو ذوق و متنی باتیں کی ہیں ان کی تک ہم پہنچ چکے ہیں۔ محمد ہمایوں سید! ارے بھئی یہ راج کادم چھلا کہاں غائب ہو گیا۔ طاہرہ گلزار! رونا رونے سے مہنگائی کون سا کم ہو جاتی ہے اور خالمو، بادام تجویز کیے گئے تھے سعدیہ بخاری کے لیے اور اس کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ماریہ فاروق! اجہاں سے نیا سالہ لیتی ہیں وہیں سے آپ کو پرانا بھی مل جائے گا وادیلانہ بچائیں۔ بابا ایمان آپ کے خط پر No Comments اپنا کچا چٹا خود ہی کھول دیں اور اصلیت بتادیں سب کو۔ ایک قول ہے کہ "تعلق امتحان نہیں ہیں پھر لوگ دھوکا کیوں دیتے ہیں۔" باقی عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ تاریخی کہانی پڑھ کے بہت اچھا لگا کاش آج ہمیں صلاح الدین ایوبی جیسا کوئی حکمران میسر آئے۔ مشکور ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ شیخ حامد کی بوکلا ہٹ بہت مزہ دے رہی ہے، بلیک میلنگ مواد وصول کرنے کے بعد اس کا جو حال ہوا بہت خوشی ہوئی۔ مسافر میں اسٹوری کو میڈم شکیلہ اور شہر یار پر روک دیا گیا ہے۔ شہر یار نے بھی انٹرویو کے نیچے پتڑی طرح ہر قسط کے آخر میں انخوا ہونا شروع کر دیا ہے۔ طاہر جاوید مغل کی انوکھا ملاپ، محبت فارغ عالم کی تعبیر محسوس ہوئی، سردار آروش خاں کا نظریہ بالکل درست ہونے کے باوجود محبت کے آگے غلط ثابت ہو گیا۔ ممنوعہ جی الدین نواب حسب سابق معاشرتی برائیوں کو موضوع بنائے ہوئے ہیں ان کی منتظر زنی جاری ہے۔ کترینوں میں سید حکیم رضا کی ایک لوہا کی بہت پسند آئی۔ محفل شعر و سخن میں غلام رسول خان، مانگا منڈی اور سارہ، نیو کر اپنی کا انتخاب اچھا لگا۔"

✽ اور یس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں "نومبر کا سسٹمز دو تین دن کی تاخیر سے ملا۔ دیدہ زیب رنگوں سے سجاسرورق و سرورق والی اچھی لگی۔ اس کے بعد انٹائیپ سے مستفید ہوئے اور حکمت و دانائی کے موتی چنے، ادارے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے خطوط کی کھکشاں سے بھی اپنی محفل میں پہنچے۔ شیر علی خان کو مبارکباد، محمد جاوید بلوچ کا خط اچھا لگا۔ تصویراصحن، سج سنور کر ہی کسی کا انتظار کیا جاتا ہے پھر سراپے والا اپنے خیالات کا اظہار نہ کرے تو بد ذوق کہلائے گا۔ ناموں کی انجمن میں اپنا نام بھی نظر آیا، بہت بہت شکریہ۔ مشکور بھی دورانی سے جاری و ساری ہے۔ کہانی تیزی سے اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔ فارغ نے کافی متاثر کیا، صلاح الدین ایوبی کا نام بلاشبہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یقیناً کامل ہے انشاء اللہ ایسا مرد آہن پھر پیدا ہوگا (آمین) جاوید مغل کا انوکھا ملاپ نے بھی اچھا متاثر دیا۔ سیاسی محبت بہت اچھی لگی کہ محبت سے زیادہ فرض کو مقدم جانا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی بھی دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی تھی۔ واقعی غریب کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ یوڑ حاد رخت بھی بہتر تھی محفل شعر و سخن میں اپنا شعر بھی تھا اس کے لیے بھی شکریہ۔ پروفیسر ملک کا شعر اچھا لگا۔ اس کے بعد خطرناک عشق کی طرف بڑھے۔ عشق تو خطرناک ہی ہوتا ہے۔ گویا کہ ایک آگ کا دریائے اور ڈوب کے جانا ہے۔ روسی ادب سے ماخوذ کہانی سگ گزیدہ بھی دلچسپ تھی۔ جلتی چھاؤں ناہید سلطانہ آخر کی خوب صورت ترین کہانی تھی۔ بہو کے آتے ہی ماں باپ کو اپنی محبت قربان ہوتی نظر آتی ہے۔ بہو سسرال میں آتے ہی ان کے بے کو بلا شرکت غیرے اپنی جاگیر بھگتے لگتی ہے۔ ان ماں باپ کے احساسات کیا ہوتے ہوں گے جن کے ساتھ ایسی صورت حال پیش آتی ہوگی۔ ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی تحریر حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی ذوق و شوق سے آخری قسط پڑھی۔ منظر امام کی جناب عالی کا بھی مطالعہ کیا اس دنیا میں خوشامدی اور چالپوسی آدمیوں کی کی نہیں ہے۔ ممنوعہ جی الدین نواب کی تحریر بھی واقعی وہ ایسی شاعرانہ تحریریں لکھ سکتے ہیں۔ تمام ہی دوستوں! عید الاضحیٰ کی بہت بہت مبارکباد۔"



✽ بابر عباس، حسنین عباس، مکمل عباس، بھلیانہ روڈ، بکھاریاں سے محفل میں شامل ہوئے ہیں "آپ سب کو اپنی طرف سے اپنی جگہ کی طرف سے عید کی بہت ساری مبارکباد۔ نومبر کا سسٹمز ایک اذیت ناک انتظار کے بعد آج 20 اکتوبر کو ملا (ہمارا خیال تھا کہ پڑھ آپ تک دونوں میں پہنچ جایا کرے گا لیکن ٹرینیں بند ہونے اور لیٹ ہونے نے ہمارے اندازے بالکل غلط کر دیے۔ ہم آپ سب سے معذرت خواہ ہیں) اس بار سرورق کچھ طبعی سا لگا اور حاتم علی کی یاد تازہ کروا گیا۔ فہرست کو چیک کیا تو اپنے پسندیدہ راسخراہم اسے راحت کو غائب پایا مگر اس سے زیادہ خوشی آخری صفحات پر نواب صاحب کو دیکھ کر ہوئی۔ جون ایلیا مرحوم کا انٹائیپ حسب معمول اور حسب حال زبردست تھا۔ بھجلی بار آپ نے مہنگائی کے بارے میں فکر انگیز باتیں کی تھیں اس میں کوئی شک نہیں ہمارے حکمرانوں نے مہنگائی کی شکل میں جو صفریت ہم پر چھوڑ رکھا ہے اسے غالباً آئی ایم ایف بھی کہتے ہیں۔ سربئی ایک درخواست تھی، آپ نے خشک سسٹمز کی قیمت دس روپے اور بڑھائیں مگر خدا را اس کے دو تین صفحے بڑھا کر بلیک لسٹ کو ختم کر دیں (خطوط اگر وقت پر مل جائیں تو ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ مختصر سی لیکن شامل کر لیا جائے۔ ویر سے ملنے کی صورت میں نام شائع کر کے حاضری لگائی جاتی ہے) اس بار کرکی صدارت پر شیر علی خان آف خانیوال تشریف فرما تھے۔ آپ کا خط پسند آیا مجھ کو۔ محمد عمار کشف بیٹا، اپنی اصلی شناخت انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ جان عزیز ایک مشورہ دوں جھوٹ مت بولنا کبھی۔ بندے کو صحت کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ تفسیر عباس بابر بھائی زبردست، اس میں کوئی شک نہیں آپ ایک اچھے شاعر اور خوب صورت لکھاری ہیں، آپ الفاظ کا انتخاب کر کے ان میں اپنی تحریر کے ذریعے جان ڈالتے ہیں۔ محمد ہمایوں سعید راج، راج کپور صاحب کے جاں نشین صاحب بھایا ٹھیک تو ہے ناں۔ عبدالغفور رشک صاحب اگر سسٹمز سو روپے کا بھی ہو جائے تو بھایا اس کے دیوانے اس کو ضرور خریدیں گے۔ سارہ جی خط لکھنے کے معاملے میں آپ میری شاگرد بن جائیں، یقین کریں سب کو پیچھے چھوڑ دیں گی۔ رائے تفسیر عباس کھل صاحب خوش آمدید، آپ کو ایک بار پھر محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محمد جاوید بلوچ صاحب آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ الفاظ کا چناؤ بھی ٹھیک تھا۔ سوچ رہا ہوں کس بات کو لے کر آپ کے خط کو تنقید کا نشانہ بناؤں۔ چودھری صاحب بات یہ ہے ہر کوئی ایسے ایسی کسی کے پیچھے نہیں پڑ جاتا۔ ہم نے کون سا اصول ولا پڑھی ہے کہ بابا ایمان صاحب میدان چھوڑ کر ہی بھاگ گئی ہیں۔ واہ جی واہ، اس بار تو آئی طاہرہ گلزار بھی آئی ہوئی ہیں۔ تیس آئی جی آپ کا رونا دھونا کام آگیا۔ باقی میں کوئی ٹیلی فنی نہیں جانتا جو بابا ایمان کے دماغ میں محسوس جاؤں گا۔ ابراہار وارث بھایا میں نے اور تفسیر نے کسی کو نہیں روکا لکھنے کے لیے اب یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے، ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب محفل میں نئے لوگ آتے ہیں۔ ماریہ فاروق صاحب ہمارا یہ ملک بہت پیارا ہے اور ہم اٹھارہ کروڑ عوام اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ عزیزہ آپ نے شاید سسٹمز ابھی پڑھنا شروع کیا ہے میں تو سسٹمز کو اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔ جائیں صاحبہ راجا صاحب آپ کو معاف کیا، آپ کو کچھ نہیں کہتا۔ واہ بابا ایمان واہ، اسے کہتے ہیں ڈر۔ ارے بابا ایمان صاحبہ مجھ سے ڈر کر آپ کی برادری کی اریضہ بخاری، بشری افضل، آمنہ افضل، سعدیہ ہاشم، نورین خاکوانی، ارم خان، بلیک کیٹ، طاہرہ یاسمین، سمیرا افضل اور بہت سی بھاگ گئی تھیں آپ بھلا کس کھیت کی گاجر ہیں۔ سوری پاشا بھائی مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ ابھی تک کنوارے ہیں خدا آپ کو ایک عدد اچھی بیوی دے۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ محفل کی مقبول ترین شخصیت کو آپ نے بھلا دیا، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ حسنین عباس اور عمران حیدر بلوچ اور دوسرے ساتھی جو کہ ڈسٹرکٹ جنیل سرگودھا سے حلق رکھتے تھے غیر حاضر ہیں۔" (سلام دعا..... خیر خیریت اور جھیمڑ چھاؤں کا شکر یہ مگر..... پر پے پر تمبرہ غائب)

✽ یاسر علی راجپوت، نوبیک سنگھ سے چلے آ رہے ہیں "پہلی بار 10 سال کی عمر میں اپنے چاچو سے سسٹمز لے کر ملک مندر حیات کی کہانی پڑھی بس پھر کیا، شروع ہو گئے۔ پھر یہ محبت کا رشتہ آج تک قائم ہے۔ نومبر کا سسٹمز 26 تاریخ کو کافی لیٹ مل سکا۔ گاؤں میں رہنے والوں کی یہی تو پریشانی ہے۔ سب سے پہلے نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کی داستان جو جذبہ ایمانی سے سرشار کر دینے والی داستان تھی، پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر بہت اچھی لگی۔ انہوں نے اس میں میڈم کے کردار کو بہترین مولا کر دیا ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی داستان پڑھی، جو یقیناً اہل ایمان کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ اور آخر میں مرزا امجد بیگ صاحب کی دائمی نجات پڑھی۔ مرزا امجد بیگ صاحب اچھے طریقے سے کیس لڑتے ہیں اور مدعا علیہ سے لے گئے پیسے کا حق ادا کرتے ہیں ورنہ غریب آدمی کو پاکستان میں عدلیہ سے انصاف کے لیے لوہے کے جوتے درکار ہیں۔"

✽ سعدیہ بخاری، ایک سے خوبصورت تمبرہ کے ساتھ محفل میں آئی ہیں "دوماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر ہیں۔ نومبر کا سسٹمز دو دن کی تاخیر سے اکتوبر کی 20 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کو ملا خط کیا اس کی تعریف منصف کا میں کا نہیں پڑھوڑتے ہوئے اور اشتہارات کو درگزر کرتے ہوئے انٹائیپ کا سرسری جائزہ لیا اس کو بھی دیکھو ذہین و فطین قارئین پر چھوڑتے ہیں اور اپنی عزیز از جان محفل کا رخ کرتے ہیں۔ ابتدا سے خاصا بڑا ہے پہلے نمبر پر شیر علی صاحب شیر بنے بیٹھے ہیں، صدارت کی مبارکباد۔ عمار کشف آپ آثار قدیمہ کے کون سے ٹھنڈر سے برآمد ہوئے ہیں کیا آپ کی پسندیدہ ڈش مغز ہے؟ ہمایوں سید..... ذرا اس دکان کا نام تو بتانا جہاں سے دل جوڑنے والی اٹلی ملتی ہے۔ باجی طاہرہ گلزار ہمایوں کے پرایا ہو جانے کی خبر ایسے ہی ہے جیسے ہمارے سابق وقایع وزیر بانی و بکلی کا یہ بیان کہ "اس سال کے آخر تک لوڈ شیڈنگ کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔" بابا ایمان اس دور میں بھی محبت فتح و نقصان دیکھ کر نہیں کی جاتی پر اپنا نہیں دوسرے کا۔ جاوید بلوچ آپ فٹیل اردو اور عقل قلیل و طیل کے سہارے لنگ کر اپنا تمبرہ طویل کر ہی دیتے ہیں۔ بابر عباس چوٹ آپ کی ٹانگ پر لگی متاثر آپ کا دماغ ہو گیا، ادب کے ساتھ اگر میرا مارا ہوا کوئی چمکا سیدھا جا کر آپ کی کپٹی پر لگا ہے تو اس میں مجھے محسوس کا کیا

التماس سورۃ فاتحہ
اور سے کے قدیم معاون اور قلم کار حسام بیٹ کی والدہ محترمہ 11 نومبر 2012ء اور ہمارے پرانے قاری محمد الیاس خان (سانکھڑ) کی والدہ ماجدہ مریم سلطان 2 نومبر 2012ء کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ مرحومین کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دعائے مغفرت فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین



قصور؟ مانسہرہ کے ذیل ایم اے اور خوشیوگ کے والے محمد نعمان پیارے آپ دونوں تو ایسے غائب ہوئے جیسے پاکستان سے امریکن سنڈی۔
 دائمی نجات کیس جتنا سادہ اور آسان تھا اس کا انجام اتنا ہی تکلیف دہ۔ آخری صفحات پر نواب محی الدین کا نام دیکھ کر سیدھے ادھر ہی پہنچے، بہت
 خوب اسے عرصے بعد اپنی کہانی کے ساتھ آئے اور چھانگئے۔ مسافر میں شہر یار اور میڈیم ٹیکلیہ کا روٹس اب بورڈ کرنے لگے، یہ قسط بہت ست
 رفتاری رہی جہاں سسٹنی خیر موڈ آیا وہاں جاری ہے لکھا ہوا تھا۔ تاریخی کہانی فاتح میں عالم اسلام کے سرور صلاح الدین ایوبی کے بارے میں اگرچہ پہلے ہی پڑھ
 چکے ہیں لیکن ان کے کارنامے ایسے ہیں کہ جتنی بار بھی پڑھا جائے کم ہے۔ کشکول کی یہ قسط بھی سوائے ذہنی ورزش کے کچھ نہ تھی۔ مختصر کہانیوں میں جہاں
 منظر امام کی جناب عالی نے مسکراتے پر مجبور کر دیا وہیں ڈاکٹر شیر شاہ کی جو کیزری سوکائی نے بہت افسردہ کیا۔ انوکھا ملاپ میں محبت فاتح شہری، مزہ آ کیا کہانی
 کا۔ سیاسی محبت میں میریائے محبت پر اپنا فرض قربان نہ کر سکی۔ بوڑھا درخت میں محبت دولت کے آگے ہار گئی۔ خطرناک عشق
 میں عاشق خطرناک کا واسطہ فراڈیوں سے پڑ گیا۔ سچ کہتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ آخر جانی اور مانی ہوئی رائٹر ہیں بہت ہی خوب صورت انداز
 تحریر اور کہانی تھی۔ نسیہ نے اتنی قربانیوں کے بعد بھی سب کچھ کھو دیا۔ اشعار میں محمد افتخار جو نیو اینڈ جنید احمد ملک کے اشعار بہت پسند آئے۔

✽ ماریہ فاروق، جن سے تشریف لائی ہیں۔ ”آپ نے ماہ اکتوبر میں میرے خط کی تعریف کی تھی اس دفعہ ہم نے ذرا اور ہی طریقے سے خط
 سجا لیا (بہت خوب) پچھلے ہفتے کتابوں میں میرے ہاتھ 2002ء کا پرانا شمارہ لگ گیا قیمت 30 روپے اور صفحے آج کے سسٹن کے مقابلے میں دگنے! مانا
 کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے ہر کوئی پریشان حال ہے مگر یہ بھی تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوئی کہ آپ رسالہ 60 روپے کا کر کے اس کے صفحے بھی کم کر دیں
 (دگنے صفحات والا پرچہ ہم بھی نہیں دیکھ سکے۔ دسی صفحات کم کرنے والی بات تو وہ کم نہ کرنے کی وجہ سے ہی قیمت بڑھانی پڑی) جو محفل کے دوست میرے
 اس گلے سے متعلق ہیں وہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کیجیے گا (اور جو متعلق نہ ہوں وہ کیا کریں؟) محفل شعر و سخن میں صوبیہ تفسیر بابر اور عون عباس بابر دونوں اکاڑہ
 سے تھے، آپ دونوں کا آپس کا کوئی رشتہ تو نہیں؟ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کے تبصرے ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا شعر بھی بہت زبردست تھا۔“

✽ اے ایم چودھری، احمد پور شرقیہ سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں۔ ”سسٹن نومبر بڑی مشکل سے آج ملا ہے۔ محفل دوستان میں چھلانگ
 لگا کی اور یہ کیا..... ابھی رات یعنی 17 اکتوبر کو تو عید کا چاند دیکھا تھا اور آج 18 کو پھر نظروں کے سامنے موجود ہے؟ ارے جناب ہم اپنی پیاری بہنا ماہ ایمان کی
 بات کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے محفل میں داخل ہوئی جہاں شیر علی صاحب جنگل کے بادشاہ بننے کی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ شیر صاحب میری فکر میں دبا
 ہونے کے بجائے آپ ڈاکٹر سے رجوع فرمائیں۔ بہر حال جناب، اول نمبر آنے پر مبارک باد قبول ہو۔ دوسرے نمبر پر محمد عارف کشف صاحب تشریف فرما تھے۔
 جناب کا تبصرہ بہت ہی پسند آیا۔ پھر تفسیر صاحب اپنی گفتگو کی تفسیر کرتے ہوئے نظر آئے۔ سرہم بالکل آپ سے متعلق ہیں کہ شوق اور محبت کا کوئی مول نہیں تو
 جانا۔ سسٹن اگر 500 کا بھی ہو جائے تو پھر بھی ہم پڑھیں گے۔ تفسیر صاحب، کبھی کی بھی حد ہوتی ہے، جناب اک کتاب ہی مانگی ہے آپ سے شاعری
 کی، وہ بھی آپ نہیں عطا فرما رہے؟ ہمایوں سعید راج جی اب بھی آپ بیاباں دل، بنجر دل اور ویران دل ہیں؟ حالانکہ آپ کی پسند آپ کو مل چکی۔ سارہ فرام
 نیو کراچی، سسر خوش آمدید۔ کھرل بھائی آپ کو اور تمام جیل والے بھائیوں کو اللہ عزوجل رحمانی نصیب عطا فرمائے (آمین) ارے رائے کھرل بھائی کیا واقعی
 آپ فرار ہو گئے ہیں؟ طاہرہ گلزار باجی کسی ہیں آپ؟ بہت دل کر رہا ہے آپ سے بات کرنے کو انشا اللہ عید کے دنوں میں ضرور بات کروں گی۔ اب آپ کی
 طبیعت کیسی ہے؟ ساجدہ راجا ڈیڑ سسٹن حاصل کرنا ہر ماہ ہی میرے لیے مشکل ہوتا اور وقت پر پڑھنا اور زیادہ مشکل اور اگر آپ ایڈریس دیں تو اکتوبر کا
 شمارہ ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔ رمضان پاشا بھائی تو ٹینس کس بات کی ہے کہ بھائی نہیں ہے آپ فوراً سے جو شتر شادی کے حسین بندھن میں بندھ جائیں اور ہماری
 بھائی لے آئیں نا..... محمد قدرت اللہ نیازی بھائی کیسی طبیعت ہے۔ تصویر اللہین سسر کا خط بھی پسند آیا۔ من پسند کہانی مسافر میں جہاں شہر یار خان، میڈیم اور
 دشمنوں کے جال میں دھنسا جا رہا ہے، یہ قسط بہت زبردست رہی، اب یقیناً شہر یار دشمن کے جنگل سے نکل جائے گا یا پھر والدین کے قاتل کو دنیا سے رخصت کر
 وائے گا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد کشکول میں جہانکا جہاں اورنگ زیب، سراج اینڈ کمپنی سے ذرا پوشیدہ معاملات کو کرکے کرکے باس
 کے گرد جال تنگ کرتے نظر آئے۔ آخر میں نواب انکل کی تخلیق کردہ ممنوعہ کو پڑھا جس اتنا ہی کہوں گی کہ نواب انکل لا جواب لکھتے ہیں۔“

✽ ریاض شاہد، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ”اس ماہ کا شمارہ سسٹن جہاں فشتانی سے اخبار والے سے وصول کیا۔
 نائل کی تراش خراش دیکھی، ہلکی دھکی حینہ عید مبارک کہہ رہی تھی۔ محفل یاراں میں سب سے پہلے کرسی صدارت پر شیر علی کو شہر۔ مانند ہاڑتے اور گرجے چمکتے
 ہوئے پایا۔ مبارک باد قبول ہو، باقی ماندہ خطوط بے پناہ تفرق کا باعث ثابت ہوئے۔ تفسیر عباس بابر صاحب اور ادیس احمد خان صاحب مجھ تاجپ کو یاد
 رکھنے اور دعا میں دینے پر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں اور دوبارہ خط نہ لکھ سکے کی وجہ ہائی کورٹ میں کیس سماعت ہو رہا تھا اور آپ تمام رائٹر اور قارئین کی
 دعاؤں کے طفیل اللہ رب العزت نے مجھے سزائے موت سے بری کر دیا ہے (مبارک ہو) کہانیوں میں مسافر سے ابتدا کی، بے پناہ اچھی اسٹوری ہے
 شہر یار کا کردار لائق تحسین ہے اور میڈیم کے رنگ ڈھنگ بھی قابل غور ہیں۔ دیگر تمام سسٹن ابھی زیر مطالعہ ہے۔ باقی ہمارے اسیر بھائی عمران حیدر بلوچ
 جیل اسپتال میں داخل ہیں اور بہت سخت بیمار ہیں خصوصی دعاؤں کے لیے التماس ہے۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب معیاری اور پائیدار تھا۔“

✽ عدنان یوسف، بنوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ”نومبر کا سسٹن اکتوبر کی 20 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر موجودہ لڑکی دل کو کچھ زیادہ ہی بھائی۔
 اتنی خوب صورت لڑکی کو کچھ کر دل تو نہیں چاہتا تھا کہ سرورق کو چھوڑ لیکن کیا کرتا باقی رسالہ کو بھی پڑھنا تھا۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح پہلے مسافر پڑھی۔
 شہر یار نے خانزادی اسکا مشن تو کامیابی سے کر لیا لیکن پھر بری طرح پھنس گیا۔ میرے خیال میں وہ شخص سرور حیدر خان ہوگا، اب تو شہر یار اور میڈیم ٹیکلیہ
 کچھ زیادہ ہی فری ہو گئے۔ مسافر ایک زبردست ناول ہے۔ دسی بات کشکول کی، جو بہترین جاری ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ کشکول کے صفحے مزید
 بڑھائے جائیں۔ طاہرہ جاوید مغل صاحب کی انوکھا ملاپ اور کاشف زہیر صاحب کی سیاسی محبت نے واقعی دل کے تار چھیڑ دیے۔ یہ دونوں کہانیاں بہت اچھی



تھیں۔ محفل میں ایک بار پھر ماہ ایمان کو دیکھ کر دل باغ ہوا۔ ماہی! آپ کا کیا خیال ہے کہ چند ماہ غیر حاضر ہونے سے آپ کی قدر بڑھ
 جائے گی۔ عباس مغل، ماہ ایمان نے فرار کی اچھا بہانہ بنایا۔ شیر علی خان آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا، کرسی صدارت مبارک ہو۔ محمد عارف کشف یار
 آپ نے کیسا لڑکیوں والا کام کیا ہے۔ اپنا نام تبدیل کرنا، عمر تبدیل کرنا تو کوئی ان سے کیجئے، آئندہ اپنی شناخت پر فخر کرنا ہے نہ کہ کھودینا۔ باقی
 محمد ہمایوں سعید، تفسیر عباس بابر، طاہرہ گلزار، رمضان پاشا، محمد قدرت اللہ نیازی اور تصویر اللہین کے تبصرے اچھے تھے۔“

✽ احسان سحر، زوایہ خیلانوالہ، میانوالی سے تشریف لائے ہیں۔ ”سب سے پہلے پیاری آئی اور انکل کو پیار بھر اسلام۔ سسٹن 17 کو ملا۔
 نائل دیکھ کر موسم کی طرح ٹھنڈے ٹھنڈے ہو گئے، خوشبو کی طرح دل میں بستا ہوا، سوتے ہوئے گلاب کی طرح تروتازہ صنف نازک کا معصوم اور جاذب نظر
 چہرہ دیکھ کر تو اندھے ہو گئے..... جون ایلیا مرحوم کا انتہائی پڑھا اور دل میں محفوظ کر لیا، محفل زعفران میں پہنچے تو ایک خوشخبری ہماری منتظر تھی، لیکن اسنے
 سارے غموں اور غموں کے پھاڑ کا یہ چھوٹی سی خوشخبری ادا کر کے گی یہ تو خیر وقت ہی بتائے گا۔ شیر علی خان محفل یاراں کے نمبر ون نمبر قرار پائے۔ مبارک
 جی، کھلے اور نرم دل سے اور کچھ دوستوں کی باتیں اور کچھ نصیحتیں کرتے نظر آئے، کاش خود بھی ان پر عمل کریں آپ۔ عارف کشف جی پر آپ نے تبصرہ لکھا ہے
 کہ..... اسنے اوکھے (مشکل) الفاظ آئندہ ہمیں ان سے بچائیں۔ تفسیر عباس بابر صاحب نے ہمایوں سعید کی عمر کا انکشاف کر کے ہمیں حیران کر دیا۔ سارہ جی
 پہلی واری آتے ہی اتنا لمبا تبصرہ کھینچ مارا پھر بھی کہتی ہو لکھنے کا طریقہ نہیں آتا۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ اچھا پڑھو اسما شکارہ (مزاحیہ) تھا۔ ہم مرنے نہیں انسان
 ہیں، ہماری قدرت اللہ نیازی کی طرح دم نہیں ہے جی۔ ماہ ایمان بھی آگئیں۔ واہ اچھی گل (بات) ہے۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی پڑھی اور جی اٹھے۔
 صلاح الدین ایوبی کی بہادری نے سرشار کیا، کاش اس وقت بھی کوئی ایسا حکمران آجائے جو ہمارے پیارے پاکستان کو بچالے۔ بوڑھا درخت دل کے
 تاروں کو چھیڑتی اور ہم کو بھی اپنی پرانی یادوں میں دھکیل گئی پراسوس ہمارے پاس بوڑھا درخت نہیں جسے دیکھ کر ہم بھی نصیحت پکڑی اور سبق سیکھیں۔ جناب
 عالی اچھی اور اچھا موضوع رہا۔ جو کیزری سوکائی، ہمارے اپنے دیہاتوں کی عکاس جنہیں ہمارے حکمران بھی فراموش کر چکے ہیں، دیہاتیوں اور دیہات کو۔
 حضرت یحییٰ علیہ السلام بابر پڑھی اور دل کو سکون اور راحت سے نوازا۔ طاہرہ صاحب اس دفعہ الگ انداز کی جدا گانہ تحریر لے کر حاضر ہوئے۔ انوکھا ملاپ
 واقعی حیران کر دینے والا ملاپ تھا۔ خلوص اور چاہت میں لہو بھی شامل ہوتا اس سے بھوک کیا ہر چیز اور بڑی سے بڑی رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ سگ گزیدہ
 مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ خطرناک عشق اور ملتی چھاؤں نے دل کو کافی سکون مہیا کیا۔ خوب صورت شاہکار رہے۔ کشکول اب اچھے انداز میں چل رہی ہے،
 لیاقت حسین سے زیادہ اورنگ زیب ایکشن میں نظر آ رہا ہے۔ پراسراریت میں ٹھوڑا اور اضافہ کریں تو بات سولہ آنے بہترین ہو جائے گی۔ مسافر کی ہر قسط
 میں شہر یار ایک نیا مشن کرتے کرتے خود ہی مشین نہ بن جائے اگر ایسا ہو جائے تو مزہ آئے گا ہر ماہ نئے مشن کے ساتھ کچھ ایڈوینچر بھی دیکھنے کو مل جائے گا۔
 اشعار سب کے سب بہت اچھے رہے۔ سیاسی محبت کافی عرصہ بعد سسٹن میں مصر کے حوالے سے کہانی پڑھی، بہت زیادہ پسند آئی، خاص کر صحرائی علاقے
 میں اونٹوں کا بدکنا، ویلڈن..... اینڈ شکریہ۔“ (بھر پور تبصرے کا شکریہ)

✽ رضوان تنولی کرپڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”ایک طویل غیر حاضری کے بعد ادارہ سسٹن،
 اسٹاف وقار کین کو اسلام علیکم (ولیکم السلام) ماہ نومبر کا شمارہ 17 تاریخ کی صبح اسٹال پر جگمگا نظر آیا قدم بے اختیار رک گئے اور دل جھل اٹھا ہا کر سے
 سسٹن لے کے پیسے دیے تو اس نے بتایا پرچہ 2 ماہ 60 روپے کا ہو چکا ہے، مہنگائی کے اس دور میں جب سب ہی پاکستان کی ادھ موٹی عوام کا خون
 چوسنے اور چوڑی ادھیڑنے میں مصروف ہیں تو یقیناً ادارہ سسٹن بھی اس مہنگائی کی لپیٹ میں آئے گا۔ قارئین سسٹن کو ادارہ سے کی مجبوری کا احساس ہے
 اور عاشقان سسٹن کے لیے قیمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ (آپ سب کی محبت کو ہم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں) سرورق کی سینہ کا تبصرہ بابر عباس کے
 لیے چھوڑتے ہوئے صفحہ پلانا اور استاد معظم جون ایلیا کی کلاس اینڈ کی مرحوم نہایت درد مند دل رکھتے تھے۔ محفل خطوط کی ابتدا آپ کے تبصرے سے
 کی۔ چاچو جی مالہ کا ذکر چھیڑا تو بات بہت ہی ہو جائے گی۔ بات مختصر کرتے ہوئے عرض کروں بابائے قوم کا پاکستان، عظیم المرتبت مصیبتوں کی بے
 مثال قربانیوں کا پاکستان، شہیدوں کا پاکستان چاروں طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں ہے۔ اے اللہ رب العزت پاکستان کی حفاظت فرما۔ خطوط کی
 محفل کے صدر شیر علی کو منصب صدارت کی مبارک باد۔ عزیز ساتھیوں میں کافی عرصہ بعد آپ سے ہم کلام ہوں۔ محفل میں کسی بھی قسم کا کوئی ہلہ گلہ نظر نہیں
 آیا اور نائل کے بغیر مجھے محفل ادھوری لگتی ہے۔ سوچ رہا ہوں میں کس کی دم پے پاؤں رکھ کے ابتدا کروں، خوب صورت چڑیلیں سائڈ پکڑ لیں کیونکہ جتنے
 بلکن سے اپنا کوئی جوڑ نہیں ویسے محفل کا مزہ بھی صنف اولی، آہ، اف، ہائے سے ہے۔ بے کوئی مرد جوان جو قلم کی تلوار پکڑ کے میرے مد مقابل آئے، ہے
 کوئی شیر دل جو میری ایک کے بدلے 4 سائے۔ میں بچپن سے ہی سسٹن کی پہلی تاریخی کہانی اور صرف قسط وار کہانیوں کو پسند کرتا ہوں اس لیے کہانیوں
 کی ابتدا اپنی محبوبہ تحریر ڈاکٹر ساجد احمد کی شاہکار تحریر فاتح سے کی۔ صلاح الدین ایوبی ایک عظیم ماں کا عظیم بیٹا، قبلہ اول کا فاتح مرد مجاہد آج بھی دنیا کے
 اسلام کے دلوں میں زندہ ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عیسائی آج بھی ہم سے صلیبی جنگیں لڑ رہے ہیں۔ انوار
 صدیقی کی کشکول کا آٹھ ماہ بعد مطالعہ کیا اور کشکول پچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح ملی، صدیقی صاحب اتنی شاہکار داستان کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔
 مسافر نامہ ملک کے خوب صورت قلم کی تحریر میڈیم ٹیکلیہ کے کردار سے اپنی محفل کی مایہ ناز جگمگاتے اکا مس ٹیکلیہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ مس جی آپ کہاں ہیں میں
 آپ کے خالص زمانہ اسٹائل کو اکثر یاد کرتا ہوں کستوری لگا کے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
 چودھری رضا خان، راولپنڈی۔ توقیر خان، اکاڑہ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ محمد زہیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ میمونہ عزیز، اسلام آباد۔ محمد عامر، لاہور۔ محمد
 انعام، کراچی۔ یاسر امین، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔ الیاس خور، سیالکوٹ۔ محمد زہیر، حیدر آباد

ماضی کے اوراق طرح طرح کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں جنہیں دہرانے والے ہر بار ایک الگ ہی انداز میں دیکھتے ہیں۔ انہی اوراق میں والی خراسان الپتگین کے غلام سبکتگین نے جب ایک روز ہرنی کے بچے پر رحم کرتے ہوئے اپنے شکار کو آزاد کیا اور آگے چل کر اسی غلام کے ہونہار بیٹے محمود غزنوی نے اشاعت اسلام اور بت پرستی کے خلاف یادگار سترہ حملے کیے اور تاریخ میں بت شکن کا خطاب پایا۔ یہی غلام آگے بصر میں غزنی کا بادشاہ بنا جس کے خوابوں میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتا تھا... محمود شکلاتو خوب صورت نہیں تھا مگر اس کا غلام ایاز حسین چہرے اور ضرب المثل زبان کا مالک تھا۔ محمود علم کا اس قدر شیدائی تھا کہ اس کے دربار میں علما کا ہجوم رہتا تھا۔ اس کے خیال میں اہل علم کی زمین ایسی زرخیزی لیے ہوئے ہوتی ہے جس میں خلوص اور احسان کے بیج بوئے جائیں تو ایسے پھل اور سائے نصیب ہوتے ہیں جن سے دین اور دنیا کی ٹھنڈک اور ذائقے نصیب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اس کے دربار سے علم نجوم کا ماہر ابوریحان البیرونی اور کئی درخشندہ ستارے وابستہ تھے۔ تاریخ پر چھا جانے والے یہ لوگ بڑے عجیب مزاج و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک طرف تلوار اٹھاتے ہیں اور دوسری جانب عشق و عقیدت کے پھول کھلاتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اس کے پیچھے بھانسی چلی آرہی ہے۔ ہرنی کے چہرے سے رنج اور ملال کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ سوار کو اچانک یاد آیا کہ ہرنی کا بچہ اس کے پاس ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ ہرنی کو دوڑاتا ہوا شہر تک لے چلے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا دل یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ یہ ہرنی محض ہرنی نہیں ہے، ایک ماں ہے جو اپنے بچے کی رہائی کے لیے بے چین ہے۔ اس نے بغیر کسی توقف کے بچے کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ بچہ بھاگتا ہوا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ منظر دیکھنے کا تھا جب بے زبان ہرنی اپنے بچے کو بے تحاشا چوم رہی تھی اور بار بار نظریں اٹھا کر سوار کی طرف دیکھ لیتی تھی جیسے آنکھوں آنکھوں سے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ پھر اس نے بچے کو ہمراہ لیا اور جنگل کی طرف پلٹ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر سوار کی آنکھوں میں نمی بر گئی۔

وہ جب رات کو سونے کے لیے لیٹا، اس وقت بھی وہ مامتا کی ماری ہرنی پر غور کر رہا تھا۔ پھر اسے نیند آگئی اس نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے۔ ”تو نے ایک بے زبان جانور پر جو رحم کیا ہے وہ خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں بہت مقبول ہوا ہے لہذا اس کے صلے میں تجھے چاہیے کہ یہی طریقہ اختیار کرے اور بھی رحم کو ہاتھ سے

اس کا معمول تھا کہ اپنے واحد گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں گھومتا اور چھوٹا موٹا شکار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اسی شغل میں مشغول تھا کہ اس کی نظر ایک ہرنی پر پڑی۔ ہرنی کا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کسی کی آمد سے بے خبر گھاس چرنے میں مگن تھے کہ ہرنی کے کان کھڑے ہوئے۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس طرف آرہا ہے۔ اس نے ایک مخصوص آواز نکالی۔ شاید وہ اپنے بچے کو خبردار کر رہی تھی کہ خطرہ قریب ہے۔ ہرنی نے گردن گھما کر دیکھا۔ گھوڑا اور اس پر بیٹھا ہوا سوار اس کی طرف آرہے تھے۔ ہرنی بھاگ کھڑی ہوئی۔ ماں کے ساتھ بچے نے بھی زقند بھری، سوار نے گھوڑے کو سر پٹ دوڑا دیا۔ ہرنی تو چھلانگیں بھرتی ہوئی ہوا ہو گئی لیکن بچہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا۔ ایسی ٹھوکر لگی کہ دور تک گھسٹا چلا گیا۔ سوار نے گھوڑا روکا، ہرنی کے بچے نے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن سوار نے اسے پکڑ لیا۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور زین کے ساتھ باندھ دیا اور شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اب وہ گھوڑے کو تیز نہیں دوڑا رہا تھا۔ کچھ سرشاری تھی کچھ اطمینان، گھوڑے کو دکی چال چلا رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہرنی



نہ جانے دے کیونکہ یہ طریق دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔
یہ رحم دل سوار سبکتگین تھا جو والی خراسان اپٹلین کا
غلام تھا، اسی کے ہونہار بیٹے سلطان محمود غزنوی نے تاریخ
اسلام میں ”بت شکن“ کا خطاب پایا۔

سبکتگین کے ابتدائی حالات میں آتا ہے کہ وہ نسل
ایران کے بادشاہ یزدجرد کے خاندان سے تھا۔ اسے ایک
سوداگر ترکستان سے بخارا میں لایا اور پھر اسے اپٹلین کے
ہاتھ فروخت کر دیا، اپٹلین نے اس کے چہرے پر عقل و
دانش کے آثار دیکھے تو اسے اپنے خاص لوگوں میں شامل
کر لیا۔ بعد میں اسے اپنے لشکر کا امیر الامرا بنایا۔

حضرت عثمان کے زمانے میں ایران کا بادشاہ یزد
جرد قتل کرایا گیا تو اس کی اولاد ترکستان کی طرف بھاگ گئی۔
سبکتگین انہی کی اولاد سے تھا۔

وہ نہ جانے کب تک اسی حال میں رہتا کہ اس پر ترقی
کے دروازے کھلنے لگے۔ ہوا یوں کہ خلیفہ عبد الملک کا
انتقال ہو گیا۔ امراء بخارا نے اپٹلین کے پاس ایک
قاصد بھیجا۔

اپٹلین اس وقت اپنے غلام سبکتگین سے عقل و دانش
کی باتیں سیکھ رہا تھا کہ چوب دار نے بخارا سے آئے ہوئے
قاصد کے آنے کی اطلاع دی۔ اپٹلین نے اسی وقت اسے
بلوایا۔ وہ قاصدوں سے ہمیشہ خلوت میں ملاقات کرتا تھا
لیکن قاصد بخارا سے آیا تھا اور عبد الملک کے انتقال کو زیادہ
دن نہیں گزرے تھے اس لیے اس نے یہی سمجھا کہ کوئی
از حد ضروری پیغام ہوگا۔ اس نے اتنا وقت بھی ضائع نہیں کیا
کہ اٹھ کر جاتا یا غلام کو باہر جانے کو کہتا۔

”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، خلیفہ قضائے الہی سے
رحلت فرما چکے ہیں اور یہ فیصلہ اب تک نہیں ہو سکا ہے کہ
حکومت کسے سونپی جائے۔ امراء بخارا نے دریافت
فرمایا ہے کہ آل سامان میں اب کوئی ایسا شخص ہے جو حکومت
کرنے کا اہل ہو؟“

اپٹلین نے جواب طلب نگاہ سے سبکتگین کی طرف
دیکھا۔ پھر اچانک اسے اپنی حیثیت یاد آگئی۔ قاصد کی
موجودگی میں ایک غلام سے رائے لینا ٹھیک نہیں۔ اس نے
خود جواب دینا مناسب سمجھا۔

”میرا یہ پیغام امراء بخارا تک پہنچا دو کہ منصور بن
عبد الملک ابھی نوجوان ہے لہذا حکومت کا اہل اس کے چچا
سے زیادہ کوئی نہیں۔“

قاصد کے رخصت ہو جانے کے بعد سبکتگین نے

بولنے کی جسارت کی۔ ”یہ آپ نے کیا پیغام پہنچا دیا۔“
”میری رائے میں یہی مناسب تھا۔ کیا تمہارا خیال
اس کے برعکس ہے؟“
”یہ صحیح ہے کہ رموز مملکت بادشاہ ہی جانتے ہیں لیکن
اگر اجازت ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔“

”تمہاری باتوں کو میں نے ہمیشہ سے سنا ہے۔“
”آپ نے ایک طرح سے منصور بن عبد الملک کی
مخالفت کر دی ہے۔ اگر امراء بخارا منصور ہی کو تخت پر بٹھا
دیتے ہیں تو یہ مخالفت منصور کے دل میں کانٹے کی طرح ٹھکنے
پر رہے گی۔ اگر وہ تخت پر نہیں بیٹھ سکا تو بھی وہ اس حق تلفی کو
آپ کی مخالفت کا نتیجہ سمجھے گا۔ آپ کو سکوت اختیار کرنا
چاہیے تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اب تو تیرے کمان سے نکل چکا۔“
سبکتگین کا اندازہ درست نکلا۔ قاصد یہ پیغام لے کر
بخارا آیا تو امراء نے اپٹلین کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور
منصور کو تخت نشین کر دیا۔ بعض امراء نے منصور کے کان میں یہ
بات بھی ڈال دی کہ اپٹلین نے اس کی مخالفت کی تھی۔

منصور بن عبد الملک نے حکومت کی باگ ڈور
سنبھالتے ہی اپٹلین کو اپنے حضور طلب کیا۔ اپٹلین کے دل
میں چور تھا کیونکہ وہ منصور کی مخالفت کر چکا تھا۔ اس کے
پاس جانا آزادی کو قید سے بدلنا تھا۔ اس نے علم سرکشی بلند
کیا۔ دو تین ہزار سواروں کو ساتھ لیا جو اس کے غلام تھے اور
خراسان سے غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ سبکتگین اس کے لشکر
کا سپہ سالار تھا۔

سبکتگین نے دلیری دکھائی اور ایک ہی حملے میں غزنی
کو فتح کر لیا۔

اپٹلین غزنی کا خود مختار حکمران بن گیا۔ خراسان اس
کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اپٹلین نے پندرہ سال تک ہمت و اقبال مندی سے
حکومت کی۔ اس عرصے میں سبکتگین کے جو ہر خوب کھلے۔
اس نے اپنے آقا کے حکم سے کئی بار ہندوؤں سے جہاد کیا
اور کامیابی حاصل کی۔

اپٹلین کے انتقال کے بعد حکومت اس کے بیٹے
ابو اسحق کے پاس گئی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسحق کا انتقال
ہو گیا۔ ارکان سلطنت نے سبکتگین کے چہرے پر فتح مندی
کے آثار دیکھ کر اسے بادشاہ تسلیم کر لیا۔

ایک غلام غزنی کا بادشاہ بن گیا۔ ایک شاہانہ عزم کے
ساتھ جہاد پر کمر بستہ ہو گیا۔ وہ ہندوستان پر حملے کرنے لگا۔

وہاں سے غلام اور مال غنیمت لاتا تھا۔

اس نے اپٹلین کی بیٹی سے شادی کر لی۔

وہ ان دنوں دریائے چناب کے کنارے واقع شہر
موہدرہ (وزیر آباد) میں ایک مقامی ہندو حکمران سے
برسر پیکار تھا۔ اس نے یہاں ایک خواب دیکھا کہ اس کے
مکان کے آتش دان سے ایک بڑا درخت پیدا ہوا جس کے
سائے کے تلے پوری دنیا آگئی۔ آنکھ کھلی تو وہ اس خواب
کے بارے میں سوچنے لگا، خواب مبارک معلوم ہو رہا تھا
لیکن کوئی واضح تعبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے باقی
رات کچھ سوئے، کچھ جاگتے گزار دی۔

اس نے سوچا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ اس خواب کے
بارے میں کسی سے مشورہ کرے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں
آئی۔ خواب کی تعبیر خود اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

ایک شخص غزنی سے آیا تھا اور اتنی تیزی میں تھا کہ
گھوڑا دوڑاتا ہوا سبکتگین کے خیمے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا
حالانکہ یہ بے ادبی تھی۔ اسے پیدل چلتے ہوئے آنا چاہیے
تھا۔ اس نے پہرے داروں کی پروا بھی نہیں کی اور سبکتگین
کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”اے شخص! کیا تو سارے آداب بھول گیا ہے
حالانکہ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تجھے کیا کہنا ہے؟“

”حضور، بات ہی اتنی خوشی کی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ
رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرزند عطا کیا ہے۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ سبکتگین کی زبان سے بے
اختیار نکلا۔ ”تو نے میرے خواب کو سچ کر دکھایا۔“

پیغام لانے والا کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ
رہا ہے۔ اس نے سبکتگین کی جانب سے انعام وصول کیا اور
خیمے سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سوہدرہ کے
کنارے واقع مندر کو سبکتگین کے لشکر نے مسمار کر دیا اور
حریف راجا فرار ہو گیا۔ سبکتگین اس لڑکے کی پیدائش پر
شکر گزار ہوا جس کے طالع کی مدد سے بت خانہ مسمار ہوا۔
سبکتگین نے اس لڑکے کا نام محمود رکھا۔ یہی لڑکا تاریخ میں
سلطان محمود غزنوی کے نام سے مشہور ہوا۔

سبکتگین نے محمود کے ہوش سنبھالتے ہی اسے جنگی
تربیت سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ اس بچے میں بھی کچھ
ایسی خداداد صلاحیتیں تھیں کہ بچپن ہی میں وہ ایک اچھا
شہسوار بن گیا۔ اس کی حرکات و سکنات سے دلیری اور
بہادری بھی ظاہر ہوتی تھی۔ سبکتگین اسے ہر لڑائی میں ہم
رکاب رکھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر میں پہنچ گیا۔

حکم خداوندی

ایک فقیر نے کسی درویش کو دیکھا جو نشے
کی حالت میں بدست ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر
فقیر اپنے زہد پر فخر و غرور کرنے لگا۔ پھر اس نے
تکبر کی وجہ سے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ
کیا۔

وہ بدست فقیر سر اٹھا کر کہنے لگا اگر خدا
نے تجھ پر انعام کیا ہے تو اس کا شکر ادا کر۔ تکبر نہ
کر کیونکہ غرور کرنے والوں کو محرومی کے سوا کچھ
نہیں ملتا۔ شیطان تکبر کی وجہ سے ہی ذلیل
و مردود ہوا تھا، کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر
ہنسنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ خدا نخواستہ کل تم بھی کسی
مصیبت میں پھنس گئے تو پریشان ہو جاؤ گے۔
کیا خبر کہ قسمت کے پھیر سے کل تو بھی میری
طرح نشے سے بدست ہو کر گر پڑے اور لوگ
تجھ پر ہنسیں۔ اگر خدا نے تجھے مسجد میں بیٹھنے کی
توفیق دی تو آتش کدوں میں بیٹھنے والوں کی ہنسی
تو نہ اڑا۔ ایسا نہ ہو کہ خدا انہیں مسجد میں اور تجھے
آتش کدے میں پہنچا دے۔

مسلمان کو ہر حال میں خدا سے ڈرنا اور
اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اس لیے کہ حکم خداوندی
کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ زمین و آسمان
تقدیر سے باہر نہیں ہے۔ اس لیے اپنے عمل پر
غرور کرنے کے بجائے تقدیر الہی سے خوفزدہ
اور ذات باری پر متوکل ہونا چاہیے۔ اگر انسان
کو توکل نصیب ہو جائے تو یہ بڑی اللہ تعالیٰ کی
نعمت ہے۔

نصیحت: ”دوسرے کی عیب جوئی نہیں
کرنا چاہیے۔ توکل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں
سے ایک ہے۔“

قلبی تعاون محمد زریان سلطان۔ کراچی

اس کی عمر سولہ سال تھی کہ اسے اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان کے راجا جے پال سے جنگ لڑنے کا موقع ملا۔ ان دنوں شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا راجا جے پال تھا۔ اس کی سلطنت ایک طرف جلال آباد اور پارہ چنار تک تو دوسری طرف کشمیر کے جنوبی پہاڑی علاقے سے لے کر ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ایک مقام بھٹنڈہ میں قیام کیا اور پھر ایک بہت بڑا لشکر لے کر مسلمانوں کی سلطنت کی طرف بڑھا۔ اس کے جواب میں سکپتگین نے بھی لشکر تیار کیا اور اس سے مقابلے کے لیے غزنی سے روانہ ہوا۔ کم سن محمود غزنوی جس کی ابھی مسین بھیگ رہی تھیں، باپ کے ہم رکاب تھا۔ اس کے لیے یہ پہلی اتنی بڑی جنگ تھی لیکن وہ بے خوف بھی تھا اور چونکا بھی۔ قدم قدم پر باپ کو مشورے دیتا جاتا تھا۔

”ہمارا لشکر راجا کے مقابلے میں بہت کم ہے۔“ محمود نے سکپتگین سے کہا۔

”تو کیا ہم واپس پلٹ جائیں؟“

”میرا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس جنگ میں ہمیں طاقت سے زیادہ حکمت عملی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“

”کوئی تجویز ہے تمہارے پاس؟“

”غورینہ اور گنڈا بک کے پہاڑ میری تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔“

”کیسی تجویز؟“

”آپ میرے ساتھ اس پہاڑ کی چوٹی پر چلیے۔“ وہ اپنے باپ سکپتگین اور چند سرداروں کے ساتھ پہاڑ کی بلند چوٹی پر چلا گیا۔

”آپ لوگ جے پال کا لشکر ملاحظہ فرمائیں۔ انسانی سمندر ہے جو ٹھائیں مار رہا ہے۔ میں کل ہی اس چوٹی پر آیا تھا اور جے پال کے لشکر کو دیکھا تھا۔“

”ہم اسی لشکر کو اپنی طاقت سے چوٹی کی طرح مسل دیں گے۔“

”یہ سمندر ہمیں ڈبو بھی سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے بابا جانی کو مشورہ دینے کی جسارت کی تھی کہ وہ میری تیار کردہ حکمت عملی پر غور فرمائیں۔ مصلحت اس وقت اسی میں ہے کہ پانچ پانچ سو سواروں کے دستے بنائے جائیں۔ یہ دستے باری باری لڑیں۔ پہلے ایک دستہ میدان میں جائے۔ باقی لوگ پہاڑوں میں چھپے رہیں، جب یہ دستہ تھک جائے تو

دوسرا روانہ ہو۔“

سکپتگین نے اس رائے کو پسند کیا۔ پہاڑ سے نیچے اتر کر دوسرے سرداروں سے بھی مشورہ کیا۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ سکپتگین کا سینہ اس وقت فخر سے پھول گیا۔

”محمود، میرے عظیم فرزند! میں نے تیری پیدائش کے وقت خدا سے دعا کی تھی کہ یہ بچہ میرا نعم البدل بنے۔ میرے ادھورے کاموں کو مکمل کرے۔ گفرستان ہند سے باطل کا خاتمہ کرے۔ بت فروش نہ ہو، بت شکن بنے۔ مجھے آج محسوس ہو رہا ہے میری یہ دعا قبول ہوئی ہے، تو ضرور تاریخ عالم میں نام پیدا کرے گا۔“

محمود کی تجویز کے مطابق دفاعی مورچے قائم کر دیے گئے جہاں غزنی فوج کے دستے متعین کر دیے گئے۔ ان سب کو اپنی اپنی باری پر دشمن کے سامنے آنا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو امیر سکپتگین، محمود غزنوی اور دوسرے سردار محض چند ہزار سواروں کے ساتھ دشمن پر چھپے۔ راجا جے پال اپنے ہاتھی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ایک لاکھ سپاہ کے مقابلے میں چند ہزار سوار میدان میں اترے تھے۔ ہٹنے کی تو بات ہی تھی لیکن کچھ ہی دیر میں وہ بے چینی سے پہلو بدلتے لگا۔

”یہ بالک کون ہے؟“ جے پال نے اپنے ایک سردار سے محمود کے بارے میں پوچھا۔ ”اس کے بدن میں بجلی سی بھری ہوئی ہے، کس بہادری سے لڑ رہا ہے۔ کون ہے؟“

”مہاراج! یہ سکپتگین کا بیٹا محمود ہے۔“

”اگر سکپتگین کے بعد حکومت اسے مل گئی تو یہ ہندوستان کے لیے بڑا خطرہ بن جائے گا۔“

”مہاراج! ابھی یہ ہماری تلواروں کے دم خم سے واقف نہیں۔“

”اپنے آدمیوں سے کہو، سب کو چھوڑ کر اس دلیر کو گھیر لیں۔ اس جنگ میں یہ فتح کرنے جانے پائے۔“

جے پال کی نظریں محمود پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی تلوار برق کی طرح کوند رہی ہے۔ گردنیں اڑانی چلی جا رہی ہے۔ کبھی وہ قلب میں نظر آ رہا تھا، کبھی سینہ اور میسرہ میں۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے چند سرداروں نے محمود کو گھیرے میں لے لیا ہے لیکن یہ کیا، محمود گھیرا توڑ کر نکل گیا۔ اس کی مدد کے لیے غزنی سردار پہنچ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کی پشت پر شور مچا۔ دفاعی مورچوں سے پانچ سو سواروں کا دستہ نکل آیا تھا۔ جے پال کی فوج کو اتنی عددی برتری حاصل تھی کہ اس نے اس حملے کو

سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور تازہ دم دستے نے حملہ کر دیا۔ ہندو لشکر اس دستے کے خلاف بھی جم کر لڑنے لگا۔ اس کے بعد جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دفاعی دستے ایک ساتھ باہر نکل آئے اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ ہندو لشکر اس ناگہانی آفت سے بوکھلا گیا۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ سکپتگین کو کہیں سے تازہ کمک مل گئی ہے۔ انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس فرار میں بے شمار ہندو قتل ہوئے۔ لشکر کی تعداد کم ہوئی تو جے پال کا ہاتھی بھی میدان سے نکل گیا۔

مسلمانوں نے نیلاب (سندھ) کے کنارے تک ان کا تعاقب کیا اور وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری کی۔ پشاور کے ملک دریائے نیلاب کے کنارے تک مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ ان مفتوحہ علاقوں میں قانون اسلامی رائج ہوا اور سکپتگین کے نام کا خطبہ و سکہ رائج ہوا۔

اس جنگ میں شاندار کامیابی کے بعد وہ امیر نوح بن منصور کی مدد سے آگے بڑھا اور خراساں اور ماوراء النہر میں کئی شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔

ان دنوں محمود نیشاپور میں تھا کہ اس کے پاس امیر سکپتگین کے انتقال کی روح فرسا خبر پہنچی۔ اس خبر کو سن کر وہ نیشاپور سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس خبر نے اس کا پاؤں رکاب تک نہیں پہنچے دیا کہ اس نے سنا اس کا بھائی اسماعیل (دوسری ماں سے) بلخ میں تخت نشین ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ باپ نے مرنے سے پہلے خود اسے نامزد کیا تھا۔

محمود غزنوی، باپ کی نامزدگی کے احترام میں خاموش ہو گیا لیکن بہت جلد یہ خبریں بھی اس تک پہنچنا شروع ہو گئیں کہ اسماعیل ایک نا اہل حکمران ثابت ہوا ہے۔ مملکت کے کام کاج انتشار کا شکار ہیں۔ معاملہ بھائی کا تھا اس لیے وہ لشکر کشی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس نے بھائی کی نصیحت کے لیے ایک خط تحریر کیا۔

”والد گرامی جو ہم سب کے پشت پناہ تھے، وہ اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان کے بعد تم سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔ تم میری آنکھیں ہو۔ جو کچھ تمہاری خواہش ہو میں اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن سلطنت کے قیام کے لیے سن رسیدہ اور پختہ کار ہونا ضروری ہے۔ تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو اور تمہاری عقل و دانش بھی تمہاری عمر کے مطابق ہے۔

والد صاحب نے جو تمہیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا وہ مصلحت وقت کا تقاضا تھا کیونکہ میں دور تھا۔ اچھائی اور

برائی کے فرق کو سمجھو۔ غزنی جو ہماری حکومت اور رعب داب کا سرچشمہ ہے مجھے دے دو تا کہ بلخ و خراساں کو دشمنوں سے پاک صاف کر کے تمہیں دے دوں۔ یہ تمہارے قابو میں آنے والے نہیں۔“

امیر اسماعیل نے اپنے بھائی کے خط کی مطلق پروا نہیں کی اور مخالفت پر ڈٹا رہا۔ محمود نے یہ حال دیکھ کر اپنے چچا اور سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ لشکر جرار اکٹھا کیا اور دارالحکومت کے قریب پہنچ گیا۔ امیر اسماعیل بھی اپنا لشکر لے کر بلخ سے آگے بڑھا۔ محمود نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی نصیر الدین کو اسماعیل کے پاس بھیجا کہ وہ اسے اس جنگ سے باز رہنے کی تلقین کرے۔ اسماعیل اپنی ضد پر ڈٹا ہوا تھا بلکہ اس نے مزید کسی سفارت کا انتظار بھی نہیں کیا اور حملے میں پہل کر دی۔ جنگ ہوتی رہی اور بالآخر محمود نے اپنے قلب لشکر سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ اسماعیل کی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور غزنی میں قلعہ بند ہو گئی۔

محمود نے مختلف عہد و پیمان کر کے ان لوگوں کو قلعہ سے باہر نکالا اور ملک کے خزانے وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ امیر اسماعیل اس کے سامنے لایا گیا۔

محمود نے اس سے پوچھا۔ ”اگر تمہاری قسمت یاوری کرتی اور تم جیت جاتے تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟“

اسماعیل نے جواب دیا۔ ”میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے فتح نصیب ہوتی تو تمہیں ایک قلعے میں نظر بند کروں گا اور وہاں تمہیں راحت و آرام کا تمام سامان بہم پہنچاؤں گا۔“

سلطان محمود اپنے بھائی کے اس خیال کو سن کر خاموش ہو گیا لیکن چند دنوں بعد اس نے اسماعیل کو جرجان کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور راحت و آرام کا تمام سامان بہم پہنچا دیا۔ اسے یہ بھی کہلا بھیجا۔ ”اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو میرے سوال کے جواب میں یہ کہتے کہ تم مجھے معاف کر دینے کا پکا ارادہ کر چکے تھے تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کرتا۔“

بھائی کو سزا سنانے کا دکھ اسے اتنا تھا کہ اپنے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ نہ جانے کس عالم میں تھا کہ ہزار مرتبہ کا دیکھا ہوا چہرہ آج اسے بد صورتی کا احساس دل رہا تھا۔ اس کی صورت خوش نما اور خوب نہ تھی۔ چپک کے داغوں نے اس کی صورت کو مزید بدنما بنا دیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ آئینہ نہیں

دیکھ رہا تھا لیکن اس وقت اسے اپنی بد صورتی کا شدت سے احساس ہوا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ سلطان محمود تھا۔ ایک بڑی اسلامی مملکت کا بادشاہ۔

اس کا غلام ایاز جس سے وہ عشق کی حد تک لگاؤ رکھتا، حسن و جمال میں یکتا تھا۔ اس کے قریب کھڑا اپنے آقا کی بدلتی ہوئی کیفیات کو دیکھ رہا تھا۔

محمود نے اس سے کہا۔ ”مشہور ہے کہ بادشاہوں کی صورت دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آتی ہے۔ ایک میری صورت ہے جسے دیکھ کر شاید دیکھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو۔“

ایاز کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا جواب دیا کہ محمود کی تعریف ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”مالک! آپ کی صورت دیکھنے والے کم ہیں لیکن سیرت سے سب کا تعلق ہے۔ آپ کی اچھی سیرت خلق خدا کی بھلائی کا باعث بنے گی اور آپ کو ہر دل عزیز حاصل ہوگی۔ خلق خدا پر آپ کی مہربانیاں اور آپ کے کارنامے آپ کو خوب صورت بنادیں گے۔“

ایاز کی باتیں سن کر محمود کی آنکھیں بھیک گئیں۔

”آقا، میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”یہ بات نہیں بلکہ تمہاری نصیحت سن کر مجھے ابا حضور کی یاد آگئی۔ میں نے اپنی جوانی کے ابتدائی دنوں میں غزنی کے اندر ایک باغ لگوایا تھا۔ اس میں ایک شاندار عمارت بھی تعمیر کرائی تھی۔ میرے والد اور دوسرے ارکان دولت جب اسے دیکھنے آئے تو والد نے فرمایا۔

”ایسی چیزیں تو تمہارے ملازم بھی بنا سکتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان و شوکت کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ ایسی عمارت کی بنیاد ڈالیں جس کی مثال پیدا نہ کی جاسکے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کون سی عمارت ہے؟“

ابا حضور نے فرمایا۔ ”ایسی عمارت سے مراد اہل علم کے دل ہیں۔ ان کے دل ایسے زرخیز ہیں کہ اگر تم ان میں اپنی محبت اور احسان کے بیج بوگے تو ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نام حشر تک زندہ رہے گا۔“

ایاز، بالکل یہی بات آج تمہاری زبان سے ادا ہوئی ہے۔ میں نے اس وقت تو اس پر عمل نہیں کیا لیکن اب ضرور کروں گا۔ ایسے اہل علم کو دربار میں جگہ دوں گا جن کی قدر و منزلت فلک بلند سے بھی بلند ہوگی۔ ان کے کارناموں سے میری زندگی کا باب بھی روشن رہے گا۔ کبھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔“

اس بات کو ہوئے چند روز گزرے تھے کہ اس کے دربار میں ایک شخص اپنی فریاد لے کر آیا۔ محمود نے اس سے اس کی شکایت پوچھی تو اس نے عرض کیا۔ ”میری شکایت ایسی نہیں کہ سب کے سامنے بیان کر سکوں۔“ محمود اسے فوراً اکیلے میں لے گیا۔

”اب بتاؤ تم پر کیا پتا ٹوٹی ہے؟“

”میں تو آپ سے کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں عتاب شاہی نازل نہ ہو۔“

”تم بے خطر ہو کر کہو۔“

”حضور، آپ کے بھانجے نے چند دنوں سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ رات کو سب کو میرے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے تو مار مار کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے اور خود میری بیوی کے ساتھ رات بسر کرتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی دن بھر اس بے عزتی پر روتے رہتے ہیں۔ میں نے ہر امیر سے کہہ کر دیکھ لیا لیکن معاملہ چونکہ آپ کے بھانجے کا ہے اس لیے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اسے روک سکے۔ اب میں آپ سے فریادی ہوں، آپ مجھ پر رحم فرما کر میرے معاملے میں انصاف کریں۔“

محمود اس کی داستان سن کر رونے لگا۔ ”اے شخص! تو اس سے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ یہ ظلم کیونکر برداشت کرتا رہا؟“

”میں پہلے دن سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح آپ کے حضور حاضر ہو سکوں لیکن دربان مجھے آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ آج بھی نہ جانے کس طرح نظر بچا کر اندر آسکا ہوں۔“

”اچھا، اب ایک بات غور سے سنو۔ مجھ سے ملاقات کا حال کسی پر ظاہر مت کرنا۔ جب وہ سفاک تمہارے گھر میں داخل ہوا اور تمہیں باہر نکال دے تو فوراً میرے پاس چلے آنا۔“

”حضور، رات کے وقت؟ مجھے آپ سے کون ملنے دے گا۔“

محمود نے دربانوں کو بلا کر اس کی صورت دکھا دی اور انہیں حکم دیا کہ یہ شخص جس وقت بھی آئے اس کی ملاقات مجھ سے کروا دینا۔

یہ شخص مطمئن ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ رات ہوئی تو وہ بادشاہ کے بھانجے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بدبخت اس رات نہیں آیا۔

دوسری رات کو واقعہ پیش آگیا۔ وہ ظالم گھر میں داخل ہوا اور اس شخص کو گھر سے نکال اس کی بیوی کے ساتھ

عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ وہ شخص گھر سے نکلا اور دوڑتا ہوا شاہی محل میں پہنچ گیا۔ دربانوں نے اسے سلطان محمود تک پہنچا دیا۔

”حضور، وہ گھڑی آگئی ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔“

سلطان محمود اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ شخص دیوار پھاند کر اندر گیا اور کنڈی کھول کر محمود کو اندر بلا لیا۔ محمود نے دیکھا کہ اس کا بھانجا بستر پر بے خبر سو رہا ہے۔ اس شخص کی بیوی اس کے قریب بیٹھی سسکیاں لے رہی ہے۔ محمود نے سر ہانے رکھی شمع کو ہاتھ بڑھا کر بجھا دیا اور اپنا خنجر نکال کر بھانجے کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

”اگر تیرے گھر میں پانی ہے تو فوراً لے آتا کہ میں اپنی پیاس بجھاؤں۔“ سلطان نے پانی پیا اور رخصت ہونے لگا۔ ”اب صبح ہونے کو ہے۔ میرے سپاہی آکر اس بدبخت کی لاش یہاں سے اٹھالیں گے۔ اس وقت تک تو اس ناپاک وجود کو برداشت کر لے۔“

وہ جانے لگا تو اس شخص نے محمود کا دامن تھام لیا۔

”بادشاہ وقت! دین و دنیا کی نعمتیں آپ کو فیض یاب کریں۔ اس راز سے پردہ اٹھا دیجیے کہ شمع گل کرنے اور سفاک کا سر تن سے جدا کرنے کے فوراً بعد پانی پینے میں کیا مصلحت تھی؟“

”سننا چاہتا ہے تو سن۔ شمع تو میں نے اس لیے بجھائی تھی کہ اپنے بھانجے کا چہرہ دیکھ کر مجھے رحم نہ آجائے اور انصاف ہاتھ سے چلا جائے۔ پانی باگ کر پینے کی وجہ یہ تھی کہ جس دن سے تو نے اپنی روداد میں بیان کی تھی تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک انصاف نہیں کر لوں گا نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔“

اس شخص نے اپنی فریاد بہت راز میں رکھی تھی لیکن جلد ہی یہ قصہ باہر نکل گیا اور ہر طرف محمود کے عدل و انصاف کی دھوم مچ گئی۔

کئی مواقع اور ایسے آئے کہ دادرس کو انصاف مہیا ہو گیا اور محمود کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنا۔ وہ اب ایسی شاہراہ پر چل رہا تھا جہاں اس کی ہر دل عزیز کی اس کی منتظر تھی۔ اس نے علم و ہنر کی ایسی پرورش کی کہ اس کا دربار اس وقت کے مشہور شعرا سے آراستہ ہو گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ محمود کے دربار سے چار سو شاعر وابستہ تھے۔

ان شعرا کو انعام و اکرام سے نوازنے میں بھی محمود کا

کوئی مد مقابل نہیں تھا چنانچہ مشہور ہے کہ عصائری نام کا شاعر جو ”رے“ سے غزنی آیا تھا، اس نے محمود کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے معاوضے میں محمود نے اسے چودہ ہزار درہم دیے تھے۔ فردوسی جیسا شاعر بے بدل اس کے دربار سے وابستہ تھا جس نے ”شاہ نامہ فردوسی“ تخلیق کیا۔ ابوریحان البیرونی جیسا باکمال بھی محمود کے خوانِ نعمت سے وابستہ تھا۔ محمود خود بھی علم و فضل میں کمال رکھتا تھا۔ بعض مصنفین نے اسے فقہا میں شمار کیا ہے۔

محمود نے شاید سوچ لیا تھا کہ وہ ایک ایسے بادشاہ کی صورت میں تاریخ کے سامنے آئے گا جس کی علمی خدمات کا شہرہ ہوگا لیکن قسمت اسے بے شمار جنگوں کی طرف لے گئی۔ وہ دور ہی ایسا تھا جب بادشاہوں کو اپنا رعب قائم کرنے کے لیے جنگوں کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ خونریزی اور لکوار بازی سے گریز ممکن ہی نہیں تھا۔ محمود کے سامنے ایسے ہی حالات تھے جب وہ لشکر لے کر غزنی سے نکلا۔

امیر سبکتگین کے دور حکومت میں افغانستان کا کافی حصہ ہندوستان میں شامل تھا یا وہاں کے لوگ ہندو راجاؤں کے باجگوار تھے۔ امیر سبکتگین نے راجا جے پال سے کچھ علاقے چھین کر وہاں اسلامی قوانین رائج کر دیے تھے۔ ان جنگوں میں خود محمود بھی شامل رہا تھا۔ سبکتگین کے دنیا سے اٹھتے ہی جے پال ان علاقوں پر دوبارہ قابض ہو گیا۔

جے پال کی سرکشی کی اطلاعات برابر غزنی پہنچ رہی تھیں۔ پھر وہ سردار بھی واویلا کرتے ہوئے آگئے جو پشاور اور آس پاس کے علاقوں میں متعین تھے۔ جے پال کے لشکر نے انہیں مار بھگا یا تھا۔

سلطان محمود ان دنوں خراسان میں تھا کہ ان سرداروں نے محمود سے ملاقات کی۔

”میں نے یہ عہد تو کیا تھا کہ تخت نشین ہوتے ہی ہندوستان کے راجاؤں سے جنگ کروں گا لیکن دربار کی درستی نے مجھے اس جانب متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے جو میرے سردار اس ذلت و خواری کے ساتھ مجھ تک پہنچے ہیں۔ میں ہندوؤں کے خلاف جہاد کروں گا اور غزنی سے ہندوستان تک اسلامی پرچم بلند کروں گا۔“ اس دن کے بعد سے اس نے ہندوستان کے بارے میں معلومات جمع کرانا شروع کر دیں۔

ان دنوں ہندوستان بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ پنجاب اور سرحد میں جے پال کی حکومت تھی۔ راجپوتوں کے مختلف گروہ مختلف علاقوں میں حکمران تھے۔

چوہان اجیر میں حکمران تھے۔ تو مار دہلی میں، پور ماوہ میں، بھابیہ قوم بھیرہ میں تھی، ہری پر اس قوت میں اور چندال بندیل کھنڈ میں حکومت کرتے تھے۔

یہ معلوم ہونے میں بھی محمود کو دیر نہیں لگی کہ ہندوستان میں مندروں کی تعداد ان گنت ہے۔ ان مندروں میں چھپی ہوئی بے پناہ دولت کے قصبے بھی محمود کے کانوں تک پہنچے۔

”سلطان مکرم! ہندوستان کے مندروں میں اتنی دولت ہے کہ ہماری سلطنت مالا مال ہو جائے گی۔“ محمود کے سرداروں نے اسے ترغیب دینے کے لیے کہا۔

”جنگوں میں مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگتا ضرور ہے لیکن ہم مال غنیمت کے لیے جنگ نہیں کرتے۔ میں نے ان جنگوں کا ارادہ اشاعت اسلام کے لیے کیا ہے نہ کہ مال و دولت کے لیے۔ آپ لوگ مندروں میں چھپی دولت کے بجائے ہندوستان کے راجاؤں کی فوجی طاقت کے بارے میں مجھے بتائیں تاکہ میں بھی اسی معیار کی تیاری کر سکوں۔“ محمود کے اس مطالبے پر ایک سردار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور کہنا شروع کیا۔ ”ہند کے راجاؤں کی مجموعی افواج کسی بھی حملہ آور کو شکست دینے کے لیے کافی ہیں۔ ان راجاؤں کا سب سے بڑا ہتھیار مست جنگی ہاتھی ہیں جن کی سونڈیں دشمن کے سپاہیوں کو اٹھا کر شیخ دیاتی ہیں۔ راجپوتوں کی بہادری کا یہ عالم ہے کہ جب کمزور پڑنے لگتے ہیں تو اپنا تمام مال و اسباب اور بیش قیمت اشیاء حتیٰ کہ اپنی عورتوں تک کو نذر آتش کر کے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ اس وقت انہیں اپنی موت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس حالت میں ان راجپوتوں سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔“

”ان کی یہ کمزوری تو بہر حال اپنی جگہ ہے کہ یہ ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر اس وقت کوئی ایک راجا حکومت نہیں کر رہا ہے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔“ محمود نے اپنی رائے دی۔

وہ سردار پھر بول اٹھا۔ ”ان راجاؤں کا اختلاف صرف آپس کی حد تک ہے لیکن مذہب کے نام پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مذہب کا حکمران ان پر حملہ کرے تو سب مل کر اس سے لڑتے ہیں۔“

”آپ لوگوں کی فراہم کردہ معلومات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کو ایک ہی حملے میں زیر کرنا ممکن نہیں۔ ہمیں بار بار ہندوستان کی طرف جانا ہوگا۔ یہ وہ دشمن ہے جسے مارا نہیں جاسکتا، کمزور کرنا ہوگا۔ اتنا کمزور کہ وہ اپنی موت خود مر جائے۔“

اس کے سرداروں نے اس سے اتفاق کیا۔

اس کا غلام ایاز ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ رات بہت بیت گئی تھی۔ اب تہجد کا وقت قریب تھا۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

سلام پھیرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”مالک عزوجل۔ تیری مدد کے بغیر میں حقیر بندہ کچھ بھی نہیں۔ میری افواج میرا لشکر کسی کام کا نہیں۔ اگر تیری مدد شامل حال نہ ہو۔ میں نے کفرستان ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا ہے۔ مال غنیمت اور کشور کشائی کے لیے نہیں بلکہ دین حنیف کی اشاعت کے لیے، نعرۂ توحید بلند کرنے کے لیے۔ اگر مجھے شکست ہوئی تو اس ظلمت کدے میں چراغ جلانے والا کوئی دوسرا بادشاہ مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے غیب سے طاقت عطا فرما۔ ہندو راجاؤں پر میری ہیبت طاری فرمادے۔ مجھے نصرت سے ہمکنار فرما۔“

اس وقت سلطان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ خدا کے حضور گڑ گڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان بلند ہوئی۔ سلطان نے مسجد پہنچ کر باجماعت نماز ادا کی اور خلاف معمول علی الصباح دربار خاص طلب کر لیا۔

اراکین سلطنت جمع ہوئے تو اس نے ان سب کو مخاطب کیا اور اپنے عزائم ان پر ظاہر کیے۔

”مسلمان بادشاہوں کو صرف اتنا ہی زیب نہیں دیتا کہ وہ درباروں کی زیب و زینت کا اہتمام کرتے رہیں۔ تلوار اگر اٹھائیں بھی تو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بلکہ ان کا فرض ہے کہ وہ خدا کے دشمنوں سے جنگ کریں اور کفر کے اندھیروں میں اسلام کی شمع روشن کریں۔ ہندوستان اس وقت کفر و ضلالت کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ ہندوؤں کے مضحکہ خیز اعتقادات، پجاریوں اور پنڈتوں کی عیاشیوں کی بے شمار داستانیں ہمارے کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا لیکن ہندو راجاؤں کے عزائم یہ ہیں کہ وہ اسلامی علاقوں پر قابض ہو جائیں اور وہاں بھی اپنی بے ہودہ رسومات رائج کریں۔“

ان راجاؤں میں سب سے زیادہ شرانگیز راجا جے پال ہے جو فتنے پیدا کرتا رہتا ہے۔ امیر سکھتین نے جے پال سے پشاور کا علاقہ اور کابل و درہ خیبر کا درمیانی علاقہ جنگ کر کے حاصل کیا تھا اور وہاں اسلامی قوانین رائج کیے تھے مگر اب جے پال نے یہ علاقے دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیے ہیں۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ اب کسی مسلمان امیر میں یہ

طاقت نہیں رہی کہ وہ راجا کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اس کی ہمت دراز ہوتی رہے گی۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ میں ہندوستان پر حملوں کا آغاز کروں گا اور اس کی ابتدا جے پال سے مقابلے کی صورت میں ہوگی۔ آپ لوگ تیاری کریں اور یہ یاد رکھیں کہ دعوت اسلام پھیلانے کے لیے دریائے سندھ تک کا علاقہ فتح کرنا اور راجا جے پال کی فوجی قوت کو پکڑنا نہایت ضروری ہے۔“

اس کے حکم کے مطابق اس کے سرداروں نے لشکر فراہم کیے۔

شوال کا مہینہ تھا 391ھ کا سال آگیا تھا کہ محمود غزنوی دس ہزار سوار لے کر پشاور آگیا۔ راجا جے پال بھی بارہ ہزار سوار، بہت سے پیادے اور تین سو ہاتھی لے کر مقابلے پر آیا۔

جے پال نے صفیں درست کر کے ہاتھیوں کو سب سے آگے رکھا۔ محمود نے تیر اندازوں کو حکم دیا، تیروں کی بارش نے ہاتھیوں کو بدحواس کر دیا۔ شمشیر زنوں نے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ ڈالیں۔ دودو جنگ شروع ہوئی تو میدان جنگ ہندوؤں کی لاشوں سے پٹ گیا۔

دوپہر ہونے کو تھی کہ میدان تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ محمود نے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ دشمن گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ جے پال کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تاہم بھاری تاوان جنگ وصول کر کے اسے خراج کی ادائیگی کے وعدے پر رہا کر دیا گیا۔

محمود نے چند حفاظتی دستے وہاں چھوڑنے اور غزنی کی راہ لی۔

راجا جے پال اپنے بچے سمیت علاقوں میں واپس گیا تو شرمندگی سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ رانیوں نے اس کا سواگت کیا لیکن وہ خاموش رہا۔

محمود سے شکست کے بعد وہ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ کھانا پینا اور رانیوں کے پاس جانا سب کچھ چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن اس کے جی میں کیا سمانی کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ایک چتا تیار کرو اور اس میں اچھی طرح آگ بھڑکا دو۔ وہ حیران تھے کہ یہ حکم کس لیے دیا جا رہا ہے لیکن حکم عدولی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب چتا تیار ہو گئی تو اس نے اپنے بیٹے اتند پال کو بلایا۔

”اتند پال، میں نے جب محمود کو پہلی مرتبہ اس کے

باپ سکھتین کے ہم رکاب دیکھا تھا اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا ہندوستان کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس نے مجھے شکست دے کر یہ بات سچ کر دکھائی۔ ہمارے بزرگوں کا قاعدہ رہا ہے کہ جب کوئی راجا دوسری شکست کھا جائے تو اسے حکمرانی کا حق نہیں رہتا۔ میری غیرت نہیں چاہتی کہ میں زندہ رہوں۔ چتا جل رہی ہے۔ کچھ دیر میں یہ آگ مجھے پاک کر دے گی۔ میں تمہیں ولی عہد مقرر کرتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں کہ محمود سے لڑائی کرنے میں کبھی پہل مت کرنا۔ محمود خطرناک حکمران ہے۔ اگر جنگ کرنا ہی پڑ جائے تو تمام راجاؤں کو ساتھ ملا کر اس سے مقابلے کے لیے نکلتا۔“

جے پال نے بیٹے کو نصیحت کی اور خود بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کے درمیان بیٹھ گیا۔

جے پال کے اس انجام نے محمود کو مطمئن کر دیا تھا لیکن وہ طے کر چکا تھا کہ ہر ایک سال کے وقفے کے بعد ہندوستان پر حملے کیا کرے گا اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہو جائے گا۔ اس مرتبہ اس کے نشانے پر ملتان کے قریب ایک علاقہ بھاٹنہ یا بھابیہ تھا جو ایک ہندو راجا ”بجے راؤ“ کا دار السلطنت تھا۔ اس راجا نے چونکہ سلطان کے خلاف جے پال کی مدد کی تھی اس لیے اس کی سرکوبی ضروری تھی۔

سلطان غزنوی، ملتان کی سرحد سے گزر کر بھاٹنہ کے قریب اتر گیا۔ بھاٹنہ کے گرد بھٹی ہوئی شہر پناہ بے حد بلند اور مضبوط تھی۔ اس کے گرد نہایت چوڑی اور گہری خندق تھی جسے عبور کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

راجا بجے راؤ کو اپنی فوج کی کثرت اور ہاتھیوں پر اتنا ناز تھا کہ محمود سے مقابلے کے لیے نکل آیا، ورنہ شہر پناہ سے اندر جانا محمود کے لیے تقریباً ناممکن تھا یا اسے ایسی سرتوڑ کوشش کرنی پڑتی جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی ہوتی۔

فریقین میں زبردست جنگ ہوئی۔ بجے راؤ کا غرور بے جا نہیں تھا۔ تین روز کی خون ریز جنگ کے بعد بھی حالت یہ تھی کہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ تیسرے دن تو یہ حالت تھی کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ اندھیرے نے جنگ روک دی ورنہ شاید فیصلہ ہو ہی جاتا۔

سلطان محمود ابھی ابھی میدان جنگ سے لوٹا تھا، اس کے کپڑے گرد آلود تھے۔ جوتوں میں پاؤں جل رہے تھے لیکن اس نے ٹھکن اتارنے کے لیے آرام کی زحمت بھی نہیں کی اور تھکے ہارے سرداروں کو بھی اپنے حضور طلب کر لیا۔

”آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ تین دن گزر جانے کے

باد جو ہمیں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔“
”سلطان ہم شرمندہ ہیں۔“

”میں آپ لوگوں کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں نے تو صرف یہ کہنے کے لیے آپ کو بلایا ہے کہ کل ”سلطانی جنگ“ ہوگی۔ فوج کا ہر فرد جان دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ کل یا تو ہم نہیں ہوں گے یا فتح ہمارے ساتھ ہوگی۔ بس اب آپ لوگ جاہیں اور آرام کریں۔“
رات آگئی تھی۔ محمود کی لشکرگاہ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ دن بھر کی لڑائی کے بعد تھکے ہارے سپاہی اپنے جسموں کو آرام دے رہے تھے۔ جانور بھی اتنا تھک گئے تھے کہ ہنہانا بھول گئے تھے۔

محمود اپنے رب کے آگے سجدہ ریز تھا اور رورو کر اپنی فتح کے لیے مدد طلب کر رہا تھا۔

بجے راؤ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ مندر میں تھا اور اپنے معبودوں سے مدد کا خواستگار تھا۔

اس دن کا سورج طلوع ہوا تو بجے راؤ نے اپنی فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا اور اپنے لشکر کو لے کر میدان میں آیا۔ غزنی لشکر بھی مقابلے کے لیے تیار تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد کون زندہ رہتا ہے کون شہید ہوتا ہے۔

حکم ملتے ہی مسلمانوں نے دائیں اور بائیں سے بہ یک وقت ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ پسینے سے زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ دونوں طرف کے سیکڑوں سپاہی مارے جا چکے تھے لیکن ہندوؤں کے پاؤں ابھی تک زمین پر لگے ہوئے تھے۔

محمود قسم کھا چکا تھا کہ یہ جنگ کا آخری دن ہوگا لیکن اب سورج چھپنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی اور فیصلہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ محمود نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اپنے قلب لشکر کو لے کر ہندوؤں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ ہندوؤں کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ ان کے قدم اکھڑنے لگے، محمود نے یہ دیکھ کر حملے میں مزید تیزی پیدا کی۔ بجے راؤ نے دیکھ لیا کہ نتیجہ سامنے ہے۔ اس نے اپنی بھاگتی ہوئی فوج کو ساتھ لیا اور قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔

اس کے اور محمود کے درمیان گہری خندق حائل تھی۔ محمود نے خندق کو پاٹنے کا حکم دے دیا۔ کئی دنوں کی کوشش کے بعد یہ گہری خندق اس قابل ہو گئی کہ اسے پار کیا جاسکتا تھا۔

بجے راؤ یہ سب کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ محمود کے سپاہی خندق پار کر لیں گے تو وہ بدحواس ہو گیا۔ اس کے ساتھ جو لشکر تھا وہ دشمن سے لڑنے کی تیاری

کرنے لگا لیکن بجے راؤ نے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اس نے اپنے لشکر کو محمود کے مقابلے پر چھوڑا اور خود رات کے اندھیرے میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ بجے راؤ کے لشکر نے محمود کی فوج کو روکنے کی کوشش کی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ بجے راؤ فرار ہو گیا ہے تو انہوں نے قلعے کی دیواروں پر سفید چھنڈا لہرا دیا۔ محمود کسی خاص کوشش کے بغیر قلعے میں داخل ہو گیا۔

بھاطنہ اپنے تمام مصافقات کے ساتھ اسلامی مملکت میں داخل ہو گیا۔

محمود کو اب بجے راؤ کی تلاش تھی جو فرور تھا۔ محمود کے جاسوس ادھر ادھر گھوم پھر کر یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ بجے راؤ بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔ اس مہم کے دوران اڑتے اڑتے یہ خبریں ملیں کہ وہ دریائے سندھ کے قریب جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہو گئی کہ ایک روز چند ہندو تاجر اپنے حق میں رعایتیں طلب کرنے کے لیے محمود کے پاس آئے۔ محمود نے ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور مہربانی سے انہیں کچھ رعایتیں دے دیں۔ یہ تاجر محمود کے رویے سے سخت متاثر ہوئے اور بجے راؤ کی شکایتیں کرنے لگے۔

”مہاراج بجے راؤ تو ہمارا ہم قوم تھا لیکن محصول میں اتنی رقم وصول کر لیتا تھا کہ ہمیں کھانا ہی کھانا دیکھنا پڑتا تھا۔ اسے ہماری ہائے لگی ہے کہ اب سندھ کے جنگلوں میں خاک چھانتا پھر رہا ہے۔“

”ہمیں کیسے معلوم کہ وہ وہاں ہے؟“

”آس پاس کے دیہاتیوں نے تو ہمیں یہی بتایا ہے۔ انہی کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ بھاطنہ میں اب مسلمانوں کی حکومت ہے۔ ہم تو بہت ڈر رہے تھے یہاں آتے ہوئے مگر آپ تو بڑی مہربانی سے ملے۔“

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ بجے راؤ دریائے سندھ کے کنارے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ وہاں چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے چلا جائے اسے تلاش کر کے گرفتار کرنا ضروری تھا۔ محمود نے اپنے لشکر کا ایک حصہ اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا۔

یہ لشکر برق رفتاری سے روانہ ہوا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ بہت جلد ایسے آثار مل گئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ بجے راؤ یہیں ہے۔

بجے راؤ نے خطرے کو بھانپ کر یہاں سے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن محمود کا لشکر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس

نے جب دیکھا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں تو اپنا خنجر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔

مسلمان سپاہیوں نے اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور بجے راؤ کا سر کاٹ کر محمود کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ملتان کا حاکم شیخ حمید لودھی، امیر سیکھتین کے بھی خواہوں میں سے تھا، اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا پوتا داؤد بن نصر ملتان کا حاکم مقرر ہوا۔

”فرقتے“ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ قرامطیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہ ظاہر تو مسلمان تھے لیکن ان کے عقائد اسلام سے بالکل مختلف تھے، وہ کہتے تھے نیکی اور بدی کوئی چیز نہیں۔ نہ کوئی جزا ہے نہ سزا۔ زندہ رہو اور عیش کرو۔ حرام حلال کی تمیز کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ تعلیمات خفیہ رکھی جاتی تھیں۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ درحقیقت یہ فرقہ عیسائی مبلغوں کی سازش کے تحت وجود میں آیا تھا۔ اس کے ذریعے مسلمانوں کی بربادی مقصود تھی۔

یہ فرقہ ایران سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ یہاں چونکہ اسلام دشمنی میں ہندو راجاؤں نے اس فرقے کی حمایت کی اس لیے اس فرقے کو یہاں پھیلنے کے خوب مواقع ملے۔ ملتان کا حاکم داؤد بھی اس فرقے میں شامل ہو گیا اور جے پال کے بیٹے اندپال کے ساتھ مل کر سازشیں شروع کر دیں۔ محمود کی اطاعت سے بالکل ہی ہاتھ اٹھالیا۔

محمود غزنی پہنچ کر اپنی مملکت کے انتظام و انصرام میں مشغول ہو گیا تھا لیکن یہ خبریں برابر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد بن نصر نے اندپال سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔

یہ خبریں اسے غضب ناک کرنے کے لیے بہت تھیں۔ اس نے لشکر تیار کیا اور ملتان کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے لشکر نے ابھی دھول اڑائی تھی کہ حاکم ملتان داؤد کا چہرہ گرد آلود ہو گیا۔ اس نے اندپال کی طرف آدمی دوڑائے۔

”مسلمانوں کا بادشاہ سلطان محمود ملتان کو غارت کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ مجھ سے دوستی کا حق ادا کیجیے اور محمود کا راستہ روکنے کے لیے فوجیں روانہ کیجیے۔ ادھر میں ملتان کی مضبوطی کا انتظام کرتا ہوں۔“

محمود کی فوجیں بڑھی چلی آ رہی تھیں کہ اندپال کی فوج نے اس کا راستہ روک لیا۔ اندپال اس لشکر کے ساتھ بذات خود موجود تھا۔

اندپال اپنے باپ کی اس نصیحت کو بھول گیا تھا کہ محمود سے لڑائی میں کبھی پہل نہ کرنا۔ سلطان کا لشکر اس سرفروشی سے لڑا کہ دشمن کی فوج منتشر ہو گئی۔ اندپال نے بانسا پلٹنے دیکھا تو فرار ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اسلامی لشکر اس کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے تک پہنچ گیا۔ بھاگتے بھاگتے اندپال کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ گھبرا کر کشمیر کے پہاڑوں میں گھس گیا۔ اب اس کا پیچھا کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ اصل مقصد ملتان پہنچنا تھا۔ محمود نے اندپال کی اس حرکت کو دل میں رکھا اور راستے کے اس روڑے کو ہٹا کر ملتان کی طرف بڑھا۔

داؤد نے جب دیکھا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا راجا اندپال بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکا ہے تو وہ مقابلے پر آئے بغیر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ محمود نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ ایک بے چراغ رات میں حاکم ہرات ارسلان جاذب کی طرف سے ایک تیز رفتار قاصد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس طرف سے کسی قاصد کا آنا غیر معمولی تھا۔ قاصد کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ بھی معمولی نہیں تھا۔ وہ ترکوں کی بے وفائی کا قصہ لے کر حاضر ہوا تھا۔

سلطان محمود اور ترکستان کے حکمران ایلک خاں کے درمیان صرف خلوص و محبت کا رشتہ نہیں تھا بلکہ ایلک خاں محمود کا خسر بھی تھا۔

جب سلطان محمود ملتان کی طرف روانہ ہوا اور خراسان، لشکر سے خالی ہو گیا تو ایلک خاں کے دل میں لالچ نے جگہ بنائی۔ اس نے خراسان فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار سیارش یکن کو ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ خراسان فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔

ہرات کے حاکم ارسلان جاذب نے جب یہ خبر سنی تو غزنی کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہاں پہنچ کر دارالسلطنت کی حفاظت کرے لیکن اس وقت تک ایلک خاں خراسان پر قبضہ کر چکا تھا۔

ہرات سے آنے والا قاصد یہی خبر لے کر آیا تھا۔ یہ خبر سلطان محمود کے لیے معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ اس کا دارالخلافہ اس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ اس نے اعلان

کر دیا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر غزنی چلا جائے گا لیکن اسی رات غیب سے ایک سامان مہیا ہو گیا۔ حاکم ملتان کی طرف سے ایک وفد معافی کی درخواست لے کر محمود کی خدمت میں آیا۔ حاکم ملتان نے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کی تھی اور ہر سال دس ہزار اشرفیاں سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو محمود اس شرط پر صلح کے لیے تیار نہ ہوتا لیکن وہ تو پہلے ہی محاصرہ اٹھانے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس نے اس صلح کو آبرو مند سمجھا۔

حاکم ملتان کو ان حالات کا علم نہیں تھا۔ اگر وہ ایک رات ٹھہر جاتا تو صلح کے پیغام کے بغیر ہی اسے محمود سے نجات مل جاتی۔

سلطان محمود نے غزنی پہنچ کر ایک زبردست فوج تیار کی اور بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں ایک خاں نے جعفر یگن کو یہاں کا کوتوال مقرر کیا تھا۔ وہ بھلا س طرح محمود کی آمد کی تاب لاتا۔ وہ بھاگ کر ”ترند“ چلا گیا۔

ایک خاں نے چین کے بادشاہ قدر خاں سے مدد طلب کی۔ اس کے پانچ ہزار سوار مدد کو آ گئے۔ ایک خاں کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے دریائے جیحوں کو پار کیا اور بلخ سے چار میل کے فاصلے پر محمود کے مقابلے کے لیے مقیم ہو گیا۔

ایک خاں اپنے مخصوص غلاموں کا دست لے کر آگے بڑھا اور مردانگی کے جوہر دکھانے لگا۔ محمود نے حملے کی شدت دیکھی تو گھوڑے سے اتر کر اپنا سر، زمین پر رکھ دیا۔ کامیابی کی دعا کی اور پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اب اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ اسے لڑتے ہوئے دیکھ کر اس کی فوج میں بھی ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

ترکوں کی فوج میں ایسی بدحواسی پھیلی کہ وہ اپنے سرداروں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک خاں نے بڑی مشکل سے جان بچائی اور دریائے جیحوں کو پار کر کے اپنے ملک میں پہنچ کر دم لیا۔

ایک خاں کو شکست دینے کے بعد محمود نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ایک خاں کا تعاقب کیا جائے۔ شدید سردی کے دن تھے۔ برف باری بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے سرداروں نے پس و پیش کی۔

”حضور، سردی بہت ہے۔ فوج کا ایک بڑا حصہ اس موسم کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ کئی ہلاکتیں ہو جائیں گی اور فوج میں بددلی پھیل جائے گی۔“

محمود کی فطرت میں سخت گیری اور ضد تھی۔ اس نے

سرداروں کے مشورے کو اہمیت نہیں دی۔ چاروٹا چار سرداروں کو اس کا حکم ماننا پڑا اور بادشاہ کے ساتھ لشکری بھی ایک خاں کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پیروں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ سپاہی اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں چلے جا رہے تھے۔ محمود خود بھی اس سردی میں ان کے ساتھ تھا۔ بس یہی ایک ڈھارس تھی جو ان سپاہیوں کو تازہ دم رکھے ہوئے تھی۔

اس سفر کی تیسری رات اس قدر شدید برفباری ہوئی کہ آگے چلنا دشوار ہو گیا۔ مجبوراً رکنا پڑا کہ برف گرنی بند ہو تو آگے چلا جائے۔

سلطان محمود کے لیے ایک بڑا خیمہ لگایا گیا۔ اس خیمے کو گرم رکھنے کے لیے انگلیٹھیاں اتنی تعداد میں جلائی گئیں کہ خیمے میں حدت پیدا ہو گئی۔ محمود اور اس کے امیر جو اس خیمے میں موجود تھے انہوں نے اپنے گرم کپڑے اتار دیے، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سردیوں کا موسم رخصت ہو گیا ہو۔

اسی وقت ایک غلام کسی کام سے محمود کے سامنے آیا۔ اسے دیکھ کر محمود کو مذاق مچھا، اس نے غلام کو اپنے قریب بلایا۔ ”باہر جا کر سردی سے کہنا، تم کیوں اس قدر جان توڑ کوشش کر رہی ہو۔ ہمارا تو گرمی کے مارے برا حال ہے۔ تن کے کپڑے اتارنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“

غلام بھی اس مذاق کو سمجھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور واپس آ کر عرض کیا۔

”حضور، سردی نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر بادشاہ اور اس کے خاص ندیموں پر میرا زور نہیں چلتا تو کیا ہوا۔ میں سائیسوں اور دوسرے ملازمین کو آج کی رات اس قدر تنگ کروں گی کہ کل صبح بادشاہ اور اس کے امیر اپنے گھوڑوں کی تیمارداری خود اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔“

بادشاہ نے غلام سے تفریحاً ایک بات کہی تھی لیکن غلام کے جواب سے اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ خود تو انگلیٹھیوں کی حدت سے سردی بھگتا رہا ہے، باہر اس کے ملازموں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

ان جان لیوا مہمات سے نمٹنے کے بعد اسے ہندوستان کے راجا اند پال کا خیال آیا جو بڑی تیزی سے محمود کو نچا دکھانے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ محمود ابھی تک اس کی اس حرکت کو نہیں بھولا تھا کہ اس نے ملتان جاتے ہوئے محمود کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی تھیں۔

محمود نے اپنے سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”رفیقو! ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ وہاں دولت بھی بے پناہ

ہے لیکن ہم ابھی اس ملک کے چوتھائی حصے پر بھی قابض نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمیں بہت دور تک جانا ہے لیکن اند پال بار بار ہماری راہ میں آتا ہے۔ اس کی طاقت کو مٹانا بے حد ضروری ہے ورنہ ہم ملک ہندوستان میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر لشکر جرار تیار کیا اور ہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔ یہ ہندوستان پر اس کا چھٹا حملہ تھا۔

محمود کی روانگی کا چرچا ہوا تو اند پال پریشان ہو گیا۔ محمود کی طرف سے وہ سخت خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ اسے بار بار اپنے باپ جے پال کی یہ نصیحت یاد آتی تھی کہ محمود سے لڑائی میں کبھی نہیں نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس سے ٹکر نہ لیتا۔ اس نصیحت کے باوجود وہ محمود سے ٹکرا بھی چکا تھا اور شکست بھی کھا چکا تھا۔ اب پھر وہ بلائے ناگہانی کی طرح اس سے ٹکرانے کے لیے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اند پال نے مذہب کا واسطہ دے کر ہندو راجاؤں کو اس کے ساتھ مل کر محمود سے مقابلے کی دعوت دی۔

مسلمانوں سے مقابلہ کرنا ہندو دھرم میں ثواب اور ترقی درجات کا باعث تھا اس لیے اُچین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی، اجمیر اور دوسرے راجاؤں نے لشکر کے دستوں کے دستے پنجاب کی طرف بھیجنے شروع کر دیے۔ محمود کے مقابلے پر پورا ہندوستان اٹھ آیا تھا۔

مڈی دل لشکر اند پال کی ماتحتی میں روانہ ہوا۔ اس لشکر نے پشاور کے قریب پہنچ کر محمود کا راستہ روک لیا۔

ایک تیر کے فاصلے پر دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ دیکھیں پہل کون کرتا ہے۔

ہندوؤں کے لشکر میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مشہور تھا کہ عورتیں اپنے زیور بیچ بیچ کر اپنے شوہروں کے سفری اخراجات برداشت کر رہی ہیں اور انہیں محاذ جنگ پر بھیج رہی ہیں۔

محمود نے سرفروشی کا یہ عالم دیکھا تو اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا تاکہ ہندوؤں کا کسی طرف سے بس نہ چل سکے۔

اس تیاری کے بعد سلطان محمود نے آغاز جنگ میں پہل کی۔ سلطان کے حکم سے ایک ہزار تیر انداز آگے بڑھے اور دشمن پر تیر اندازی شروع کر دی۔

اس موقع پر کھنکر قوم کے ہندوؤں نے دلیری کی انتہا کر دی۔ تقریباً تیس ہزار سپاہی ننگے سر اور ننگے پاؤں عین لڑائی کے دوران دونوں طرف سے خندق پار کر کے

مسلمانوں کے لشکر میں داخل ہو گئے اور مسلمانوں پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین ہزار مسلمان سپاہی شہید ہو گئے۔ سلطان محمود اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ لڑائی بند کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس آنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ اچانک ایک معجزہ ظہور میں آ گیا۔ وہ ہاتھی جس پر اند پال بیٹھا تھا، اچانک بھڑک اٹھا اور خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگا۔

اند پال کے ہاتھی کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہندو لشکری یہ سمجھے کہ مسلمانوں کی بہادری سے خوفزدہ ہو کر اند پال میدان جنگ چھوڑ بھاگا ہے، اس کی بزدلی کو تصور کر کے وہ لشکری بھی راہ فرار ڈھونڈنے لگے جو اس کی مدد کے لیے آئے تھے۔

محمود کے بڑے بڑے سرداران فوج ان بھاگتے والوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ دو دن اور دو رات تک ان ہندو فراریوں کا تعاقب کیا اور آٹھ ہزار ہندو تہ تیغ کر دیے گئے۔ تیس ہاتھی اور بے شمار مال و اسباب لا کر محمود کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

اند پال نے گجرات کا رخ کیا تھا۔ سلطان محمود نے سیدھا گجرات کا رخ کیا، اب اند پال پر محمود کا ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ معمولی سی جھڑپ کے بعد ہی اند پال صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ راجا نے تاوان جنگ کے علاوہ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تحفے میں دیا۔

راجا اند پال ہندوستان کا سب سے بڑا راجا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے خلاف کامیابی نے محمود کے حوصلے بڑھا دیے۔ اس نے اسلام کی اشاعت کا پکا ارادہ کر لیا۔ اس کے جاسوس ہندوستان کے بارے میں اسے مسلسل خبریں پہنچا رہے تھے۔ انہی کے زبانی اسے ”نگر کوٹ“ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ بنایا گیا تھا جو ”قلعہ بھیم“ کے نام سے مشہور تھا اور ہندوؤں کے نزدیک یہ قلعہ بتوں کا گڑھ تھا۔ گرد و پیش کے تمام راجا اعلیٰ درجے کی اشیائے طور نذرانہ وہاں بھیجتے تھے اور ثواب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ نمل برسوں سے جاری تھا لہذا یہاں سونے چاندی، ہیرے جواہرات اور بیش قیمت موتیوں کا ایسا ذخیرہ ہو گیا تھا کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کا خزانہ بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

اس قلعے کو چونکہ مندر کی حیثیت حاصل تھی اور یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ ان مقدس جوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اس لیے یہ قلعہ سپاہیوں سے خالی تھا۔ بڑی تعداد میں مندر کے پجاری تھے جو اس قلعے کے کیلیں تھے۔

”ایسی بات ہے تو ضرور سنائیے۔“

”ہندوستان میں ایک مقام تھا۔ سرہے۔ اس شہر کی حیثیت ہندوؤں کے نزدیک ایسی ہے جیسی کہ مسلمانوں کے نزدیک کعبہ کی۔ یہاں ایک بہت پرانا مندر ہے۔ اس میں بڑے بڑے بت رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑے بت کا نام ”جگ سوم“ ہے۔ اس بت کے بارے میں اہل ہندو کا ایمان ہے کہ اس کا وجود اس وقت ظہور میں آیا تھا جس وقت دنیا میں انسان پیدا ہوا تھا۔ اہل ہندو اس کی پرستش کرتے ہیں۔ حضور کے قدم ابھی تک اس سرزمین کی طرف نہیں گئے ہیں۔ اگر آپ اس بت کو توڑیں گے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اتنے قدیم مندر میں مال و دولت بھی بے انتہا ہوگا جو غزنی کے خزانے کو بھر دے گا۔“

محمود نے حسن میمنہ کی کو انعام و اکرام دے کر رخصت کیا اور تھانیر پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک مرتبہ پھر غزنی میں شور مچا کہ محمود ہندوستان کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ پورے شہر میں جشن کی سی کیفیت تھی۔ محمود جب بھی ہندوستان کا قصد کرتا، خراسان میں خصوصاً خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اس خوشی میں مذہبی جذبہ بھی کارفرما ہوتا تھا اور یہ امید بھی کہ ہندوستان سے واپس آکر محمود، ضرورت مندوں کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ اس کے امرا اور شعرا حضرات بھی انتظار کیا کرتے تھے کہ وہ کب ہندوستان کا رخ کرتا ہے۔

سلطان محمود تازہ دم لشکر کے ساتھ پنجاب کے علاقے میں پہنچا تو اسے راجا اندپال کا خیال آیا۔ اس کے تعاون سے تھانیر تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو سکتی تھی۔ اندپال اور محمود کے درمیان ایک صلح نامہ طے ہو گیا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ اندپال اس کے ساتھ تعاون ضرور کرے گا۔ سلطان نے ایک قاصد اندپال کے پاس بھیجا اور اس کو مطلع کیا۔

”اس بار میرا ارادہ تھانیر پر حملہ کرنے کا ہے۔ مجھے پنجاب سے تھانیر تک کا سفر طے کرنا ہے تم اپنے کچھ قائل اعتبار آدمی میرے ساتھ کر دو تاکہ جو قصبہ تمہارا ہو وہ میری فوج کی دستبرد سے محفوظ رہے۔“

اندپال محمود سے خائف تو تھا لیکن ہندو بھی تو تھا۔ اسے اس خبر سے سخت دھچکا لگا کہ محمود تانیر پر حملہ کرے گا اور وہاں کے بت خانوں کو توڑے گا۔ اس نے اپنے بھائی کو محمود کی خدمت میں بھیجا اور ایک خط اس کے نام دیا۔ اس خط میں لکھا تھا۔ ”میں آپ کی خدمت اور آپ

پرگرا اور جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

علاقہ غور بھی سلطان محمود کے قبضے میں آ گیا۔ ملتان سے ایک مرتبہ پھر سرکشی کی خبریں آرہی تھیں۔ ملتان کے حاکم نے مذہب کے ساتھ ساتھ اطاعت سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ محمود کے پہلے حملے کے وقت اس نے قرامطی عقائد سے توبہ کر لی تھی لیکن اب وہ پھر اپنے عقائد کی طرف لوٹ آیا تھا۔ محمود کے پیٹھ موڑتے ہی وہ سب قول و قرار بھول گیا تھا۔ اس کی شہ پا کر قرامطیوں نے ملتان کے مسلمانوں کو جنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

محمود اسے (داؤد کو) سزا دینے کے لیے ایک مرتبہ پھر ملتان پہنچ گیا اور نہایت قہر و غضب کے عالم میں ملتان فتح کر لیا۔ بہت سے قرامطیوں اور کافروں کو موت کے کھٹ اتارا اور داؤد کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ ایک مدت بعد داؤد نے غزنی کے قلعے میں قید حیات سے نجات پائی۔

یہ محمود کا آٹھواں حملہ تھا جو اس نے ہندوستان پر کیا۔ اس کے امیر سات مرتبہ ہندوستان پر حملے کر چکے تھے۔ اب ان کا شوق جہاد کسی اور منزل کی تلاش میں تھا لیکن دور و نزدیک کوئی محمود کا مد مقابل نہیں تھا۔ سب اس کے مطیع ہو چکے تھے۔ ایک امیر نے پھر ہندوستان جانے کی صلاح پیش کی لیکن بات قہقہوں میں اڑ گئی۔

”ہم ہندوستان کو اتنی مرتبہ چیر پھاڑ چکے ہیں کہ بے چارے ہندوستان کے راجاؤں پر رحم آتا ہے۔“

”ابھی ہندوستان کی دولت ختم نہیں ہوئی۔ اگر ہم پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تو گھائے میں رہیں گے۔“ ایک امیر نے کہا۔

”تو کیا ہم دولت کے لیے ان راجاؤں سے ٹکراتے ہیں؟“

سلطان محمود بڑی دلچسپی سے ان امیروں کے درمیان ہونے والی نوک جھوک کو سن رہا تھا کہ اسی وقت اس وفد نے باریابی کی اجازت چاہی جو ہندوستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔ اس وفد کی قیادت محمود کا ایک امیر حسن میمنہ کر رہا تھا۔ محمود نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ پورے وفد کو اندر بلایا جائے اس نے حسن میمنہ کی کو اپنے حضور طلب کیا۔

”محترم امیر، ایسی کون سی انوکھی اور دلچسپ معلومات ہیں جو تم ہندوستان کی طرف سے لائے ہو؟“

”حضور، معلومات تو ایسی لایا ہوں کہ اسے اس خاکسار کی جانب سے سوغات سمجھیے گا۔“

تھی کہ وہ آئیں اور دولت کے اس ڈھیر کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، کیا دیہاتی کیا شہری، لوگ، جوق در جوق آ رہے تھے اور اس نمائش کو دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف ہندوستان میں چچی دولت کے چرچے ہو رہے تھے۔

یہ نمائش تین دن جاری رہی۔ لوگ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ اس دولت کا بیشتر حصہ محمود نے نیکیوں اور مستحقین کو عطیہ کر دیا اور بڑا حصہ شاہی خزانے میں داخل ہو گیا۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد اس نے اپنی مملکت کو دوسرے کرنے کے لیے ”غور“ پر حملہ کیا۔ حاکم غور دس ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں لشکروں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ غوریوں کی جانبازی کا یہ عالم تھا کہ صبح سے دوپہر ہو گئی اور محمود ان سرفروشی غوریوں کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکا۔

محمود نے یہ عالم دیکھا تو حکم دیا۔ ”دشمن کو دھوکا دیا جائے۔“ سلطان کی فوج دشمن کو دھوکا دینے کے لیے میدان سے بھاگ نکلی۔ غوری اس جھانے میں آ گئے اور بھاگنے والی فوج کے تعاقب میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس تیزی سے بھاگے کہ خود اپنی کھودی ہوئی خندق پار کر گئے۔ اس طرح وہ نادانستگی میں کھلے میدان میں آ گئے۔ محمود اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگ پھیر دی۔ اشارہ ملے ہی لشکر بھی پلٹ گیا اور غوریوں کو ٹکوار پر رکھ لیا۔ غوری لشکر کا جرمولی کی طرح کٹنے لگا۔

محمد بن غوری جانفشانی سے لڑ رہا تھا لیکن لشکر اس کا ساتھ چھوڑ گیا تو اس نے بھی میدان سے نکل جانا چاہا لیکن اس کی بد قسمتی کہ محمود کے ایک سپاہی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے کند پھینکی اور محمد بن غوری گھوڑے سے نیچے آ گیا۔ لشکریوں نے اسے گرفتار کیا اور محمود کے سامنے لے آئے۔

محمود نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”کیا میری اطاعت کا پیغام تم تک نہیں پہنچا تھا؟ پھر تم نے میری اطاعت کیوں نہیں کی؟“

”وہ تو میں اب بھی نہیں کرتا ورنہ تم سے جنگ کیوں کرتا۔“

”تم نے جنگ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا؟“

”شکست اور فتح دونوں جنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔“

”میں تمہیں موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔“

”یہ کام تو میں خود بھی کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنی انگلی اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ اس انگلی کا گینہ غالباً زہر آلود تھا اور ایسا خطرناک زہر تھا کہ زبان پھیرتے ہی زہر نے اثر دکھایا۔ جتنی دیر میں کوئی کچھ سمجھتا۔ محمد بن غوری زمین

سلطان محمود اس قلعے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو برہمنوں اور مندر کے پجاریوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اس مندر کو راج نعتی سے کیا تعلق۔ یہ تو عبادت گاہ ہے، مسلمان بادشاہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ راستے میں کسی راجا نے اس کی مزاحمت کیوں نہیں کی؟ یہ سوال جیسے ہی ذہنوں میں آیا پنڈتوں پر سلطان کا رعب طاری ہو گیا۔ جب کسی راجا میں اتنی ہمت نہیں کہ محمود کو روک سکے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ تین دن بعد ان پنڈتوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور محمود کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

”اے مسلمانوں کے بادشاہ! ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ تیرا مقابلہ کر سکیں۔ یہ کام تو راجاؤں کے کرنے کا تھا لیکن ایسا لگتا ہے وہ سب تجھ سے ڈرتے ہیں۔ ہم اپنے بتوں کے نام پر تجھ سے بھیک مانگتے ہیں۔ تو یہاں سے چلا جا۔“

”تم مجھے مسلمان بھی کہتے ہو اور بے جان مورتیوں کا واسطہ بھی دیتے ہو۔ تم جانتے ہو میں بار بار ہندوستان کیوں آتا ہوں؟“

”بھگوان جانے۔ ہم تو تم سے لڑنے کبھی نہیں گئے۔“

”تمہارے ایک راجا جے پال نے یہ جسارت کی تھی۔ وہ میری سرحدوں میں ٹھس آیا تھا۔ وہ اگر غالب آ جاتا تو کوئی مسجد سلامت نہ چھوڑتا۔ تمہارے موجودہ راجاؤں میں اتنی ہمت نہیں کہ میرا راستہ روک سکیں۔ میرا خدا میری مدد کر رہا ہے لیکن تمہارے بت بے جان ہیں۔ تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔ میں ہندوستان میں خدا کا دین پھیلانے آیا ہوں۔ تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔“

”مہاراج! یہ ہم سے نہیں ہوگا۔ ہم تو تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ ہمیں امان دے دو۔ ہماری جان بخشی دو۔ ہم نے قلعے کے دروازے تمہارے لیے کھول دیے ہیں۔“

”ہمارے دین میں زبردستی نہیں ہے۔ میں تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔“

محمود اپنے چند خاص ندیموں کے ہمراہ قلعے میں داخل ہوا۔ ساٹھ لاکھ اشرفیاں، سات سو من سونے چاندی کے اوزار، دو سو من خالص سونا، دو ہزار من خالص چاندی اور بیس من انواع و اقسام کے جواہرات۔ یہ بھی وہ دولت جو اس قلعے سے محمود کے ہاتھ لگی۔

یہ بے بہا دولت لے کر وہ غزنی روانہ ہوا۔ اس نے شہر سے باہر ایک مکان بنوایا۔ اس میں سونے اور چاندی کے تخت بچھوائے اور وہ تمام مال و اسباب جو وہ مگر کوٹ سے لایا تھا ان تختوں پر قرینے سے سجا دیا۔ شہریوں کو عام دعوت

کے احکام کی تعمیل کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں لیکن اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تھانیر کا مندر ہم ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ ہے۔ اگر آپ کے مذہب میں بت شکنی ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے تو نگر کوٹ کے قلعے میں بتوں کو توڑ کر آپ اس مقصد کو پورا کر چکے ہیں۔

تھانیر کے مندر کے سلسلے میں گزارش ہے کہ آپ اس کو تاخت و تاراج نہ کریں۔ اس مہربانی کے عوض آپ جو بھی طلب کریں گے، ادا کیا جائے گا۔ یہاں کی رعایا کو اپنا باج گزار بنا کر اپنے ملک واپس تشریف لے جائیں تو یہ بندہ حقیر اپنی درخواست کی قبولیت کے شکر کے طور پر ہر سال پچاس ہانگی اور دیگر بیش قیمت اشیاء ارسال کرے گا۔“

سلطان محمود نے ان باتوں کے جواب میں انند پال کو لکھا۔

”میں اس ارادے سے گھر سے نکلا ہوں کہ مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کروں گا۔ ہمارے عظیم پیغمبر نے مذہب اسلام کی اشاعت کی تھی اور طاقت حاصل ہوتے ہی کعبہ میں رکھے بتوں کو مسمار کیا تھا۔ میرے پاس طاقت ہے پھر میں بت فروشی کیوں کروں، بت شکنی کیوں نہ کروں؟ جب دنیا سے بت پرستی کے رواج کو ختم کر دینا ہی ہمارا مقصد ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تھانیر جیسے بت پرستی کے مرکز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس فتح کا ارادہ نہ کیا جائے۔“

انند پال، سلطان محمود کے اس جواب سے بہت مایوس ہوا لیکن اس کے مقابلے پر نہیں آسکتا تھا۔ اس نے اپنے علاقوں کو بچانے کے لیے اپنے آدمی محمود کے لشکر کے ہمراہ کر دیے اور انہیں ہدایت کر دی کہ پنجاب کی سرحد پار کراتے ہی واپس چلے آئیں۔

اس نے محمود کو الجھائے رکھنے کے لیے اپنے ملک کے تاجروں کو حکم دیا کہ وہ غلہ اور روغن وغیرہ لشکر سلطانی میں پہنچانے کا انتظام کریں۔

وہ چاہتا تھا کہ محمود ان اشیاء کے حصول کی خاطر کچھ دنوں پنجاب ہی میں رکا رہے۔ محمود اس کی مہمان داری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

انند پال نے ایک قاصد راجا دہلی کی طرف دوڑایا۔ اسے لکھ بھیجا کہ سلطان محمود ایک لشکر جرار لے کر آپ کی سلطنت کے مشہور مندر تھانیر پر حملہ کرنے کے لیے بے چین ہے، پنجاب تک پہنچ چکا ہے، میں نے اسے حیلے بہانے سے پنجاب میں روک لیا ہے۔ اگر اس سیلاب کو نہ

روکا گیا تو ہم سب اسی سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ جتنی جلدی ہو تمام راجاؤں کو یکجا کر کے محمود کا مقابلہ کریں۔ آپ جب تک تھانیر پہنچیں گے میں بھی آپ کی مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔“

سلطان کے امیر پنجاب میں زیادہ قیام کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندو راجا محمود کی آمد سے باخبر ہوں۔ بالآخر یہ بات محمود کی سمجھ میں آگئی۔ خود اسے بھی انند پال پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا۔

انند پال اب بھی اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے پڑاؤ اٹھا لیا۔ انند پال کے دو ہزار سوار اس کے ساتھ انند پال کی سرحد تک آئے۔

اس سے پہلے کہ راجا دہلی اس کے مقابلے پر آتا وہ تھانیر پہنچ گیا۔ محمود کی بہت محمود سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ شہر خالی پڑا تھا۔ محمود کے لشکر نے جی بھر کے غارت گری کا بازار گرم کیا۔ تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا، سب سے بڑے بت ”جگ سوم“ کو غزنی بھجوا دیا اور حکم دیا کہ اس بت کو کوچ راستے میں ڈال دیا جائے تاکہ چلنے والوں کے پیروں کے نیچے پامال ہو کر رہ جائے۔

ایک مورخ کے بیان کے مطابق تھانیر کے مندر سے بیش بہا دولت کے علاوہ ایک ایسا سرخ یا قوت بھی محمود کے ہاتھ لگا جس کا وزن 450 مثقال (ایک مثقال تقریباً 25 تولہ) تھا۔

کہا جاتا ہے اس فتح کے دوران وہ دو لاکھ لونڈیوں اور غلاموں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس سال غزنی میں اس قدر ہندوستانی صورتیں نظر آئی تھیں کہ غزنی بھی ہندوستان کا ایک شہر لگتا تھا۔

لشکر سلطانی کے ہر رکن کے پاس کئی کئی ہندوستانی لونڈیاں اور غلام تھے۔

سلطان نے 1013ء میں غرجستان کو فتح کر کے اس کے حاکم ”شار“ کو گرفتار کر لیا۔

اسی سال راجا انند پال کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا (مختلف مورخوں نے اس کے مختلف نام لکھے ہیں) لاہور کا راجا بنا۔ سلطان محمود، انند پال سے صلح نامے کی لاج رکھ رہا تھا۔ اب وہ درمیان میں نہیں رہا تو اس نے ”بالنات“ کے مشہور قلعے ”مڈوہ“ پر حملہ کر دیا۔ انند پال کا بیٹا اس حملے کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے قلعہ چند سمجھ دار لوگوں کے حوالے کیا اور خود درہ کشمیر میں جا کر چھپ گیا۔ محمود نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور یوں میں نقب لگانے کا حکم دیا۔

قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کام میں بہت دیر لگ گئی۔ محمود کی ان کوششوں سے بے خبر اہل قلعہ اس محاصرے سے عاجز آ گئے اور ہتھیار ڈال دیے۔ محمود نے ان سب کو جان کی امان دی اور قلعے پر قبضہ کر کے اپنے ایک معتمد خاص کو قلعے کا حاکم مقرر کر کے خود درہ کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ انند پال کے بیٹے نے اس کی آمد کی خبر سنی تو وہاں سے بھی ہٹا نکلا۔ محمود نے درہ پر قبضہ کر لیا، اس کے ہاتھ بہت سامان غنیمت آیا۔ بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھنے کے بجائے غزنی واپس چلے جانے میں عافیت سمجھی۔

یہ سلطان محمود کا ہندوستان پر دسواں حملہ تھا۔ اس کا میابی کے دو سال بعد یعنی 406ھ میں اسے کشمیر کی فتح کا خیال آیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ غزنی سے نکلا اور ”لوہ کوٹ“ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ اپنی بلندی اور مضبوطی کی وجہ سے مشہور تھا۔

قلعے کی مضبوطی نے محمود کے تمام ہتھیار کند کر دیے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور قلعہ سر ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا وہ یہ تاخیر بھی برداشت کر لیتا لیکن موسم کی شدت نے اس کے لشکریوں کے حوصلے پست کر دیے۔ برف باری شروع ہو گئی تھی اور وہ کھلے میدان میں پڑا تھا۔ اس نے لشکر کو ہلاکت میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا اور غزنی کی طرف واپس چل دیا۔

کئی دن کا سفر طے کرنے کے بعد اچانک احساس ہوا کہ وہ غلط راستے پر آ گیا ہے۔ اس نے لشکر کے ان لوگوں کو بلا یا جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ان راستوں سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ بھی اس کے سامنے سر جھکا کے اعتراف کر رہے تھے کہ وہ راستہ بھٹک گئے ہیں۔

”ان علاقوں میں راستہ بھٹکنے کا مطلب جانتے ہو؟ کیا کبھی ہم ان بھول بھلیوں سے نکل سکیں گے؟ کیا ہمارے پاس اتنا غذائی سامان ہے کہ بھٹکتے رہیں اور بھوک سے مر نہ جائیں؟“

”ہم نے نقشوں کا خوب اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب ہم جس طرف جا رہے ہیں وہ راستہ ہمیں یہاں سے باہر نکال لے جائے گا۔“

کارواں پھر چل پڑا لیکن شاید قدرت کو پھر امتحان مقصود تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ سارا جنگل پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ اس پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

راستہ پھر بدلا گیا اور بڑی مشکل سے صحیح راستہ دریافت ہو سکا۔

ہندوستان میں محمود کی یہ پہلی ناکامی تھی۔ وہ بہت سے آدمیوں کو گنوا کر غزنی پہنچا تھا۔ اس کا دربار اس وقت سوگوار تھا۔ اس کے تخت کے دونوں جانب اس کے وفادار غلام ہاتھ باندھے، نظریں نیچی کے کھڑے تھے۔ سامنے کی رو میں امرائے وقت کچھ شرمندہ کچھ افسردہ بیٹھے تھے۔ اس کا وفادار غلام اباز اس کی پشت پر تھا۔ ان افراد کو سزا سنائی جا چکی تھی جو کشمیر سے واپسی میں لشکر کی رہنمائی کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے لشکر غلط راستے پر چلا گیا تھا۔ اس لیے بھی ماحول پر سوگواری تھی۔ کچھ نہیں کھل رہا تھا کہ دربار کس لیے منعقد کیا گیا ہے کیونکہ ابھی تک محمود نے لب کشائی نہیں کی تھی۔ اس سناٹے میں کسی نے پتھر پھینکا۔ ابوالعباس مامون خوارزم شاہ کی جانب سے ایک قاصد دربار میں حاضر ہوا تھا۔ محمود نے اسے اپنے سامنے بلا یا۔ یہ قاصد خوارزم شاہ کی جانب سے ایک خط لایا تھا جو اس نے محمود کی طرف بڑھا دیا۔ محمود نے تخت پر بیٹھے بیٹھے اس خط کو پڑھا اور خلاف توقع دربار ملتوی کر دیا۔

امرا میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ خط میں آخر ایسا کیا لکھا تھا کہ محمود دربار سے اٹھ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا، اس خط میں درخواست کی گئی تھی کہ محمود اپنی بہن کی شادی خوارزم شاہ سے کر دے۔

محمود نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ خوارزم شاہ اب اس کا بہنوئی تھا۔ اس شادی کے سلسلے میں اسے خوارزم جانا پڑا۔ اس نے خوارزم شاہ کے دربار میں بڑی تعداد میں اہل علم ہستیوں کو دیکھا۔ محمود کا دربار بھی ایسی نامور ہستیوں سے بھرا پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے وہ ان نامور ہستیوں پر چار لاکھ دینار سالانہ خرچ کیا کرتا تھا۔

سلطان خوارزم سے واپس آیا تو اس نے ایک خط خوارزم شاہ کے نام لکھا۔

”تمہارے دربار میں اتنے بے نظیر اہل علم و فن جمع ہیں، ان میں سے چند کو ہمارے دربار میں بھیج دو۔“

سلطان محمود کے پاس شیخ بوعلی سینا اور البیرونی کی شہرت کی خبریں پہنچ چکی تھیں جو اس وقت علم کے آسمان پر آفتاب بن کر چمک رہے تھے۔ سلطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں اس وقت خوارزم شاہ کے دربار میں موجود ہیں۔ اسی لیے اس نے یہ خط لکھا تھا۔ ممکن ہے ان دونوں کے نام بھی لکھ دیے ہوں۔

خوارزم شاہ نے یہ خط ان علما کو سنانے کے بعد کہا۔
 ”سلطان محمود کا یہ پیغام میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔
 میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ غزنی جانے کو تیار ہو جائیں۔
 اگر آپ وہاں جانے پر تیار نہیں تو پھر ایک ہی راستہ ہے کہ
 میری سلطنت چھوڑ کر کسی اور ملک چلے جائیں۔“

شاہ خوارزم کے دربار میں موجود علما ابن سہیل، ابن سینا
 اور دو چار نے سلطان کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور
 ایران چلے گئے۔ البیرونی ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔
 ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ محمود کو اطلاع ملی کہ کچھ
 باغیوں نے فتنہ و فساد پیدا کر کے خوارزم شاہ کو قتل کر دیا
 ہے۔ یہ خبر سنتے ہی وہ غزنی سے بلیغ پہنچا اور وہاں سے خوارزم
 کی طرف روانہ ہوا۔ وہ خوارزم کی سرحد کے قریبی علاقے
 حضرت بند تک پہنچ کر رک گیا اور ایک امیر محمد طائی نامی کو لشکر
 کے ساتھ آگے روانہ کیا۔

یہ لشکر آگے جا کر ایک مقام پر صبح کی نماز ادا کر رہا تھا
 کہ خوارزم کے سپہ سالار خمار تاش در اس کے لشکریوں نے
 کہیں گا ہوں سے نکل کر حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ
 غزنوی لشکر کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔

محمود اپنے غلامان خاص کے ہمراہ پیچھے چلا آ رہا تھا۔
 خمار تاش اس سے بے خبر تھا، اسے تو ہوش اس وقت آیا جب
 محمود بالکل قریب پہنچ گیا، اتنی دیر میں غزنوی لشکر بھی بہت
 سا نقصان اٹھا کر سنبھل چکا تھا۔ خمار تاش نے فرار ہونے کی
 کوشش کی لیکن گرفتار ہوا۔ اس کے لشکریوں نے مقابلہ کیا
 لیکن شکست فاش ہوئی۔ محمود خوارزم میں داخل ہو گیا۔
 سلطان نے باغیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تلوار
 بے نیام کر لی۔ جس پر بھی بغاوت میں شامل ہونے کا شبہ ہوا
 اسے قتل کر دیا گیا۔

کچھ لوگ قید ہو کر اس کے سامنے لائے گئے۔ ان
 میں ابوریحان البیرونی بھی تھا۔ اس کے قتل کا بھی حکم جاری
 ہوا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سلطان کے حکم پر غزنی آنے
 سے انکار کر دیا تھا یا پھر وہ اسے پہچانا نہیں تھا۔

البیرونی اس کے سامنے آیا اور نہایت بے خوفی سے
 مخاطب ہوا۔

”اے بادشاہ! میں علم نجوم میں اپنے وقت کا امام ابو
 ریحان البیرونی ہوں۔ سلاطین ایسے باکمال شخص سے بے
 نیاز نہیں رہ سکتے۔ تو نے اگر مجھے قتل کر دیا تو ایسے شخص کے
 طور پر یاد رکھا جائے گا جسے علم و فن کی قدر نہیں تھی۔“

بادشاہ اس کی تقریر سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ

اسے اپنے ساتھ غزنی لے آیا اور اسے اپنے ندیمان خاص
 میں شامل کیا اور ایسی پرورش کی کہ البیرونی کو کسی اور دربار
 کی حاجت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنی رحلت تک اسی دربار سے
 وابستہ رہا۔ اسی بادشاہ کی بدولت اسے ہندوستان میں قیام
 اور تحقیق کا موقع ملا۔ اسی قیام کی یادگار البیرونی کی تصنیف
 ”کتاب الہند“ ہے۔



سردیوں کا موسم گزر چکا تھا۔ موسم بہار کی آمد آ رہی تھی۔
 ہمزے نے زمین کو دلہن بنا دیا تھا۔ محمود کے فوجی ٹھکان اتار
 چکے تھے کہ محمود کے شوق جہاد نے کروٹ لی۔ اس مرتبہ اس
 نے قنوج جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے پاس اس وقت ایک
 لاکھ کا لشکر تھا۔ اس کی روانگی کی خبر سن کر ترکستان اور خراسان
 وغیرہ سے بیس ہزار دیگر مسلمان آگئے جو جہاد کی نیت لے کر
 گھر سے نکلے تھے۔

کوئی غیر ہندوستانی اب تک قنوج پر حملہ آور نہیں
 ہو سکا تھا۔ محمود پہلا شخص تھا جو اس عظیم لشکر کے ساتھ قنوج
 کے خطرناک راستے پر رواں دواں تھا۔ وہ سات ہولناک
 دریاؤں کو پار کر کے تین مہینے کی مدت میں قنوج کی سرحد
 پر پہنچا۔ راستے کی دشواریاں کیا کم تھیں، قلعے کو دیکھا تو محمود کو
 کہنا پڑا کہ یہ قلعہ اپنی بلندی اور مضبوطی کے اعتبار سے بے
 مثال ہے۔

محمود کا یہ سوچنا بجا تھا کہ ایسے مضبوط قلعے کو کس طرح
 سر کیا جائے گا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ اب تک کسی
 حملہ آور نے اس طرف کا رخ کیوں نہیں کیا۔

قنوج کے راجا کا نام ”کورا“ تھا جو نہایت زبردست
 فرماں روا تھا لیکن جب اس نے قلعے کی فصیلوں سے
 انسانوں کا سمندر دیکھا تو وہ خائف ہو گیا۔ قلعے کا دروازہ
 کھلا اور راجا کورا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے بیٹوں اور
 درباریوں کے ساتھ قلعے سے باہر آ گیا۔ سلطان محمود کی
 خدمت میں پہنچ کر اطاعت کا اظہار کیا۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ ”کورا“ مشرف بہ اسلام
 بھی ہو گیا تھا۔

محمود نے قنوج کو اپنا باجگزار بنایا اور تین روز راجا
 کورا کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے بعد قلعہ میرٹھ (برن)
 کی طرف بڑھا۔ یہاں کا راجا ہر دت قلعے کو چند قابل اعتبار
 درباریوں کے سپرد کر کے خود کسی جنگل کی طرف نکل گیا۔ اہل
 قلعہ کو کیا بڑی تھی کہ مقابلہ کرتے۔ انہوں نے دس لاکھ درہم
 اور تیس ہاتھی محمود کی خدمت میں پیش کیے اور جان کی امان

طلب کی۔

سلطان وہاں سے قلعہ ”مہاون“ پہنچا۔ یہ قلعہ متھرا کے قریب تھا۔ دریائے جمنا قریب ہی بہتا تھا۔ حاکم قلعہ ہاتھی پر سوار ہوا اور چاہتا تھا کہ دریا پار کر جائے۔ سلطان کے لشکریوں نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے تو اس نے اپنا خنجر اپنے گلے پر چلا دیا۔

قلعہ فتح ہو گیا۔ پچاسی کوہ پیکر ہاتھی اور بے انتہا مال غنیمت لشکر اسلام کے ہاتھ آیا۔

یہاں سے متھرا شہر تک جانا مشکل نہیں تھا۔ محمود نے سن رکھا تھا کہ متھرا نام کا شہر ہندوؤں کے نزدیک نہایت مقدس ہے اور ”کرشن“ کی جنم بھومی سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر میں مندروں کی بہتات تھی اور اتنی دولت اور نادرا اشیا جمع تھیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلطان کے دہلے کا یہ عالم تھا کہ جب سلطان اس شہر میں پہنچا تو کوئی شخص بھی جنگ کے لیے نہیں نکلا۔ یہ شہر راجا دہلی کے زیر نگین تھا۔ وہ بھی ڈر کے مارے مقابلے پر نہیں آیا۔ محمود کسی روک ٹوک کے بغیر متھرا پر قابض ہو گیا۔ اس کے لشکریوں نے جی کھول کر اس شہر کو تاراج کیا۔ بہت سے بت خانوں کو توڑا اور جلا دیا۔

متھرا کی عمارتیں ایسی شاندار تھیں کہ خود محمود انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے غزنی کے بعض امیروں کو لکھا تھا۔

”اس شہر میں ایک ہزار بلند ترین محل ہیں جن میں سے زیادہ تر سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور مندر تو اتنی تعداد میں ہیں کہ میں ان کو توڑتے توڑتے تھک گیا ہوں۔“

مورخین کا بیان ہے کہ بے شمار مال غنیمت کے علاوہ پانچ سونے کے بنے ہوئے بت بھی تھے جن کی آنکھوں میں یا قوت جڑے ہوئے تھے۔ ان کی قیمت پچاس ہزار

زر سرخ تجویز کی گئی تھی۔ ان بتوں میں سے ایک بت میں ارزنی یا قوت کا بھی ایک ٹکڑا بڑا ہوا تھا جس کا وزن چار سو مثقال تھا جب یہ بت پاش پاش کیا گیا تو اٹھانوے ہزار تین سو مثقال سونا اس میں سے برآمد ہوا۔ ان پانچ سونے کے

بتوں کے علاوہ سبوت اور تھے۔ یہ سب کے سب چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ ان بتوں کو توڑ کر جو چاندی حاصل کی گئی وہ اتنی تھی کہ سوا دنوں پر لادی گئی۔

اس بت شکنی کے بعد متھرا کو آگ لگا دی گئی۔

یہ ہندوستان پر محمود کا تیرھواں حملہ تھا۔ اس حملے میں

اس نے پے در پے سات اٹھ اہم مقامات فتح کیے۔ محمود کی بیعت ایسی طاری ہوئی تھی کہ کسی جگہ بھی اسے مزاحمت سامنا نہیں ہوا حتیٰ کہ متھرا جیسے مقدس مقام کو بچانے کے لیے بھی اس کے مقابلے پر کوئی نہیں آیا۔

وہ متھرا کے بعد اردگرد کے قلعوں کو فتح کر چکا تو اس نے قریب ہی کے ایک مغرور اور سرکش راجا جندرائے سے دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور اہل و عیال پہاڑوں میں جا چھپا۔ راجا کے پاس ایک نہایت ہی طاقتور اور کوہ پیکر ہاتھی تھا جو پورے ہندوستان میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ محمود نے اس ہاتھی کو خریدنے کی بار بار کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ جندرائے کے فرار کے بعد وہ ہاتھی اتفاق سے ایک رات بغیر قیل بان اپنے تھان سے بھاگا اور محمود کے خیمے کے پردے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ محمود کے

چوب دار اس کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ ان چوب داروں نے آخر ہمت کی اور ہاتھی کو پکڑ لیا۔ وہ ایسا خاموش کھڑا تھا جیسے ان چوب داروں کا پالتو ہو۔

یہ ہاتھی چونکہ کسی محنت اور معاوضے کے بغیر محمود کے پاس چلا آیا تھا لہذا محمود نے اس کا نام ”خداداد“ رکھا اور اسے لے کر غزنی چلا آیا۔

غزنی پہنچ کر مال و اسباب کی فہرست بنائی گئی تو معلوم ہوا اس سفر میں بیس ہزار اشرفیاں، کئی لاکھ روپے، پچاس ہزار لونڈی غلام، تین سو پچاس ہاتھی اور دوسری بیش قیمت اشیا حاصل ہوئی ہیں اور یہ بھی نعمت خداوندی تھی کہ اسے کسی جگہ بھی مقابلہ کرنا نہیں پڑا تھا۔ اپنا ایک آدمی گنوائے بغیر اتنی

دولت لے آیا تھا۔ اس نعمت کے شکر یہ کے طور پر اس نے غزنی میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی۔ یہ پوری عمارت سنگ مرمر کی تھی اور دیگر بیش قیمت پتھر اس عمارت میں لگائے گئے۔

جب یہ مسجد تیار ہو گئی تو اسے خوب صورت قدیلوں سے بھر کر نور بنایا گیا۔ اس مسجد کا نام ”عروس فلک“ تھا۔

اس مسجد کے ساتھ ہی محمود نے ایک عالی شان مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ مدرسے کے کتب خانے میں نایاب کتب جمع کیں، مسجد اور مدرسے کے اخراجات کے لیے کئی دیہات وقف کر دیے۔

محمود کے اس شوق نے دیگر امرا کی بھی رہبری کی۔ انہوں نے بھی بادشاہ کی تقلید میں مسجدیں، درس گاہیں اور مدارس قائم کیے۔ غزنی عروس البلاد بن گیا۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد سلطان محمود نے ایک ”فتح نامہ“ جس میں اس کی تمام فتوحات کی تفصیل درج تھی،

خلیفہ بغداد کی خدمت میں ارسال کیا۔

خلیفہ بغداد نے محفل آراستہ کی اور یہ فتح نامہ بلند آواز سے پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا۔ ہر طرف سے سلطان محمود کی ہمت و جرأت پر آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کہنے والوں نے یہ آواز بلند کہا کہ عرب، عجم، روم اور شام میں جو کارنامے صحابہ کرام نے سرانجام دیے وہی ہندوستان میں سلطان محمود کی ذات سے ظہور میں آئے۔

بہت دشمن

ہندو لشکر یہ سوچ کر بے فکر تھا کہ مسلمان اس وقت دریا پار کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ وہ ہتھیار اتار کر مڑے کی نیند سو رہے تھے۔

یہ ساٹھ غلام دریا کے پار ہوئے اور ہندوؤں کے لشکر میں گھس گئے۔ ہندو اس وقت نہتے تھے، گاجر مولیٰ کی طرح کٹنے لگے۔ لشکر میں شور مچ گیا کہ محمود کا لشکر آ گیا۔ سیکڑوں قتل ہو گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔

دن نکل آیا تھا اور ان غلاموں کی اتنی ہمت ہو گئی تھی کہ قریب کے ایک شہر میں گھس گئے اور خوب جی کھول کر شہر کو لوٹا۔

صبح جب محمود پر حقیقت حال روشن ہوئی تو اس کے لشکریوں کو غیرت آئی۔ انہوں نے محمود سے اجازت طلب کی کہ وہ بھی دریا پار کر لیں۔ یہ بھی خدا کی قدرت تھی کہ ساحل پر جا کر دیکھا تو دریا اتر چکا تھا۔ محمود کے لشکر نے بہ آسانی دریا عبور کر لیا۔

صرف ساٹھ غلاموں نے ایک بڑے لشکر کو تتر بتر کر دیا تھا۔

راستے کا پتھر ہٹ گیا تھا۔ محمود نے یہاں سے کالنجرا رخ کیا۔ کہتے ہیں چھتیس ہزار سوار، ایک لاکھ سے زیادہ پیادے اور تین سو چالیس ہاتھی اس کے لشکر میں شامل تھے۔ محمود نے ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر اس کے لشکر کو دیکھا تو اپنے آنے پر پشیمان ہوا۔ پھر اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر خدا تعالیٰ کے حضور میں سچ و ظفر کی التجا کی۔

اس دعا کی تاثیر تھی کہ اسی رات نندا کے دل میں محمود کا ایسا خوف طاری ہوا کہ اپنا تمام مال و اسباب چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔

سلطان دوسرے دن یہ خبر پا کر سوار ہوا اور کمین گاہوں کو اچھی طرح دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے تو اس نے تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ بے انتہا مال غنیمت آیا۔ نندا کے لشکر کے پانچ سو ہاتھی بھی اس کے ہاتھ آئے۔

سلطان فتح و نصرت کے پرچم لہراتا ہوا غزنی واپس چلا گیا۔

اس مہم کے بعد ہی محمود کو احساس ہو گیا تھا کہ پنجاب کو زیر نگین لانا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر دور دراز کی مہمات خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کالنجرا کے راجا کا تعاقب نہیں کر سکا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اگر اسے پشت کی جانب سے خطرہ نہ ہو تو وہ بے خطر

محمود نے اس شوق نے دیگر امرا کی بھی رہبری کی۔ انہوں نے بھی بادشاہ کی تقلید میں مسجدیں، درس گاہیں اور مدارس قائم کیے۔ غزنی عروس البلاد بن گیا۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد سلطان محمود نے ایک ”فتح نامہ“ جس میں اس کی تمام فتوحات کی تفصیل درج تھی،

خلیفہ بغداد کی خدمت میں ارسال کیا۔

خلیفہ بغداد نے محفل آراستہ کی اور یہ فتح نامہ بلند آواز سے پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا۔ ہر طرف سے سلطان محمود کی ہمت و جرأت پر آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کہنے والوں نے یہ آواز بلند کہا کہ عرب، عجم، روم اور شام میں جو کارنامے صحابہ کرام نے سرانجام دیے وہی ہندوستان میں سلطان محمود کی ذات سے ظہور میں آئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نامحرموں کو محفل سے باہر کر دو۔“

حمود نے ان کنیزوں کو وہاں سے اٹھا دیا پھر شیخ سے مخاطب ہوا۔ ”حضرت بایزید بسلامی کی کوئی حکایت مجھے سنائیے۔“

شیخ صاحب نے بایزید بسلامی کا یہ قول سنایا۔ ”جس نے مجھے دیکھ لیا وہ ظلم و ستم کی تمام برائیوں سے محفوظ ہو گیا۔“ محمود معترض ہوا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا بایزید کا مرتبہ حضرت محمد ﷺ کے مرتبے سے بھی زیادہ ہے، نبی کریم ﷺ کے دیکھنے والوں میں بھی کبھی اچھے نہیں تھے۔ ابو جہل اور ابولہب ویسے ہی کافر رہے تو پھر بایزید کے دیکھنے والوں میں ہر ظالم کس طرح اچھا ہو سکتا ہے؟“ شیخ صاحب نے قدرے خشکی سے کہا۔ ”اے محمود، تو اپنی بساط سے بڑھ کر باتیں نہ کر۔ ادب کو ملحوظ رکھ۔ بادشاہ بنارہ، ولایت کی دنیا میں قدم نہ رکھ۔ جان لے کہ حضرت محمد ﷺ کو خلفائے راشدین اور چند دیگر صحابہ کے کسی اور نے نہیں دیکھا۔ دیکھنا اسے نہیں کہتے کہ نظر بھر کر کسی کو دیکھ لیا جائے۔ قرآن نے خود کہہ دیا۔ ”اور تم دیکھتے ہو ایسے لوگوں کو وہ نظر کرتے ہیں تمہاری طرف حالانکہ حقیقت میں وہ تم کو نہیں دیکھتے۔“

”حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔“

”تجھے چاہیے کہ چار چیزیں اختیار کرے۔ پرہیزگاری، نماز باجماعت، سخاوت اور شفقت۔“

”میرے حق میں دعا فرمائیے۔“

”جائیری عاقبت محمود ہو۔“

اس کے بعد محمود نے اشرافیوں کی ایک تھیلی شیخ کی خدمت میں پیش کی، شیخ نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور محمود کے سامنے جو کی ایک روٹی رکھ دی اور اصرار کیا کہ وہ اسے کھائے۔

حمود نے اسے چبانے کی کوشش کی لیکن روٹی اتنی سخت تھی کہ دانتوں سے کٹتی ہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے کٹی تو حلق سے نیچے نہ اتر سکی۔

شیخ نے فرمایا۔ ”کیا یہ روٹی تمہارے گلے میں اٹکتی ہے۔“

”جی ہاں، کچھ بھی ماجرا ہے۔“

”جس طرح یہ سوچی روٹی تمہارے گلے میں نہیں اترتی اسی طرح یہ اشرافیوں کی تھیلی ہمارے گلے سے نیچے نہیں اترتی۔ اسے ہمارے سامنے سے اٹھاؤ۔“

حمود نے اشرافیوں کی تھیلی ان کے سامنے سے ہٹا دی

قاصد یہ پیغام لے کر حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچا۔ ”حضور، بادشاہ وقت امین الملک، یمن الدولہ سلطان محمود غزنوی اس وقت خرقان میں موجود ہیں اور آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ وہ غزنی سے چل کر یہاں تک آئے ہیں تو آپ کے بھی اخلاق کا تقاضا ہے کہ آپ ان سے ملاقات کے لیے جائیں۔“

”بادشاہ سے کہنا، مجھے اس خدمت سے معذور سمجھا جائے۔ میں خانقاہ سے نکل کر نہیں آ سکتا۔“

”حضرت، حکم خداوندی تو یہ ہے کہ اطاعت کرو خدا کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔“

”بہت خوب! تم نے یہ آیت مجھے سنائی اور میں نے سنی۔ اب تم محمود سے جا کر کہو کہ میں اب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اس حد تک مستغرق ہوں کہ رسول کی اطاعت کے مرتبے پر نہ پہنچنے کی بڑی ندامت ہے۔ بھلا حاکم کی اطاعت کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہوں؟“

قاصد واپس چلا گیا اور اس نے شیخ صاحب کا جواب سلطان تک پہنچا دیا۔ سلطان یہ جواب سن کر اتارو یا کہ بچکی بندھ گئی۔

”شیخ ابوالحسن واقعی مرد حق آگاہ ہیں۔ اگر وہ نہیں آئے تو ہم خود ان سے ملاقات کے لیے جائیں گے۔“

حمود نے اس حالت میں جانا پسند کیا کہ خود ایاز کا لباس پہنا اور اپنے کپڑے ایاز کو پہنائے اور دس کنیزوں کو غلاموں کے کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔

جب یہ لوگ شیخ کی خدمت میں پہنچے تو شیخ نے سلام کا جواب دینے پر اکتفا کیا، بادشاہ کے احترام میں اٹھ کر کھڑے نہ ہوئے۔ محمود کی طرف مطلق توجہ نہ کی جس نے ایاز کے کپڑے پہنے ہوئے تھے بلکہ ایاز کی طرف ملتفت ہوئے جو اس وقت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ کہنے کو تھے کہ محمود بول اٹھا۔

”اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نہ تو بادشاہ کی تعظیم کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے نہ اس کی طرف توجہ کی، کیا فقر کے جال کی یہی کائنات ہے کہ بادشاہ کو اس طرح نظر انداز کیا جائے؟“

شیخ ابوالحسن نے فرمایا۔ ”ہاں جال تو یہی ہے لیکن تو سامنے آ، کیونکہ تو خود اس جال کا سب سے بڑا شکار ہے۔“

حمود نے بھانپ لیا کہ شیخ اپنے کشف سے حقیقت تک پہنچ گئے ہیں تو وہ بڑے ادب سے شیخ کے سامنے بیٹھ گیا اور ان سے کہا۔ ”مجھ سے کچھ فرمائیے۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”غلاموں کے لباس میں بیٹھی ہوئی ان

نہ ان شرط پوری کی لیکن چالاکی یہ کی کہ تین سو ہاتھی فیل بانوں کے بغیر قلعے سے باہر نکال دیے۔ تین سو ہاتھی ہجوم کر کے جنگل میں نکل آئیں تو اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ نندا بھی یہی دلچسپ تماشا دیکھنا چاہتا تھا کہ محمود کے لشکر کی کس طرح ان ہاتھیوں کو قابو کرتے ہیں۔

حمود نے اپنے ترک لشکریوں کو حکم دیا کہ وہ ان ہاتھیوں کو پکڑ کر ان پر سوار ہو جائیں۔ اس کے لشکریوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بہادری کے ساتھ ان ہاتھیوں پر قابو پالیا۔

راجا نندا نے اس بہادری کی تعریف میں، ہندی زبان میں ایک شعر لکھ کر محمود کی خدمت میں بھیجا، محمود ہندی نہیں جانتا تھا لیکن اس کے ساتھ ایسے شعر اسفر کر رہے تھے جو ہندی زبان سے واقف تھے اور ہندی شاعری کے اسرار و رموز کو جانتے تھے۔ محمود نے اس شعر کو ان صاحبان علم کو دکھایا اور ان سے ان کی رائے طلب کی۔ ان سب نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

اس شعر کی خوبی و لطافت کے صلے میں محمود نے نندا کے پاس پندرہ قلعوں کا فرمان بھیجا جن میں کالجرج کا قلعہ بھی شامل تھا۔

راجا نندا نے بھی حق ادا کر دیا۔ بیش قیمت جواہرات اور بہت سے نادر تحفے محمود کی خدمت میں پیش کیے، سلطان محمود راجا سے کسی قسم کا تعرض کیے بغیر اپنے دارالسلطنت غزنی واپس چلا گیا۔

سلطان محمود ان دنوں خراسان میں تھا کہ اس کے دل میں شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کا شوق ہوا۔ اس نے سلسلہ نقش بندی کے ان بزرگ کی شہرت بھی سنی تھی اور یہ بھی سنا تھا کہ یہ بزرگ عمائدین و بادشاہان سے گریزاں رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ملاقات کی نیت کی اور خرقان پہنچ گیا جہاں شیخ ابوالحسن تشریف فرما تھے۔ محمود نے اپنا ایک قاصد ان بزرگ کی خدمت میں بھیجا۔ اس قاصد کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ کیا کہنا ہے۔

”شیخ سے کہنا، بادشاہ آپ سے ملنے کے لیے غزنی سے چل کر یہاں آیا ہے۔ اب اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی خانقاہ سے باہر نکل کر آئیں اور مجھ سے ملاقات کریں۔“ محمود نے مزید یہ بھی کہا۔ ”وہ اگر خانقاہ سے باہر نکلنے سے انکار کریں تو انہیں یہ فرمان خداوندی سنا دینا۔“ اے ایمان والو! اطاعت کرو خدا کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہیں۔“

ہو کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اگر لاہور اس کے قبضے میں آجائے تو وہ بار بار غزنی سے آنے کی زحمت سے بھی بچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے ولایت نندا کا ارادہ کیا۔ اس کے دل میں یہ کائنات بھی چھ رہا تھا کہ انند پال کے بیٹے نے جو اس وقت لاہور کا راجا تھا، راجا کالجرج کی مدد کی تھی اور محمود کی راہ میں مزاحم ہوا تھا۔ اس کا بدلہ بھی لینا تھا۔

لاہور پہنچ کر اس نے اپنی فوج کو متعدد حصوں میں تقسیم کر کے شہر کے مختلف حصوں میں غارت گری کے لیے روانہ کیا۔

لاہور کے راجا میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ سلطان محمود کے لشکر کا مقابلہ کرتا لہذا وہ اجیر کی طرف بھاگ گیا۔

سلطان نے لاہور پر بہ آسانی قبضہ کر لیا اور ایک قابل اعتماد امیر کے سپرد کر کے پنجاب کے دوسرے مقبوضات کی حکومتیں بھی قابل اور دیانتدار عاملوں کے سپرد کیں۔

لاہور میں اس نے ایک بڑا لشکر بھی متعین کیا۔ اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا اور غزنی واپس چلا گیا۔

راجا کالجرج سے بدلہ لینا ابھی باقی تھا جو اس کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا۔ اب پنجاب زیر نگین ہو چکا تھا لہذا بے فکر ہو کر اس سے لڑا بھی جاسکتا تھا اس کا پیچھا بھی کیا جاسکتا تھا۔

ایک سال بعد ہی وہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں تھا۔ یہ اس کا پندرھواں حملہ تھا۔

اسے کالجرج جانا تھا لیکن جب وہ قلعہ گوالیار کے قریب پہنچا تو اس کی طمع نے اس کو قلعے کا محاصرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

محاصرے کو ابھی چار دن ہی گزرے تھے کہ قلعے کے راجا نے اس شرط پر صلح کی درخواست پیش کی کہ وہ محمود کی خدمت میں 35 ہاتھی پیش کرے گا۔ محمود نے اس کی درخواست قبول کی اور ہاتھیوں کا نذرانہ وصول کر کے کالجرج کی طرف روانہ ہو گیا۔

کالجرج کا قلعہ پختگی و استحکام میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ محمود جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو راجا نندا قلعے سے باہر آیا تھا اور پھر محمود سے مقابلہ کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ محمود نے یہاں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اب وہ اسی ارادے سے آیا تھا۔ اب وہ نندا کو بھی بھاگنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرے کو ایک مدت گزر گئی تو نندا نے اپنا اپنی بھیجا اور تین سو ہاتھیوں کی پیشکش کر کے امان چاہی، محمود نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

اور شیخ صاحب سے کوئی چیز بہ طور یادگار طلب کی۔ انہوں نے اپنا ایک کرتہ دے کر رخصت کیا۔ محمود رخصت ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تو شیخ صاحب نے اس کی تعظیم کی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”حضرت، جب میں آپ کے پاس آیا تھا تو آپ نے میری بالکل پروا نہیں کی تھی لیکن اب آپ میرے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”جس وقت تم میرے پاس آئے تھے بادشاہت کے غرور میں مبتلا تھے اور میرا امتحان لینے کی نیت سے آئے تھے، لیکن اب تم عاجزی کے ساتھ واپس جا رہے ہو۔“

محمود نے دستِ شیخ کو بوسہ دیا اور خانقاہ سے باہر نکل آیا۔

سلطان محمود پے در پے حملوں کے بعد شمالی ہند کا پورا علاقہ فتح کر چکا تھا۔ اس کے اپنے علاقوں میں بھی ہندو بہت اتنا مضبوط تھا کہ کسی کو بغاوت کے ارادے سے سراٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ بے فکری ہی بے فکری تھی، دور دور تک کوئی مد مقابل نظر نہ آتا تھا۔ محمود کی جنگجو طبیعت فکرمند تھی کہ اب کس طرف جایا جائے، کس معرکے میں الجھا جائے۔ وہ اپنی فکرمندی اپنے امیروں پر کئی مرتبہ ظاہر کر چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے امیروں سے مخاطب تھا۔

”آپ کے خیال میں اب ایسا کون سا مقام ہے جس کے مال و زر سے غزنی کے خزانے بھرے جاسکتے ہیں؟“

اراکین دولت میں سے کسی نے ایک ملک کا نام لیا، کسی نے دوسرے کا۔ محمود ایک ایک کی رائے کو غور سے سن رہا تھا لیکن دل ہی دل میں ایک ایک کی تردید بھی کرتا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس پر سب کو حیرت ہوئی تھی۔ ایک نورانی شکل صورت کے بزرگ اچانک مجلس میں حاضر ہو گئے۔ ان بزرگ کا تعلق نہ تو اراکین دولت سے تھا اور نہ اس سے پہلے انہیں کسی نے دیکھا تھا۔ یہ بھی باعث حیرت تھا کہ ان بزرگ کو کسی چوہدار، کسی پیرے دار نے نہیں روکا تھا، نہ ان کے آنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اراکین میں سے بعض نے ان سے ان کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا لیکن محمود نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روک دیا تھا۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ بزرگ اس موضوع سے واقف تھے جو ان کے آنے سے پہلے زیر بحث تھا۔ اس لیے انہوں نے آتے ہی اپنی رائے کا اظہار کر ڈالا۔

”آپ لوگ کیوں جھگڑتے ہیں، میری رائے تو یہی

ہے کہ ہندوستان پھر ہندوستان ہے۔“

”بزرگوار، ہندوستان میں جو کچھ تھا وہ ہم غزنی میں لایچکے۔“ محمود نے کہا۔

”وہاں اب بھی اتنی دولت ہے جس کا آپ لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔“

”آپ کا اشارہ ہندوستان کے کس علاقے کی طرف ہے؟“

”امیر محترم! گجرات کے نزدیک جہاں شمالی بحیرہ عرب کی ایک شاخ گزرتی ہے ایک مشہور شہر سومات ہے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک عبادت خانہ ہے۔ اس عبادت خانے یعنی مندر میں ایک عظیم الشان بت ہے جسے لوگ سومات کے نام سے پکارتے ہیں جس کے لفظی معنی ”چاند دیوتا“ ہیں۔ اس بت کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں چند غیر مسلم ایک بہت بڑا بت خانہ کعبہ سے ہندوستان لائے تھے۔ اس بت کا نام سومات تھا۔ اسے اس جگہ نصب کیا گیا لہذا اس مقام کا نام بھی اس بت کے نام پر رکھا گیا۔ بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ یہ بت سری کرشن کے زمانے سے تمام برہمنوں کا معبود ہے اور برہمنوں کے قول کے مطابق سری کرشن نے اس جگہ دنیا سے روپوشی اختیار کی تھی یعنی ان کا دھیانت ہوا تھا۔“

(آج کل یہ شہر ہندو دیوی میں ہے اور اہل فرنگ کے قبضے میں ہے)

”بزرگ محترم! آپ نے تو بڑی دلچسپ حکایت بیان کی۔“ محمود نے کہا۔ ”اس کے بارے میں اگر کچھ اور معلوم ہو تو وہ بھی فرمائیے۔“

”امیر محترم! آگے بھی سنئے۔ جس مکان میں ”سومات“ ہے وہاں باہر کی روشنی کا دخل نہیں۔ جواہرات اور الماس اس کثرت سے دیواروں میں جڑے ہیں کہ ان کی جگہ گاہٹ سے اندھیرے کا گزر نہیں ہوتا۔ راتیں بھی دن کی طرح چمکتی ہیں۔ ایک بھاری سونے کی زنجیر ہے کہ اس میں گھٹنے ہر کڑی میں لٹک رہے ہیں۔ عبادت کے وقت اس زنجیر کو ہلایا جاتا ہے تو ایسا شور بلند ہوتا ہے کہ پورا شہر گونج اٹھتا ہے۔ ہزار ہا سال سے راجا اور پرجا اس بت کے شیدائی ہیں اس لیے اس بت پر جو چڑھاوے چڑھائے جاتے رہتے ہیں اس کا کوئی حساب نہیں۔ ایک اور دلچسپ بات بتاؤں۔“ ان بزرگ نے کہا۔ ”ہندوستان والوں کا عقیدہ ہے کہ جب کسی انسان کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کی روح ”سومات“ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور سومات دیوتا ہر روح کو اس کے اعمال اور کردار کے مطابق نیا جسم عطا کرتا ہے۔ اسی لیے

ہر ہندو سومات کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی موت کے بعد سومات اس کی روح کو اچھا جسم عطا کرے۔“

اس بزرگ نے یہ بھی بتایا۔ ”گنگا وہاں سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے مگر ہر روز تازہ گنگا جل اس دیوتا کے اشران کے لیے لایا جاتا ہے۔“

دو ہزار برہمن وہاں کے پجاری ہیں، تین سو کنواری لڑکیاں اور اتنے ہی گویے ہیں جو بچپن گاتے ہیں اور لڑکیاں اپنے رقص سے سومات دیوتا اور پجاریوں کے دلوں کو لہلاتی ہیں۔ ان سب کے اخراجات کے لیے دو ہزار سے زیادہ گاؤں وقف ہیں۔“

بزرگ کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آرہی تھیں اور محمود ارادہ کر چکا تھا کہ عنقریب اس مہم پر روانہ ہوگا۔ اس کے لیے دو باتیں اہم تھیں۔ اس بت کو توڑنا ضروری ہے کہ بت شکنی ہی اس کا شیوہ تھا اور وہاں مال و دولت کی فراوانی ہے۔

”بزرگ، یہ بتائیے کہ اگر میں وہاں کے لیے روانہ ہوں تو اس سفر کے لیے مجھے کیا خاص اہتمام کرنا چاہیے؟“

”جہاں تک میرا خیال ہے وہاں آپ کو کوئی بڑی جنگ لڑنی نہیں پڑے گی البتہ سفر بہت دشوار ہوگا۔ ریگستان اور چٹیل میدان ہیں جہاں کوسوں تک پانی نہیں۔ میدانوں میں گھاس نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے جو کچھ لے جاسکتے ہیں لے جائیں، آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔“

”بزرگوار! آپ یہ تو بتائیے کہ کون ہیں اور میری مجلس تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی؟“ محمود نے ان بزرگ سے پوچھا۔

ابھی وہ بزرگ شخص کوئی جواب دے نہیں پائے تھے کہ چوب دار نے امیر احسن کی آمد کی اطلاع دی جو ترکستان سے کچھ خبریں لے کر آیا تھا اور محمود سے ملاقات کا متنی تھا۔ محمود نے یہ سوچ کر کہ اجنبی بزرگ کہاں جا رہے ہیں یہیں تو بیٹھے ہیں جو کچھ پوچھنا ہے بعد میں پوچھ لوں گا، امیر احسن کو طلب کر لیا۔ امیر احسن آئے تو دیگر علما ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ خود محمود کی نظر ان بزرگ کی طرف سے ہٹ گئی۔

امیر احسن جب ترکستان کے حالات سے آگاہ کر چکا تو محمود کی آنکھوں نے ان بزرگ کو تلاش کیا۔ وہ اپنی نشست پر موجود نہیں تھے۔ جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک غائب ہو گئے تھے۔ محمود نے امر اسے دریافت کیا۔ وہ سب بھی بے خبر تھے۔ کسی نے بھی انہیں

اپنی جگہ سے اٹھتے اور جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”کیا وہ کوئی فرشتہ تھا جو ہمیں ہندوستان کے حالات بتانے آیا تھا؟“ محمود نے استفسار کیا۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا البتہ ایک امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کیا۔ ”امیر محترم! یہ شخص یقیناً کوئی جاسوس تھا جو ہندوستان کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ ہندو راجاؤں نے ہمیں بھانسنے کے لیے جال بچھایا ہے۔ وہ ہمیں ایک ایسے مقام کا پتا بتا گیا ہے جو صحرا اور ریگستان ہے۔ مقصد یہی ہوگا کہ سلطانی لشکر وہاں بھوکا پیاسا مر جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندو لشکر وہاں چھپا بیٹھا ہو اور ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سومات شہر میں پتھروں کے بتوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ وہاں کا مال و زر پہلے ہی نکال لیا گیا ہو اور ہمیں دھوکے سے بلایا جا رہا ہو۔“

”یہ کیسا جاسوس تھا کہ نہ اسے کسی نے جاتے ہوئے دیکھا نہ آتے ہوئے۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی صاحب کرامت بزرگ تھے یا کوئی فرشتہ جو ہمیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہندوستان میں ایک مقام اب بھی ایسا ہے جسے ایک بت شکن مرد مجاہد کی ضرورت ہے۔“ محمود نے خوش اعتقادی سے کہا۔

”ہندوستان میں جادو کا بہت زور ہے۔ یہ شخص کوئی ہندو جادوگر بھی ہو سکتا ہے۔ جو جادو کے زور سے آیا اور اسی طاقت سے چلا گیا۔“

محمود بھی سوچ میں پڑ گیا کہ اپنی رائے کو فوقیت دے یا امر کے شبہات کو قبول کرے۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قصے کو یقیناً چھوڑ دیا جائے اور ان خبروں کے نات کا بندوبست کرے جو ترکستان کی طرف سے آئی تھیں۔ اسے خبر ملی کہ بلخ کا کوتوال علی ٹمیں ماورائے نہر کے باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ لوگ محمود کے نام کی دہائی دے رہے ہیں۔ علی ٹمیں، محمود ہی کا مقرر کردہ ہے اور اسی کے احکام کی پاسداری نہیں کر رہا ہے۔

محمود نے فوج کو مرتب کیا اور بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی فوج نے جیسے ہی دریائے جیوں پار کیا ماورائے نہر کا ہر سردار استقبال کے لیے آیا اور اپنی حیثیت کے مطابق نذریں گزرائیں۔ یوسف قدر خاں بھی جو تمام ترکستان کا بادشاہ تھا، محمود سے ملاقات کے لیے آیا۔ کئی روز تک جشن مسرت منایا گیا اور مہمانداری ہوئی۔ دونوں حکمران گلے مل کر رخصت ہوئے۔

علی ٹمیں کو جب محمود کی آمد کا علم ہوا تو وہ خوف زدہ ہوا اور اپنا ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ محمود نے اپنے چند با اعتبار لوگوں

کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ بھاگ کر جاتا کہاں پکڑا گیا۔ سلطان محمود نے اسے پابہ زنجیر کر کے ہندوستان کے قلعوں میں سے کسی قلعے میں بھیج دیا اور خود غزنی چلا آیا۔ غزنی سے پنج تک کے سفر میں وہ مسلسل اپنے دربار میں آنے والے بزرگ اور ہندوستان کے بارے میں ان کی فراہم کردہ معلومات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس نے اب یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ بزرگ کون تھے۔ اسے تو صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ کانٹھیا واڑ کے قریب سومنات کا مندر ہے جس میں ایک بڑا بت ہے اور جو اپنی حیثیت میں ان سب بتوں سے بڑا اور مقدس ہے جنہیں وہ اب تک پاش پاش کر چکا ہے۔

شمالی ہند میں محمود کے حملوں کا شور مچا ہوا تھا لیکن جنوبی ہند کے راجا بہ سوچ کر مطمئن تھے کہ دوری کے سبب محمود اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ لیکن اب یہ خبریں بھی آنے لگی تھیں کہ محمود کی دلیری یہ راستہ بھی دیکھنے والی ہے۔ ان راجاؤں نے جوتشیوں کو بلایا کہ کنڈلی نکال کر بتائیں کہ محمود کے ارادے کیا ہیں۔

ان جوتشیوں نے حساب لگا کر تصدیق کر دی کہ اس مرتبہ محمود کے لشکر کا رخ جنوبی ہند کی طرف ہوگا۔ راجا اجیر کے دربار کا جوتشی اپنی پوتھی سنہالے راجا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ”مہاراج! اگر آپ اپنے نزدیک سے سب کو ہٹا دیں تو میں ایک اہم بات آپ کو بتاؤں۔“

”یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔“

”مہاراج، میری دی ہوئی خبر سے پہلے مجھے کاؤر ہے۔ یہ خبر عام نہ ہو تو اچھا ہے۔“

راجا نے تمام آدمیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیا تو جوتشی بولا۔ ”مہاراج! میرا حساب بھی غلط نہیں کہتا۔ میں اجیر کی سرحدوں کے آس پاس مسلمانوں کے لشکر کو منڈلاتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔“

”خوب اچھی طرح غور کر لے۔ تو جو کہہ رہا ہے کیا وہی ٹھیک ہے؟“

”خوب اچھی طرح غور کر چکا۔ اجیر کے بھاگوں میں یہی ہے۔“

”کیا محمود اجیر پر حملہ کر دے گا؟“

”میرا حساب یہاں آکر خاموش ہو جاتا ہے، پر تو یہ طے ہے کہ وہ اس طرف آئے گا ضرور۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دیوتا اسے حملہ کرنے سے روک دیں یا محمود خود ہی ٹل جائے کیونکہ اس کی منزل کوئی اور ہے۔ میرا حساب یہی کہتا ہے۔ اس خبر کو پھیلنے سے روکیں ورنہ شہر میں بھگدڑ مچ جائے گی۔“

راجا پر گھبراہٹ طاری تھی، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ جوتشی کی بات کا یقین کرے۔ اس نے چند اور جوتشیوں کو بلایا کہ شاید وہ کوئی اور بات کریں یا اس کا کوئی توڑ بتائیں۔ درجن بھر جوتشی اسی وقت حاضر ہو گئے۔ انہوں نے بھی حساب کتاب لگا کر پہلے جوتشی کی تصدیق کی بلکہ ان میں سے ایک نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ بڑی ہابا کار بچے گی۔ محمود حملہ کرے گا۔

یہ سنتے ہی راجا اس قدر حواس باختہ ہوا کہ اپنی ملکہ کو فوج کے حوالے کر کے خود قلعے سے فرار ہو گیا۔ یہ بات کہیں چھپنے والی تھی۔ اس کے درباریوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔

مندروں میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ پنڈت اور پجاری سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ بتوں کے آگے ڈنڈوت کر رہے تھے۔ پرارتھنا کر رہے تھے کہ محمود یہاں آنے سے پہلے ہی غارت ہو جائے۔

اجیر کے بڑے مندر میں بڑا پجاری اپنی دیو داسیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دو دن پہلے وہ اپنا ایک آدمی صحرا کی طرف یہ جاننے کے لیے بھیج چکا تھا کہ محمود کے لشکر کے آثار نظر آرہے ہیں یا نہیں۔ دور دور تک کسی لشکر کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ خبر اطمینان کا باعث تھی لیکن پجاریوں کی گھبراہٹ دور نہیں ہو رہی تھی۔ ان میں سے بہت سے مندر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔

ایک پنڈت نے تجویز دی۔ ”ہم سب کو چاہیے کہ قلعے میں پناہ لے لیں۔ جتنی دیو داسیاں ہیں وہ مندر کی دیکھ بھال کے لیے مندر ہی میں رہیں۔ مندر کی گھنٹی بجانے والا بھی تو کوئی ہو۔“

”ہم دیو داسیوں کی زندگی اتنی سستی نہیں کہ ہم یہاں رہ کر محمود کے سپاہیوں کا انتظار کرتے رہیں۔“

”میں نے تو یہ تجویز اس لیے دی تھی کہ مسلمانوں کے لیے مشہور ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کی جان نہیں لیتے۔ وہ تم دیو داسیوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔“

”جب راجا ہی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو ہم خطرہ مول کیوں لے لیں۔“

”وہ بھی اپنی ملکہ کو چھوڑ کر گیا ہے۔ ہم بھی تم داسیوں کو بھگوان کے سپرد کر کے قلعے میں پناہ لے لیتے ہیں۔“

پنڈتوں کے درمیان بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر بڑے پجاری نے یہ کہہ کر فیصلہ کیا۔ ”میرا جینا مرنا تو اسی مندر میں ہے۔ تم سب چلے جاؤ۔ مندر کی دیکھ بھال کے

لیے میں یہاں موجود رہوں گا۔ جو داسی میرے ساتھ رہنا چاہے وہ میرے ساتھ رہ لے۔“

کئی داسیوں کو غیرت آئی اور انہوں نے گرو کے ساتھ رہنا منظور کر لیا۔ باقی سب قلعے میں پناہ گزین ہو گئیں۔ اس رات کے بعد سے ہر رات اجیر میں ایسی سسنان اور اندھیری تھی جیسے محمود کی فوج ابھی غارت گری کر کے گئی ہو حالانکہ محمود کے لشکر کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔ یہی حال یہاں سے کانٹھیا واڑ تک ہر شہر کا تھا۔



سلطان اس سے پہلے پندرہ مرتبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں حملہ آور ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان کے کسی راجا میں اب اس سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں لیکن پھر بھی اس کے دل میں اندیشے سراٹھارے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ کسی ایسی خطرناک مہم پر روانہ نہیں ہوا ہوگا۔ وہ غیر معمولی تیاریاں کر رہا تھا۔

اس نے اپنا خاص لشکر تیار کیا اور دیگر تیس ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا جو ترکستان وغیرہ سے جہاد کے لیے آئے تھے۔ سلطان محمود اس ٹڈی دل کو لے کر اڑا اور ملتان تک آ گیا۔ اڑتا ہوا غبار سومنات تک جا رہا تھا۔ خبر پہنچ چکی تھی کہ محمود ملتان پہنچ گیا ہے۔

”ہمارے معبود اسے یہاں تک نہیں پہنچنے دیں گے۔“ ایک پجاری نے نعرہ بلند کیا لیکن اس کی آواز کی لرزش صاف بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے۔

سلطان کو بتایا گیا تھا کہ آگے راستے میں بے آب و گیاہ جنگل ہے اور ریگستان سے گزرتا ہے۔ غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے بیس ہزار اونٹوں پر غلہ اور پانی لا دیا اور لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

کئی دن تک گھنے جنگلوں، بقی ووق میدانون، اونچے نیچے ٹیلوں کو سمیٹا ہوا وہ اجیر کی سرحد میں جا پہنچا۔ شہریوں نے سن تو رکھا تھا کہ محمود کا لشکر آنے والا ہے لیکن بہت سوں کو یقین نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ ابھی تک شہر میں موجود تھے۔ اب جو محمود کو بجلی بن کر گرتے دیکھا تو خرمن بچانے کی فکر ہوئی۔ کیا خبر وہ کب شہر میں داخل ہو اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دے۔ شہریوں نے مال و زر وہیں چھوڑا۔ جتنا ساتھ لے سکتے تھے ساتھ لیا، گھروں کو منہ بٹکتے چھوڑا اور دیکھتے دیکھتے شہر خالی ہو گیا۔ پورا شہر ویران ہو گیا، گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں تھا۔

بڑے مندر کی ایک کونٹھری میں ایک دیار روشن تھا۔

بڑا پجاری تنگ و دھڑک صرف ایک لنگوٹ باندھے زمین پر اوندھا بڑا تھا۔ کچھ داسیاں اس کا بدن دباری تھیں، کچھ ان سے دور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔

”اس وقت شیو دیوتا مدد کو کیوں نہیں آتے؟“ ایک لڑکی نے کہا۔

”یہ مدد نہیں تو کیا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر شہر سے باہر آ کر رک گیا ہے۔ اب تک شہر میں داخل نہیں ہو سکا ہے۔“ دوسری نے کہا۔

”ذرا سوچو، اگر وہ اندر آگئے تو کیا ہوگا۔ کیا ہماری عزتیں لٹنے سے بچ جائیں گی؟“

”سنائے مسلمان، عورتوں کی عزتیں پامال نہیں کرتے۔“ ”کیوں، کیا وہ انسان نہیں ہوتے، مرد نہیں ہوتے؟“

”ان کے سردار نے انہیں یہی سکھایا ہے۔ لونڈی باندی بنا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر سنائے مسلمان بنا کر شادی کر لیتے ہیں۔“

ایک داسی اوشا جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی، اس مندر میں دو مہینے پہلے ہی آئی تھی، شادی کا نام سن کر آگے کھسک آئی۔

”دیدیں، تم کیا کہہ رہی تھیں۔ مسلمان بنا کر شادی کر لیتے ہیں؟“

”ہاں، یہی سنائے۔“

”اگر وہ یہاں آگئے تو بڑے پجاری کو تو نہیں چھوڑیں گے۔“ ”کیا خبر چھوڑ بھی دیں۔ اتنا بوڑھا جو ہو گیا ہے۔“

”مندر میں رکھے بتوں کو تو ضرور توڑیں گے یہ مسلمان۔“

”ہاں ضرور توڑ دیں گے۔ یہی کرنے تو نکلے ہیں۔“

اوشا دیوی ان باتوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

”یہ مسلمان ہوتے کیسے ہیں؟“

سب داسیاں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

”ہماری طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں کی بددعا میں ہیں اسی لیے مسلمان کہلاتے ہیں۔“

اس کے بعد شاید کوئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی تھی۔ سب خاموش ہو گئی تھیں۔ پھر ایک طرف سے آواز آئی۔

”مندر کا بڑا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا ہے؟“

گرو کی کونٹھری سے چار داسیاں باہر نکلیں۔ انہوں نے اندھیرے میں اوشا کو پکارا۔ ”گرو جی تمہیں اندر بلا

رہے ہیں۔“ اوشا بے دلی سے انھی اور گرو کی کوشری کی طرف جانے لگی۔

”کوشری اندر سے اچھی طرح بند کر لینا۔“ سب لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا اور ہنس پڑیں۔

”آؤ، اوشا آؤ۔ تمہیں آئے دو مہینے ہو گئے اور میں نے تم سے کوئی خدمت ہی نہیں لی۔ اب آخری چند راتیں ہیں، کیا خبر مسلمان یہاں کب چڑھ دیں گے۔ کیا تم اپنے باپ نہیں دھلو آؤ گی؟“

اوشا خاموش تھی، کیا کہتی، اس کے اندر داخل ہوتے ہی گرو نے چراغ بھی بجھا دیا تھا۔ اوشا نے اندھیرا ٹٹول کر دیکھا۔ گرو کے بدن پر کپڑے نام کی چیز نہیں تھی۔

اندھیرے میں گرو کی آواز پھر نکلی۔ ”اوشا، میرے قریب آ کر لیٹ جاؤ تا کہ میں تمہیں ”چاپ“ کراؤں۔“ اوشا اتنی دیر میں سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

”آپ نے اوشا کو بلایا تھا؟“

”ہاں وہی جو دو مہینے پہلے یہاں آئی تھی۔ اس نے ابھی تک بھینٹ نہیں دی ہے۔“

”لیکن میں تو مدھر ہوں۔“

”تجھے یہاں کس نے بھیج دیا۔ چل جا کر اوشا کو بھیج، سے نکلا جا رہا ہے۔“

”مہاراج! ابھی گئی۔“

اوشا نے بڑی ہوشیاری سے گروہ کو چمکا دے دیا تھا۔ اندھیرے میں وہ دوسرے دروازے سے نکلی اور مندر کے صحن میں آ گئی۔ یہاں سے مندر کا بڑا دروازہ دور نہیں تھا۔ وہ دے پاؤں بلی کی چال چلتے ہوئے دروازے تک آ گئی۔

دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ گلیوں میں مندر سے بھی زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں چلنا اسے دشوار ہو رہا تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ چلتی رہی۔ کبھی دوڑنے لگتی پھر چلنے لگتی یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل آئی۔

اسے اپنی قوم کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ شہر کے دروازے خالی پڑے ہیں، وہاں کوئی پہرے دار تک نہیں تھا۔ کسی نے اسے نہیں روکا۔

ہوا بہت تیز چلنے لگی تھی۔ اس ہوا کے ذریعے جانوروں کی خوشبو اس تک پہنچنے لگی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ سلطان کا لشکر یہیں کہیں قریب ہے۔ اسی وقت چار گھڑ سوار اس کے قریب سے تیزی سے گزر گئے لیکن کچھ دور جا کر چاروں سوار پلٹے اور اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

”اے لڑکی! تو کون ہے اور اس وقت یہاں اس

ویرانے میں کیا کر رہی ہے؟“

”تم لوگ مسلمان ہو؟“

”ہاں ہم مسلمان ہیں مگر تو ہمارے سوال کا جواب دے۔ اس ویرانے میں تو کس ارادے سے نکلی ہے؟“

”میرا نام اوشا ہے۔ میں مسلمانوں کے لشکر میں جانے کے لیے نکلی ہوں۔“

”کس لیے؟“

”میں تمہارے سردار کو غیرت دلانے آئی ہوں۔ شہر کے باہر آ کر رک گیا ہے شہر میں کیوں نہیں آتا۔ یہاں کے مندروں میں عورتوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ تمہارا سردار ان کی مدد کو کیوں نہیں آتا؟“

”تم ہندو ہو کر یہ بات کیوں کہہ رہی ہو؟“

”اس لیے کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔“

اوشا نے ان چاروں کو لاجواب کر دیا تھا۔ وہ چاروں اوشا کو چھوڑ کر ایک طرف چلے گئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

”علی خاں، اس لڑکی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے یا سچی ہے؟“

”اکیلی لڑکی ہمیں کیا بے وقوف بنائے گی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کسی نے جاسوسی کے لیے اسے بھیجا ہو۔“

”جاسوسی کے لیے بھیجا ہوا؟“ جعفر سنگین نے نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں ہے کون جو اسے بھیجے گا۔“

”قلعے میں چھپی ہوئی فوج کی جاسوس بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”یہ سب تو معلوم کر لیا جائے گا۔ یہ بتاؤ اس لڑکی کا کیا کریں؟“

”کرنا کیا ہے۔ اسے امیر کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں۔“

یہ سوار محمود کے دو امیر علی خاں اور جعفر سنگین تھے جو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ گشت کے لیے نکلے تھے کہ اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔

ان ساتھیوں میں سے ایک تیر انداز عبدالرحمن تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب ہو گئی۔ یہ نوجوان اوشا کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور دل و جان سے چاہتا تھا کہ یہ لڑکی لشکر میں پہنچا دی جائے اور پھر موقع دیکھ کر اسے محمود سے مانگ لے۔ اس لیے وہ شدد و دھم سے اصرار کر رہا تھا کہ اوشا کو لشکر میں لے جایا جائے۔

یہ چاروں مشورہ کرنے کے بعد اوشا کے پاس

بٹ بٹشکن

آئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گھوڑے دو تھے، سوار پانچ ہو گئے تھے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی، طے یہ ہوا کہ ایک گھوڑا اور دو بچا جائے۔ عبدالرحمن، علی خاں کے گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر سے ایک گھوڑا لے آیا۔ اوشا اکیلی گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتی تھی اس لیے طے ہوا کہ اوشا، عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھے گی۔ علی خاں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

عبدالرحمن یہی چاہتا تھا۔ اس کی تو مراد پوری ہو گئی۔ ”میرا نام عبدالرحمن ہے۔“ عبدالرحمن نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم میرا نام یاد رکھو گی؟“

”میں تمہارا نام کیسے بھول سکتی ہوں۔ تم تو مجھے لشکر میں لے جا رہے ہو۔“

”میں تم سے شادی کروں گا۔ تم انکار تو نہیں کر دو گی؟“

”میں نے یہی سنا تھا کہ مسلمان شادی کر لیتے ہیں۔“

”بس اب خاموش ہو جاؤ۔ وہ دیکھو مشغلوں کی روشنی نظر آرہی ہے، ہم لشکر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“

اوشا نے کبھی کوئی لشکر نہیں دیکھا تھا۔ جہاں تک اس کی نظر جا رہی تھی گھوڑے اور اونٹ بندھے نظر آرہے تھے۔ دور تک خیموں کا شہر آباد تھا۔

”اتنے لوگ تو اجیر میں بھی نہیں جتنے یہاں ہیں۔“

اس نے دل میں سوچا۔ عبدالرحمن کہہ چکا تھا کہ خاموش رہے اس لیے وہ خاموش رہی۔

گھوڑے سے اترتے ہی علی خاں نے اوشا کو گھوڑے سے اترنے کا حکم دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ ایک لڑکی ہے اور گھوڑے پر شاید پہلی مرتبہ بیٹھی ہو، کس طرح اترے گی۔

عبدالرحمن نے اوشا کا پاؤں رکاب میں رکھا۔ اوشا اترنے لگی تو عبدالرحمن نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر نیچے اتار لیا۔

”عبدالرحمن، تمہیں یہ خیال نہیں کہ یہ لڑکی تمہارے لیے نامحرم ہے؟“ علی خاں نے تادیبی انداز میں استفسار کیا۔

”یا امیر، اس وقت مجبوری تھی۔ قریب میں کوئی اونچی جگہ نہیں تھی۔“

علی خاں اور جعفر سنگین، اوشا کو لے کر محمود کے خیمے کی طرف چل دیے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے اس جگہ روکے تھے جہاں سے محمود کا خیمہ قریب تھا۔

دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے دونوں

امیروں سے زیادہ اس لڑکی کو دیکھا جو ان کے ساتھ تھی۔ پھر ان میں سے ایک محمود کو خبر کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ محمود کو چونکہ معلوم تھا کہ یہ دونوں امیر گشت پر نکلے ہیں اس لیے وہ یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہوں گے ورنہ اس ناوقت کیوں آئے۔ اس نے فوراً طلب کر لیا لیکن جب اس نے ایک لڑکی کو ان کے ساتھ دیکھا تو اس کی تیوری پر پل پڑ گئے۔

”کون ہے یہ لڑکی؟“

”سلطان معظم۔ آپ اس سے خود پوچھ لیں۔“

سلطان معظم کے الفاظ پر اوشا نے چونک کر دیکھا۔ درمیانے قد کا ایک آدمی اس کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے پر چمک کے داغ نمایاں تھے۔ نقش جاذب نظر نہیں تھے لیکن چہرے پر نامعلوم سی دلکشی تھی۔ اس دلکشی کے باوجود ایسا رعب تھا کہ اوشا کھڑے کھڑے کانپ گئی۔

خصوصاً اس کی آنکھیں کہ جسے آنکھ بھر کر دیکھ لے، اس کا کلیجا کانپنے لگے۔ اس وقت وہ جنگی لباس میں نہیں تھا لیکن اس کا سینہ ابھرا ہوا تھا جو بتا رہا تھا کہ وہ مضبوط جسم کا مالک ہے۔

وہ جس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس پر اتنے ہیرے جڑے ہوئے تھے کہ چراغ روشن کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود خیمے میں شمعیں اور مشعلیں روشن تھیں۔ یہیں اوشا نے ایک اور حسین و جمیل آدمی کو دیکھا جس کی زلفیں اس کے شانوں پر تھیں۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے چاند کے ارد گرد سیاہ بادل ہوں۔ یہ اسے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ سلطان کا غلام ایاز ہے۔

محمود کے اشارے پر دونوں امرائے سے باہر چلے۔ صرف ایاز رہ گیا۔

محمود نے اوشا سے پوچھا۔ ”تمہیں یہاں کون لے کر آیا ہے؟“

”یہی دونوں جو ابھی یہاں سے گئے ہیں۔“

”زبردستی لے آئے ہیں؟“

”رام رام، زبردستی کیوں لاتے۔ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔“

”کیوں آئی ہو؟“

”یہ پوچھنے کے مندر میں بت پڑے ہیں اور تم انہیں توڑنے نہیں پہنچے۔“

”تو کیسی ہندو ہے کہ اپنے بتوں کو توڑنے کی خود دعوت دے رہی ہے۔ سچ بتا تیری یہ کیسی چال ہے۔ وہ کون سا جال ہے جس میں تو ہمیں پھانسا چاہتی ہے؟“

”سلطان، میرا نام اوشا ہے۔ میرے ماں باپ نے

مجھے داسی بنا کر اجیر کے بڑے مندر میں چھوڑ دیا تھا۔ مندروں کے پجاری ان داسیوں سے اپنی ہوس پوری کرتے ہیں۔ جن بتوں کو وہ اپنا دپوتا کہتے ہیں انہی کے چرنوں میں ان داسیوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ میں اب تک پلید ہاتھوں سے بچی ہوئی تھی لیکن آج بڑے پجاری نے مجھ پر نیت خراب کی اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ کہہ رہا تھا، مسلمانوں کا راجا آگیا ہے، کیا خبر وہ مندروں کا کیا حال کرے۔ اس سے پہلے کہ مسلمان آجائیں میں اسے اپنی بھیٹ دول اور اس کے کہنے کے مطابق میں اپنے پاپ دھولوں۔ میں کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل آئی۔ اس خیال سے آئی تھی کہ آپ کے پاس آکر ان پجاریوں کی پول کھولوں گی اور التجا کروں گی کہ میری جیسی اور لڑکیوں کو ان پجاریوں کے چنگل سے بچالو۔

”تمہارے ساتھ اور کتنی لڑکیاں ہیں وہاں؟“
”تھیں تو تین سو مگر اب وہ قلعے میں پناہ لے چکی ہیں۔ مندر میں تو اب بیس پچیس سے زیادہ نہیں رہ گئیں۔ یہ تو ایک مندر کا حال ہے۔ شہر میں اور بھی کئی مندر ہیں۔ میں نے تو سنا ہے آپ جہاں جاتے ہیں مندروں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں پر ابھی تک تو آپ شہر میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ وہاں پجاری یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ہمارے دیوتاؤں نے آپ کو روک دیا ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟“
”میں نے سنا ہے تم مسلمان ہونا چاہتی ہو؟“
”آپ نے ٹھیک سنا ہے اور میں نے سنا ہے آپ لوگ مسلمان کر کے شادی کر دیتے ہیں۔“
”تم نے ٹھیک سنا ہے۔ ابھی تمہارے لیے غسل کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تمہیں مسلمان کیا جائے گا۔“

”آپ کے ساتھ عورتیں نہیں ہیں جن کے پاس میں جا کر بیٹھ جاؤں۔“
”ہم اپنی عورتیں میدان جنگ میں لے کر نہیں نکلتے۔ ویسے تم فکر مت کرو، کچھ خدمت گار عورتیں ہیں جو تمہارا خیال رکھیں گی۔“
یہ پہلا موقع تھا جب محمود اپنے لشکر میں کچھ لونڈیوں کو بھی لے آیا تھا۔ اوشا کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ باتوں باتوں میں رات گزر گئی تھی، اب فجر کی اذان کا وقت ہو گیا تھا۔ محمود نے نماز ادا کی۔ اوشا کو بھی تیار کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب آگئے اور اوشا نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام خدیجہ رکھا گیا۔

اس لڑکی کی داستان سن کر سلطان محمود کو محمد بن قاسم کی یاد آگئی جو کچھ عورتوں کی فریاد پر دیار عرب سے سندھ آگیا تھا اور راجا دہر سے لکڑی تھی۔ اس نے سوچا، کیا میں چند گز کے فاصلے پر ہوتے ہوئے اس لڑکی کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دے دیا کہ شہر میں لوٹ مار کرو، مندروں کو سار کر دو۔ جتنی عورتیں ملیں انہیں لونڈی بنا کر لشکر میں لے آؤ۔ لشکر کے سپاہی خوش ہو گئے کہ انہیں مال غنیمت سمیٹنے کا موقع ملے گا۔

جب ایک دستہ فوج کا شہر جانے کے لیے روانہ ہو گیا تو محمود نے امیر علی خاں کو بلایا اور حکم دیا کہ کسی کو اس لڑکی کے ساتھ اجیر بھیجتا کہ وہ اس مندر کی نشاندہی کرے جہاں سے وہ آئی تھی۔ وہاں کی تمام داسیوں کو لے آؤ اور وہاں کے بڑے پجاری کو قتل کر دو۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ علی خاں نے اس کام کے لیے عبدالرحمن کو موزوں سمجھا۔ اوشا کو گھڑ سواری نہیں آتی تھی اس لیے اس مرتبہ بھی اسے عبدالرحمن کے ساتھ ایک ہی گھوڑے پر بیٹھنا پڑا۔

عبدالرحمن اسے لے کر اجیر میں داخل ہوا۔ شہر سنان پڑا تھا۔ صرف محمود کے سپاہی تھے جو ہر طرف لوٹ مار مچا رہے تھے۔ اوشا راستہ بتا رہی تھی اور عبدالرحمن گھوڑے کو دھکی چال سے چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بڑی سڑک سے دائیں طرف مڑ کر وہ ایک کنویں کے پاس سے گزرا۔ پھر ایک عمارت آگئی۔ یہی بڑا مندر تھا۔

”تم اس کنویں کے پیچھے چھپ جاؤ، میں اپنے سپاہیوں کو بلا کر لاتا ہوں۔“ عبدالرحمن گیا اور کچھ سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔

”ٹھہرو، میں دروازہ کھلواتی ہوں۔“ اوشا نے کہا اور دروازے پر لگی لوہے کی زنجیر کو زور زور سے بجانے لگی۔

کچھ دیر بعد کوئی عورت اندر سے بولی۔ ”کون ہے، کون دروازہ بجا رہا ہے؟“

”میں اوشا دیوی ہوں۔ جلدی دروازہ کھولو۔“
”تو باہر کیسے گئی؟“

”یہ میں اندر آ کر بتاؤں گی۔ اس وقت تو بس دروازہ کھول دو۔“

دروازہ کھلتے ہی پہلے اوشا اندر گئی اور اس کے پیچھے محمود کے سپاہی۔ اوشا نے عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر مہا گرو کی کوٹھری میں پہنچ گئی۔ عبدالرحمن باہر کھڑا تھا۔ ”گرو، تم نے کل رات کو مجھے بلایا تھا۔“

”ہاں، مگر تم اب آئی ہو۔“
”کیوں، کیا اب بھیٹ نہیں ہو سکتی؟“
”کیوں نہیں ہو سکتی، دروازہ بند کر اور ادھر آ کر لیٹ جا۔“
”ٹھہرو، میں دروازہ بند کرتی ہوں۔“
وہ دروازہ بند کرنے کے بہانے گئی اور عبدالرحمن کو اندر بلایا۔ گرو کی نظر جیسے ہی عبدالرحمن پر پڑی وہ رام رام کر کے اٹھ بیٹھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عبدالرحمن کی لمباوار نے اسے خاموش کر دیا۔

سپاہی تمام بتوں کو توڑ پھوڑ چکے تھے۔ اس مندر سے پچیس داسیاں ملی تھیں جنہیں عبدالرحمن پیدل چلاتا ہوا لشکر تک لے آیا۔ جو سپاہی شہر میں لوٹ مار کے لیے گئے ہوئے تھے شام تک وہ بھی لوٹ آئے۔

اجیر کا قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا محمود کو دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ محمود کو یہ بھی معلوم تھا کہ راجا کی فوج اسی قلعے میں ہے۔ ہندوتوں اور داسیوں نے بھی اسی قلعے میں پناہ لے رکھی ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس مضبوط قلعے کو فتح کرنے میں کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں، ارادہ تو سومات فتح کرنے کا ہے، اجیر میں کیوں وقت ضائع کیا جائے۔ ہاں اگر مزاحمت ہوتی تو بات الگ تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ایک رات اور تھکن اتار لو، کل صبح سومات کی طرف روانگی ڈال دی جائے گی۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی کہ نماز کے بعد عبدالرحمن نے علی خاں کے خیمے پر حاضری دی۔ وہ امیر علی خاں کے لشکر سے وابستہ تھا اس لیے وہ انہی سے یہ بات کہہ سکتا تھا۔ ”امیر، آپ کو وہ لڑکی یاد ہے جو ہمیں گشت کے دوران اجیر کے قریب ملی تھی؟“

”اس واقعے کو کیا دو سو سال گزر گئے، جو میں نے بھلا دیا ہوگا۔“

”وہ میرے گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں تک آئی تھی اور پھر میرے ہی گھوڑے پر بیٹھ کر شہر کی تاراجی کے لیے گئی تھی۔“
”منع کر دوں گا، آئندہ نہ جائے۔“

”امیر محترم! میں اس سے شادی کا خواہاں ہوں۔“
”بس..... ایک دن کی رفاقت میں تم نے یہ فیصلہ کر لیا؟“

”مجھے لگتا ہے میں ایک سو سال سے اس کے ساتھ ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے مال غنیمت میں آنے والی لڑکیوں

کا فیصلہ خود سلطان محترم کرتے ہیں۔“
”میں یہی چاہتا ہوں، آپ سلطان تک میری یہ درخواست پہنچا دیں۔ سومات کا معرکہ قریب ہے۔ کیا خبر کون جان سے جاتا ہے کون رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں شادی کی یہ رسم آج ہی ادا کر دی جائے۔“
”تمہارا مطلب ہے میں سلطان سے اجازت لے آؤں؟“

”جی امیر، میں یہی چاہتا ہوں۔“
”اچھا مجھے بھی نہیں لگتا کہ نیک کام میں دیر کی جائے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

انہیں خود جانا نہیں پڑا، محمود نے انہیں خود ہی طلب کر لیا تھا۔ ضروری باتوں کے بعد انہوں نے اوشا اور عبدالرحمن کا تذکرہ بھی چھیڑ دیا۔ انہیں امید نہیں تھی کہ محمود اتنی جلدی تیار ہو جائے گا۔

”وہ لڑکی ہمیں بہت معصوم لگی تھی۔ اس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مسلمان جن عورتوں کو اٹھاتے ہیں ان سے شادی کر لیتے ہیں، ہم نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس کا یہ خیال صحیح ثابت کر دیں گے۔ کسی سے اس کی شادی کرادیں گے۔ اب تم نے خود ہی عبدالرحمن کا نام پیش کر دیا۔ یہ شادی ابھی ہو جانی چاہیے کیونکہ کل صبح ہم سومات کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“

”خدیجہ اٹھو، دلہن بنو، تمہارا ڈولا اٹھنے والا ہے۔“
اگر یہ شادی غزنی میں ہوئی ہوتی تو نہ جانے کیسے کیسے انتظامات ہوتے۔ اس جنگل میں وہ انتظامات کیسے ہو سکتے تھے۔ پھر بھی اوشا کی قسمت اچھی تھی، لوٹ مار کے سامان میں دلہن کا ایک جوڑا بھی ہاتھ لگا تھا۔ عبدالرحمن نے وہ جوڑا لا کر دے دیا۔ لونڈیوں باندیوں نے اپنے زیورات کے صندوقے کھولے۔ یہ زیورات اوشا کو پہنا دیے گئے۔ باہر ایک رتھ تیار کھڑا تھا، دولہا دلہن اس رتھ میں سوار ہو گئے۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اس رتھ نے فاصلہ طے کیا اور شاہی خیمے کے سامنے پہنچا دیا۔ کنیزوں نے سہارا دے کر اسے نیچے اتارا اور گل پاشی کے بجائے کہ پھول میسر نہ تھے، سونے کے سکے نچھاور کر کے اسے محمود کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ عبدالرحمن اس کے ساتھ تھا۔

کچھ شرم، کچھ رعب شاہی۔ اوشا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک لونڈی نے چپکے سے کہا۔ ”بادشاہ کو سلام کرو۔“ اوشا منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ ہاتھوں کی کٹوری بنائی اور ماتھے تک لے گئی۔

محمود نے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ وہ اور عبدالرحمن ایک کار چوٹی تخت پر بیٹھ گئے۔ اوشا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، کتنی جلدی وہ ذرے سے آفتاب بن گئی ہے۔ یہ مسلمان لوگ کتنے اچھے ہیں۔

مولوی صاحب تشریف لے آئے تھے۔ محمود کے سامنے ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ محمود اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک قیمتی ہار اوشا کے گلے میں ڈال دیا۔

ان دونوں کو ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ صبح اوشا کی آنکھ کھلی تو عبدالرحمن اپنے بستر پر نہیں تھا۔ باہر عجیب قسم کا شور ہو رہا تھا جیسے لوگ بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ اس نے خیمے کے پردے سے باہر جھانکا۔ خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہو رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی، کیا یہ لوگ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ عبدالرحمن تو شاید جا بھی چکا ہے۔ اچانک اسے عبدالرحمن آتا دکھائی دیا۔ اس وقت وہ کوئی دوسرا ہی عبدالرحمن تھا۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا، گھوڑے پر سوار، کمر سے تلوار بندھی ہوئی، کندھے پر ترکش جس میں تیر تھے۔ وہ پردہ چھوڑ کر بستر پر آ بیٹھی۔

عبدالرحمن اندر داخل ہوا۔ ”جلدی سے غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لو۔ لشکر روانہ ہونے والا ہے۔“

”ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟“

”یہ بتانے کا حکم نہیں ہے۔“

”آپ کو معلوم ہے؟“

”مجھے تو معلوم ہے۔“

”پھر مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟“

”اس سفر کو خفیہ رکھا جا رہا ہے۔“

”مجھے بتا کر بھی خفیہ ہی رہے گا۔ بس مجھے یہ خوشی ہوگی کہ آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔“

اس بات کے بھی صرف ٹکڑے بچیں گے۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ”ہمارے مذہب میں“ اب تو میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھے بھی خوشی ہے کہ میں بت شکنی کی اس جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

خدیجہ (اوشا) غسل کرنے کے تیار ہو گئی۔ دوسری عورتوں کے ساتھ اسے بھی رتھ میں سوار کرا دیا گیا۔ عبدالرحمن گھوڑے پر سوار اپنے دستے کے ساتھ تھا لیکن کبھی بھی اس رتھ کے ارد گرد بھی چکر لگاتا تھا۔

لشکر نے سامان سفر باندھا اور روانہ ہو گیا۔ راستے میں محمود کو چند اور قلعے ملے۔ اگرچہ ان قلعوں میں بہادر سپاہی بھی تھے اور سامان جنگ کی بھی فراوانی تھی لیکن محمود کے سر پر خدا کی رحمت تھی کہ ان قلعوں میں بسنے والوں کو یہ جرأت ہی نہ ہو سکی کہ اس کے سامنے آتے۔ جنگ کرنے کے بجائے محمود کے خوف سے اپنے قلعے محمود کے سپرد کر دیے۔

ان قلعوں سے فراغت کے بعد محمود نہروالا پہنچا جسے پٹن گجرات بھی کہا جاتا ہے۔ پورا شہر بھائیں بھائیں گر رہا تھا۔ اسلامی لشکر کے خوف سے یہاں کے باشندے شہر خالی کر کے جا چکے تھے۔ محمود نے حکم دیا کہ شہر سے جتنا غلہ حاصل کر سکتے ہو لے لو۔ لشکر نے ایک ایک گھر میں جا کر دیکھا اور ذخیروں کا غلہ ہتھ لیا۔ لشکر نے تیزی کے ساتھ سفر طے کیا اور سومات پہنچ گیا۔

قلعہ سومات نہایت بلندی پر تھا اور دریا کا پانی قلعے کی فصیل تک پہنچا ہوا تھا۔ محمود کے آنے کی خبر پہنچتے ہی اہل سومات قلعے کی دیوار پر آگئے اور چلا چلا کر کہنے لگے۔

”ہمارا معبود سومات خود تم کو یہاں پہنچ لایا ہے تاکہ جو مندر اور شوالے تم اب تک برباد کر چکے ہو اس کی تم کو یہاں سزا دی جائے۔ تم اپنی فوج اور لشکر کے گھمنڈ میں یہاں تک چلے آئے مگر اب ہمارا پر ماتما تم میں سے ایک کو بھی یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔“

یہ باتیں محمود تک بھی پہنچا دی گئیں۔ اس نے بڑی بے فکری سے کہا۔

”تم بھی اپنی بات ان تک پہنچا دو۔ ان سے کہو ہمارا خدا تمہارے پر ماتما سے بڑا ہے۔ اس کا مظاہرہ کل دیکھنا جب تمہارا سومات اوندھے منہ زمین پر پڑا ہوگا۔“

دوسرے دن سلطان محمود نے قلعے کی دیواروں پر تیروں کی بارش کا حکم دے دیا۔ تیر اندازوں کا دستہ مستعدی سے دیوار کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف تیر برسانا شروع کر دیا۔

ہندوؤں نے بھی فصیل پر مورچے بنا لیے۔ جنگ کا

بہت دشمن

کر دیے۔ عبدالرحمن چونکہ اس دستے میں شامل تھا اس لیے وہ بھی تیر برسانے والوں میں شامل تھا۔ اس کی دیوانگی دیکھنے سے لعلق رکھتی تھی۔ وہ چونکہ ذاتی طور پر سلطان کا احسان مند تھا اس لیے بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اس کا کوئی نشانہ خالی نہیں جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنے ہندو اس نے جہنم واصل کیے۔ اس کے سامنے خدیجہ (اوشا) کی صورت گھوم رہی تھی جو ایسے ہی میں کسی مندر سے بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، نہ جانے کتنی اوشائیں اس مندر میں ہوں گی جنہیں نجات دلانا اس کا فرض ہے۔

تیروں کی بارش اتنی شدید تھی کہ اہل قلعہ ششدر رہ گئے۔ ادھر سے بھی آتش بازی کے بان (آگ کے گولے) اور تیر برسائے جا رہے تھے۔ ہر چند وہ بلندی پر تھے لیکن انہیں شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ پھر وہ اتنے بوکھلائے کہ دیوار سے قلعے کے اندر اتر گئے اور مندر میں پہنچ کر سومات کے بت سے لپٹ گئے۔

”ان مسلمانوں نے ہندوستان بھر کے مندروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ انہوں نے اے دیوتا تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ہم انہیں روکنے کا پورا بندوبست کر رہے ہیں لیکن جب تک تمہاری آشر باد ہمیں حاصل نہیں ہوگی ہماری جیت نہیں ہو سکتی۔ ان مسلمانوں کا منہ کالا کرو انہیں سومات سے چلتا کرو۔“

دودا سیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سومات دیوتا کو منانے کے لیے اس کے سامنے رقص کریں۔ یہ رقص رات بھر جاری رہے۔ جب دو تھک جائیں تو دوسری دو ان کی جگہ لے لیں۔

ادھر یہ ہو رہا تھا دوسری طرف مسلمان بہت سی بیڑھیاں لگا کر قلعے کے ایک حصے پر چڑھ گئے۔ نعرہ بکبیر کی آوازوں سے قلعہ گونج اٹھا۔ اس وقت تک رات ہو چکی تھی اس لیے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ قلعے کے اندر داخل ہوا جائے۔

اسلامی لشکر اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آ گیا۔ مندر میں عبادت ہوتی رہی۔ اسلامی لشکر سر نیاز جھکائے فتح کی دعائیں مانگتا رہا۔

دوسرے دن جب آفتاب طلوع ہوا اور ذرا دن چڑھا تو محمود غزنوی سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق گھوڑے پر سوار جھنڈا اٹھائے میدان جنگ میں آکھڑا ہوا۔

ہندوؤں نے بھی فصیل پر مورچے بنا لیے۔ جنگ کا

بہت دشمن

بگل بجا اور دونوں طرف سے تیر برسائے جانے لگے۔ ان تیروں کی آڑ میں محمود اپنے خاص دستے کو لے کر آگے بڑھنے لگا۔

اس کثرت سے تیر برس رہے تھے کہ ہندوؤں نے بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد فصیل چھوڑ دی۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں چھپ گیا۔ پنڈت اور پروہت سومات کے آگے دعائیں مانگ رہے تھے۔

مسلمانوں نے فصیل صاف دیکھی تو سیدھیاں لگا کر اوپر چڑھ گئے۔ نعرہ بکبیر کی آوازوں سے قلعہ گونج رہا تھا۔ ان نعروں نے غصے کی آگ کو ایسا بھڑکایا کہ تلواریں سونت کر اندر آنے والے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، دونوں طرف سے شمشیر زنی کے جوہر دکھائے جانے لگے۔ راجپوتوں نے ایسی بہادری دکھائی کہ مسلمان لشکر کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ تلواریں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ اندھیرے نے دونوں لشکروں کے درمیان حد فاصل سمجھ دی۔

دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔ دونوں طرف سنائے کا عالم تھا۔ قلعہ والے قلعہ بند بیٹھے تھے۔ محمود سنان جنگل میں پڑا تھا۔ دودن کی زور آزمائی نے محمود کو ناامید کر دیا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا کہیں نہ کہیں سے کمک آجائے گی۔ یہ اندیشہ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ قلعہ والوں نے ٹھاکروں اور راجاؤں کے پاس قاصد دوڑا دیے تھے کہ دھرم کی حفاظت کے لیے جلدی آؤ اور مسلمانوں کو کاٹ کر رکھ دو۔

آدھی رات ادھر آدھی ادھر ہو چکی تھی۔ محمود کچھ دیر کے لیے سو رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ یہ کوئی وقت نہیں تھا لیکن صبح سر پر کھڑی تھی۔ اس نے سرداران لشکر کو بلوا بھیجا۔

محمود ان سے مخاطب ہوا۔ ”جس طرح ممکن ہو اس لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جس قدر دیر ہوگی دشمن پر ہماری ہیبت کم ہو جائے گی۔ یہ امکان بھی رہے گا کہ دشمن کو کمک ملتی رہے۔ ہم ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں، ہمیں کوئی کمک نہیں پہنچا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے لشکر میں بھی بے دلی پھیلے گی۔ اب تک ہماری فوج بہ آسانی فتح کی عادی ہو گئی ہے جبکہ اسے سومات میں مزاحمت کا سامنا ہے۔ ہمیں کل ہر حال میں قلعہ فتح کرنا ہے۔“

لشکر میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں تھی۔ کچھ جاگ رہے تھے کچھ سو رہے تھے۔ جو جاگ رہے تھے سخت ہراساں تھے، گھروں سے ہزاروں میل دور تھے۔ بال بچوں

”اگر بادشاہ سلامت ہمارے بت کو نہ توڑیں تو ہم اس کے بدلے منہ مانگی دولت دینے کو تیار ہیں۔“ محمود نے غصے میں بھرا جواب دیا۔ ”اگر میں اس بت کے بدلے میں دولت وصول کروں تو بت فروش کہلاؤں گا، میں تاریخ میں بت شکن کے نام سے زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لیے میں اس بت کو ضرور توڑوں گا۔“ محمود کے ہاتھ میں اس وقت ”گرز“ تھا۔ اس گرز سے اس نے کاری ضرب لگائی۔ اس بت کا منہ ٹوٹ گیا۔ یہ بت کھوکھلا تھا۔ دوسری ضرب نے اس کا چھلا دھڑکڑے کھڑے کر دیا۔ محمود کی نیک نیتی اس وقت رنگ لائی جب اس بت کے پیٹ سے ان گنت اور بیش قیمت جواہر اور اعلیٰ درجے کے موتی نکلے۔ ان سب جواہرات کی قیمت برہمنوں کی پیش کردہ رقم سے سو گنا زیادہ تھی۔ محمود نے حکم دیا کہ اس بت میں سے پتھر کے دو ٹکڑے کاٹ کر الگ کیے جائیں اور غرنی بھجوائے جائیں۔ ان میں سے ایک ٹکڑا جامع مسجد کے دروازے پر اور دوسرا ایوان سلطنت کے صحن میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ سومنات کے بت سے دو اور ٹکڑے الگ کر کے مکہ اور مدینہ بھیجے گئے تاکہ انہیں عام راستے میں رکھ دیا جائے اور لوگ انہیں دیکھ کر سلطان محمود کی جرأت و ہمت کی داد دیں۔ بت کو توڑنے سے قبل معززین سلطنت (محمود کے امرا) نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ برہمنوں کی درخواست قبول کر لی جائے اور اس کے عوض منہ مانگی رقم وصول کر لی جائے۔ بت کو توڑ ڈالنے سے نہ تو بت پرستی کی رسم اس شہر سے مٹ سکتی ہے اور نہ ہمیں کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر ہم معاوضے میں کوئی رقم وصول کر لیں گے تو اس سے غریب مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔ اگر محمود اس وقت ان کی بات مان لیتا تو تاریخ اسے بت فروش کے نام سے یاد کرتی، بت شکن کوئی نہ کہتا۔ لفظ سومنات کی حقیقت کیا ہے؟ تمام مورخین متفق ہیں کہ ”سومنات“ اس مخصوص بت کا نام تھا جسے ہندوستان کے تمام باشندے بتوں کا سردار مانتے ہیں۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار کے قول کی رو سے یہ دو لفظوں کا مرکب ہے ”سوم“ اور ”نات“ سوم مندر کا نام ہے اور نات بت کا۔ مورخ فرشتہ کا قول ہے کہ ”سوم“ اس راجا کا نام ہے جس نے یہ بت بنایا اور ”نات“ اس بت کا نام۔ کثرت

پورے میدان میں گونج رہی تھی۔ اس تقریر نے ایسا اثر کیا کہ جھکی ہوئی کمریں تن گئیں۔ ایک جان اور بے خوف ہو کر ایسا حملہ کیا کہ پانچ ہزار کی فکری کا دم بھر میں صفایا کر دیا۔ دشمن کی صفوں میں ہچکچاہٹ مچ گئی۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے، سپاہی اور پجاری جن کی تعداد چار ہزار تھی، اپنی جان بچا کر دریا کی طرف بھاگے اور کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرہ سراندیب کی طرف روانہ ہوئے، محمود نے پہلے ہی ان فراریوں کا انتظام کر رکھا تھا اور کشتیوں میں مسلمان لشکر کے چھوٹے چھوٹے دستے بٹھا کر ان کشتیوں کو دریا میں چھوڑ رکھا تھا لہذا جس وقت ہندو کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرہ سراندیب کی طرف روانہ ہوئے، اسی وقت مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا اور دشمن کی کشتیوں کو غرق کر دیا۔ مدد کو آنے والے کچھ لشکری خشکی کے راستے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کا بھی دور تک تعاقب کیا لیکن اصل مقصد ان کا تعاقب نہیں تھا لہذا لوٹ آئے۔ اس فتح کو دیکھ کر قلعہ والوں کی رہی سہی آس ٹوٹ گئی۔ جب ہندوؤں کی طرف سے پوری طرح اطمینان ہو گیا تو سلطان محمود اپنے بیٹوں اور امرا کو ساتھ لے کر قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک اندرونی راستہ بت خانے کی طرف جاتا تھا۔ وہ بت خانے میں پہنچا۔ اس عظیم الشان بت خانے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مندر کی چھت چھین ستونوں پر قائم تھی اور ہر ستون سنگ مرمر کا تھا اور جواہرات سے مرصع تھا، عین درمیان میں سونے کی جڑاؤ زنجیر لٹکی تھی۔ اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات جلتا تھا۔ پتا نہیں کب سے روشن تھا جسے آج مسلمانوں کے ہاتھوں گل ہونا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں گانے بجانے والی عورتوں کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی اور مرد سازندے تین سو کے قریب تھے۔ تقریباً تین سو حجام پجاریوں کے سر اور ڈاڑھیاں مونڈنے کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔ ہندوستان کے راجے، مہاراجے اپنی کنواری لڑکیوں کو سومنات کی خدمت کے لیے بھیج دیتے تھے۔ محمود نے بت خانے کی وسعت اور سج دھج دیکھنے کے بعد نظر ڈالی تو دروازے کے سامنے سومنات رکھا نظر آیا۔ اس بت کی لمبائی پانچ گز تھی جس میں دو گز زمین کے اندر اور تین گز اوپر تھا۔ یہ بت پتھر کا بنا ہوا تھا۔ مندر کا بڑا پجاری ہاتھ جوڑ کر محمود کے سامنے آیا۔

لڑنا چاہتے ہو تو ہم سومنات سے فارغ ہو لیں، اس کے بعد دودھ ہاتھ کر لیتا۔“ ادھر سے جواب آیا۔ ”قلعہ والے اور ہم جدا جدا نہیں۔ ان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔ ہم ان کی مدد کو آئے ہیں۔ ہماری بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں، تم قلعے کا محاصرہ ختم کر کے چلے جاؤ، ہم بھی واپس چلے جائیں گے۔“ اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے فوج کے ایک بڑے حصے کو قلعے کے محاصرہ سے واپس بلا لیا اور اس بیرونی لشکر سے دفاع کے لیے نبرد آزما ہو گیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ میدان جنگ میں خون کی ندیاں بہنے لگیں، تیر و تفتنگ سے موت کے پیام و سلام ہونے لگے۔ ایک طرف سے پھر ویسا ہی غبار اٹھا۔ ایک لشکر اور آگیا تھا۔ معلوم ہوا نہروالا کا راجا ”پرمدیو“ ہے جو اپنے ہم مذہبوں کی مدد کو آپہنچا ہے۔ اس لشکر کو دیکھ کر ترکوں اور افغانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خود محمود بھی ایسا بھی نہیں گھبرا یا تھا جیسا اس وقت گھبرا گیا تھا۔ اس نے فوراً قلعہ والی فوج کو پیغام بھیجا کہ قلعہ کا چھپا چھوڑو اور ہماری خبر لو۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے لشکر میں بددلی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ گھوڑے سے کودا اور ایک گوشے میں جا کر حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی کی مقدس عبا کو ہاتھ میں لیا اور سجدے میں گر گیا۔ گریہ وزاری کرتا رہا اور دعائے فتح مانگتا رہا۔ یہ وہی کرتہ تھا کہ جب اس نے خرقان میں شیخ ابوالحسن سے ملاقات کی تھی اور شیخ نے نشانی کے طور پر اپنا کرتہ دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک محمود اس کرتے کو سرفروں میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس وقت وہ اسی کرتے کا واسطہ دے کر دعا بر لب تھا۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد وہ چیخ چیخ کر اپنے لشکر کو مخاطب کر رہا تھا۔ ”یاد رکھو، اگر ہم بھاگے تو خراسان و ترکستان تک نہیں پہنچ سکیں گے، راستے ہی میں قتل کر دیے جائیں گے۔ بھاگ کر مرنے سے بہتر ہے کہ میدان جنگ میں کام آ جاؤ۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ ہم اس کے دین کے لیے سینہ سپر ہیں، وہ ہماری ضرورت مدد کرے گا۔ اٹھو اور اپنے دست و بازو پر اعتماد کرو، غازی ہو یا شہید۔ میں نے ابوالحسن خرقانی کا واسطہ دے کر دعا کی ہے۔ تمہیں ضرور فتح ملے گی۔“ وہ گھوڑا دوڑاتا بھی ایک طرف نکل جاتا اور یہ پیغام پہنچاتا جاتا، دوسری طرف نکل جاتا۔ اس کی آواز

کی یاد ستارہ تھی۔ بعض تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر لوٹ مار کا لالچ نہ ہوتا تو کیوں اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔ امرا نے حکم ملتے ہی فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ پورے لشکر کی ترتیب ہوئی۔ ڈیرے ڈیرے میں حکم پہنچ گیا کہ صبح نور کے تڑکے قلعے پر دھاوا ہوگا۔ ادھر شہنشاہ مشرق نے تخت افلاک کی پہلی سیزم پر قدم رکھا اور شہنشاہ غرنی نے اسلحہ جسم پر سجاتے ہی سواری کا حکم دیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی، جنگ کا پھر پرابلند ہوا۔ قلعے میں بھی تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ پجاری، راجپوت، برہمن دھاوے کا غل سن کر گھبرا گئے۔ پہلے تو سب مندر کی طرف دوڑے۔ بت سے لپٹ کر زار و قطار روتے تھے اور فتح کی دعائیں مانگتے تھے۔ کسی نے خبر دی کہ مسلمانوں نے سیزمیاں لگائی ہیں۔ قلعہ خطرے میں ہے۔ وہ لشکر جو قلعے کے آس پاس جمع تھے اہل قلعہ کی مدد کے لیے مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئے۔ محمود نے اپنی فوج کے ایک بڑے حصے کو قلعے کے محاصرے سے واپس بلایا اور اسے ساتھ لے کر اس بیرونی لشکر سے نبرد آزما ہوا۔ زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ میدان جنگ میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ سومناتی بڑی تعداد میں قتل ہو رہے تھے لیکن مذہبی جذبہ اس قدر غالب تھا کہ ایک لمحے کو پیچھے ہٹنا گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تھا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا کہ لو اب مجھے مارو۔ جنگ اپنی گری پر تھی کہ ایک طرف سے غبار اٹھتا نظر آیا۔ تجربہ کار محمود نے بھانپ لیا کہ کوئی راجا ہے جو اپنے لشکر کے ساتھ اہل قلعہ کی مدد کو آپہنچا ہے۔ اس نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور ایک ہرکارہ غبار کی جانب دوڑایا کہ پتا کرو، یہ کیسا لشکر ہے۔ ہرکارہ دوڑا اور واپس آ کر خبر سنا دی کہ واشلم نامی راجا اپنے لشکر کے ساتھ بس پہنچے ہی والا ہے۔ ”خبردار! لشکر میں یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔“ محمود نے ایک دستہ ساتھ لیا اور آنے والے سے مقابلے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کی فوج اہل قلعہ سے مصروف جنگ تھی۔ کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ محمود دائیں طرف کھینچتے ہوئے کس طرف غائب ہو گیا۔ محمود نے آنے والے راجا کو راستے ہی میں جالیا۔ اسے پیغام بھیجا۔ ”ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر پھر بھی تم ہم سے

استعمال سے یہ دونوں لفظ آپس میں مل کر سومات ہو گئے بلکہ یہاں تک ہوا کہ اس شہر کا نام ہی سومات ہو گیا۔ تات کے معنی ہندی زبان میں بزرگ یا بڑے کے ہیں۔ جب بھی سورج کہن یا چاند کہن ہوتا تھا تو اس مندر میں تقریباً دو لاکھ تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے بڑی تعداد دور دراز کے علاقے کے لوگوں کی ہوتی تھی جو مرادیں مانگنے اور نذرین چڑھانے آتے تھے۔ ہندوستان کے راجا اس مندر کے اخراجات کے لیے وقتاً فوقتاً گاؤں اور قصبے وقف کرتے رہتے تھے۔ جس وقت سلطان محمود نے اس پر حملہ کیا تھا اس وقت تقریباً دو ہزار قصبوں کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے وقف تھی۔ دو ہزار برہمن پوجا پاٹ کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

مصنف تاریخ فرشتہ کا بیان ہے۔ ”اس مندر سے سلطان محمود کو جو اعلیٰ درجے کے جواہرات اور سونا چاندی ہاتھ لگا وہ اس قدر زیادہ تھا کہ اس کا دسواں حصہ بھی اس سے پہلے کسی بادشاہ کے خزانے میں جمع نہ ہوا ہوگا۔“ تاریخ ”زین المائر“ میں لکھا ہے کہ مندر کی وہ مخصوص جگہ جہاں ”سومات“ رکھا ہوا تھا بالکل تاریک تھی اور وہاں جو روشنی پھیلی ہوئی تھی وہ دراصل اعلیٰ درجے کے جواہرات کی شعلیں تھیں۔ یہ جواہرات مندر کی قدیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔ اسی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ سومات کے خزانے سے سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے بت اتنی بڑی تعداد میں برآمد ہوئے کہ ان کی قیمت کا اندازہ تقریباً ناممکن ہے۔

جب سلطان محمود سومات کی غارت گری سے فارغ ہو چکا اور اس کے اراکین سلطنت نے انتظامات سنبھال لیے تو محمود کو نہروالا کے راجا پریم دیو کا خیال آیا۔ یہ وہی راجا تھا جس نے سومات کی مدد کے لیے لشکر روانہ کیا تھا اور دو تین ہزار مسلمان شہید کر دیے تھے۔ اس سے انتقام لینا ضروری تھا اور نہ محمود کے غزنی روانہ ہوتے ہی وہ پھر سر اٹھا سکتا تھا۔ راجا پریم دیو کو بھی خدشہ تھا کہ محمود اس سے انتقام لینے ضرور آئے گا اس لیے وہ نہروالا چھوڑ کر ”کندھ“ کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ سومات سے ”کندھ“ کا فاصلہ چالیس کوس تھا۔ محمود نے اس فاصلے کو گھوڑوں کی ”سموں“ سے باندھا اور کندھ جا پہنچا۔

جب مسلمانوں کا لشکر ”کندھ“ کے قلعے کے قریب پہنچا تو وہاں ایک بہت بڑی خندق نظر آئی۔ یہ خندق قلعے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھی۔ اس خندق میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ خندق کی گہرائی کتنی ہے۔ خندق کو پار کر کے ہی قلعے تک پہنچا جاسکتا تھا لیکن خندق کو پار کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ آخر غوطہ خور اتارے گئے کہ گہرائی کا پتا لگائیں اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں گہرائی نسبتاً کم ہو۔ خندق کی گہرائی اتنی تھی کہ تھاہ نہیں ملتی تھی۔ سارے غوطہ خور زمین کو ہاتھ لگائے بغیر ہی واپس آ گئے۔ پھر ایک غوطہ خور نے ایک ایسی جگہ کا پتا چلا لیا جہاں گہرائی اتنی تھی کہ خندق پار کی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود محمود اپنے لشکریوں کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ سامنے قلعے کی دیواریں چمک رہی تھیں اور وہ بے بس خندق کے اس طرف کھڑا تھا۔ محمود کے ارادوں میں جو چیز مانع تھی وہ یہ تھی کہ غوطہ خوروں نے یہ انتباہ کیا تھا کہ اگر خندق عبور کرتے ہوئے پانی میں پھسل پیدا ہوئی تو پورا لشکر تباہ ہو جائے گا۔ اس بحث و تحقیق میں کئی دن گزر گئے تھے۔ اس کے امرائے سلطنت بھی دو حصوں میں بٹ گئے تھے، کچھ کا خیال تھا کہ خطرہ مول لے لیا جائے، کچھ کہتے تھے یہ کوئی ایسی لازمی مہم نہیں واپس چلا جائے۔ محمود اس خیال سے قطعی متفق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو ہم یہاں تک آئے نہ ہوتے۔ جب آ گئے ہیں تو واپس جانا نامردی ہے۔ دشمن کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔

اس نے اعلان کیا کہ وہ قرآن کریم سے استخارہ کرے گا، اگر اجازت مل گئی تو پھر سب کو اس کے ساتھ خندق پار کرنا ہوگی۔

قرآن کریم سے استخارہ کیا اور اجازت ملنے پر خدا کی ذات بابرکات پر بھروسہ کر کے اس نے اپنے امیروں اور لشکریوں کے ہمراہ اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔ یہ لشکر خدا کی رحمت سے صحیح سلامت پارا تر گیا۔ خندق پار کرنے کی دیر تھی۔ پریم دیو یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا جو قوم اس عظیم الشان خندق کو پار کر سکتی ہے اس سے وہ کتنی دیر لڑ سکے گا۔ جو وہ سوچے بیٹھے تھا، اس پر عمل کر گزرا۔ اس نے ہمیشہ بدلا اور مسلمانوں کی نظروں سے بچ بچا کر فرار ہو گیا۔ راجا پریم دیو کے فرار ہوتے ہی اہل قلعہ نے دروازے کھول دیے اور مسلمان اندر داخل ہو گئے۔ اندر

جا کر عقدہ کھلا کہ راجا یہاں سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ پریم دیو کے خزانے کے سوا محمود کو کچھ نہ مل سکا۔ سلطان محمود نے قلعہ کندھ کو فتح کرنے کے بعد نہروالا کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ راجا پریم دیو کندھ سے بھاگ کر یہاں آیا ہوگا لیکن یہاں محمود کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ راجا تو اسے نہ مل سکا لیکن نہروالا کی شادابی اور خوب صورتی نے محمود کو خرید لیا۔ ایسا سرسبز علاقہ اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دولت کی فراوانی تھی۔ جلد ہی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں خالص سونے کی کانیں ہیں۔ چند روزہ کر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بہترین ہے۔

چند دن کے قیام کے بعد وہ ان خطوط پر سوچنے لگا کہ وہ اس علاقے کو اپنی سلطنت کا مرکزی مقام بنالے اور غزنی کی حکومت سلطان مسعود کے حوالے کر دے۔ جب یہ خیال اچھی طرح اس کے دل میں راسخ ہو گیا تو اس نے چند امیروں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا۔ ان امیروں کے ذریعے یہ بات دوسرے امیروں تک پہنچی۔ انہیں فکر ہوئی کہ اگر سلطان اس فیصلے پر عمل کر بیٹھا تو غزنی دیکھنا انہیں کبھی

نصیب نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ پہلا موقع تھا جب محمود کے امیروں نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ ایک روز سلطان اپنی مجلس میں بیٹھا تھا کہ اس نے یہ تذکرہ سب کے سامنے پھیر دیا۔

”نہروالا کی شادابی، یہاں کے باشندوں کا حسن و جمال، محل وقوع وغیرہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں اسے اپنی مملکت کا دار السلطنت بنا لوں اور غزنی شہزادہ مسعود کے حوالے کر دوں۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟“ اب تک امرانے یہ باتیں صرف سنی تھیں مگر اب محمود خود ان سے کہہ رہا تھا۔ نہ صرف کہہ رہا تھا بلکہ ان کی رائے بھی طلب کر رہا تھا۔ اب خاموش رہنا بعید از مصلحت تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے مخالفت کی۔ اس مخالفت کا لب لباب یہ تھا۔

”ہم نے خراسان کو ایک عرصہ بعد خس و خاشاک سے پاک کیا ہے اور اس گراں قدر جواہر پر بہت سی جانیں قربان کی ہیں لہذا ان قربانیوں کے پیش نظر اس ہر دلچیز شہر کو چھوڑ کر گجرات کو دار السلطنت بنانا دور اندیشی نہیں۔“ سلطان اس کے بعد بھی کوشش کرتا رہا کہ اراکین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عید کی پرجوش ساتتیں
جاسوسی کی نئی نئی ساتتیں
نومبر 2012ء

آخری منزل • نئی نسل کے عزم اور حساسیت کا جواگر کرتی ایک نئی نسل کا جادو

مغرب کے نالے انداز • مغربی دنیا کی تہذیبی ماحول کی عکاسی اور محبت کی پڑوہ ناقابل فراموش کہانیاں

گرداب • واقعات کے نئے رنگ و بام میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ

لکار • محبت کی جلی شعلیں انتقام کے بھڑکنے شعلے طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز تحریر

سرورق کی کہانیاں

زمین کی گہرائی سے آسمان کی بلندیوں کو چھونے کا عزم رکھنے والے

دہنوں کی حیرت انگیز فتنہ انگیزیاں **امجد جاوید** کے خیال کی پرواز

اس سفر کی روداد... جس میں تقدیر نے دھوپ ہی دھوپ لکھ

دی گئی **احمد اقبال** کی پرمزاح و پرکشش تحرییر

آپ کے تہرے...
مشوئے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا نہیں

دولت کسی طرح اس کی بات مان لیں لیکن کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان سب کو غزنی چھوڑے دو سال ہو چکے تھے۔ ہر فرد چاہتا تھا کہ جلد از جلد غزنی چلا جائے۔ اب تو یہ باتیں بھی محمود کے کانوں میں پڑنے لگی تھیں کہ بہت سے لوگ فرار ہو کر غزنی جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ محمود کو بالآخر اپنا یہ ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔

روانگی سے قبل اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جسے یہاں کا حکمران بنا کر وہ غزنی چلا جائے اور یہ حکمران اسے سالانہ خراج ادا کرتا رہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہوا تھا کہ اس کا اپنا کوئی امیر یہاں کا حکمران بننے کو تیار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سلطان نے سومنات کے شہریوں سے بھی مشورہ کیا۔ ان معزز شہریوں نے ایک شخص کی نشاندہی کی جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور محمود کے خوف سے برہمن کا روپ بدل کر عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ وہ چونکہ راجا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے نہروالا کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی ہوگا۔ اس کا نام داکشیم مرتاض ہے۔ محمود نے حکم دیا کہ اس شخص کو پیش کیا جائے۔

وہ شخص عبادت خانے میں برہمن بنا بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ اسے بلانے کے لیے پہنچ گئے۔ مرتاض کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بھی سمجھا ہوگا کہ بھانڈا پھوٹ گیا اور اب اسے اس جرم میں قتل کر دیا جائے گا کہ وہ راجا نہروالا کا رشتہ دار ہے۔ اس نے محمود کے دربار میں آتے ہی اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی۔

”اے مسلمانوں کے بادشاہ، میں راجا کا قریبی رشتہ دار ضرور ہوں لیکن اس کا ساتھی نہیں ہوں اور نہ اس ملک پر کسی قسم کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ آپ کے خلاف بھی نہیں ہوں۔ ایک کونے میں بیٹھا عبادت کر رہا ہوں، پھر مجھے کیوں قتل کرتے ہو، تم کہو تو میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں۔“

”یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے تجھے قتل کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”پھر تمہیں مجھ سے کیا کام۔“

”ہم اس ملک پر حکومت کرنے نہیں آئے ہیں۔ دو سال ہوئے اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہیں یہاں کا حکمران بناؤں۔ تم مجھے سالانہ خراج ادا کرتے رہو گے تو میں تمہارے معاملات میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔“

وہ شخص کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے یہ پیشکش

قبول ہے۔ میں آپ کا ہمیشہ وفادار رہوں گا لیکن چلتے چلتے آپ میرا ایک کام کر دیں۔“

اس نے بتایا کہ اس کا ایک ہم قوم فلاں ملک کا راجا اس کا جانی دشمن ہے۔ وہ محمود کے جاتے ہی نہروالا پر حملہ کر دے گا اگر محمود اس کی شرارتوں سے اسے مطمئن کر دے تو خراج سے دگنی رقم شاہی خزانے میں جمع کرائے گا۔ محمود نے اس کے دشمن کے ملک پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر کے مرتاض کے پاس لے آیا۔

”تیرا دشمن تیرے سامنے ہے۔ چاہے تو اسے قتل کر دے تاکہ تو ہمیشہ کے لیے اس کی شرارتوں سے محفوظ ہو جائے۔“ محمود نے نئے حکمران مرتاض سے کہا۔

”ہمارے مذہب میں کسی بادشاہ کو قتل کرنا جائز نہیں۔“ مرتاض نے بتایا۔ ”ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جب ایک راجا دوسرے راجا کو شکست دے کر گرفتار کر لیتا ہے تو فاتح اپنے تخت کے نیچے ایک کٹھری بنا کر مفتوح راجا کو اس میں قید کر دیتا ہے۔ اس کٹھری کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا، دیوار میں ایک سوراخ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے اسے روٹی پانی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ یہ قید اس وقت تک رہتی ہے جب تک فاتح کا انتقال نہ ہو جائے۔“

”جو تمہاری رسم ہے اسے پورا کرو، یہ تمہارے اختیار میں ہے اسے قید کر دو۔“

”مجھے خدشہ ہے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد اس کے ہمدرد علم بغاوت بلند کریں گے اور اسے چھڑا کر لے جائیں گے۔ میری حکومت کی بنیادیں ابھی اتنی مضبوط نہیں کہ میں اس قیدی کی حفاظت کر سکوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے میرے پاس چھوڑنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جائیں۔ جب میری حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی تو میں اسے اپنے پاس بلا لوں گا۔“

سلطان نے اس کی یہ درخواست بھی قبول کر لی۔

اب محمود کو واپسی کا سفر درپیش تھا۔ وہ پورے ڈھائی سال کے بعد اپنے وطن غزنی لوٹ رہا تھا۔ عین موقع پر اسے یہ اطلاع ملی کہ راجا پرمدیو اور راجا اجیر نے ایک لشکر جرار تیار کر لیا ہے اور گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ واپسی میں اس پر حملہ کریں۔ محمود اس وقت کسی جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ راستہ بدل کر سندھ کے جنگلوں سے گزرتا ہوا ملتان کی طرف نکل جائے گا۔

یہ راستہ چونکہ اس کے لیے اجنبی تھا اس لیے اس نے ایک ہندو راہبر کی خدمات لیں جس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس

راستے سے بخوبی واقف ہے۔

لشکر نے سامان سفر باندھا۔ ہزاروں گھوڑوں اور سیکڑوں اونٹوں پر مشتمل یہ قافلہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ ہندو راہبر کو ایک مرتبہ پھر محمود نے اپنے سامنے بلایا اور اس سے سفر کے لیے ضروری انتظامات کے بارے میں بات کی، راہبر نے بتایا کہ پانی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

”جس راستے سے میں آپ کو لے جا رہا ہوں وہاں پانی کی بہتات ہے اور پھر چونکہ جنگل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے اس لیے سفر زیادہ طویل بھی نہیں ہوگا۔ بس اتنا پانی ساتھ لے لیں کہ اگر کسی جگہ پانی نہ ملے تو ضرورت پوری ہو جائے۔“

محمود نے اس کی بات مان لی اور چند اونٹوں پر یہ قدر ضرورت پانی ساتھ لے لیا۔ ایک دن اور ایک رات یہ قافلہ میدانی سفر کے بعد جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل ایسا گھنا تھا کہ دن میں اندھیرا رہتا تھا۔ راہبر نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو دن بعد ہم اس جنگل سے نکل جائیں گے۔ اس کی بات اس حد تک درست بھی تھی کہ جنگل میں پانی میسر تھا۔ دو دن گزرے پھر تیسرا دن ہوا، پھر چوتھا دن آ گیا۔ اب دور دور تک پانی بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ساتھ لائے ہوئے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ایک ایسے جنگل میں داخل ہو چکے تھے جہاں سپاہیوں کو ایک دن اور ایک رات پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہو سکا۔ ہر طرف بے چینی تھی۔ گلے خشک ہو گئے تھے، موت قریب نظر آنے لگی تھی۔ اب لوگوں کو شک ہونے لگا تھا کہ راہبر نے جان بوجھ کر انہیں بھٹکا دیا ہے۔

محمود نے یہ عالم دیکھ کر اس ہندو راہبر سے پوچھا۔ ”تو نے راہبری کا وعدہ کیا تھا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تو خود راستہ بھول گیا ہے۔ آخر تو لشکر کو کس طرف لے جا رہا ہے۔“

”کیا آپ اب بھی نہیں سمجھتے کہ میں لشکر کو کس طرف لے جا رہا ہوں؟“

”اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تو نے ہمیں بھٹکا دیا ہے۔ اپنی جان کی خیر چاہتا ہے تو ہمیں ٹھیک راستے پر لے چل۔“

”اگر ٹھیک راستے پر لانا ہوتا تو یہاں لاتا ہی کیوں۔ جو کام بڑے بڑے راجا نہ کر سکے وہ میں نے کر دکھایا۔ اب اگر تم اپنی تمام دولت بھی مجھے دو تو بھی صحیح راستہ نہیں دکھاؤں گا۔“

”تجھے مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“

”میں سومنات کے جاں نثاروں میں سے ہوں۔ میں

آپ کی فوج کو جان بوجھ کر اس جنگل میں لایا ہوں جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ سومنات کو برباد کرنے والے اس جنگل میں تباہ ہو جائیں گے۔ اب آپ مجھے قتل بھی کرادیں تو بھی اس جنگل سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔“

محمود اتنے طیش میں تھا کہ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ راہبر کو قتل کرادے گا تو وہ آخری سہارا بھی ختم ہو جائے گا جو اسے اس جنگل سے نکالنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے اس ہندو راہبر کو قتل کرادیا۔

اسی رات کو محمود اپنے لشکر سے الگ ہو کر ایک گوشے میں آیا اور سر نیاز کو خاک پر رکھ کر خداوند تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ مسلمانوں کو جلد از جلد اس بلائے ناگہانی سے نجات دے۔ رات ابھی تھوڑی گزری تھی کہ شمال کی جانب ایک روشنی نظر آئی۔ یہ عجیب بات تھی، اس تاریک جنگل میں روشنی کیسی! سلطان محمود نے اس روشنی کو غیبی اشارہ سمجھا اور اس نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔

”جس طرف روشنی دکھائی دے رہی تھی اسی طرف چلتے رہو۔“

یہ لشکر تمام رات چلتا رہا آخر کار صبح کے وقت وہ ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ ایک دن اور ایک رات کا پیاسا لشکر پانی پر ٹوٹ پڑا، خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

اس مصیبت سے نجات ملی تو لشکریوں کی جان میں جان آئی اور محمود نے کامیاب و کامران غزنی میں قدم رکھا۔ اس کے آنے کی دعوم پچی تو قادر باللہ خلیفہ بغداد نے اس کے نام تہنیتی خط لکھا اور خراسان، ہندوستان، نیم روز اور خوارزم کے جھنڈے بھیجے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ ان علاقوں کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ اس کے بیٹوں اور بھائیوں کے لیے اس خط میں خطابات بھی لکھے تھے۔ سلطان محمود کو کھف الدولہ والا سلام کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

اس خط میں یہ صراحت بھی کی گئی تھی کہ تو جس کو اپنا ولی عہد مقرر کرے گا ہم بھی اس کو قبول کریں گے۔ محمود اس وقت بلخ میں تھا جب اسے یہ خط ملا۔ اس نے اسی وقت تمام مفتوحہ ممالک میں ان خطابات کا اعلان کرادیا۔

اسی سال سلطان نے ہندوستان پر اپنا آخری اور ستر ہواں حملہ کیا۔ یہ حملہ ہندوستان کے جاٹوں کو سزا دینے کے لیے تھا۔

جب سلطان سومنات کی فتح کے بعد اپنے وطن لوٹ رہا تھا تو اس قوم نے سلطانی لشکر کو روکنے کی کوشش کی تھی اور مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس وقت وہ تھکا ہارا

اور جلدی میں تھا لیکن اب اس قوم سے بدلہ لینا ضروری ہو گیا تھا ورنہ سلطان کا رعب اس پر سے جاتا رہتا۔
یہ قوم کوہِ جوڈی کے دامن میں دریا کے کنارے آباد تھی۔
سلطان نے فوج کشی کا اعلان کیا تو لوگ جوق در جوق اس کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس کے ساتھ جانے کا مطلب مالِ غنیمت کی فراوانی تھی لہذا اسے لشکر جمع کرنے میں کبھی دقت نہیں ہوئی۔

وہ منزلیں طے کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ اس نے یہاں پہنچ کر چودہ سو کشتیاں بنانے کا حکم دیا۔ کاریگروں کو بتا دیا کہ کشتیاں اس طرح بنائی جائیں کہ ہر کشتی میں تین سلاخیں نصب کی جائیں۔ ایک سلاخ کشتی کے سامنے کی طرف اور دوسری کشتی کے دونوں اطراف لگا دی جائیں۔ کاریگر حیران تھے کہ ان خاص کشتیوں کو بنوانے کا مقصد کیا ہے۔ یہ سلاخیں آخر کس مقصد کے لیے لگائی گئی ہیں۔

جب یہ کشتیاں تیار ہو گئیں اور دریا میں اتار دی گئیں تو سلطانی حکم سے ہر کشتی میں بیس آدمی بٹھائے گئے۔ یہ آدمی تیرکمان سے مسلح تھے اور کشتیوں میں بارود رکھا گیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بحری جنگ تھی۔

یہ چودہ سو کشتیاں ایک ساتھ دریا میں آگے کی طرف چلیں۔

جانوں کو اس لشکر کی آمد کی خبر مل چکی تھی لہذا انہوں نے بھی مقابلے کی تیاری کی۔ اپنے بال بچوں کو جزیروں میں بھیج دیا اور خود تنہا مقابلے پر آئے۔ وہ بھی کشتیوں میں سوار تھے، ہر کشتی میں سب سے دستہ بیٹھا ہوا تھا۔

دونوں فوجیں دریا میں ایک دوسرے کے سامنے آئیں۔ سلطان کی حکمت عملی کا راز اب کھلا کہ اس نے کشتی میں سلاخیں کیوں لگوائی تھیں۔ جانوں کی جو کشتی بھی مسلمانوں کی کشتی کے سامنے آتی، آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی۔ جاٹ حیران ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کی کشتیوں میں آخراہی کیا بات ہے کہ ہماری جو کشتی بھی ان کے قریب پہنچتی ہے غرق ہو جاتی ہے۔ اسی حیرانی میں ان کی ہر کشتی ایک ایک کر کے ڈوب گئی۔ جو لوگ ڈوبنے سے بچ گئے اور دریا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھے گئے، انہیں مسلمانوں نے اپنی تلواروں سے ختم کر دیا۔

ان سب کو ختم کرنے کے بعد مسلمانوں کا لشکر دشمن کے پس ماندگان کی طرف روانہ ہوا اور ان سب کو قید کر لیا اور ہنگامہ تھا ہوا غزنی لے آیا۔

یہ 417 ہجری 1026 عیسوی کا سال تھا۔

۳۳۳

داشلم مر تاض جس کو محمود نہروالا کی حکمرانی پر چھوڑا تھا اور اس کے دشمن قیدی کو ساتھ لے آیا تھا، اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے اپنا اپنی محمود کی خدمت میں روانہ کیا اور تقاضا کیا کہ اس کا دشمن قیدی اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اپنی رسم کے مطابق اسے اپنے تخت کے نیچے تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کرے جو اس مقصد کے لیے تیار کر لی گئی ہے۔

سلطان نے اس قیدی کو ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے لے کر سومات کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب یہ سومات کی حدود میں پہنچے تو انہوں نے مر تاض کو اپنی آمد کی خبر دی۔ مر تاض اپنے قیدی کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ اس نے ایک طشت اور لوٹا بھی ساتھ لے لیا تاکہ وہ دستور کے مطابق ان چیزوں کو قیدی کے سر پر رکھ کر اسے اپنے گھوڑے کے ساتھ بھگاتا ہوا لائے اور اسی حالت میں اسے قید خانے تک پہنچا دے۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور اس کی قسمت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا لشکر اس کے ساتھ تھا کہ مر تاض ایک جگہ رک گیا اور سیر و شکار میں مصروف ہو گیا۔ مر تاض شکار کا بہت شائق تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے شوق پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

شکار کی تلاش میں وہ دور تک چلا گیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور سرخ رنگ کا ایک رومال اپنے چہرے پر ڈال لیا۔ اسی وقت اس کی قسمت اس کے خلاف پانسا پھینک رہی تھی۔ ایک سخت چنگل پرندے نے سرخ رومال کو گوشت کا ٹکڑا سمجھا اور نیچے اتر کر اس زور کا جھپٹا مارا کہ پرندے کے ناخن مر تاض کی آنکھوں میں گھس گئے اور اس کی دونوں آنکھیں زائل ہو گئیں۔ مر تاض کی چیخوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو عالم ہی دوسرا تھا۔

ان لوگوں میں یہ رواج تھا کہ کسی ایسے شخص کو راجا تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جس کے جسم کے کسی حصے میں بھی کوئی نقص ہو۔ اس کے لشکر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہر شخص نے مر تاض کی اطاعت سے انکار کر دیا۔

اتنی دیر میں قیدی کو بھی وہاں لے آیا گیا جہاں مر تاض اس سانچے سے دوچار ہوا تھا۔ یہ قیدی چونکہ مر تاض ہی کے خاندان کا تھا لہذا اس کے علاوہ کوئی اور اس سلطنت کا مستحق نہیں تھا۔ اس لیے اس قیدی کو حکمرانی کے لیے منتخب

بہت دشمن

کر لیا گیا۔

خدا کی قدرت کہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ جو لوٹا اور طشت مر تاض اپنے قیدی کے لیے لایا تھا، خود اس کے سر پر رکھا گیا اور قیدیوں کی طرح اسے گھوڑے کے ساتھ دوڑاتے ہوئے لایا گیا اور جو کوٹھری اس نے قیدی کے لیے تیار کر لی تھی وہی اب اس کا ٹھکانا بن گئی۔ وہ روتا ہوا اس کوٹھری میں داخل ہو گیا اور قیدی تخت پر بیٹھ گیا۔ قیدی نے تخت پر بیٹھتے ہی محمود کو لکھ بھیجا کہ اسے محمود اپنا باجگوار نہ سمجھے۔ وہ خود مختار راجا ہے اس لیے خراج ادا کرنے سے معذرت کرتا ہے۔

یہ ایسی کھلی بغاوت تھی کہ محمود اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے محمود کا اٹھارہواں حملہ بھی تاریخ کی زینت بن جاتا لیکن محمود ان دنوں سلجوقیوں سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔

سلطان محمود نے طوس کے حکمران ارسلان کو باد آورد کے علاقے پر لشکر کشی کرنے کا حکم دیا۔ اس لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ ترکمانی سلجوقیوں کو تباہ کر دیا جائے کیونکہ وہ باد آورد کے گرد و نواح میں ہنگامے پیدا کر رہے ہیں۔

امیر طوس نے زبردست معرکہ آرائیاں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے ماپوس ہو کر سلطان محمود کو لکھا کہ ترکمانی سلجوقی اس کے بس کے نہیں ہیں۔ بادشاہ بذات خود ان پر حملہ کرے۔ محمود نے اس مشورے پر دھیان دیا اور لشکر لے کر دشمن کے سر پر پہنچ گیا۔ غزنوی لشکر نے بہادری کے جوہر دکھائے اور ایک طویل معرکہ کے بعد ترکمانیوں کو ایسا منتشر کیا کہ وہ پھر بھی سر نہ اٹھا سکے۔

سلجوقیوں نے عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اس لیے محمود نے ملک ”رے“ کی طرف کوچ کیا اور وہاں کے دہلیز اور خزانے قبضے میں کر لیے جو وہاں کے حکمرانوں نے برسوں سے جمع کر رکھے تھے۔ سلجوقیوں کا عمل و عمل عراق پر سے بھی ختم ہو گیا۔ یہاں محمود نے ان لمحوں اور قریطیوں کو قتل کیا جو اس ملک میں آباد تھے اور جن کے عقائد اسلام کے خلاف تھے۔

رے اور اصفہان کی حکومت اس نے اپنے بیٹے امیر مسعود کے سپرد کی اور خود غزنی واپس آ گیا۔

محمود کے خزانے میں آدھے ہندوستان کے جواہر، رے اور اصفہان کے خزانے اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ کسی بادشاہ کے خزانے میں نہ ہوں گے۔ اسے بجا طور پر یہ فخر تھا کہ اس کا باپ آل سامان کا غلام تھا اور آج اس کے

بیٹے (سلطان محمود) نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ آل سامان کے خزانے میں اس کا عشر عشر بھی نہ رہا ہوگا۔ ایک دن اس فخر نے زیادہ شور مچایا تو اس نے چند عقل مندوں سے سوال کیا۔

”آل سامان نے اپنے عہد حکومت میں کس قدر جواہرات جمع کیے تھے؟“

سامانی خاندان کا ایک فرد جو وہاں بیٹھا تھا، اس نے جواب دیا۔ ”امیر نوح سامانی کے عہد میں 7 رطل اعلیٰ جواہرات شاہی خزانے میں جمع تھے۔“

محمود نے خوش ہو کر کہا۔ ”خداوند تعالیٰ نے مجھے 100 رطل سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہرات دیے ہیں۔“ یہ تمام دولت اس نے مختلف معرکوں میں حاصل کی تھی اور یقیناً اس میں زیادہ حصہ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا تھا۔

طبقاتِ ناصری میں ہے کہ سلطان محمود کو تین باتوں میں شک تھا۔ اس مشہور حدیث پر یقین نہیں تھا کہ ”علماء کے وارث انبیاء ہیں۔“ قیامت کے آنے میں بھی شک تھا۔ اس کے علاوہ اسے اس میں بھی شبہ تھا کہ وہ سلجوقیوں کا بیٹا ہے۔

یہ شکوک اسے بے چین رکھا کرتے تھے خصوصاً یہ خیال کہ وہ سلجوقیوں کا بیٹا نہیں ہے۔ عمر کے آخری دنوں میں اس کے یہ تینوں شکوک اچانک رفع ہو گئے۔

ایک رات وہ اپنی قیام گاہ سے نکل کر پیدل ہی کسی طرف چل رہا تھا۔ فراش صبح دان لے کر آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں ایک ایسا طالب علم اسے ملا جو اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ اس طالب علم کے پاس جلانے کے لیے روغن نہیں تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جاتا تو ایک بچے کے چراغ کے پاس آ کر اپنی کتاب پڑھ لیتا۔ محمود کو اس طالب علم کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اس نے وہ شیخ دان جو اس کے فراش نے اٹھا رکھا تھا اس طالب علم کو دے دیا۔

جس رات کا یہ واقعہ ہے اسی رات کو اسے حضرت محمد ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے ”اے ناصر الدین سلجوقی کے بیٹے! خدا تعالیٰ تجھ کو ویسی ہی عزت دے جیسی تو نے میرے ایک وارث کی قدر کی ہے۔“ آنحضرت ﷺ کے اس فرمان نے محمود کو اس کے تینوں سوالوں کے جواب دے دیے۔ اسے ناصر الدین سلجوقی کا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا یعنی یہ بتا دیا گیا کہ تو سلجوقی ہی کا بیٹا ہے۔ اس طالب علم کو حضور ﷺ نے اپنا وارث کہا اور یہ بھی کہا کہ خدا تعالیٰ تجھ کو ویسی ہی عزت دے جیسی تو نے میرے

منتقم مزاج

کاشف زبیر

لہو صرف رگوں میں ہی گردش نہیں کرتا زمین پر ناحق بکھرتا ہے تو قاتلوں کے پاؤں زمین سے اکھاڑ دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی طوفان اس کی خاموشی میں بھی چھپا تھا۔ جس کی آمد نے قلبی کیفیات میں ایسی ہلچل مچائی کہ کسی کی دنیا اجڑ گئی اور کسی کے خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔



آئین میں چھپے سانپوں کی برقی کرڈوں کا احوال

شام کا وقت تھا اور ڈوبتے سورج کی کرنوں میں وہ خستہ حال فارم کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹوٹی ہوئی باڑھ، جھولتا ہوا سال خوردہ لکڑی کا مین گیٹ، فارم کے کناروں پر لگے، بے تنگ بڑھ جانے یا سوکھ جانے والے درخت تھے۔ فارم کی پوری زمین لمبی گھاس، خود رو پودوں اور جھاڑیوں سے بھر گئی تھی۔ داخلی دروازے کے دائیں طرف دو منزلہ مکان تھا۔ مکان کی حالت بھی باقی فارم سے مختلف نہیں تھی۔ برسوں سے رنگ و روغن اور مرمت سے محروم مکان

کی صحبتوں میں گزارتا رہا۔ علم فقہ پر ایک کتاب بھی تحریر کی۔ غزنی میں نئی نئی عمارتوں کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اکو تھیراتی کاموں کی نگرانی خود کرتا تھا تا کہ لوگ اس کی طرف سے ناامید نہ ہو جائیں۔ وہ اپنی صحت کی طرف سے لوگوں کو دھوکا دیتا رہا۔

وہ آب و ہوا کی تبدیلی اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لیے تلخ چلا گیا۔ آب و ہوا کی تبدیلی نے اس کی صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا وہ پھر غزنی واپس چلا آیا۔ اب وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کی بیماری کا حال سب پر کھل گیا۔

اگر کوئی اور بادشاہ ہوتا تو اس کی بیماری کو دیکھ کر ملک میں بغاوتیں عام ہو جاتیں لیکن اس کا دبدبہ ایسا تھا کہ اس بیماری کے باوجود کسی کو جرأت نہیں تھی کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک روز وہ محل میں تھا کہ اسے ایک عجیب بات سوچی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے خزانے اور قیمتی مال اس کے محل کے سامنے ڈھیر کر دیے جائیں۔ وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے کارندوں نے تمام دولت میدان میں سجادی، جواہرات کی چمک سے صحن خانہ دمک رہا تھا۔ محمود نے ان گراں قیمت جواہر پاروں پر حسرت کی نظر ڈالی اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ ان خزانوں کو چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد انہیں پھر خزانے میں جمع کرا دیا۔ اس کے دوسرے روز اس نے محافے میں بیٹھ کر میدان کی سیر کی۔ اس کے حکم کے مطابق شاہی ملازموں نے گھوڑے، اونٹ، ہانسی اور دوسرے جانور جو اس کی ملکیت تھے، اس کے سامنے پیش کیے۔ ان جانوروں کو دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے ماضی میں چلا گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر رونے لگا اور اسی حالت میں اپنے محل میں واپس آ گیا۔

کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ محل میں جا کر بستر پر لیٹا اور پھر نہیں اٹھا۔ جمعرات کے روز 23 ویں ربیع الثانی 421 ہجری کو اس کا انتقال ہو گیا۔

انتقال کے وقت اس کی عمر 63 سال تھی۔

دارث کی قدر کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قیامت ضرور آئے گی اور ہر شخص خدا تعالیٰ کے روبرو پیش ہوگا۔ سلطان کے تینوں شکوک رفع ہو گئے۔

ترکمان سلجوقیوں سے جنگ کرنے کے بعد وہ غزنی واپس آیا تو بیمار پڑ گیا۔ اطباء نے ملیر یا تجویز کیا اور اس کا علاج کرنے لگے لیکن یہ کیسا ملیر یا تھا کہ بخار اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس بخار نے اسے اتنا نحیف کر دیا کہ دو قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ کئی مہینے بعد طبیعت سنبھلی تو اسے سومنات کا خیال آیا۔ نہروالا کے راجا نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ اسے سبق سکھانا ضروری تھا۔ اس دور دراز کے سفر پر وہ کسی امیر کو نہیں بھیج سکتا تھا اور خود میں اتنی طاقت نہ پاتا تھا۔ اس نے تیاری کا ارادہ کیا لیکن اس انتظار میں کچھ دن کے لیے ٹھہر گیا کہ بدن میں کچھ طاقت اور آ جائے۔

اس انتظار میں وہ ایک مرتبہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اطباء دوا میں تجویز کرتے تھے لیکن بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ اسے معمولی بخار سمجھ رہا تھا۔ اس کے سچا بھی شاید اس اصل بات کرنے سے گریزاں تھے۔ پھر ایک روز ایک حکیم نے اس پر یہ راز کھول دیا۔ وہ وق (ٹی بی) کے مرض میں مبتلا تھا لیکن اس کے میچانے اسے امید دلائی تھی کہ اس مرض کا علاج ممکن ہے۔ علاج ہوتا رہا مگر مرض بڑھتا چلا گیا۔ اس نے صبر کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کی اس بیماری کا کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ وہ خود کو تندرست و توانا ظاہر کرتا رہا کہ سلطنت کے کاموں میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔

پورا سال گزر گیا تھا، وہ کسی معرکے کے لیے روانہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کے حق میں غیر معمولی بات تھی لیکن وہ یہ کہہ کر اپنے وزیروں کو مطمئن کرتا رہا کہ اب کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے مقابلے پر آئے۔ غزنی سے ہندوستان تک اس کی حکومت ہے۔ اب کیا ضرورت ہے کہ خلق خدا کا خون بہایا جائے۔ حدود سلطنت اتنی بڑھ گئی ہیں کہ سلطنت کے مناسب انتظام ہی میں وقت گزارنا چاہیے۔ کبھی یہ کہہ کر لوگوں کو مطمئن کر دیا کرتا تھا کہ سلطنت کی بنیادیں ذرا اور مضبوط کر لوں اس کے بعد جہاد کے لیے نکلوں گا۔

اس عرصے میں وہ اپنا زیادہ وقت اپنے درباری شعرا

طبقات ناصری ترجمہ احمد علی خاں شوق، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، طبقات اکبری خواجہ نظام، آئینہ حقیقت نما، اکبر شاہ خاں، تاریخ ہندوستان، مولوی ذکا اللہ

اس وقت تباہ حالت میں تھا۔ سامنے والے لان میں اتنی لمبی گھاس اُگ آئی تھی کہ اس میں بچیں اور جھولے بھی چھپ گئے تھے صرف ان کی لمبی زنجیریں اور فولادی پائپ جن سے زنجیریں لٹک رہی تھیں دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہوا جیسے سوچ رہا ہو کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر اس نے لکڑی کا گیت کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ مکان تک جانے کے لیے لمبی گھاس میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا جو پیدل چلنے سے بن گیا تھا۔ وہ برآمدے تک پہنچا۔ وہاں بوڑھا کریم جیکسن جیسے پریشان جھول رہا تھا، اس کی عمر تقریباً ستر برس تھی اور اس کی کھلی آنکھوں پر آجانے والی سفیدی بتا رہی تھی کہ وہ نابینا ہے۔ کرسی بٹنے سے فرش کے تختے آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ بہت دبے قدموں وہاں تک آیا تھا لیکن جیسے ہی اس نے برآمدے کے پہلے تختے پر قدم رکھا، اس نے چرچا کر کریم کو خبردار کر دیا اور وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

”کون ہے؟“ بوڑھے کریم نے سامنے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”بولو کون ہو تم؟“
نوادریز میز پر چڑھ کر کریم جیکسن کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”گریڈ پا۔“
کریم بے قراری سے کھڑا ہو گیا۔ ”کون... بریڈ... تم بریڈ ہو؟“

”ہاں گریڈ پا۔“ اس نے جواب دیا تو کریم نے دونوں بازو اڑا کر دیے تھے اور وہ اس کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔ کریم دیکھنے میں صحت مند لگتا تھا لیکن درحقیقت وہ بہت کمزور تھا۔ نووارد کو اس کے سینے کی ہڈیاں محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اس کا چہرہ ٹٹول رہا تھا پھر وہ رونے لگا۔

”بریڈ... میرے بچے۔“ وہ اسے چوم رہا تھا اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھو رہا تھا۔ بریڈ جیکسن ساکت کھڑا تھا، اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے جسم پر بہت خستہ حال اور پرانا لباس تھا۔ سر کے بال بے ہنگم بڑھے ہوئے تھے اور چہرہ یوں سُتا ہوا تھا جیسے اسے عرصے سے ڈھنگ کی زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ کریم نے خاصی دیر بعد گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ بریڈ نے کریم کو واپس کرسی پر بٹھایا۔ لیکن اس نے بریڈ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ”تم بولتے کیوں نہیں؟“
”در بدر پھرتا رہا ہوں۔“ اس نے جھکے لہجے میں کہا۔ ”نہ جانے کتنی جگہوں پر رہا اب تو یاد بھی نہیں ہے۔“
بوڑھا کریم دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس نے بریڈ کا چہرہ

اور جسم ٹٹول کر اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ”میرے بچے، لگتا ہے تم نے بہت سخت وقت دیکھا ہے۔“
”ہاں، لیکن آپ کو کیا ہوا... آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔“

”جس پودے کا کوئی رکھوالا نہ ہو وہ بھی مرجھا جاتا ہے، میں تو پھر بھی انسان ہوں۔“ کریم نے سرد آہ بھری۔
”لگتا ہے کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔“

کریم جیکسن نے جلدی سے تردید کی۔ ”نہیں، نہیں ہمارے پڑوسی بہت اچھے ہیں۔ وہ میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میٹ مجھے ناشتا کراتا ہے اور کپڑے بدلواتا ہے۔ میٹ یاد ہے نا... تمہارے بچپن کا ساتھی ہوتا تھا۔“

بریڈ نے سر ہلایا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ دادا تو دیکھ ہی نہیں سکتا اُس نے کہا۔ ”مجھے سب یاد ہے۔“

”لیکن تم شرمین کے بارے میں نہیں جانتے ہو گے۔ اس کا خاندان دس سال پہلے ہمارے پڑوسی میں آباد ہوا تھا، شرمین کے شوہر نے ایڈم کی زمین خرید لی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا اس کے سارے بچے شہر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ شرمین شام کے وقت مجھے کھانا کھلانے آتی ہے۔ باقی اپنی دیکھ بھال میں خود کر لیتا ہوں۔“
”آپ کی آنکھیں...؟“

”آٹھ سال پہلے موتیا ہوا تھا۔ میں نے آپریشن سے انکار کر دیا، رفتہ رفتہ موتیا نے بینائی ختم کر دی۔ میرے بچے تمہارے جانے کے بعد میرا دل ہر چیز سے ہٹ گیا تھا، مجھے تو جینے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی لیکن موت بھی نہیں آئی۔“

”گریڈ پا۔“ بریڈ نے ذرا جھک کر کہا۔ ”اب میں آگیا ہوں میں سب سنبھال لوں گا۔“

”اندر چلو میرے بچے۔“ کریم نے مسرت سے کہا۔ ”میرے پاس سو سال پرانی وہسکی کی آدھی بوتل رکھی ہے، آج ہم اس سے تمہاری واپسی کا جشن منائیں گے۔“

کریم اور وہ اندر آئے۔ مکان کی حالت اندر بھی اچھی نہیں تھی۔ ہر چیز گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ کریم نے ایک کینٹ سے وہسکی کی بوتل اور دو گلاس نکالے۔ مکان میں اس کی نقل و حرکت محدود تھی اس لیے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے؟ پوتے کی واپسی کی خوشی نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ بریڈ کو بتا رہا تھا کہ بارہ سال پہلے جب وہ گھر سے گیا تھا تو اس کے بعد اس پر کیا گزری۔ وہ

اکیلا اتنا بڑا فارم نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے سوشل سیکورٹی کی جو رقم ملتی تھی اس کے گزارے کے لیے وہی کافی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی اور اس نے قصبے والوں کے اصرار کے باوجود موتیے کا علاج کرانے سے انکار کر دیا اور انجام کار وہ دیکھنے سے معذور ہو چکا تھا۔

تیل بھی تو بریڈ باہر آیا۔ ایک خوش شکل اور جوان عورت کھڑی تھی، اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ بریڈ کو دیکھ کر وہ ٹھکی۔ ”تم... کون ہو؟ میں مسٹر جیکسن کے لیے ڈنر لاتی ہوں۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ بریڈ نے نرمی سے کہا۔ ”میں بریڈ جیکسن ہوں۔“

”مسٹر جیکسن کے پوتے؟“ عورت مسرت سے بولی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”میں شرمین ہوں، تم سے مل کر خوش ہوئی۔“

”مجھے بھی خوش ہوئی۔“ بریڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے نوٹ کیا کہ شرمین کے ہاتھ میں شادی کی انگلی نہیں تھی اور نہ اس نے شوہر کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ ”ٹھیک ہے، اب شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔“
شرمین نے کہا۔ ”لیکن آج میں لے آئی ہوں اور اتفاق سے یہ اچھا خاصا ہے، امید ہے تم دونوں دادا پوتے کے لیے کافی ہوگا۔“

بریڈ نے اس کا شکر یہ ادا کر کے ٹرے لے لی اور اندر آنے کی دعوت دی لیکن شرمین نے کہا۔ ”میرے بچے بھوک سے بے تاب ہو رہے ہیں ان کے لیے ڈنر لگانا ہے۔“

بریڈ اندر آیا اور اس نے ٹرے کچن کی میز پر رکھ دی۔ کھانے میں ٹھننا ہوا بیف اور ساتھ میں انڈوں اور ربڑی سے بنا ہوا گرم سوپ تھا۔ کریم اتنا خوش تھا کہ اس کی بھوک اڑ گئی تھی لیکن بریڈ اسے اصرار کر کے کھلاتا رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی صحت بہت گری ہوئی تھی۔ پھر اسے نیند آنے لگی اور اس نے دادا سے اجازت چاہی۔ ”میں اب سوؤں گا۔“

”میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم کتنے تھکے ہوئے ہو۔ ایسا کرو آج میرے کمرے میں سو جاؤ کل تمہیں اپنا کراٹھک کرنا ہے۔“

”ہاں کل مجھے بہت چھک کرنا ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ اگلی صبح جب میٹ، کریم جیکسن کے لیے ناشتا لایا تو وہ بھی بریڈ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس سے لپٹ گیا اور گرم

جوش سے بولا۔ ”بد معاش، مجھے امید نہیں تھی کہ پھر تمہیں دیکھ سکوں گا۔ تم بہت بدل گئے ہو۔“
”ہاں میں نے بہت مشکلات دیکھی ہیں اور مشکلات آدی کو بدل دیتی ہیں۔“

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم واپس آؤ گے۔“ میٹ نے کہا تو بریڈ کو اس کا لہجہ معنی خیز لگا تھا۔ ”خیر اب تم آگئے ہو۔“

شرمین نے کسی کو نہیں بتایا تھا لیکن میٹ نے بریڈ کی آمد کی خبر پورے ہاگ ٹاؤن میں پھیلا دی تھی۔ شام تک بہت سارے لوگ بریڈ سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ بارہ سال پہلے بریڈ صرف اٹھارہ برس کا تھا جب وہ یہاں سے گیا تھا۔ ان بارہ سالوں میں بہت ساری تبدیلیاں آئی تھیں۔ اکثر نوجوان بہتر مستقبل کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف چلے گئے تھے۔ بہت سارے بوڑھے فوت ہو چکے تھے اور بہت سارے ادھیڑ عمر اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر بریڈ کے لیے اجنبی تھے لیکن بہت سارے لوگوں کو اس نے پہچان لیا تھا۔ ملنے والوں کا رش ایک دودن رہا اور اس کے بعد سب معمول پر آنے لگا۔ ان سے فرصت ملی تو بریڈ نے سب سے پہلے مکان پر توجہ دی۔ اس نے تمام ناکارہ سامان اور فرنیچر نکال کر باہر لان میں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد مکان کی صفائی شروع کر دی۔ میٹ اور شرمین اس کی مدد کے لیے آئے تھے لیکن اس نے نرمی سے منع کر دیا۔

”میں کام اپنی مرضی سے کر رہا ہوں اس لیے تمہاری مدد بے سود ہوگی۔ ممکن ہے جب تمہارے پاس وقت ہو تو میرا کام کرنے کا موڈ نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے جب تک تم مکان سیٹ نہیں کر لیتے صبح اور شام کا کھانا میری طرف سے ہوگا۔“ شرمین نے پیشکش کی۔

”نہیں تمہیں زحمت ہوگی۔“ بریڈ نے پھر انکار کر دیا۔ ”مجھے کھانا بنانا آتا ہے اور دو آدمیوں کا کھانا بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری غیر موجودگی میں گریڈ پا کا خیال رکھا۔“

”پڑوسی ہونے کے ناتے یہ ہمارا فرض تھا۔“ شرمین نے کہا۔
”اور میرا دوست ہونے کے ناتے۔“ میٹ آنکھ مار کر بولا۔ ”تم ذرا مکان کے کام سے فارغ ہو جاؤ پھر رات کو کہیں چلنے کا پروگرام بناتے ہیں۔“

شرمین نے اسے گھورا۔ ”میں تمہاری بیوی کو بتاؤں گی کہ تم کیا پروگرام بنا رہے ہو۔“

برید مسکراتے ہوئے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان چند دنوں میں اس کے حلیے میں بھی خاصا فرق آیا تھا، اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی اور چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔ اس نے پرانے ہی لیکن صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ فی الحال اس نے نئے کپڑے لینے سے گریز کیا تھا۔ کریم جیکسن بھی پوتے کے آنے کے بعد جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ اب وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ پہلے سارا دن برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا رہتا تھا، اب برآمدے سے اتر کر تھوڑی بہت چہل قدمی بھی کر لیتا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر برید نے مکان کو اندر سے پوری طرح صاف ستھرا کر یا تھا۔ اس کے بعد اس نے پورے گھر میں پالش اور رنگ کا ارادہ کیا۔ کریم جیکسن کے پاس رقم موجود تھی۔ یہ برسوں سے جمع ہوئی آئی تھی اور اس کا خرچ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک مہینے میں نہ صرف مکان پالش اور رنگ کے مراحل سے گزر کر بہترین حالت میں آ گیا تھا بلکہ اس کے سامنے والے لان سے سارا جھاڑ جھکاڑ بھی غائب ہو گیا تھا۔

برید نے جلانے کے قابل ساری لکڑی اٹھا کر عقب میں موجود شیڈ تلے رکھ دی۔ اس نے ناکارہ فریج بھی توڑ کر لکڑی نکال لی تھی جو سردیوں میں جلانے کے کام آتی۔ لان کی گھاس اور پودے کاٹ کر اس نے فارم کی زمین پر پھیلا دیے تھے۔ وہ روز فارم کے کچھ حصے کی گھاس اور جھاڑیاں پودے کاٹ کر وہیں ڈال دیتا تھا۔ جب تک وہ مکان سے فارغ ہوا، اس نے فارم کی ساری گھاس اور جھاڑیاں بھی کاٹ دی تھیں۔ اس نے مکان پر سفید رنگ کیا تھا۔ برید برآمدے کی سیڑھی کا ٹوٹ جانے والا ایک تختہ بدل رہا تھا کہ میٹ آ گیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں۔

”تمہیں یاد ہے جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہیں دیوار میں کیل بھی سج سے ٹھونکی نہیں آئی تھی اور اب تم نہایت مہارت اور صفائی سے یہ سارے کام کر رہے ہو۔“

”میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔“ برید نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”آج شام کو بار چلنے کا ارادہ ہے؟“

”کیوں نہیں۔“

اپنی آمد کے بعد جب برید کو پہلی بار فرصت ملی تو وہ میٹ کے ساتھ مقامی بار میں گیا۔ وہاں بہت سارے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس دوران میں برید نے اپنے بال مختصر کر لیے تھے۔ جب یہاں آیا تھا تو اس کی شیوئی دن کی بڑھی ہوئی

تھی، اب وہ روز شیو کرنے لگا تھا۔ اس کی صحت بھی کہیں ہو گئی تھی۔ جب وہ آیا تھا تو اپنی اصل عمر سے بڑا لگ رہا لیکن اب وہ عمر کے مطابق ہی لگ رہا تھا۔ دوسروں علیک سلیک کر کے میٹ اور وہ ایک الگ میز پر آ بیٹھے تھے۔

”تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔“

میٹ کی اس بات پر برید چونکا۔ ”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ تم اب وہ کام کر رہے ہو جن کی تم نوجوانی میں بھی توقع نہیں تھی تم محنت سے بھاگتے تھے اسی وجہ سے تو گھر سے بھاگے تھے کہ تم کھیتوں میں کام نہ کرنا چاہتے تھے۔“

”وہ میری حماقت تھی۔“ برید نے بیڑ کا گھونٹ کر کہا۔

”اس کی مجھے قیمت ادا کرنی پڑی۔ میں نے بہت ساری جگہوں پر رہائش رکھی اور کمانے کے لیے مجھے بہت سارے کام کرنے پڑے۔ یہ سب میں نے اسی سے سیکھا ہے۔ اب مجھے محنت کرنی آ گئی ہے اور کام کرنا بھی۔“

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

برید نے شانے اچکائے۔ ”میرے پاس اور کچھ نہیں ہے، میں فارم پر کام کروں گا۔“

میٹ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمہارے پاس دس ہیکٹر ز بہترین زمین ہے اور برسوں سے ایسے ہی پڑے رہنے کی وجہ سے اس کی زرخیزی بھی آس پاس کی زمینوں سے کہیں بہتر ہے۔ اگر تم اسے کاشت کرو گے تو کہیں زیادہ کمائے ہو۔“

برید نے سر ہلایا۔ ”ایک دو ہفتے میں اس طرف بھی توجہ دوں گا۔“

”اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو ضرور کہنا۔“

”شاید مجھے آلات کے سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔“

میٹ خود بھی کسان تھا لیکن اس کے پاس صرف پانچ ہیکٹر زمین تھی۔ اس کے باپ کے پاس بہت ساری زمین تھی لیکن جب وہ مرا تو اس کی زمین تین بیٹوں میں بٹ گئی اور میٹ کے حصے میں پانچ ہیکٹر زمین آئی تھی۔ میٹ کے پاس ٹریکٹر اور دوسری فارم مشینری سمیت تمام ضروری آلات تھے۔ کریم جیکسن کے فارم پر اب کچھ نہیں تھا۔ کچھ مشینری اور آلات چور لے گئے تھے اور کچھ پڑے پڑے ناکارہ ہو گئے تھے۔ اسے زمین آباد کرنے کے لیے مشینری اور آلات کی ضرورت تھی لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی

کہ وہ ان کی خریداری کر سکتا۔ میٹ نے فراخ دلی سے اسے پیش کش کر دی تھی، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

جون کے آخری دنوں میں گرمی خاصی بڑھ گئی تھی۔ اس دن ہوا الٹی چل رہی تھی۔ برید نے درختوں اور مکان کے آس پاس سے جھاڑیاں اور گھاس بالکل صاف کر دی تھی۔ اس نے سوکھ جانے والی ان جھاڑیوں اور گھاس کو آگ لگا دی۔ چند گھنٹوں میں سب گھاس جل کر راکھ بن گئی تھی۔ برید نے میٹ سے موٹر پمپ اور اسپرنگرز لے لیے تھے۔ جب آگ بجھ گئی تو اس نے موٹر پمپ بور کے پائپ سے جوڑا اور زمین کو پانی سے تر کر دیا۔ شروع میں گرم زمین سے بھاپ کے بادل اٹھے تھے لیکن جلد ہی زمین ٹھنڈی ہو گئی اور اس نے پانی جذب کر لیا۔ اگلے دن برید نے میٹ کا ٹریکٹر لیا اور پورے فارم کی زمین پر ہل چلا کر اسے ایک جیسی صورت میں لے آیا۔ راکھ اچھی طرح زمین میں مل گئی تھی اور اس نے زمین کو مزید زرخیز کر دیا تھا۔ دوپہر تک اس نے اچھی خاصی زمین ہموار کر لی تھی اور پھر ستانے کے لیے رکھا تھا کہ شرمین چلی آئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے فارم کی حالت دیکھی۔

”تم نے کچھ ہی دنوں میں بہت کچھ کر لیا ہے۔“

”ہاں، مجھے گزرے دنوں کی تلافی بھی تو کرنی ہے۔“ برید نے درخت کے نیچے رکھے آکس بکس سے اس کے اور اپنے لیے کولڈ ڈرنک کے ٹن نکالے۔

”شکر ہے اس جگہ کی صورت نکل آئی ورنہ پہلے اجازت تھی۔“

”کچھ عرصے بعد یہاں آلو، چقدر، گاجر اور دوسری سبزیوں کے پودے لگے ہوں گے۔“

”تم مکئی نہیں لگاؤ گے؟“

”نہیں، سبزیوں میں زیادہ بچت ہے۔“

”لیکن اس میں محنت بھی بہت ہوتی ہے۔“

برید مسکرایا۔ ”میں محنت کر سکتا ہوں۔“

”پھر بھی تمہیں مزدوروں کی ضرورت پڑے گی۔ خیر یہ دوسری بات ہے، میں یہ کہنے آئی ہوں کہ آج ڈنر تم میرے گھر کرو گے۔“

برید کو اب تک شرمین کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا حالانکہ وہ برابر میں ہی رہتی تھی۔ ”میں ضرور آؤں گا۔“

شام تک اس نے ٹریکٹر صاف کر کے میٹ کو واپس کر دیا تھا۔ اس نے نہادھو کر اپنا ایک بہترین لباس نکالا۔ واپس آنے کے بعد اس نے چند نئے جوڑے خریدے تھے لیکن

وہ زیادہ فضول خرچی سے گریز کر رہا تھا کیونکہ ابھی فارم پر سبزیوں کا شت کرنے کے لیے اسے خاصی رقم کی ضرورت پڑتی۔ وہ اس کے لیے رقم بچا رہا تھا۔ شام کو جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ ان کے لیے تحفہ بھی لے گیا تھا۔ اس نے اکیلے ہی اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے بچے لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ برید نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارا شوہر موجود نہیں ہے، کیا وہ کہیں گیا ہوا ہے؟“

شرمین نے چور نظروں سے لاؤنج میں موجود بچوں کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ”نہیں، میں اس سے طلاق لے چکی ہوں۔“

”اوہ۔“ برید نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ شرمین نے پہلے بچوں سے اس کا تعارف کرایا اور دونوں لڑکوں نے بادل ناخواستہ ٹی وی کے آگے سے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور فوراً ہی دوبارہ ٹی وی کے آگے براجمان ہو گئے۔ شرمین اسے کچن میں لے آئی۔ اس کا کچن خاصا بڑا اور شاندار قسم کا تھا۔ برید اس کے ہاتھ کے بننے کئی قسم کے کھانے کھا چکا تھا، اس کا خیال تھا شرمین ان عورتوں میں سے ہے جن کے ہاتھ میں قدرتی لذت ہوتی ہے۔ اس دن بھی اس نے بڑا شاندار قسم کا ڈنر بنایا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ باہر لان میں کرسیوں پر آ بیٹھے کیونکہ اندر خاصی گرمی تھی۔

”میں نے لوگوں سے تمہارے بارے میں جو سنا تھا تمہیں اس سے خاصا مختلف پایا ہے۔“

”تم نے کیا سنا تھا؟“

”یہی کہ تم ایک لالچی اور خود میں مگن رہنے والے نوجوان تھے اور تمہیں اپنے گریڈ یا کی بالکل پروا نہیں تھی جنہوں نے تمہاری پرورش کی تھی۔ تمہیں تعلیم سے بھی دلچسپی نہیں تھی اور تم نے یہ مشکل ہی اسکول کی سند حاصل کی۔ تم زمین پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اسی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“

”سب درست ہے۔“

”لیکن اب تم بالکل بدل گئے ہو۔“

”وقت اور حالات آدمی کو بدل دیتے ہیں۔“ برید نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”مجھ میں بھی تبدیلی آئی ہے، اب میں اٹھارہ سال کا نوجوان نہیں رہا ہوں، تیس سال کا تجربے کا مرد بن گیا ہوں۔“

”مسٹر جیکسن تمہارے واپس آنے سے بہت خوش ہیں، ان کی حالت بدل گئی ہے اور صحت بھی بہت اچھی ہو گئی ہے۔“

بریڈ نے سر ہلایا۔ ”پہلی فصل کے بعد میں انہیں آنکھوں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ فی الحال ان کی میڈیکل انشورنس ختم ہوگئی ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔“ شرمین نے مایوسی سے کہا۔ ”ایک بار میں بھی ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی اس نے بتایا کہ موتیانے پینائی کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔“

”پھر بھی امید تو باقی ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ ”میں اپنا اطمینان ضرور کروں گا۔“

”یہ اچھا ہوا کہ تم واپس آگئے اور مسٹر جیکسن کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے ہو رہی ہے۔“

”میرا ان کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔“ شرمین نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”جب تمہیں اس بات کا احساس ہے تو تم انہیں چھوڑ کر ہی کیوں گئے تھے؟“

”یہ احساس اس وقت نہیں تھا، اس وقت تو گرینڈ پا ٹھیک تھے اور خود اپنی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔“

”یعنی یہ احساس تمہیں واپسی کے بعد ہوا ہے؟“ شرمین بولی۔

”ہاں، جب میں واپس آیا اور میں نے پہلی بار گرینڈ پا کی حالت دیکھی تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے انہیں چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“

”مجھے احساس ہے کہ میں مسٹر جیکسن کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کر سکی۔“

شرمین اپنے فارم پر دو ملازموں کی مدد سے کام کرتی تھی۔ ”تمہاری اپنے شوہر سے کب علیحدگی ہوئی؟“

”اس واقعے کو چھ سال ہو چکے ہیں۔“

اگلا سوال کرتے ہوئے بریڈ ہنچکایا لیکن اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”اگر تم برانہ مانو تو میں علیحدگی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

شرمین ہنسی۔ ”اس میں برانہ ماننے والی کون سی بات ہے۔ سارا ہاگ ناؤن جانتا ہے۔ کولن ایک حرافہ کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور اسی وجہ سے ہمارے درمیان علیحدگی ہوئی۔ میں نے بھی عدالت کی مدد سے اسے کنگال کر کے چھوڑا۔ اس کی زمین، بینک بیلنس اور اس کی ہر چیز حاصل کر لی۔ وہ اس حرافہ کے ساتھ یہاں سے چلا گیا تھا لیکن مجھے یقین ہے بعد میں اس نے بھی کولن کو لات مار دی ہوگی۔“

بریڈ مسکرایا۔ ”لگتا ہے تمہیں اپنے سابق شوہر سے زیادہ اس عورت پر غصہ ہے۔“

”ہاں، اس سے ملنے سے پہلے کولن ایک اچھا شو اور باپ تھا لیکن اسے دیکھتے ہی وہ بیوی بچوں کو فراموش بیٹھا۔ بہر حال یہ بات اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں، مجھے روزگار کے لیے کچھ دھکے نہیں کھانے پڑتے، کسی باس کی خوشامد نہیں کرنی پڑی اور میں بچوں پر بھی نظر رکھتی ہوں۔“

شرمین کا فارم بریڈ کے فارم سے کچھ ہی بڑا تھا۔ اس نے اسے بہت اچھی طرح رکھا تھا۔ بریڈ کا اندازہ تھا کہ وہ یہاں سے سال میں کم سے کم دو لاکھ ڈالر ضرور کماتی گی۔ وہ گھر واپس آیا تو گریم جیکسن برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بریڈ نے خفگی سے کہا۔ ”گرینڈ پا! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟“

”ہاں، بخوردار۔“ وہ چپک کر بولا۔ ”شرمین اچھی لڑکی ہے۔“

”ہاں لیکن وہ صرف پڑوسن ہے۔“ بریڈ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

”لیکن تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔“ گریم جیکسن نے مشورہ دیا۔ ”میں نے آخری بار آٹھ سال پہلے اسے دیکھا تھا اس وقت وہ بہت جوان اور خوب صورت ہوتی تھی۔“

”وہ اب بھی جوان اور خوب صورت ہے لیکن ساتھ ہی وہ دو عدد دس اور آٹھ سال کے لڑکوں کی ماں بھی ہے۔“ بریڈ نے یاد دلایا۔ ”اس لیے میں فی الحال کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ میری پہلی ترجیح یہ فارم ہے اور اس کے بعد میں آپ کی آنکھیں ٹھیک کرانے کی کوشش کروں گا۔“

”میں ایسے بھی خوش ہوں، میں نے جتنی دنیا دیکھنی تھی دیکھ لی۔ تمہارے آنے کے بعد مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن یہ میری خواہش ہے۔“ بریڈ نے کہا اور گریم جیکسن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”چلیں بستر پر، کل صبح جلدی اٹھیے گا کیونکہ مجھے سچ لینے کے لیے منڈی جانا ہے۔“

گریم جیکسن نے اندر جاتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ ”سچ کے لیے ہار ملنے کے پاس جانا۔ وہ تو مر گیا ہے لیکن اس کے بیٹے یہی کام کر رہے ہیں اور ان کے سچ ذرا مہنگے لیکن سب سے معیاری ہوتے ہیں۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ ”ساتھ ہی مجھے مٹی کا ٹیٹ بھی کرانا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ اس علاقے کی سب سے اچھی مٹی ہے۔“ اس نے فخر سے کہا۔ ”تم دیکھنا یہ سونا اگلے گی۔“

گریم جیکسن کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ بریڈ نے مٹی کا ٹیٹ کرایا تو اس میں تمام ضروری عناصر معمول سے زیادہ ہی پائے گئے تھے۔ کسی عنصر کی کمی نہیں تھی۔ گریم جیکسن کے سچ لے کر آیا۔ اس نے شرمین کی مدد سے دو سبز یوں کے بیج لے کر آیا۔ اس نے شرمین کی مدد سے دو مزدور حاصل کر لیے تھے اور ان کے ساتھ بیجوں کی بوائی میں لگ گیا۔ گھاس پھوس اور جھاڑیاں جلانے کی وجہ سے زمین فی الحال کیڑے مکوڑوں اور غیر ضروری پودوں سے بالکل پاک ہوگئی تھی اس لیے ابھی کسی اسپرے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھاد کی ضرورت بھی بعد میں پڑتی۔ وہ روز تقریباً پونہ ہیکٹر زمین پر بوائی کرتے تھے۔ پندرہ دن میں بوائی کا کام مکمل ہو گیا۔ یہاں پانی زمین میں تیس سے چالیس فٹ کی گہرائی میں تھا۔ بریڈ نے ایک اچھی کمپنی سے بور مزید گہرا کروایا۔ اس نے اتنے پائپ اور اسپرنگرز لے لیے جو ایک دن میں دو ہیکٹر زرقے کو پانی دے سکتے تھے۔ اسپرنگرز پانی ہوا میں فوارے کی طرح اچھال کر دیتے ہیں جس سے پانی میں آکسیجن اور نائٹروجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور یہ فصل کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

مکان کے عقبی شیعہ میں ایک پندرہ سال پرانا فورڈ مینی ٹرک ناکارہ کھڑا تھا۔ آٹھ سال سے اسے استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بوائی سے فارغ ہو کر اس نے ٹرک کی طرف توجہ دی کیونکہ اب تک تو کام چل رہا تھا لیکن جب سبزی تیار ہو جاتی تو اسے منڈی تک پہنچانے کے لیے اپنی ٹرانسپورٹ لازمی تھی، ورنہ دوسری صورت میں بہت بڑی رقم کرائے کی مد میں دینا پڑتی۔ میٹ کو کسی حد تک انجن کا کام آتا تھا۔ سب سے پہلے بریڈ نے ٹرک کی صفائی کی اس کی ناکارہ ہو جانے والی اشیاء اتار دیں اور پھر ریگ مال سے رگڑ کر اس کے چیس اور اوپری جگہوں پر لگ جانے والا رنگ اتارنے لگا۔ اسے مکمل طور پر صاف کر کے اس نے میٹ کی مدد سے انجن کھولا اور میٹ نے انجن کھول کر اس کی صفائی کی جن پیرزوں کو بدلنے کی ضرورت تھی ان کو بدل دیا اور انجن دوبارہ بند کر کے ٹرک میں فٹ کر دیا۔ انجن ٹھیک ہو گیا تھا۔ بریڈ کئی دن آزمائشی طور پر چلاتا رہا اور جب رنگ پوری ہو گئی تو اس نے ٹرک رنگ و آرائش کے لیے ایک مقامی ورکشاپ میں دیدیا۔ ایک ہفتے بعد ٹرک رنگ روغن اور آرائش کے بعد واپس آیا تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ٹرک تھا جو اس کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

شرمین نے اس سے کہا تھا کہ بوائی کے بعد دوسرے کاموں کے لیے مزدور لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بس دیکھ بھال کا معمولی سا کام تھا اور اس کے ملازم عام طور سے فارغ ہوتے تھے۔ جب بریڈ زمین کو پانی دیتا تو انہیں بلا لیا کرتا تھا کیونکہ اسپرنگرز سنبھالنے کے لیے دو تین افراد کی ضرورت پڑتی تھی، اکیلے آدمی کے لیے یہ کام خاصا مشکل تھا۔ ہفتے میں ایک بار پانی کافی ہوتا تھا۔ وہ روزانہ دو ہیکٹر زرقے کو پانی دیتا تھا اس کے بعد دو دن فارغ ملتے تھے جن میں وہ دوسرے کام نمٹاتا تھا۔ فارم کے کناروں پر لگے درخت بھی توجہ چاہتے تھے۔

بریڈ نے سوکھ جانے والے درخت نکال کر ان کی جگہ نئے یوکلپس لگائے اور جو بہت بڑھ گئے تھے ان کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹا کر دیا۔ فارم کے چاروں طرف لگی لکڑی کی باڑہ خست حال ہو رہی تھی اور اسے بدلنے کی ضرورت تھی لیکن فی الحال بریڈ کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اتنی رقم کہ وہ اسے بدل سکے اس لیے اس نے جو درخت نکالے تھے ان سے لکڑی حاصل کر کے باڑہ کی مرمت کر دی۔ ایک مسئلہ اور تھا۔ مکان کو گرم کرنے والا نظام برسوں سے استعمال نہ ہونے سے تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا اور یہاں اکتوبر کے آخر میں موسم اتنا سرد ہو جاتا تھا کہ لازمی گرمائش اور پانی گرم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ گریم جیکسن کس طرح سردیاں گزارتا تھا۔ بریڈ وقت نکال کر اس کی صفائی بھی کرتا رہتا تھا اور پھر اس نے بعض پائپ اور چیزیں بھی تبدیل کیں۔ جلانے کے لیے لکڑی کی کمی نہیں تھی پیچھے شیعہ میں اس کا ڈھیر لگا ہوا تھا پھر ناکارہ فرنیچر بھی کافی نکلتا تھا۔

مشکلات آرہی تھیں لیکن بریڈ درست سمت میں بڑھ رہا تھا اسے امید تھی کہ آنے والے دنوں میں اس کے بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جب اس کے پاس فصل کی رقم آئے گی۔ وہ اسی لیے اتنی محنت کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گریم جیکسن پر بھی پوری توجہ دے رہا تھا۔ اس کی خوراک، اس کا آرام اور اس کی صفائی ستھرائی ہر چیز کا خیال رکھتا تھا۔ بریڈ کی کوششوں سے اس کی صحت اور حالت بہت اچھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ خود باقاعدگی سے اس کی شیو بناتا تھا۔ اس کے سر پر دو ہفتے بعد موٹی مشین پھیرتا تھا۔ ہر دوسرے دن اسے خود نہلاتا تھا اور روز کپڑے بدلاوتا۔ اپنے لیے بریڈ نے صرف فرش پر ایک گدا بچھا رکھا

سسٹمنس ڈائجسٹ 68 سسٹمنس ڈائجسٹ 69

تھا لیکن گریم جیکسن کے لیے وہ دوسرا بیڈ لایا تھا۔ گھر میں اب بہت کم فرنیچر رہ گیا تھا۔

ایک مہینے بعد فارم کی خشک اور بھوری زمین سبز رنگ سے چھپ گئی تھی اور پودے فٹ بھر سے زیادہ اونچے ہو گئے تھے۔ زمین کی زرخیزی سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لیے بریڈ نے پودے بھی پاس پاس لگائے تھے اس طرح وہ زیادہ فصل حاصل کر سکتا تھا۔ اگست میں بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور اب اسے پودوں کو پانی بھی نہیں دینا پڑ رہا تھا لیکن اسے نکاسی کا خیال رکھنا پڑتا تھا کیونکہ جمع ہونے والا پانی پودوں کو خراب کر سکتا تھا۔ اس لیے شدید بارش میں بھی وہ سارا دن فارم میں گھومتا رہتا تھا اور جہاں اسے پانی رکنا نظر آتا وہ اس کی نکاسی کا راستہ بنا دیتا۔ بارش کا موسم ستمبر تک جاری رہتا اس لیے اس کی یہ محنت آنے والے مہینے تک جاری رہتی۔ ایک دو بار وہ بیمار ہوا لیکن اس حالت میں بھی کام کرتا رہا تھا۔

اس مصروفیت میں اس کے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ وہ کسی سے ملے یا کہیں تفریح کے لیے جائے۔ بس شرمین اور میٹ سے ملاقات ہو جاتی تھی وہ بھی کئی دن بعد بس کچھ دیر کے لیے، اس دن کے بعد شرمین نے اسے ایک بار پھر ڈنر پر بلایا تھا لیکن اس نے معذرت کر لی، اس نے شرمین سے کہا۔ ”اب میری باری ہے اور میں نے سوچا ہے ہم کہیں باہر چلیں گے لیکن اس کے لیے کچھ عرصے انتظار کرنا ہوگا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ شرمین نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے اس لیے تو تمہیں ڈنر پر نہیں بلایا تھا۔“

”میں جانتا ہوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ ہر بار تم ہی سب کرو۔“

بریڈ اپنے اور گریم جیکسن کے لیے گھر میں ہی سب بنا لیتا تھا۔ ناشا سادہ ہوتا تھا دودھ، ڈبل روٹی اور ابلے ہوئے انڈے کے ساتھ کافی۔ دوپہر کے لیے وہ سینڈوچز بنا لیتا تھا اور رات کو گوشت کی کوئی ڈش بنا لیتا۔ ان کا گزارا ہو جاتا تھا۔ ٹرک بن کر آ گیا تو وہ گریم جیکسن کو گھمانے پھرانے بھی لے جاتا۔ گریم جیکسن پوتے کی اس خدمت گزاری سے بہت خوش تھا اور اب اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں، ساتھ ہی وہ اکثر بریڈ پر زور دیتا کہ وہ شرمین کے بارے میں سوچے۔ وہ اچھی عورت تھی لیکن بریڈ اسے ٹال جاتا تھا۔ شاید وہ شرمین کے بچوں کی وجہ سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ اول تو وہ گھر سے باہر کم آتے تھے اور اگر کبھی بریڈ سے ان کا سامنا

ہو جاتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے تھے۔ ہاں ساتھ ہوتی مجبوراً ہیلو ہائے کر لیا کرتے تھے۔ ان کے رویے سے بریڈ کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے، دوسری طرف شرمین اس سے بے تکلف تھی لیکن اس کے انداز میں پسندیدگی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

ستمبر کے آخر تک بارشیں ختم گئی تھیں اور بریڈ کی سبزیاں تیاری کے مرحلے تک آ گئی تھیں۔ پودے پوری طرح بڑے ہو چکے تھے اور اسے امید تھی کہ اکتوبر کے وسط تک سبزی پک جائے گی اور سب سے پہلے اس کی سبزی ہی منڈی تک پہنچے گی اس لیے اسے سب سے اچھی قیمت ملے گی۔ شرمین نے مکئی کی فصل سے بھٹوں کی چٹائی شروع کر دی تھی۔ اس کے دونوں ملازم روز بھٹے اتار کر پوریوں میں بھر کر منڈی لے جا رہے تھے۔ بریڈ کو فرصت ملتی تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ اس طرح وہ شرمین کے احسان کا بدلہ بھی اتار رہا تھا جو اس نے ضرورت کے وقت اپنے ملازم بھیج کر کیا تھا۔ ملازم بھی خوش تھے کہ ان کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا کیونکہ فصل اتارنے کے دنوں میں ایک لمحے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ بریڈ فکر مند تھا سبزی نکالنے کے لیے کہیں زیادہ محنت کی ضرورت تھی اور اس کے پاس اب اتنی رقم نہیں رہی تھی کہ زیادہ مزدور حاصل کر سکے اور اگر وہ کم افراد کے ساتھ سبزی نکالتا تو وہ تاخیر سے منڈی تک پہنچتی اور اس کی قیمت گر جاتی جبکہ مزدوروں کو معاوضہ اتنا ہی دینا پڑتا۔ اس مسئلے کا ایک حل تو شرمین کے ملازموں کی صورت میں تھا۔ شرمین نے اس سے کہا کہ جب مکئی کی فصل اتر جائے تو وہ اپنے ملازموں کو اس کی طرف بھیج دے گی سورج مکھی کی فصل تقریباً ایک مہینے بعد اترے گی اور اس ایک مہینے میں بریڈ ملازموں سے کام لے سکتا تھا۔

اس کے باوجود بریڈ کو دو افراد مزید درکار تھے۔ چار آدمی مل کر روز ایک ہیکٹر سے سبزی اتار سکتے تھے۔ بریڈ کا کام سبزی کو منڈی تک پہنچانا تھا۔ اس نے میٹ سے بات کی لیکن میٹ ان دنوں خود اپنی زمین پر مصروف ہوتا۔ مجبوراً بریڈ کو مہینے داموں دو مزدور حاصل کرنا پڑے۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کا معاوضہ کام ختم ہونے کے دو دن کے اندر ادا کر دے گا۔ خوش قسمتی سے وہ مان گئے۔ چودہ اکتوبر کے دن بریڈ نے پہلی آزمائشی سبزی نکال کر دیکھی۔ وہ بہترین انداز میں تیار تھی۔ اگلے دن سورج ٹپکتے ہی اس نے سبزی نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے ٹرک میں ڈھائی ٹن کی گنجائش تھی اور ایک ہیکٹر سے تقریباً بارہ ٹن سبزی

نکل رہی تھی، اس کا مطلب تھا اسے دن بھر میں منڈی کے پانچ چکر لگانے تھے۔ پہلا دن تھا اور منڈی میں تاجر تیار بیٹھے تھے اس لیے بریڈ کو ہاتھ لیا گیا اور اس نے سب سے زیادہ دام لگانے والے سے سودا کر لیا۔ لیکن اس نے اگلے دن کا سودا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ اگلے دن قیمت بڑھ جاتی بس یہی ایک ہفتہ تھا جس میں وہ اپنی پسندیدگی قیمت حاصل کر سکتا تھا اس کے بعد دوسرے کسانوں کی فصل آنا شروع ہو جاتی تو قیمت خود بخود گر جاتی۔

آنے والے دس دن بریڈ پاگلوں کی طرح لگا رہا تھا وہ صبح چھ بجے اٹھ جاتا اور جب آخری چکر لگا کر واپس آتا تو عام طور سے رات کے نو دس بج چکے ہوتے تھے۔ آخری چکر میں وہ حساب کتاب کرتا اور رقم وصول کرتا تھا۔ یہ رقم وہ منڈی میں رات تک کھلے رستے والے بینک میں جمع کر دیتا تھا۔ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس یا سوشل سیکیورٹی کارڈ نہیں تھا اس لیے منڈی کے ایک تاجر کی ضمانت پر اس کا اکاؤنٹ کھلا تھا۔ منڈی سے باہر ہزاروں ڈالر کی رقم لے کر ٹھکانا خطرے سے خالی نہیں تھا جبکہ اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ صرف اتنی رقم لاتا جو اگلے دن مزدوروں کی تنخواہ کے لیے کافی ہو۔ دس دن میں ساری سبزی اتر کر منڈی جا چکی تھی اور فارم خالی ہو گیا تھا اور وہاں صرف پودوں کے بیج جانے والے حصے پڑے تھے۔ بریڈ کا ارادہ تھا کہ جب یہ خشک ہو جائیں گے تو انہیں جلا کر زمین میں ملا دے گا، اس سے زمین کی زرخیزی واپس آ جائے گی لیکن میٹ نے اس سے اپنے جانوروں کے لیے یہ پودے مانگ لیے تو بریڈ نے اسے دے دیے۔ اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ ڈالر ز سے زیادہ رقم آچکی تھی اور یہ رقم تمام اخراجات نکال کر تھی۔ گریم جیکسن یہ سن کر خوش ہوا تھا۔

”میرے بچے تم نے محنت کی ہے اور یہ اس کا صلہ ہے۔“

”آپ کل تیار رہے گا میں نے ایک ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ لے لیا تھا وہ کل آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرے گا۔“

”تم کہتے ہو تو میں چلتا ہوں ورنہ میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے بیٹائی کی مکمل بحالی کا امکان مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے کہا۔ ”ایک مختصر آپریشن سے یہ اس قابل ہو جائیگا کہ روشنی اور تاریکی میں فرق محسوس کر سکیں۔“

ڈاکٹر نے آنکھوں میں ڈالنے اور کھانے کے لیے کچھ دوائیاں دیں اور ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔ گریم جیکسن کو گھر چھوڑ کر بریڈ، شرمین کے پاس پہنچا۔ وہ اب سورج مکھی کی فصل اتروا رہی تھی اور اس میں زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی اس لیے بریڈ کے فارم پر کام کرنے والے اب اس کے فارم پر کام کر رہے تھے۔ شرمین ٹکرائی کر رہی تھی۔ اس نے گرم جوش سے بریڈ کا استقبال کیا۔ ”مبارک ہو، تمہاری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔“

”شکر یہ، تمہاری فصل بھی اچھی ہوئی ہے۔“ بریڈ نے جواب دیا اور فارم کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال ہے کل تک یہ کام منٹ جائے گا۔“

”ہاں کل تک سب صاف ہو جائے گا۔“ شرمین بولی۔ ”اس کے بعد پودوں کی چھٹائی کا کام ہوگا وہ میں دو دن کا وقفہ دے کر کراؤں گی۔“

”میٹ نے تم سے بچے ہوئے پودے نہیں مانگے؟“

”مانگے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرا ارادہ انہیں جلا کر زمین میں ملانے کا ہے، سنا ہے تم نے دیدیے ہیں۔“

”ہاں مجھے انکار کرتے ہوئے اچھا نہیں لگا اس نے بھی میرا بہت ساتھ دیا ہے۔“

”لیکن اس سے ہوشیار رہنا، وہ بہت عیار آدمی ہے کسی کی کمزوری بھانپ جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو، میری ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔“ بریڈ نے کہا۔ ”ویک اینڈ کے ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”خیال تو اچھا ہے اور میں فارغ بھی ہوں گی۔“

”باؤنٹی چلیں، سنا ہے وہاں کا کھانا اور ماحول بہت اچھا ہوتا ہے۔“

شرمین خوش ہو گئی۔ ”کیوں نہیں، مجھے خود وہاں کا کھانا اچھا لگتا ہے۔“

”بس تو طے ہے، میں شام چھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔“

”اتنی جلدی؟“

”ہاں، میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

چھ سے رات گیارہ بجے تک کا وقت بریڈ نے بہت اچھا گزارا تھا۔ اس نے شرمین کے ساتھ کھانے اور ماحول دونوں کو انجوائے کیا تھا۔ ڈنر سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل کے بار میں آئے۔ باتوں کے دوران اچانک شرمین نے اس کی کنپٹی کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ چوٹ کیسے لگی؟“

اور یوں۔۔۔ ”ٹھیک ہے میں بریڈ نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟“

پاپی برید کوئی اور بولا۔ "ایک منٹ رکو میں تمہیں ہائی وے تک چھوڑ آتا ہوں۔"

اگر آپ نہیں کوئیں آپ کو روزانہ سیریں دے دیا۔
لے جاسکتا ہوں۔“ بریڈ اسے برآمدے تک لایا۔

M-20A الرحمان خرید سیسٹر با لمقابل سندھ داسہ راپی

خوشخبری

طلسماتی انگٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ یمنی، عقیق، ہیکھراج، لاجورد، سیلم، زمرود، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفسر اپنی طرف مائل، نا فرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، حج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردوعورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطه: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالقابل سندھ مدرسه کراچی

طرح وہ سال میں دو بار فصل حاصل کر سکتا تھا۔ وہ گریم جیکسن سے اس بارے میں تبادلہ خیال کرتا رہا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے میٹ کی دھمکی کی کوئی پروا نہ ہو۔ دو تین دن وہ دوسرے کاموں میں مصروف رہا۔ اس نے تہ خانے میں لگا بوائے اور ہیٹنگ کا نظام درست کر لیا تھا۔ بھٹی میں لکڑی ڈال کر اسے چلا دیا تھا۔ یہ بھٹی نہ صرف گھر کو گرم رکھتی تھی بلکہ گرم پانی کی ضرورت بھی پوری کرتی تھی۔ اس نے گھر میں نیا فریج چھڑا دیا تھا۔ نشست گاہ کو نئے سرے سے آراستہ کیا تھا۔ کچن کے لیے نئی ڈائننگ میز اور کرسیاں لایا تھا۔ اپنے اور گریم کے بیڈروم کے لیے فریج اور نیا سامان لایا تھا۔ گریم جیکسن کو موسیقی کا شوق تھا، اس کے لیے ایک آسانی سے استعمال ہونے والا سی ڈی پلیئر اور اس کی پسندیدہ موسیقی کی سی ڈیز لایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میٹ کی بات اور دھمکی کو اس نے اپنے ذہن سے بالکل نکال دیا ہو۔

نومبر کے آغاز میں اس نے پہلی برف باری سے پہلے فارم کی باڑھ کی از سر نو تعمیر شروع کر دی تھی۔ اس کام کے لیے اس نے ایک مزدور بھی حاصل کر لیا تھا۔ کئی ٹرک بھر کر لکڑی کے مضبوط تختے فارم پر آئے تھے۔ ہفتے بھر کے اندر بریڈ نے پرانی باڑھ نکال کر نئی باڑھ لگا دی تھی۔ باڑھ کی تکمیل کے فوراً بعد اس پر پینٹ کا کام شروع کر دیا اور دو دن میں یہ کام بھی تمٹ گیا۔ پرانی باڑھ کی لکڑی کے ٹکڑے کر کے انہیں سردیوں میں جلانے کے لیے شیڈ میں محفوظ کر لیا۔ جب کام مکمل ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس رات کے ڈنر کے بعد سے اس کی شرمین سے ملاقات نہیں ہوئی، اسے فرصت نہیں ملی تھی لیکن شرمین نے بھی اس دوران میں اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ شرمین کے فارم پر پہنچا تو شرمین مکان کے سامنے ہی اپنی گاڑی کی صفائی کر رہی تھی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ شرمین نے جواب دیا لیکن اس کا لہجہ سرد تھا۔ بریڈ نے چونک کر اسے دیکھا مگر شرمین اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے کام میں مگن رہی۔ بریڈ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”میرا خیال ہے تم مصروف ہو۔“

”ہاں۔“ شرمین نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔

”اور آئندہ بھی مصروف رہوں گی۔“

بریڈ سمجھ گیا تھا، اس نے گہری سانس لی۔ ”کیا میٹ

نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

”کیا اس نے غلط کہا ہے؟“

”اس کی بات چھوڑو یہ بتاؤ کیا میں تمہیں دھوکے لگتا ہوں جو کسی اور کی شخصیت اختیار کر سکتا ہوں؟“

شرمین کے تاثرات میں ذرا نرمی آئی۔ ”نہیں، اب تک نہیں سمجھ سکی ہوں لیکن میٹ نے ایسا کیوں کہا ہے؟“

”اگر میں بریڈ نہیں ہوں تو اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہوگا کیا اس نے تم سے ثبوت کے ساتھ بات کی ہے؟“

شرمین ہچکچائی۔ ”نہیں، اس نے ثبوت تو کوئی نہیں بتایا ہے لیکن وہ یقین سے کہہ رہا ہے۔“

”اور تم نے یقین کر لیا۔“ بریڈ نے تلخی سے کہا۔

”بریڈ، وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے آخر وہ تمہارے خلاف ایسی بات کیوں کر رہا ہے؟“

”اس نے مجھ سے بھی کہا تھا اور راز کی قیمت پچاس ہزار ڈالر زمانگی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تو وہ انتقامی کارروائی پر اتر آیا ہے۔“

”وہ لالچی ہے، لیکن اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟“ شرمین کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”کیونکہ جھوٹ بولنے کے لیے ایک ذرا سی زبان ہلانی پڑتی ہے۔“ بریڈ نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ شرمین اسے جاتے دیکھتی رہی لیکن اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے فارم کے گیٹ کے پاس پہنچا تو اسے کچھ ہی دور میٹ دکھائی دیا۔ وہ قاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ بریڈ اس کی طرف بڑھا تو وہ محتاط ہو گیا اور عیاری سے بولا۔

”مل آئے شرمین سے؟“

”تم نے اس سے بکواس کی ہے۔“

”ابھی میں نے صرف شرمین سے کی ہے اگر میں نے تمہارے گریڈ پایا پولیس سے یہ بکواس کر دی تو تم سوچ سکتے ہو کہ تم کہاں ہو گے۔ پھر تمہیں پولیس کے سامنے ثابت کرنا پڑے گا کہ تم اصل بریڈ ہو اور یہ بات تم کسی صورت ثابت نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں ثابت کر سکتا؟“

”اس لیے کہ اصل بریڈ جیکسن مرچکا ہے۔“ میٹ نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔

”یہ بات تم کسے کہہ سکتے ہو؟“

”اسے چھوڑو لیکن ضرورت پڑی تو میں پولیس کی رہنمائی کر سکتا ہوں، مجھے معلوم ہے اصل بریڈ جیکسن کی لاش کہاں ہے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”تم یہ سب پچاس ہزار ڈالر

کے لیے کر رہے ہو؟“

”ہاں، تم سوچو صرف پچاس ہزار ڈالر دے کر تم مزے سے بریڈ جیکسن بنے رہ سکتے ہو۔“

”اور جو تم شرمین سے کہہ چکے ہو۔“

”میں ہی دوبارہ اس سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔“ میٹ نے ڈھٹائی سے کہا۔

”ایک بار میں تمہیں پچاس ہزار ڈالر دیدوں گا تو اس کے بعد تم دوبارہ مجھ سے رقم کا مطالبہ کرو گے اور میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”میں یقین دلاتا ہوں کہ میں دوبارہ تم سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔ اس کے بعد میں تمہیں حتمی جواب دوں گا۔“

”اوکے، تم دو دن سوچ سکتے ہو۔“ میٹ نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن اس کے بعد تمہیں ایک فیصلہ کر لینا ہوگا۔ مجھے امید ہے تم ایسا فیصلہ کرو گے جو ہم دونوں کے لیے بہتر ہو۔“

میٹ کے جانے کے بعد بریڈ فارم کے احاطے میں داخل ہوا تھا کہ ٹھنک گیا کیونکہ قریب ہی گریم جیکسن کھڑا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس ہی تھا اور شاید اس نے میٹ اور بریڈ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ کم سے کم اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے کہا۔ ”کون... بریڈ؟“

”جی گریڈ پا۔“

”یہ میٹ کیا بکواس کر رہا تھا تم اسے پچاس ہزار ڈالر دے کر کس طرح بریڈ جیکسن بن سکتے ہو؟“

”گریڈ پا۔“ بریڈ نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ”اگر آپ نے کچھ سن لیا ہے تو اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ میٹ بکواس ہی کر رہا تھا۔“

گریم جیکسن نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تند لہجے میں بولا۔ ”تب تم نے اسے پچاس ہزار ڈالر دینے کی بات کیوں کی؟“

”گریڈ پاپلیز، مجھ پر اعتماد کریں، میٹ کسی غلط فہمی کا شکار ہے اور میں جلد اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔“

وہ گریم جیکسن کو اندر لے آیا، اس نے دیکھا بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے گریم جیکسن کو کرسی پر بٹھایا اور اندر چلا گیا۔ کرسی پر جھولتے گریم جیکسن کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے آنسو چہرے پر گر

رہے ہیں۔ شاید وہ خود سے سوال کر رہا تھا کہ بریڈ اس کا پوتا ہے یا نہیں؟ بریڈ کے آنے سے اسے جیسے پھر سے زندگی مل گئی تھی۔ کیا اس سے یہ زندگی چھن جائے گی؟

☆☆☆

بریڈ نے میٹ کے سامنے پچاس ہزار ڈالر کے نوٹ ایک بنڈل میں بندھے رکھے۔ اس نے بے تابی سے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن بریڈ نے بنڈل واپس کھینچ لیا۔ ”نہیں دوست، سودا اس طرح نہیں ہوگا۔“

”پھر کس طرح ہوگا؟“ میٹ کا منہ بن گیا۔

”مجھے ٹھوس ضمانت چاہیے کہ تم آئندہ مجھے بلیک میل نہیں کرو گے۔“

”یہ ضمانت میں کس طرح دے سکتا ہوں؟“

”تم آسانی سے ضمانت دے سکتے ہو۔“

”کس طرح؟“

”بریڈ جیکسن کی لاش کہاں ہے۔ اس جگہ کی نشان دہی کر دو، اس طرح مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ آئندہ تم مجھے کبھی بلیک میل نہیں کر سکو گے۔“

میٹ سوچ میں پڑ گیا۔ ”تم لاش کا کیا کرو گے، اب تو وہاں ہڈیاں رہ گئی ہوں گی۔“

”لیکن ان ہڈیوں سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس کی ہیں۔ نہیں دوست، میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر تمہیں پچاس ہزار ڈالر چاہیں تو لاش میرے حوالے کرنا ہوگی میں ان ہڈیوں کو کہیں اور دفن کر دوں گا جہاں کوئی ان کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔“

میٹ سوچ میں پڑ گیا، اس کی نظریں رقم پر بھی مرکوز تھیں۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ بریڈ کا مطالبہ پورا کرے یا نہ کرے۔ بریڈ نے اس کی کشمکش محسوس کر لی تھی، اس نے کہا۔ ”اگر تم نے میرا مطالبہ نہ مانا تو میں بلیک میل ہونے کے بجائے فرار کو ترجیح دوں گا۔ میرے پاس رقم ہے۔ تم یا پولیس کوئی مجھے تلاش نہیں کر سکے گا اور تمہیں ایک ڈالر بھی نہیں ملے گا۔“

اس دھمکی نے میٹ کو فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ ”مجھے منظور ہے۔ لیکن میں آج رات تمہیں لے جا کر دکھا سکوں گا۔“

بریڈ نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے لیکن یاد رکھنا، دھوکے کی کوشش مت کرنا۔“

”کیا مطلب... میں کیا دھوکا دوں گا؟“

”یہی کہ مجھے غلط ہڈیاں پکڑا دو۔“

”فکر مت کرو، میں گورکن نہیں ہوں جو کہیں سے ہڈیاں لا کر تمہیں پکڑا دوں گا، میں تمہیں بریڈ جیکسن کی قبر پر لے جاؤں گا جو ایک جنگل میں ہے اور تم اس کی حالت سے خود اندازہ کر لو گے کہ وہ کب سے وہاں دفن ہے۔“

”رات کس وقت چلنا ہوگا؟“

”بارہ بجے کے بعد۔“ میٹ نے کہا۔ یہ ساری گفتگو میٹ کے فارم کے احاطے میں ہو رہی تھی۔

بریڈ واپس گھر آیا اور ڈنر کی تیاری میں لگ گیا۔ باہر موسم سرمئی ہو رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا آج کسی وقت سرما کی پہلی برف باری شروع ہو جائے گی۔ شام ہوتے ہی آسمان سے برف گرنے لگی تھی۔ ڈنر کے بعد بریڈ، گریم جیکسن کو اس کے کمرے میں لے گیا اور اسے لٹانے لگا تو اس نے بریڈ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میرے بچے، مجھے صرف ایک بات کا جواب دیدو، اس کے بعد تم مجھے قتل کرنا چاہو گے تب بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم میرے پوتے ہو یا نہیں؟“

”گریڈ پا میں آپ کا پوتا ہوں۔“ اس نے پختہ لہجے میں کہا۔

گریم جیکسن نے گہرا سانس لیا۔ ”مجھے یقین ہے میرے بچے، میٹ ایک جھوٹا اور سازشی آدمی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں گریڈ پا، آج کے بعد اس کا منہ بند ہو جائے گا۔“

”ہاں وہ جھوٹا ہے۔“ گریم جیکسن نے یوں زیر لب کہا جیسے خود کو یقین دلارہا ہو۔ بریڈ لائٹ بند کر کے اس کے کمرے سے نکل گیا۔ بارہ بجے کے قریب وہ تیار ہو کر نیچے آیا اور خاموشی سے گیٹ کھول کر باہر نکل آیا۔ برف باری ہو کر رک چکی تھی اور اب تیز کاٹ دار ہوا چل رہی تھی۔ میٹ کچھ دیر بعد اپنے فارم سے اپنی گاڑی میں نکلا۔ اس نے بریڈ کے قریب گاڑی روکی۔ وہ بیٹھ گیا اور میٹ نے گاڑی آگے بڑھا دی، ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے شمال کا رخ کیا۔ یہاں فارم ختم ہونے کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ میٹ نے پوچھا۔

”تم رقم لائے ہو؟“

بریڈ نے اسے رقم کا بنڈل دکھایا اور پھر جیب سے پستول نکال کر دکھایا۔ ”خیال رہے میرے پاس یہ بھی ہے اس لیے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

”مجھے دھوکا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میٹ بولا۔ ”وہی اپنے بارے میں کیا خیال ہے، تم ایک بوڑھے

علاج

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے سردرد کی شکایت کی تو سہیلی نے مشورہ دیا۔ ”جب میرے سر میں درد ہوتا ہے تو میرا شوہر بڑے پیار سے میرا سر دباتا ہے اور اتنی محبت کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم بھی یہ نسخہ آزما کر دیکھو۔“

”ہاں ضرور... تمہارا شوہر کب تک گھر آئے گا؟“ عورت نے اشتیاق سے پوچھا۔

مرسلہ: ساجدہ راجہ، ہندواں سرگودھا

غیر شادی شدہ

نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوٹل کا سراغ رساں ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں ایک نوجوان جوڑا مقیم تھا، اس نے جوڑے پر الزام لگایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور ان کا ہوٹل ایسے جوڑوں کے قیام کی اجازت نہیں دیتا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم...؟“ لڑکی غصے سے چلائی۔ ”تم مجھے غیر شادی شدہ کہہ رہے ہو؟ اگر میرا شوہر یہاں موجود ہوتا تو تمہارے دانت توڑ دیتا۔“

مرسلہ: ساجدہ راجہ، ہندواں سرگودھا

آؤ مسکرائیں ساحل کے سنگ

☆ چاقو دیکھ کر بچے نے کہا۔ ”یہ آرسی کا بچہ ہے جس کے ابھی دانت نہیں نکلے۔“

☆ فون کی گھنٹی بجی خوب صورت حنا فون کی طرف لپکی مگر اس سے پہلے ننھے مجاہد نے ریسیور اٹھالیا دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ ”آپ نے غلط نمبر ملا یا ہے میں کسی خوب صورت بہن کا بھائی نہیں۔“

☆ بیوی۔ ”میں مرجاؤں گی تو تمہیں مجھے جیسی بیوی نہیں ملے گی۔“

☆ شوہر۔ ”مگر میں تمہارے جیسی تلاش ہی کیوں کروں گا۔“

☆ بایک آہستہ چلائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ شوہر بولا۔ ”تم بھی میری طرح آنکھیں بند کرلو۔“

انتخاب: مقبول عاشق، خوشاب

اور معذور آدمی کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟
”کیا مطلب؟“

میٹ ہنس۔ ”میں نے دیکھا تھا تم اسے ڈرائیو کر رہے تھے اب وہ کسی حادثے میں مر جائے تو یہ زمین اور سب کچھ کس کا ہوگا۔“

”تم بکواس کرنے کے بجائے ڈرائیو کرو۔“ بریڈ نے سرد لہجے میں کہا۔ میٹ ہنس جیسے اسے چڑا رہا ہو۔ پچاس ہزار ڈالر ملنے کے خیال سے ہی اس میں ایک ترنگ سی آگئی تھی۔ ہاگ ٹاؤن سے تقریباً دس کلومیٹر کے بعد اس نے اپنی گاڑی ہائی وے سے جنگل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دی تھی۔ کچے راستے پر پچکولے کھاتی گاڑی تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد رگ گئی۔ یہاں ایک خاصی بڑی چٹان تھی جسے چاروں طرف سے بلند درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ جیسے ہی میٹ نے انجن بند کیا، بریڈ نے پستول نکال لیا۔ میٹ گھبرا گیا۔

”یہ کیا۔۔۔ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو میں نے یہ سب ایک جگہ لکھ کر رکھا ہے اور مجھے کچھ ہو گیا تو پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔“

”میرا تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنا اطمینان چاہتا ہوں، اب نیچے اتر دو۔“

وہ نیچے اتر آئے، میٹ کھدائی کے آلات ساتھ لایا تھا۔ اس نے آلات سنبھالے اور چٹان کے ایک طرف جہی زمین کھودنے لگا۔ بریڈ پستول لے کر اس کے سر پر موجود تھا۔ میٹ پریشان تھا اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اسے گولی نہ مار دے۔ تقریباً چار فٹ کی کھدائی کے بعد تیلچہ ایک بوری سے نکلا۔ میٹ نے اس کے آس پاس سے مٹی صاف کی اور پھر بوری کھینچ کر نکال لی۔ اس میں لاش دفنائی گئی تھی لیکن اب صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں اس لیے وہ بہت ہلکی ہو رہی تھی۔ میٹ نے ہانپتے ہوئے بوری زمین پر پھینک دی اور بولا۔

اس میں ہے اصل بریڈ جیکسن کی لاش یا اس کی ہڈیاں۔
”اسے کھولو۔“ بریڈ نے حکم دیا تو میٹ نے بادل تا خواستہ بوری کھولی جس سے بدبو کے پھپکے اٹھ رہے تھے۔ وہ بوری کھولتے ہی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بریڈ نے ٹارچ کی روشنی بوری میں ڈالی، اس میں ٹوٹ پھوٹ جانے والا ڈھانچا موجود تھا۔

”اب میرے پچاس ہزار ڈالر دو۔“ میٹ نے مطالبہ کیا۔

”ضرور۔۔۔ لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ

اصل بریڈ جیکسن کی لاش یہاں کیسے آئی اور اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

میٹ بولکھلا گیا، اسے بلیک میل کرنے کے چکر میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ اسے لاش کے بارے میں وضاحت کرنی پڑے گی۔ اس نے تھوک نکل کر کہا۔ ”تمہیں اس سے کیا، تمہیں بریڈ جیکسن کی لاش درکار تھی۔ وہ میں نے دیدی اب تم جہاں چاہے اسے دفن کرو اور مجھے پچاس ہزار ڈالر دو۔“
”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ دیکھو یہ راز ہم دونوں کا ہوگا اس لیے تمہیں بتا دینا چاہیے۔“

میٹ نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا بریڈ سے جھگڑا ہوا تھا اور لڑائی کے دوران اسے چوٹ لگ گئی اور وہ مر گیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا اگر پولیس کو اطلاع دیتا تو میں ہی گرفتار ہو جاتا۔ اس لیے میں نے لاش خاموشی سے لا کر یہاں دفن کر دی اور مشہور یہ کر دیا کہ بریڈ جیکسن گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کیونکہ میں اس کا سب سے قریبی دوست تھا اس لیے اس کے گرینڈ پاسیت سب نے میری بات پر یقین کر لیا۔ اس دنیا میں صرف میں جانتا ہوں کہ بریڈ مر چکا ہے اس لیے جب تم بریڈ بن کر آئے تو میں پہلے دن سے جانتا تھا کہ تم دھوکے باز ہو لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ تم کیا کرتے ہو؟“

”تم اس لیے انتظار کر رہے تھے کہ تم شروع دن سے مجھے بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔ پولیس کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، الٹا یہ سوال سامنے آتا کہ تم مجھے اتنے یقین سے جعلی بریڈ کیسے کہہ رہے ہو؟“

میٹ نے دانت نکالے۔ ”ٹھیک کہا تم نے ہم دونوں ایک دوسرے پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ تم میرا راز رکھو اور میں تمہارا راز رکھوں گا۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ بریڈ نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ ”شیرف، تم آسکتے ہو، تم نے میٹ کا اعتراف جرم تو سن لیا ہوگا۔“

جب چاروں طرف سے پولیس نے پلخار کی اور میٹ کو ہتھکڑیاں لگیں تو اس کی حالت غیر ہو گئی تھی، اس نے چلا کر کہا۔ ”یہ شخص بھی مجرم ہے، یہ نقلی بریڈ جیکسن ہے اسے بھی گرفتار کرو۔“

لیکن مقامی شیرف اس سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ ”مسٹر فریڈ ہم تمہارے شکر گزار ہیں تمہاری وجہ سے اسے پھانسی

جرم کا سراغ ملا ہے اور اب مجرم کو سزا ملے گی۔“
میٹ آخری لمحے تک شور مچاتا رہا لیکن کسی نے اس کے شور پر توجہ نہیں دی تھی۔ اگلی صبح وہ گریم جیکسن کو ناشتا کرا رہا تھا کہ شرمین آگئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”یہ میں کیا سن رہی ہوں، کیا یہ سب سچ ہے؟“
”ہاں یہ سچ ہے۔“

”تم بریڈ جیکسن نہیں ہو؟“
”ہاں میں بریڈ جیکسن نہیں ہوں۔“

گریم جیکسن کے ہاتھ سے کافی کامگ چھوٹ گیا، وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے پوتے ہو؟“

”یہ درست ہے گرینڈ پا! میں فریڈ جیکسن ہوں۔ جب ماما اور پاپا الگ ہوئے تو مجھے ماما نے لے لیا تھا اور بریڈ آپ اور پاپا سے اٹھ چکا تھا اس لیے وہ یہاں رہ گیا۔ ماما مجھے لے کر ٹیکساس چلی گئی تھیں۔ مجھے یہاں کا نہیں پتا تھا لیکن اتفاق سے ایک دن ماما کے کاغذات میں یہاں کا پتا نکل آیا اور میں نے خط لکھا۔ بریڈ نے اس کا جواب دیا۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا کوئی بھائی بھی ہے۔“

گریم جیکسن رو رہا تھا۔ ”ہاں، میں نے اور تمہارے باپ نے اسے نہیں بتایا تھا۔“

”مجھے پا کر وہ بہت خوش تھا لیکن اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی صحبت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا دوست میٹ اسے اکساتا تھا کہ وہ اپنے دادا کی رقم چرائے اس کے بعد وہ دونوں شہر بھاگ جائیں گے مگر بریڈ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ براہی لیکن گرینڈ پا سے بہت محبت کرتا تھا۔ پھر اچانک اس کے خط آنا بند ہو گئے اور میں نے اسے جو خط لکھے وہ واپس آ گئے۔“

”بریڈ کے غائب ہونے کے صدے سے میں بہت بیمار ہو گیا تھا اور کئی مہینے اسپتال میں داخل رہا تھا۔“ گریم جیکسن نے کہا۔ ”اس دوران میں مکان خالی پڑا رہا تھا۔“

”ان دنوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کالج میں داخلہ لیا تھا۔ گریجویشن کے بعد میں نے پولیس جوائن کر لی تھی۔ یہ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ جب تک ماما زندہ رہیں میں کوشش کے باوجود یہاں نہیں آ سکا۔ پھر ایک سال پہلے ماما کا گردے کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ تب میں یہاں آیا اور مجھے پتا چلا کہ میرے خاندان پر کیا گزری ہے۔ میں نے فریڈ کے بارے میں انکوائری کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ بریڈ کی زندگی کے پیچھے کوئی جرم ہے۔ ورنہ وہ گھر سے بھاگتا

تب بھی مجھ سے تو رابطہ کر سکتا تھا لیکن وہ سرے سے غائب ہو گیا تھا اس لیے میں نے بریڈ بن کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ ہم دونوں بھائیوں کی شکلیں بھی ملتی تھیں اس لیے کسی کو شک نہیں ہوا۔“
گریم جیکسن سمجھ گیا تھا کہ بریڈ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا، اس نے دل مضبوط کر کے پوچھا۔ ”فریڈ، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

فریڈ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”سوری گرینڈ پا، بریڈ کو میٹ نے مار دیا تھا اور پھر اس کی لاش جنگل میں لے جا کر دفن کر دی تھی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور بریڈ کی لاش بھی مل گئی ہے۔“
گریم جیکسن نے فریڈ کا ہاتھ تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

ہاگ ٹاؤن کے قبرستان میں بریڈ جیکسن کی تدفین کے بعد وہ واپس آئے تو شرمین بھی ان کے ساتھ تھی۔ گریم جیکسن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اسے اس کے کمرے میں پہنچا کر فریڈ واپس نشست گاہ میں آیا تو شرمین نے اس سے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے، تم واپس چلے جاؤ گے؟“
”نہیں، گرینڈ پا کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں مستقل دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ میں انہیں ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ ایک تو وہ شہر کے عادی نہیں ہیں، دوسرے وہاں میں آٹھ سے بارہ گھنٹے گھر سے باہر ہوں گا تو ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“
”تم یہیں فارم پر کام کرو گے، ویسے تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تم یہی کام کرتے آئے ہو؟“

”یہ درست ہے، ٹیکساس میں ہم جہاں تھے وہاں میں نے کالج تک ایک فارم میں کام کیا تھا اس لیے مجھے سب معلوم ہے۔“

”تمہاری ملازمت کا کیا ہوگا؟“
”میں استغنیٰ دے رہا ہوں۔“

شرمین خوش ہو گئی تھی۔ ”یہاں رہ جانے کی بس یہی وجہ ہے؟“

فریڈ نے پُر خیال نظروں سے شرمین کی طرف دیکھا۔ ”ہاں ایک وجہ اور بھی ہے لیکن کچھ بچوں کا مسئلہ ہے۔“
شرمین کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے جھینپ کر کہا۔ ”تم بچوں کی فکر مت کرو انہیں وینڈل کیا جاسکتا ہے۔“



کشکول

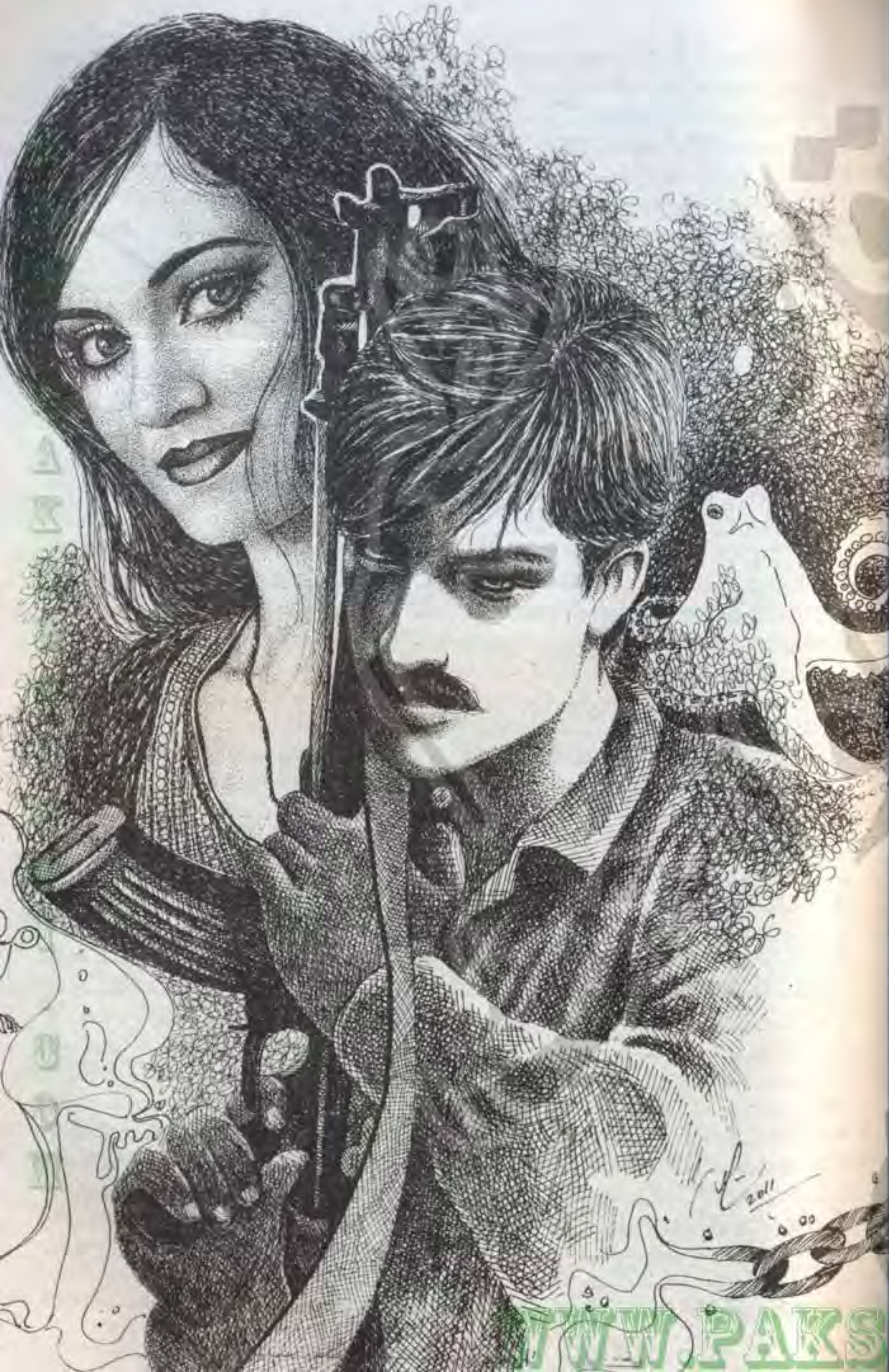
انوار صدیقی

سرور احمد خیر

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیر سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ بھی جھٹکے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو ذہنی تعلیم کے زور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحمن نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحمن کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعا مانگی، فرحمن سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی بیٹی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحمن نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ قام دراز قد شخص پر تاب بھونچ کر برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحمن کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیو ملا جس میں سفلی کے کندے عمل والی جان لیوا سوزیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیو سے سوزیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشہ لینے جاتا ہے تو جب ایک ٹائریڈ شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ ٹائریڈ کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھو لدا رسی کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ ٹائریڈ خود چھو لدا رسی کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں گھوم رہی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں ٹائریڈ لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر ٹائریڈ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس الاشوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی ماپوسی کے عالم سے دو چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سینٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیو ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سینٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم ملے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سینٹھ عثمان کا روبرو باری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں بیخ حاد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر باغیا کا مقامی سرخندہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ بیخ حاد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر قسم کی نیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی بیخ حاد کی اسلیٹ سے ناواقف تھا۔ بیخ حاد کے خائنین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ربیع کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈومالوچین اور سیام نام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سینہ اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان بیخ حاد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے کے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک سماجی شہینم کو پسند



کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روٹی سے گھبرائی ہوئی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روٹی کو اغوا کر کے اس کی خراب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحمن کو بھی اغوا کر رہا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آ جاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آ جاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابلِ احترام اسوار پر یو یو کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی عظیم احمد کے ریناز ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حاکمت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش بھی کاٹھکا ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی عظیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریریں شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی کنیتیں شروع کرتا ہے۔ اسپیکر وائش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخیز ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دائیں سمیت آگ لگو دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ شبنم ٹھن حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کو بھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کو بھی کی ایسی میں لیاقت حسین اور فرحمن بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تباہ بجوٹن جو سٹپل کا ماہر تھا، اپنے نیو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر براہِ راست شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتی ہیں۔ وہ باز آئے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روٹی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکورٹی کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک ہنگامے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پورے دو بجسکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو محفل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روٹی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جولیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذاتِ خود قماش دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ ٹھن (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریناز ڈیوڈ پیٹک کا شیل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فریج پر کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق منجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابی کی خودکشی کی کنیتیں کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں طے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیسرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحمن کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال جبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوئی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت ست سنا تا ہے اورنگ زیب طرمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کپٹی شیخ حامد کے خلاف گھیراؤ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک گڑھی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دین پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کا روٹی کو ذمہ داری کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحمن نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروبار بدھڑی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ ٹھن سے ہی معاملہ ہوا ہے لہذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کر دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ کی ناکامی پر رنج جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی جھول میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابلِ اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد قہر ٹو کے کوڈے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت جی جوائن رورلڈ میں اسلم ڈنگ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی جھول میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے ٹھن اہم بندوں کی لاشیں بھی طاہوت میں بند اس کی حوصلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی انجینی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ ٹھن اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحمن کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پر تباہ بجوٹن اپنے عمل کے ذریعے بھارن مدھو کو فرحمن کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی ملاقات

ککشول

اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ٹریسا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر رنج ہوئی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواست گار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگ زیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی جھول میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنگ کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال کنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحمن کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک آئو رز دیا جبکہ میڈم روٹی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔

***** اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے *****

ایس پی اورنگ زیب خلاف توقع بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ شام کی چائے اس نے سراج اور الماس کے ساتھ ہی پی تھی پھر وہ سب ڈرائنگ روم میں آگئے جہاں گپ شب جاری رہی۔ گفتگو کے دوران مختلف ٹیلی فون بھی آتے رہے، باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، ساڑھے آٹھ بجے اورنگ زیب نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو الماس نے کہا۔ "اب کھانے کا وقت ہو گیا تو ہمارے ساتھ ہی دال روٹی کھالیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن جب سراج نے تلفظاً بھی اظہار نہیں کیا تو میں نے سوچا کہ کسی ہوٹل میں جا کر کھالوں۔"

"میں آپ کی اس شکایت کا برا نہیں مانوں گا اس لیے کہ یہ شعبہ الماس کا ہے۔" سراج نے مسکرا کر کہا۔ "میں روک لیتا اور آپ کے جانے کے بعد الماس برا مناتیں تو اپنا گزارا بھی....."

"پلیز سراج۔" الماس نے شوہر کو تیز نظروں سے گھورا۔ "بھائی اورنگ زیب کے لیے اس قسم کی کوئی بات کبھی مذاق میں بھی نہ کہیے گا۔"

"یہ مذاق میں نہیں سنجیدگی سے مجھے ٹالنا چاہتا تھا۔"

اورنگ زیب نے الماس کو اکسانے کی کوشش کی تو سراج نے الماس کو گھور کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے..... پھر آپ دونوں گھر میں ڈنر سے شوق فرمائیں۔ میں کسی بھٹیلا خانے سے پیٹ بھر کر آ جاتا ہوں۔"

اورنگ زیب نے سراج کا ہاتھ تھام کر دوبارہ اپنے قریب بٹھا لیا۔ رات کا کھانا بھی سب نے ایک ساتھ کھایا پھر اورنگ زیب نے الماس سے فرمائش کی۔ "آپ اگر میرے لیے بلیک کافی بنا دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"کیا رات بھی یہیں گزارنے کا ارادہ ہے؟" اس بار

سراج نے اورنگ زیب کو ہاتھ سے اشارہ کر کے الماس کو چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر کافی بنانے چلی گئی تو سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب سے کہا۔ "اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو آج آپ نے کسی خاص مشن کی تیاری پہلے سے طے کر رکھی ہے؟"

"میں تمہاری ذہانت کی تعریف پہلے بھی کر چکا ہوں۔" اورنگ زیب نے دتی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "ساڑھے دس بجے ایک ضروری کال آنے کے بعد تم بھی اس مشن میں میرے ساتھ شریک ہو گے اور پھر..... ہو سکتا ہے کہ آج کی رات ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی آرام کا موقع نہ ملے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کافی پینے کے بعد میں بھی کیل کاٹنے سے لیس ہو جاؤں۔"

اورنگ زیب نے اثبات میں گردن کو جنبش دی، الماس کافی لے آئی تو پھر ان کے درمیان ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، الماس اور اورنگ زیب ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ سراج دوسرے پر تھا۔ گفتگو کے دوران بھی وہ اورنگ زیب کی مشن والی بات کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے پہلی بار سنجیدگی سے الماس سے کہا تھا۔

"الماس..... کیا میں امید رکھوں کہ تم میرے لیے ہمیشہ کامیابی کی دعائیں کرتی رہو گی.....؟"

"اس وقت آپ کو اچانک اس حوالے کی ضرورت کیسے پیش آ گئی؟"

"ہو سکتا ہے آج کی رات میرے اور سراج دونوں کے لیے زندگی کا ایک موڑ ثابت ہو۔ میں اور سراج ساڑھے دس بجے کے بعد ایک بہت ہی خاص اور اہم مشن پر روانہ ہوں گے۔ نہیں، تم سراج کو مشکوک نظروں سے نہ دیکھو، ابھی تک سراج کو بھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں نے شام سے تمہارے گھر کیوں ڈیرا جمار کھا ہے۔"

”کیا آکٹوپس کے سلسلے میں کوئی مہم درپیش ہے.....؟“ الماس نے سنبھل کر پوچھا۔

”ہاں..... لیکن آج کی رات ہمارے لیے پہلی سیڑھی ہوگی۔ کامیابی کی صورت میں ہمارا جال آکٹوپس کے گرد اور مضبوط ہو جائے گا۔“

”خدا آپ دونوں کو اس خون آشام درندے کے خلاف کامیابی نصیب کرے جس نے نہ جانے کتنے شریف لوگوں کی زندگی کا سکون غارت کر رکھا ہے۔“

”پروگرام کیا ہے.....؟“ سراج نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔

”تم تیاری کر کے آ جاؤ۔ قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیا اطلاع ہے.....؟“

”میں نے جگا کو پورے پروگرام سے مطلع کر دیا ہے، وہ آپ کے حکم پر جان بھی دینے کو آمادہ ہے۔“

”دوسرے فریق کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے یا نہیں؟“ اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”مزاحمت ضرور کی جائے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ کچھ زندگیاں بلاوجہ کام آجائیں۔“

”بات اس کی سمجھ میں مشکل سے آئی ہے لیکن اس نے بھی آمادگی ظاہر کر دی ہے.....! قربانی کے بکرے کے بارے میں گھر کے بھیدی کو وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے ویسے امکانات یہی ہیں کہ وہ آج ہی سرخرو ہونے کی کوشش کرے گا۔“

”او۔ کے! میں تم سے دوبارہ خود رابطہ کروں گا لیکن ون منٹ..... ایمر جنسی کی صورت میں تم بھی مجھے کال کر سکتے ہو..... ٹھیک ہے، وش یو گڈ لک.....“

اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے سراج کو اٹھنے کا اشارہ کیا پھر الماس سے بڑی اپنایت سے بولا۔

”آج کی مہم میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن تم سراج کی طرف سے پریشان نہ ہونا..... سراج کی زندگی مجھے اپنے سے زیادہ عزیز ہے اور..... ہمیشہ رہے گی۔“

”میں آپ دونوں کے حق میں کامیابی کی دعا کروں گی۔“ الماس نے سراج کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”خدا آپ دونوں کو اس موذی کے خلاف کامیابیاں نصیب کرے۔“

اورنگ زیب اور سراج باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے، الماس ان کو رخصت کرنے باہر تک آئی تھی۔ گاڑی رہائش گاہ کے احاطے سے باہر نکل کر کھلی سڑک پر آئی تو سراج نے پوچھا۔

”کیا اس اہم مہم میں ہمارے علاوہ ہمارے مجھے کے اور بھی لوگ شامل ہوں گے؟“

”نہیں..... مگر میری درخواست پر کچھ محکموں کے اعلیٰ افسروں کی طرف سے مخصوص ہدایت مل چکی ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے جو پروگرام مرتب کیا ہے اس میں پولیس محکمے کا ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور فرد شریک نہیں ہوگا۔“

”لیکن بعد میں تو.....“

”اس کی فکر مت کرو..... میں نے موجودہ معاملات میں اپنے مخصوص ذرائع سے وزیراعظم تک کو بریفنگ کرا دی ہے۔“

”آئی۔ سی۔“ سراج نے کسمسا کر کہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔ ”اس وقت ہم کہاں چل رہے ہیں؟“

”تم نے امداد علی کے بارے میں ضرور سن رکھا ہوگا۔“ اورنگ زیب نے عقبی آئینے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کچھ لوگ اسے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو پھر آج وہ امداد علی کے ذریعے جگا کے ٹھکانے پر حملہ کر کے اسے بھی یرغمال بنانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ امداد علی کے انکار کی صورت میں اسے زندگی سے بھی محروم کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ سب سچ حامد کے اشارے پر ہوگا؟“ سراج نے چونک کر سوال کیا۔

”یو آر رائٹ لیکن فکر مت کرو.....“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے جو جال بنا ہے وہ آکٹوپس کی توقع کے خلاف ہی ثابت ہوگا۔ کامیابی کی صورت میں تمہیں تمہارے بہت سارے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔ خاص طور پر ان باتوں کا جو میرے علم میں تھیں لیکن میں نے مصلحتاً تمہیں بھی قبل از وقت نہیں بتائیں۔“

سراج نے کوئی شکوہ نہیں کیا لیکن ابھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی کہ وہ کس مہم پر جا رہے ہیں۔ فوری

طور پر اس نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا اور ذاتی طور پر ذہنی

جناں تک کرنے میں مصروف رہا..... وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا، اورنگ زیب کسی تعاقب کا بہ غور جائزہ لیتا ہوا شہر کے مختلف راستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا جب گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر اس کو دوسری کال موصول ہوئی، اس بار اس نے موبائل آن کرنے کے ساتھ ہی اس کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔ سراج پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

”کیا خبر ہے.....؟“

”امداد علی نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد قربانی کے بکرے کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ دو افراد معمولی زخمی ہوئے ہیں۔“ دوسری جانب سے ایک مانوس آواز ابھری جسے سراج پہلے بھی ایک دو موقعوں پر سن چکا تھا۔

”اب ان کا رخ کدھر ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب امداد علی کے ذریعے جگا کو باہر آ کر ملاقات کرنے پر رضامند کیا جائے گا۔“

”کیا جگا آسانی سے امداد کی بات مان لے گا.....؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا..... ہو سکتا ہے کہ امداد علی نے پہلے سے جگا کو بھی چونکا کر دیا ہو..... ایسی صورت میں وہ اپنی کچھار سے تنہا باہر نکلنے کی غلطی بھی نہیں کرے گا۔ اس کے کچھ جاننا زورورہ کر کسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھی تیار ہوں گے۔“

”ون منٹ..... کیا قربانی کا بکرا تنہا اس مہم کو سر کر رہا ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سرسرا تے لہجے میں سوال کیا۔

”یہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس کی لاعلمی میں اس کا تعاقب بھی کر رہے ہوں۔ ہمارے دشمن نے کئی محاذ خفیہ طور پر بننا رکھے ہوں گے۔ قربانی کا بکرا ناکامی کی صورت میں جہنم رسید بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں..... تم ان کی صحیح لوکیشن بتاؤ.....“

جواب میں دوسری جانب سے لائن منقطع کر دی گئی۔

اورنگ زیب اور سراج دونوں ہی چونکے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر پریشان نہیں ہونا پڑا۔ پانچ منٹ بعد موبائل پر دوبارہ کال ملا تو اورنگ زیب نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

”تم نے لائن کیوں کاٹ دی تھی؟“

”درست صورت حال معلوم کرنے کی خاطر میں نے استاد سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ کی خاطر وہ جان کی بازی لگانے پر بھی آمادہ ہے۔ وہ دس منٹ بعد تنہا ایک خیراتی ادارے کی

کشکول

ایمبولینس میں نکل کر ساحلی علاقے کی طرف جائے گا۔ امداد

علی سے اس نے اسپاٹ نمبر فائبر پر ملنے کو کہا ہے۔“

”اسپاٹ کی وضاحت کرو۔“

”بلیک سی اسٹیک بار.....“

”فائن.....“ اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے

گاڑی کا رخ تبدیل کیا پھر ایک منٹ بعد ہی وہ خبر کی اطلاع

کو اپنے مخصوص لوگوں..... کو منتقل کرتے ہوئے ضروری

ہدایت دے رہا تھا۔ ”جب تک میری جانب سے کوئی خاص

سگنل نہ ملے کسی ایکشن کی غلطی نہ کی جائے۔ ایمر جنسی کی

صورت میں کوئی بھی قدم اٹھایا جائے لیکن اس بات کا خیال

رہے کہ ان تینوں میں سے کوئی مرنے نہ پائے۔“

کال ختم ہوئی تو سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ”امداد

علی اور جگا کا علم مجھے ہو چکا ہے۔ کیا آپ قربانی کے بکرے

کو بھی ڈی کوڈ کرنا مناسب سمجھیں گے؟“

”افضل خان.....“

”نہیں.....“ سراج نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ

اس قدر یقین سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ وہ ہوٹل سے مقابلے کے بعد فرار ہو کر یا

اغوا کر کے جہاں بھی گیا یا لے جایا گیا میری نظروں سے

زیادہ دور نہیں تھا۔“

”اوہ..... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ پھر.....“

سراج کا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کی گاڑی

جو اس وقت ساحلی علاقے پر واقع بلیک سی اسٹیک بار سے بہ

مشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اچانک سڑک پر نشے میں

دھت کسی شرابی کی طرح توازن کھو کر لہرانے لگی، اس کا

سبب وہ دھماکا تھا جو پچھلا ایک ٹائر برسٹ ہونے کے بعد ہوا

تھا، اورنگ زیب نے اسٹیرنگ کنٹرول کرتے ہوئے

بریک پر دباؤ ڈال کر سراج کو چھلانگ لگانے کی ہدایت کی

پھر وہ بھی دروازہ کھول کر دوسری طرف قلابازی کھاتا ہوا

سنبھل گیا، دونوں نے اپنے اپنے سرکاری پستول نکال لیے

لیکن فائرنگ کرنے والے اپنا کام کر کے نکل چکے تھے۔

دور دور تک پچھلے راستے پر کوئی گاڑی یا مشتبہ افراد نظر نہیں

آئے۔ البتہ سراج بڑی برق رفتاری سے کروٹ لگ کرتا ہوا،

اس کے قریب آچکا تھا۔

”آپ خیریت سے تو ہیں؟“

”ہاں لیکن وہ باسٹرڈ اپنا کام کر کے نکل گئے جنہوں

نے بڑی مہارت سے کسی خاموش رائل سے میری گاڑی

کے ایک سے ٹائر کا سٹیا ناس کر دیا۔“ اپنا جملہ مکمل کرتے

ہوئے اس نے تیزی سے موبائل پر کسی کے نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پیشتر ہی ایک سنگل ملا تو اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کر لی۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”اپنے قریب ہی سمجھیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے آپ کی گاڑی پر حملہ کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے اندھا دھند فائر کھول دیا۔ جواب فوری دیا گیا تو وہ جو تعداد میں دو تھے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے، میں نے ان کی لاش روانہ کر دی ہے لیکن حادثے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔“

”اچھا کیا.....“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”آپ کیا میرے لیے کسی.....“

”ایک منٹ انتظار کریں..... ہماری ایک بلیک وین آپ تک پہنچ جائے گی۔“ دوسری سمت سے لائن منقطع کر دی گئی۔ ایک منٹ بعد بلیک وین بھی نظر آ گئی۔ اورنگ زیب نے وین ڈرائیو کرنے والے کو پچھلی نشست پر بھیج کر بڑی سرعت سے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال لی، سراج نے بھی دوسری جانب سے بیٹھنے میں پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت ساحلی علاقہ تقریباً سسنان ہی تھا، دس بجے کے بعد چونکہ تمام کاروبار بند کر دینے کا حکم نافذ تھا اس لیے خاصے فاصلوں پر ایک دو گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ مطلوبہ اسٹیک بار کے باہر بھی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی، اورنگ زیب نے وین تقریباً چالیس فٹ دور لے جا کر روکی پھر سراج کے ساتھ نیچے اتر آیا، ان کی نظریں اس وقت مطلوبہ اسٹیک بار پر مرکوز تھیں۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ جن لوگوں نے ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے دوسرے ساتھیوں نے افضل خان اور ہمارے دوسرے مطلوبہ آدمی کو بھی درمیان ہی سے اٹھالیا ہو.....؟“

”نہیں..... ایسا ہوتا گا تو کمانڈوز اب تک مجھے اطلاع کر چکے ہوتے۔“ اورنگ زیب نے بڑے یقین سے کہا اور اس کا ثبوت بھی اس وقت دور سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے مل گیا جو مطلوبہ اسٹیک بار ہی کی طرف آرہی تھی۔ اورنگ زیب اور سراج نے وین کی آڑ لے کر ایسی پوزیشن سنبھال لی جہاں سے وہ آنے والی گاڑی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کی توقع کے عین مطابق وہ گاڑی جو گرے کلر کی ایک ہائی روف تھی، اسٹیک بار کے قریب آ کر

رک گئی۔ ہیڈ لائٹس بھی بھادی گئیں لیکن باہر کوئی نہیں نکلا۔ ”جلد بازی میں کوئی قدم مت اٹھانا۔“ اورنگ زیب نے پستول کے دستے پر اپنی گرفت جماتے ہوئے کہا۔ ”خیراتی ادارے کی ایجوکیشن آنے کے بعد ہی اصل صورت حال واضح ہوگی۔“

”آپ کے ملٹری کمانڈوز اس وقت کہاں ہوں گے؟“

”زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو نے پہلے ہی سے کہیں پوزیشن بھی سنبھال رکھی ہو۔“

تین چار منٹ اور گزر گئے۔ گرے کلر کی ہائی روف سے کوئی باہر نہیں نکلا پھر سراج اور اورنگ زیب کو وہ خیراتی ادارے کی ایجوکیشن بھی نظر آ گئی جو تیزی سے فاصلہ طے کرتی ہوئی ہائی روف کے قریب آ کر رکی تھی، اس کے رکتے ہی ڈرائیو کرنے والا نکل کر باہر آ گیا، دوسرے ہی پل ہائی روف سے بھی ایک شخص نیچے اتر آ۔ دونوں آپس میں بغل گیر ہوئے، ان کی گرم جوشی کا اظہار ابھی جاری تھا کہ ہائی روف سے ایک تیسرا شخص اتر آ جس نے ہاتھ میں کوئی آتشیں اسلحہ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے دونوں بغل گیر دوستوں کو مخاطب کر کے سرسراتے لہجے میں ایک کو لٹکارتے ہوئے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا تھا۔

”جگا..... تم جتنی آسانی سے اپنے بل سے نکل کر باہر آ گئے ہو، اب اتنی آسانی سے واپس نہیں جاسکو گے۔“

بغل گیر ہونے والے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے پھر جگا نے حیرت سے اپنے پاس کھڑے ہوئے ساتھی سے کہا۔ ”امداد علی..... تم میرے لیے بھی آستین کے سانپ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گے؟ یہ میں نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔“

”اطمینان سے سوچ لینا جگا، فی الحال اگر زندگی عزیز ہے تو خاموشی سے جیب سے اپنا اسلحہ نکال کر بیٹھیں پھینک دو۔ اس کے بعد تمہاری آستین کا سانپ جس کا زہر میں پہلے ہی نکال چکا ہوں تمہارے ہاتھ پشت پر باندھنے میں کوئی تکلف نہ کرے گا۔ پھر تم دونوں گاڑی کی پشت پر بیٹھ کر آرام سے شکوے شکایت کرتے رہنا..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”اور اگر جگا تمہاری بات ماننے سے انکار کر دے تو.....؟“ جگا نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

”فی الحال ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں میرے یار۔“ امداد علی نے شکستہ خوردہ لہجے میں جگا کو سمجھانے کی

کوشش کی۔ ”افضل خان اگر تنہا ہوتا تو میں بھی دو دو ہاتھ کر کے بازی پلٹ سکتا تھا لیکن جس نے اس کی پچھاڑی پر ہاتھ رکھا ہوا ہے اس کے دوسرے شکاری کتے بھی کہیں آس پاس موجود ہوں گے..... میں نے ایویں ہی ہتھیار نہیں ڈال دیے تھے۔“

”وہ تمہاری مرضی تھی.....“ جگا کے لہجے میں چمکریاں چمکنے لگیں۔ ”میں مرجاؤں گا لیکن کسی ولد الحرام کے سامنے قیدی بن کر نہیں پیش ہوں گا۔“

”تمہاری مرضی.....“ افضل خاں نے جو اس وقت میک اپ میں تھا سرد اور سفاک لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری اکڑی ہوئی لاش بھی میرے لیے بہت کافی ہوگی، جگ باس نے صرف جگا کو ساتھ لانے کا حکم دیا تھا..... زندہ یا مردہ کی بات طے نہیں کی تھی.....“

”اس خواب کی تعبیر تمہیں بہت مہنگی پڑے گی افضل خاں۔“ جگا نے چمک کر کہا۔ ”میں یہاں تنہا نہیں آیا تھا، میرے ساتھ.....“

اسی لمحے کچھ دور سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری، اورنگ زیب نے کسی فوری فیصلے کے تحت افضل خاں کے پاؤں کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کا نشانہ خالی نہیں گیا، افضل خان کے ہاتھ میں جو آتشیں اسلحہ تھا وہ نکل گیا اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا زمیں پر لیٹ چکا اور امداد علی بھی اس افتاد سے بوکھلا کر زمین پر لیٹ گئے۔ اورنگ زیب، سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا تیزی سے دوڑ کر افضل خان کے سر پر پہنچ گیا جو غالباً بے ہوش ہو گیا تھا، اس کے داہنے گھٹنے سے خون ابل رہا تھا۔

گولیوں کے تباہی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ قریب ہی کہیں دو پارٹیاں آپس میں ٹکرائی تھیں، اورنگ زیب کے اشارے پر امداد علی اور جگا، افضل خان کو اٹھا کر بلیک وین میں لے آئے، وین کا کمانڈو کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ اس نے فون ختم کر کے اورنگ زیب سے کہا۔

”سر..... آپ وین لے کر دوسرے راستے سے نکل جائیں۔ اوپر سے یہی حکم ملا ہے۔“

”فائرنگ کس کے درمیان ہو رہی ہے.....؟“

اورنگ زیب نے دریافت کیا۔

”ہمارے ساتھیوں نے دو مشکوک گاڑیوں کو روکنے کا اشارہ کیا تھا لیکن انہوں نے جواب میں فائر کھول دیے۔ ہمارے ساتھی انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

جگا اور امداد علی نے افضل خان کو اٹھا کر پچھلی طرف

ڈالا پھر خود بھی وین میں بیٹھ گئے تو اورنگ زیب نے جگا اور امداد علی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا بھی کیا جائے گا۔“

”ہم آپ کے خادم ہیں جناب۔“ جگا نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔“

اورنگ زیب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ راستے میں ان نے اپنے ڈی آئی جی کے نمبر ملا کر مائیک آن کر دیا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاہا دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63 فی 111 سیشن ڈسک ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

جسٹس ڈائجسٹ

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ساتھ ہی سراج کو اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔
 ”ہیلو..... ہیلو..... کم آن مسٹر اورنگ زیب۔ آئی ایم
 اٹینڈنگ یو..... ہیلو..... ہیلو.....“

ایک لمحے بعد دوسری جانب سے آواز آئی بند ہو گئی تو
 سراج نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اس کال کا کیا مطلب سمجھوں؟“

”میں رات تمہارے گھر پر تھا جب کسی نے ساحلی
 علاقے پر ہونے والی فائرنگ کی اطلاع دی، میں تمہارے
 ساتھ اپنی گاڑی پر آیا تو گھات لگائے کچھ دشمنوں نے
 ہمارے اوپر بھی فائرنگ کی..... ہم خدا کی مہربانی سے بچ
 گئے، محض ایک ٹارگیٹ قربانی دینی پڑی۔ اسی افراتفری میں
 میں نے ڈی آئی جی صاحب کے نمبر ملائے تھے لیکن قریب
 کچھ آٹھسٹن کرگفتگو سے پرہیز ہی کیا تھا۔“ اورنگ زیب
 نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری گاڑی کل
 صبح سے پہلے واپس نہیں آسکے گی۔ ساحلی علاقے پر اپنی
 موجودگی کا کوئی جواز تو پیش کرنا ہوگا۔“

”اور جو تین مہمان ہمارے ساتھ ہیں ان کے
 بارے میں کیا کہانی بیان کرنی ہوگی؟“ سراج نے حیرت
 سے پوچھا۔

”یہ ایک خاص وقت تک ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل
 میں مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس لیے ان
 کے بارے میں بھول ہی جاؤ۔“ اورنگ زیب نے بائیں
 آنکھ جھپک کر کہا تو سراج نے اسے اس انداز میں دیکھا جیسے
 وہ کسی پیچیدہ معیے کو حل کرنے کی کوشش میں الجھ گیا ہو۔

شیخ حامد کی حالت اس وقت قابل دید ہی تھی جب اس
 نے صبح کے ناشتے کے بعد فی وی کھولا تھا۔ خبروں میں اس
 ہنگامے کے بارے میں طویل کوریج دی گئی جو گزشتہ رات
 ساحلی علاقے پر پیش آیا تھا۔ خبر پڑھنے والے کے استفسار
 پر اس کے نمائندے نے بتایا تھا کہ ”ساحلی علاقے کے
 علاوہ رہائشی علاقے کی ایک ذیلی سڑک پر سے بھی ایک لاش
 دریافت کی گئی ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا ہے
 کہ فرار ہوتے وقت وہ یا تو خود گاڑی سے گرا ہوگا یا پھر اس
 کے ساتھیوں نے اس کے مرنے کا یقین ہو جانے کے بعد
 کفن و دفن کی علت سے بچنے کی خاطر اسے از خود لاوارث
 چھوڑ دیا۔“ مزید وضاحت پر اس نے کہا تھا کہ ”مقامی
 تھانے کے افسران اس حادثے کے بارے میں کوئی بیان
 دینے سے گریز کر رہے ہیں دوسری ایجنسیاں بھی اس

حقیقت سے لاعلمی کا اظہار کر رہی ہیں جبکہ ایک اندازے
 سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو پارٹیوں کے درمیان کھل کر
 فائرنگ کا تبادلہ کیا گیا پھر وہ دونوں ہی جائے وقوعہ سے اس
 طرح چھوڑ کر ہو گئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔
 نمائندے نے ایک اور سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ
 ”ساحل پر واقع ایک اسٹیک بار سے تقریباً دو فرلانگ کے
 فاصلے پر سینٹر ایس پی اورنگ زیب کی ذاتی استعمال کی
 گاڑی بھی ملی تھی جس کا ایک ٹائر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اس
 سلسلے میں مطلوبہ ایس پی سے بھی رابطہ قائم کرنے کی متعدد
 کوشش کی لیکن سینٹر ایس پی نے بھی کوئی تفصیل نہیں بتائی،
 ان کا ایک ہی جواب تھا کہ انہوں نے اپنے متعلقہ افسران کو
 تفصیل سے آگاہ کر دیا ہے۔“ نیوز ایجنسی کے نمائندے
 نے کچھ ایسی لاشوں کو بھی کور کیا جو تعداد میں چھ یا سات
 تھیں۔ لاشیں ایک دوسرے سے دور دور بکھری پڑی نظر
 آرہی تھیں۔“

شیخ حامد ناشتا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ جولاہیں فی
 وی پر دکھائی گئی تھیں ان کے چہرے اس کے جانے پہچانے
 تھے اور ان جرائم پیشہ اور پولیس کو مطلوبہ مجرموں کے تھے
 جنہیں شیخ حامد نے شکاری کتوں کی طرح پال رکھا تھا۔

فی وی کی خبروں کے بعد شیخ حامد نے صبح کے
 اخبارات دیکھے، صرف ایک انگریزی اخبار نے ”اسٹاپ
 پریس“ کے باکس میں اس حادثے کی مختصر نشاندہی کی تھی۔
 شیخ حامد نے جھلا کر نمبر ٹو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی
 لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب ملنے کے بجائے
 ”یورڈائلڈ نمبر از پاورڈ آف“ کی صدا بار بار سنائی دی۔ نمبر ٹو
 کی خاموشی بھی شیخ حامد کی الجھنوں میں اضافہ کر رہی تھی، اس
 نے نمبر ٹو کے بعد ایک دو اور اعتماد کے آدمیوں کو فون کیا لیکن
 کسی سے رابطہ نہ ہو سکا، سب ہی نمبر بندل رہے تھے۔

پانچ سات منٹ تک وہ کسی زخمی درندے کی طرح
 ٹہکتا رہا اور نیچلا ہونٹ کا تار ہا پھر اس نے وہ نمبر آزمایا جہاں
 افضل خاں کورکھا گیا تھا۔ اس بار اسے ناکامی نہیں ہوئی۔
 ”سب لوگ کہاں مر گئے؟“ رابطہ قائم ہونے پر وہ
 دھاڑنے لگا۔ ”جس قیدی کو تمہاری نگرانی میں رکھا گیا تھا وہ
 کہاں ہے؟“

”کل رات اسلم ڈنگا صاحب نے ان سے آخری
 ملاقات کی تھی سر..... پھر وہ مجھے یہ ہدایت کر کے چلے گئے
 تھے کہ اگر قیدی کہیں جانے لگے تو اسے روکنے کی کوشش نہ کی
 جائے..... اس کے بعد کل رات ہی قیدی بھی چلا گیا تھا۔“

”اس وقت تمہارے ڈنگا ولد الحرام صاحب کہاں
 ہیں؟“
 ”مجھے نہیں معلوم سر..... میں نے انہیں ابھی فون کیا
 تھا لیکن.....“

شیخ حامد نے اس کا جواب سننے کی زحمت نہیں گوارا
 کی، نمبر ٹو کا فون بند ملنا اور فی وی کی کوریج اس بات کی
 تصدیق کر رہی تھی کہ گزشتہ رات کے حادثے میں یا تو وہ
 جہنم رسید ہو گیا یا پھر پولیس کی تحویل میں ہوگا۔ افضل خاں
 بھی پھنس گیا ہوگا کیونکہ اس کے نمبر بھی بند ملے تھے۔ یہ تمام
 صورت حال اس کے لیے نہایت صبر آزمائی تھی، افضل خاں کو
 جگا کوزندہ یا مردہ لانے کی ہدایت دی گئی تھی، امداد علی کو قابو
 کر کے اسے جگا کو اس کے بل سے نکالنا مقصود تھا جہاں وہ
 روپوش تھا لیکن بساط یقیناً پلٹ گئی تھی، ساحلی علاقے پر
 موجود جن لاشوں کی کوریج کی گئی تھی وہ سب اسلم ڈنگا کے
 ماتحت تھے۔

”وہ سب ساحلی علاقے پر کس مقصد سے جمع ہوئے
 تھے؟ کیا امداد علی اور جگا ساحلی علاقے پر کہیں روپوش
 تھے.....؟ جو تصادم ہوا وہ کن پارٹیوں کے درمیان
 ہوا؟..... ایک پارٹی نمبر ٹو نے تشکیل دی ہوگی..... دوسری
 کون تھی؟..... ایس پی اورنگ زیب کی گاڑی کس نے
 ناکارہ کی؟..... وہ کس مقصد سے وہاں گیا تھا؟..... کیا اسے
 کسی نے مخبری کر دی تھی؟..... اگر ایسا تھا تو اس بات کے
 امکان بعید از قیاس نہیں تھے کہ اسلم ڈنگا کے علاوہ امداد علی
 اور جگا بھی غالباً پولیس ہی کی حراست میں ہوں گے جو
 حالات کو بتانے سے گریز کر رہی تھی.....؟“ اس کے علاوہ
 اور بھی بے شمار سوالات تھے جن کی یلغار نے شیخ حامد کو
 پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ان سوالات کے جوابات ہر قیمت پر
 معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس کے ذہن کو پراگندہ کر رہے
 تھے۔ خاصی دیر تک وہ کسی ٹھہرے ہوئے خطرناک طوفان
 کی طرح خاموش کھڑا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مستلماً توڑتا
 رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر ڈی آئی جی کے نمبر ڈائل کیے۔
 اس بار اسے ناکامی نہیں ہوئی۔

”ہیلو..... ڈی آئی جی آفس.....“ آغا منظور کے
 بجائے کسی ماتحت نے کال ریسیو کی۔

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔ آغا منظور سے بات
 کراؤ.....“

دونٹ بعد آغا منظور نے کال اٹینڈ کی تو شیخ حامد نے
 بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی

پروفیسر صاحب نے کلاس روم میں اپنے لیکچر کے دوران
 ایک لڑکے کو دیکھتے دیکھ کر غصے سے چلاتے ہوئے کہا ”تم میری
 کلاس میں سو نہیں سکتے۔“

لڑکا آنکھیں کھول کر سر اٹھاتے ہوئے قدرے بیزار
 سے بولا ”سو تو سکتا ہوں سر.....! بشرطیکہ آپ اتنے زور سے نہ
 بولیں۔“

ابھی فی وی پر خبریں دیکھ کر فارغ ہوا ہوں..... خاصی گرما
 گرم صورت حال ہے جسے آپ لوگوں نے خاموشی اختیار
 کر کے عوام کے لیے اور پراسرار بنا دیا ہے، سب خیریت
 تو ہے.....؟“

”خیریت ہوتی جناب تو میں خود آپ کی کال ریسیو
 کرتا۔“ دوسری جانب سے پریشانی کا اظہار کیا گیا۔ ”جو
 کچھ ہوا وہ خود میرے لیے بھی ایک معما ہی ہے۔“

”کیا مطلب؟..... کیا اس ٹکراؤ میں پولیس ایک
 فریق نہیں تھی؟“

”جی نہیں..... ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ
 دوسری پارٹی کون تھی۔“ آئی جی نے وضاحت کی۔ ”ہمارے
 ایکسپرس نے لاشوں کی تصویر سے اس بات کی تصدیق،
 سردخانے کا ریکارڈ الٹ پلٹ کرنے کے بعد بہر حال کر دی
 ہے کہ جولاہیں ملی ہیں وہ سب مطلوبہ مجرموں کی تھیں مگر.....
 ان کے مقابلے پر کس کا ہاتھ تھا یہ نہیں پتا چلا۔“

”اور بھی بہت ساری ایجنسیاں ہیں آغا منظور۔“ شیخ
 حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”سی، آئی، اے۔ اینٹی
 کریپشن سیل، اسٹیشل کرائم برانچ، اس کے علاوہ ریجنل اور
 ملٹری کے بھی بہت سارے شعبے ہیں اور..... یہ بھی ممکن ہے
 کہ دوسری پارٹی بھی جگا جیسے اڈوں کے مالکان کی ہو۔“
 ”یہی معلوم کرنے کی خاطر تمام کونے کھدروں کو ٹھولا
 جا رہا ہے۔“

”ایک امکان اور بھی ہے.....“ اس بار شیخ حامد نے
 چپے ہوئے جملے استعمال کیے۔ ”ممکن ہے تم بھی مجھے ٹالنے
 کی خاطر یہ سب باتیں کر رہے ہو؟“
 ”آپ یہ شبہ کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟“ آئی جی کے
 لہجے میں بھی تناؤ کی کیفیت ابھر آئی۔

”تم اپنے بہر شہر ایس پی اورنگ زیب کو کیوں
 فراموش کر رہے ہو۔ اس کی گاڑی بھی تو اسی جگہ سے ملی ہے
 جہاں ٹکراؤ ہوا تھا۔“

”یہی سوال دوسرے بھی کر رہے ہیں۔“ آئی جی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اورنگ زیب کل رات سراج کے گھر پر تھا جب اسے ہنگامے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ فوری طور پر وہاں پہنچا تھا لیکن کچھ گھات میں بیٹھے لوگوں نے اس کی گاڑی پر بھی گولیاں برسائیں۔ بات صرف ایک ٹائر برسٹ ہونے پر ٹل گئی، گاڑی کا توازن بگڑنا ہی شاید ان دونوں افسران کی زندگی کا بہانہ بن گیا۔ ایس بی نے کل رات ہی مجھے ساری پوزیشن سے باخبر کر دیا تھا مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے دونوں پارٹیاں جا چکی تھیں۔“

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ شیخ حامد نے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

”دعا کریں کہ میری کرسی محفوظ رہے۔۔۔۔۔ اعلیٰ افسروں کے سوالات نے تو فی الحال صبح سے ناشتے کی مہلت بھی نہیں دی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم اپنے آفیسروں کو بھگتاؤ، میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا۔۔۔۔۔“

شیخ حامد نے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی ریسپور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر تجسس کی علامتیں پہلے سے زیادہ نمایاں ہونے لگیں۔ نمبر نو اور افضل خاں کے سراغ نہ ملنے کے ساتھ ساتھ اسے جگا کی بھی فکر لاحق تھی جس نے اسے مخرب اخلاق تصویروں کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کاٹے کو ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانے کا خواہاں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ روشن اسکرین پر نمبر نو کا حوالہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”تم۔۔۔۔۔ اس نے موبائل آن کر کے خود پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔“ اب تک کہاں مرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔؟“

”میں بہت زخمی ہوں باس، بڑی مشکلوں سے ایک پرائیویٹ اسپتال سے مرہم پٹی کرا کے اپنے محفوظ ٹھکانے تک آیا ہوں، میں نے اس عرصے میں موبائل بند کر رکھا تھا۔“ اسلم ڈنگا نے بات جاری رکھی۔ ”اگر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو مصیبت ہی آ جاتی۔“

”افضل خاں کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، اس نے امداد علی کو بہر حال قابو کر لیا تھا، جگا بھی اپنے بل سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ ساحلی علاقے پر وہ تینوں موجود تھے، افضل خاں نے جگا کے آتے ہی اس پر پستول تان لیا تھا، میں قریب موجود

تھا لیکن پھر۔۔۔۔۔ اچانک سرکاری ایجنسی والوں نے فائرنگ شروع کر دی، میں نے بھی جواب دے کر نکلنے کی ٹھان لی تھی۔ آخری بار میں نے افضل خاں کو زمین پر گرتے دیکھا تھا، اس کے بعد ہم کو اس قدر شدید فائرنگ میں الجھنا پڑا کہ فرار کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔۔۔۔۔“

”کس ایجنسی کے لوگ تھے۔۔۔۔۔؟“

”وہ سب سیاہ پتلون اور لمبی آستھیوں والی قمیص میں تھے۔“ اسلم ڈنگا نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے پولیس یا پھر کسی اور ایجنسی کے کمانڈوز ہوں، ان کی اچانک مداخلت کا انداز کمانڈوز ایکشن سے ملتا جلتا تھا۔“

”اور کوئی خاص بات؟“ شیخ حامد نے غراتے ہوئے دریافت کیا۔

”ایس بی اورنگ زیب بھی وہاں موجود تھا، سراج بھی ساتھ ہی تھا لیکن۔۔۔۔۔ پولیس کی دوسری گاڑیاں نہیں تھیں، ہمارے ایک خاص آدمی نے ان دونوں کو راستے سے ہٹانے کا فوری منصوبہ بنالیا تھا لیکن ایس بی کی قسمت اچھی تھی کہ ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑ گیا۔ اب وہ دونوں زندہ ہیں یا مردہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

”لیکن تم۔۔۔۔۔ بہر حال ابھی تک اپنی ناکامی کی خبر سنانے کے لیے زندہ ہو۔۔۔۔۔ یوں آف اے فک، باسٹرڈ۔“

شیخ حامد ایک دم ہی آپے سے باہر ہو کر اسے مغالطات سناتا رہا پھر اس نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے تپور ہر لمحہ خطرناک ہوتے جا رہے تھے، وہ دل ہی دل میں نمبر نو کے لیے کوئی مناسب اور آخری سزا کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے فون پر گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسپور اٹھایا، ٹھوس لہجے میں بولا۔

”ہیں۔۔۔۔۔ شیخ حامد اسپیننگ۔“

”تم اس وقت شاید افضل خاں کی ناکامی کا غم منا رہے ہو گے؟“ دوسری جانب سے کسی نے نہایت سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔ ”میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔ ہمیں تمہارے غم سے زیادہ امداد علی اور استاد کی فکر ہے۔“

”کون بکو اس کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ شیخ حامد نے دہکتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا جائز باپ۔“ اس بار بھی سختی سے جواب دیا گیا۔ ”مجھے تمہارے کتوں کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ صرف استاد کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہوں، انکار کی صورت میں تمہاری اور کتوں کی تصویریں منظر عام پر بھی آ سکتی ہیں۔“

”بکو اس مت کرو۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے تلملا کر کہا۔

کشکول

”جگا اور امداد علی۔۔۔۔۔ دونوں کے بارے میں مجھے بھی کچھ نہیں معلوم۔“

”بہر حال، استاد کو ٹریپ کرنے کا حکم تمہارا ہی تھا۔ کیا اس سے بھی انکار کرو گے؟“

”نہیں، میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔“ شیخ حامد روانی میں کہتا چلا گیا۔ ”جگانے مجھ سے پنچا لڑانے کی غلطی کر کے اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔“

”ہم بھی ایک میان میں دو ٹکواریں برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمہیں ایک موقع مل سکتا ہے لیکن اسی صورت میں کہ استاد کا پتا ہمیں بتا دو۔“

”احقانہ بات کر رہے ہو۔“ شیخ حامد حلق کے بل چینا۔ ”جب میں جانتا ہی نہیں کہ اب وہ طاعون زدہ چوہا کہاں ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اس کے آگے تمہاری رہنمائی میں کر سکتا ہوں۔“ ٹھوس اور کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ”کرتل احتشام کو جانتے ہو؟ کسی زمانے میں تم دونوں کلاس فیلو تھے، اب وہ ملٹری اٹیلی جنس کا نمبر دو ہے۔۔۔۔۔ غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”لیکن موجودہ معاملے کا کرتل احتشام سے۔۔۔۔۔“

”۔۔۔۔۔ کیا تعلق ہے یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ باقی کام تمہارا ہوگا۔“ دوسری جانب سے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی ٹھوس آواز میں بات جاری رکھی گئی۔ ”تم کیا بیچتے ہو شیخ حامد، تمہارے ڈی آئی جی کو بھی ایک دو کوڑی کے ایس بی نے گھن چکر بنا دیا ہے۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ شیخ حامد نے چونک کر سوال کیا۔

”ایس بی اورنگ زیب کی۔۔۔۔۔ اسی نے اپنے اثر و رسوخ سے کل رات کمانڈوز کے ذریعے تمہارے منصوبے کو ناکام بنایا تھا اور۔۔۔۔۔ اب وہ بھی انجان بن رہا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔ افضل خاں، امداد علی اور استاد کو ملٹری کی خفیہ اور محفوظ کسٹڈی میں رکھا گیا ہے۔“

”آئی سی۔ سی۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اورنگ زیب کی گاڑی ساحلی علاقے۔۔۔۔۔“

”یہ تمہارا اور ایس بی کا معاملہ ہے۔ کرتل احتشام سے بات کر کے مجھے بتاؤ کہ تم استاد کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟“

”تم اگر کرتل کے بارے میں جانتے ہو کہ وہ میرا کلاس فیلو تھا تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ کس قدر فرض شناس اور محب وطن ہے، مرجائے گا لیکن جگا کے بارے میں میری بات نہیں مانے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ سرے سے اپنی لاعلمی کا

”دوسری جانب سے فوراً ہی کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ کچھ توقف سے کہا گیا۔“ میں کرتل احتشام کے سلسلے میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ کیا گزشتہ رات اسی کے آدمیوں نے آپریشن کیا تھا؟“

”فرض کر لو اس نے اقرار کر لیا، پھر تم۔۔۔۔۔“

”پھر، ہم استاد کو ہر صورت میں آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہوگا۔ تم صرف میری معلومات کی تصدیق کر دو، میں دس منٹ بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا، اتنا خیال رہے کہ تم نے اگر ڈبل کراس کرنے یا ٹال مٹول کی حماقت کی تو وہ تصویریں بھی لفافے میں بند نہیں رہیں گی۔ میڈیا کے علاوہ ایس بی اورنگ زیب بھی اسے ہر قیمت پر لینے کو آمادہ ہو جائے گا۔“ اس جملے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شیخ حامد نے ریسپور کو کریڈل پر رکھا پھر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ جو معلومات اسے فراہم کی گئی تھیں، ان میں وزن تھا، خاص طور سے اورنگ زیب کے حوالے نے اسے زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دو چار منٹ تک وہ بیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے ریسپور اٹھا کر کرتل احتشام کے نمبر ملائے، ایک دو درمیانی رکاوٹوں کے بعد کرتل کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو شیخ۔۔۔۔۔ اس وقت ہماری یاد کیسے آگئی؟“ بے تکلفی سے بات کا آغاز ہوا۔

”تمہیں کل رات کا محاذ سر کرنے کی مبارکباد دینا مقصود تھا۔“

”کس بات کی۔۔۔۔۔؟“

”جگا سے اپنا بھی کچھ حساب کتاب نکلتا ہے کرتل۔“ شیخ حامد نے دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ تمہارے آدمیوں کی تحویل میں ہے۔“

”لیکن تمہیں۔۔۔۔۔“

”ڈونٹ وری۔۔۔۔۔ فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“ میں کل تم سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اطمینان سے بات ہوگی۔“ شیخ حامد نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے فون بند کر دیا لیکن اب اس کے وجود میں ایک نیا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ فون پر ملنے والی ٹپ کی تصدیق کے بعد اس کے ذہن میں صرف ایک نام صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔۔۔۔۔ ایس بی اورنگ زیب۔ جس نے بڑی کامیابی سے اسے ڈبل کراس کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کسی آخری فیصلے کو ذہن میں مرتب کر رہا تھا جب

فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ دوسری جانب سے جگا کے بارے میں ٹپ دینے والے کی آواز ابھری۔

”کیا معلوم ہوا.....؟“

”تمہاری اطلاع غلط نہیں لیکن.....“

”شکر یہ شیخ حامد۔“ جواب بات کاٹ کر دیا گیا۔

”تم نے ہماری ایک مشکل آسان کر دی، استاد کو کیسے نکالنا ہے؟ یہ سوچنا اب ہمارا کام ہے لیکن تم فی الحال چوبیس گھنٹوں تک خاموش ہی رہنا..... استاد کو آزاد کرانے کے بعد تم سے دوبارہ بات ہوگی۔“

شیخ حامد نے غصے سے ریسیور کریدل پر رکھا پھر ہاتھ ملنے لگا۔ بساط کا رخ اس انداز میں بھی پلٹ سکتا ہے۔ یہ خیال ہی اس کے جنون کو ہوا دینے کی خاطر بہت تھا۔ اب چوبیس گھنٹوں تک خاموش رہنے کی بندش کے حکم نے اس کے تن بدن میں جیسے آگ بھڑکا دی تھی۔ کنول کی تصویریں اس کے پیروں میں بیڑیاں بن گئی تھیں، اس نے باسی کھانوں سے بچنے کی خاطر کنول کی تازہ ڈش کو قبول کر لیا تھا لیکن حالات نے اسے کنول سے بھی دور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی جس نے جنگل کے بادشاہ کو صرف اپنی کچھار تک محدود کر دیا اور..... اور..... اچانک شیخ حامد کے ذہن میں صبا نیگم کی خودکشی کا حادثہ ابھر آیا..... اسی ایک عورت کی خودکشی کے بعد اس کے اوپر نحوست کے بادل منڈلانے شروع ہوئے تھے۔ وہی ایک جائز رشتہ تھا جس کی آڑ میں وہ اپنے گھر کی چھت کے نیچے بھی من مانی کرتا تھا، رنگ رلیاں مناتا تھا لیکن اس نے خودکشی کر کے شیخ حامد کے لیے دشواریاں پیدا کر دی تھیں پھر ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد سراج بھی اس کے ساتھ مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو گئے تھے۔ اس کی جی جی بساط کے مہرے ایک ایک کر کے پٹنے لگے پہلے افضل خاں کو حالات کا شکار ہو کر تار کردہ گناہوں کی سزا سنائی پڑی۔ وہ شیخ حامد کے لیے کلیدی کردار کا مالک تھا۔ اس کے زوال کے بعد بلیک ٹائیگر کا سورج بھی گہنا گیا۔ شبنم کو بھی حالات کی گردش نے شکار کر لیا۔ اب اسلم ڈنکا بھی طوفان کی لپیٹ میں تھا۔

شیخ حامد کا ذہن بار بار اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اس کے زوال کا سبب صبا نیگم کی خودکشی تھی جس کے بعد اورنگ زیب کی شاطرانہ چالوں نے اس کی جڑ بنیاد کو ہلانا شروع کر دیا تھا۔ کل تک جگا اور اس قسم کے دوسرے گینگ لیڈر بھی شیخ حامد کے راستوں سے کتر کر چلنے کے عادی تھے مگر اب اورنگ زیب کی وجہ سے وہ بھی اپنی اوقات سے

بڑھ رہے تھے۔ تازہ واقعے کے بعد فون پر ملنے والی اور اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد شیخ حامد کا چونکنا لازمی اس کے ذہن میں متعدد منفی طریقے ابھر رہے تھے جن کو اختیار کرنے کے بعد وہ اورنگ زیب کی چالوں کو کھل کر سکتا تھا۔

خاصی دیر تک وہ اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کی جڑوں مضبوط کرنے کی پلاننگ کرتا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا۔ ”ممکن ہے کہ اس کے اغوا میں بھی اورنگ زیب کا ہاتھ ہو؟..... اسی نے جگا بھی کچھ لو اور کچھ دو، کی بنیاد پر خرید لیا ہو؟..... اقتدار ہوس نے اسلم ڈنکا کو بھی غداری پر آمادہ کر دیا ہو.....؟“ کے سلسلے میں افضل خاں کی کامیابی اسے منظور نہ رہی شبنم بھی اورنگ زیب کی آلہ کار بن کر دوبارہ اس کے آگئی ہو؟“ اس کے علاوہ اور بھی شکوک اور شبہات اس کے ذہن میں گرم ہوا کے تیز و تند پھیروں کی طرح گردش رہے تھے۔ اس کا ایلیمی ذہن اورنگ زیب کی چالوں کو توڑ کرنے کی خاطر منصوبے بناتا رہا پھر..... ایک مثال اس کے وجود میں سنسناتی ہوئی ابھری۔ ”کشتی طوفان کی زد سے آجائے تو اسے ڈوبنے سے بچانے کی خاطر تجربہ کار ملازم اپنا قیمتی مال بھی سمندر میں پھینک کر بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی شکوک اور شبہات کو دور کرنے اور کمزور ہوتی ہوئی بازی نقشہ بدلنے کی خاطر کچھ مہرے پٹواتا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا، اس کے بعد وہ دشمن کی چالوں کو کمزور کر کے سرے سے اپنی بازی جھاسکتا تھا۔ ان مہروں کے بساط سے ہٹ جانے کے بعد اورنگ زیب کی جی جی جمائی بازی بھی کمزور ہو سکتی تھی۔ اس کا دشمن اورنگ زیب کے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی ان جیتے جاگتے کرداروں کے ہوجانے کے بعد آسانی سے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

اپنے نئے منصوبے پر غور و فکر کرنے کے بعد شیخ حامد نے قدرے سکون کا سانس لے کر موبائل پر کسی کے نمبر ڈال دیے۔ رابطہ قائم ہونے اور ضروری کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں حکم دیا..... ”تم شبنم کو ساتھ لے کر اسلم ڈنکا کے ٹھکانے پر جاؤ، وہ زخمی حالت میں ہوگا شبنم سے کہنا کہ وہ اسلم ڈنکا کو گولی مار کر ختم کر دینے کے بعد میرا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اسلم ڈنکا خاموش ہوجانے کے بعد تم شبنم کو بھی گولی مار دینا۔ تمہارا

ککشول

کامیابی جمہاری ترقی کی ضمانت بھی بن سکتی ہے..... کام ہوشیاری سے کرنا، اس کے بعد کسی پبلک فون سے قریبی خانے کو کسی فرضی نام سے حادثے کی اطلاع بھی کر دینا۔ اور انڈیا آل۔“

شیخ حامد نے موبائل آف کر کے دوسری بار کنول کے نمبر ڈال دیے، دوسری جانب سے کنول کے بجائے اس کی ماں کی آواز ابھری تو اس نے سرو لہجے میں پوچھا۔ ”کنول کہاں ہے؟ اس کا موبائل تم نے کیوں استعمال کیا؟“

”آپ کی ہدایت پر وہ جاتے وقت موبائل مجھے دی گئی تھی۔“ خشک لہجے میں جواب ملا۔

”میں نے اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔“ شیخ حامد تھملا کر بولا۔ ”وہ کب گئی اور کہاں کا کہہ کر گئی ہے؟“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ اس بار بھی پست آواز میں کہا گیا۔ ”اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ آپ نے اسے بلوایا ہے، کہاں؟ اس کی وضاحت اس نے نہیں کی تھی۔“

”گارڈ کہاں ہے.....؟“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے حکیمانہ انداز اختیار کیا۔ ”نیچے جا کر فوری طور پر اس سے میری بات کراؤ۔“

ایک منٹ بعد ڈیوٹی گارڈ نے جو کچھ کہا اسے سن کر شیخ حامد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کے بیان کے مطابق کنول جس آدمی کے ساتھ گئی تھی وہ اسلم ڈنکا کا دست راست تھا لیکن شیخ حامد اسے خود اپنی نظروں سے ٹی وی پر ان افراد کی لاشوں میں دیکھ چکا تھا جن کو واضح طور پر متعدد بار کورج دی گئی تھی۔

لیاقت حسین کو جو کام سونپا گیا تھا وہ زیادہ مشکل نہیں تھا، سپروائزر کے فرائض سمجھنے میں یہ مشکل دودن لگے تھے، کام کرنے والے سب ہی شریف لوگ تھے۔ لیاقت کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ شاید ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھ کر سپروائزر کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ دفتر والوں پر اپنا سکہ جمانے کی خاطر کچھ دنوں تک رعب میں رکھنے کی کوشش کرے گا لیکن لیاقت حسین نے روز اول ہی سے اپنی شرافت اور محبت بھری باتوں سے ان کے دل جیت لیے تھے۔ دو روز بعد وہ کسی کام سے سیٹھ عثمان کے دفتر میں گیا تو انہوں نے اسے روک کر کہا۔

”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے لیاقت حسین؟“

”خدا کا شکر ہے، ہر کام نہایت خوبی سے انجام دیا

جار رہا ہے لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا.....؟“ سیٹھ عثمان نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔

”میرے کچھ ماتحت مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو.....“

”سمجھ گیا۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اس بات کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں کہ کون ورکر کس اہلیت کا ہے، اسے اسی کی محنت اور قابلیت کے اعتبار سے معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ویسے میری اطلاع ہے کہ تم نے کرسی سنبھالتے ہی انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔“

”یہ بھی آپ کی محبت ہے ورنہ کہاں ایک ڈرائیور اور کہاں.....“

”لیاقت حسین.....“ سیٹھ عثمان نے اسے سنجیدگی سے ٹوکا۔ ”دوبارہ اس قسم کی بات کبھی نہ کرنا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تم اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔ میں تمہارے احسانوں کو بھولا نہیں ہوں۔“

”سر.....“ لیاقت حسین نے قدرے جھجک کر پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ نے کسی نئے ڈرائیور کے لیے اشتہار دیا ہے؟“

”ہاں..... کیوں؟“

”آپ نے میری ترقی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ جب تک میرا ادانہ پانی آپ کے ساتھ لکھا ہوا ہے، آپ کی گاڑی میرے علاوہ.....“

”مجھے یاد ہے.....“ سیٹھ عثمان نے محبت سے جواب دیا۔ ”ڈرائیور کی ضرورت مجھے آؤٹ ڈور ورکر کے لیے ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے.....“ لیاقت حسین نے سکون کی سانس لی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھنے لگا تو سیٹھ عثمان نے اسے روک کر کہا۔

”انیکسی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”تکلیف کیسی؟ میں پہلے بھی تو فرحین کے ساتھ اسی انیکسی میں رہتا تھا۔“

”میرا مطلب کچھ اور تھا۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر

کہا۔ ”قریب رہنے کی وجہ سے راحیلہ، فرحین کو بار بار بلا لیتی ہیں اور تم.....“

”یہ نیگم صاحبہ کی مہربانی ہے کہ وہ فرحین کو اپنے برابر بیٹھنے کا موقع دیتی ہیں۔“

”تو پھر آج رات بھی تمہیں دیر تک تہہ رہنا ہوگا۔“

سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”را حیلہ نے کچھ خواتین کو رات کھانے پر بلایا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اس موقع پر فرحین بھی ان کے ساتھ رہے۔“

”یہ تو ہمارے لیے بڑی عزت کی بات ہے، میں بھلا برا کیوں مانوں گا۔“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا پھر کچھ دیر دفتری معاملات پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد اپنے آفس میں آگیا۔

مغرب کی نماز کے بعد فرحین بن سنور کر کمرے سے باہر نکلی تو لیاقت حسین نے چھینٹنے کی خاطر کہا۔

”یہ روپ سنگار کر کے کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہے؟“

”پہلے یہ بتا کہ کیسی لگ رہی ہوں؟“ فرحین نے پوچھا۔

”تو ہر حال میں میرے سپنوں کی رانی ہی لگتی ہے۔“ لیاقت حسین نے یکھت سنجیدگی سے کہا۔ ”یاد ہے..... آج سنیچر ہے؟“

”یاد تو ہے لیکن آج تجھے دیر تک میرا انتظار کرنا پڑے گا۔“ فرحین نے اس کی بات سمجھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔

”بیگم صاحب کی بات نہ ہوتی تو میں انکار کر دیتی لیکن تو یہی تان کر نہ سو جانا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

”خیال ہے تیرا..... بڑے آدمیوں کے ہاں دعوتوں کے موقعوں پر رات کا کھانا بھی ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتا۔ کل ویسے بھی چھٹی ہے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے.....“ فرحین نے لیاقت حسین کے قریب آ کر کہا پھر اس کی دلجوئی کی خاطر بولی۔ ”تو کہے تو میں بیگم صاحب سے تیاری یا سرور کا بہانہ کر کے جان چھڑاؤں؟“

”نہیں..... میں تو صرف تجھے آزمانے کی خاطر کہہ رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے کہا۔ ”عثمان صاحب نے آج دفتر ہی میں بتا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ تجھے دعوت کے موقع پر اپنے ساتھ رکھیں گی۔“

جتنی دیر فرحین سنگار میز کے سامنے کھڑی گھوم پھر کر اپنا جائزہ لیتی رہی لیاقت حسین اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جب وہ جانے لگی تو لیاقت حسین نے حسب معمول اپنا ٹیکس ایک پیار کی شکل میں وصول کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ کا عمل تھا، وہ جانتا تھا فرحین کی واپسی تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد ہی ہوگی۔ اسے واپسی میں رات کے بارہ بھی بج

سکتے تھے، را حیلہ بیگم اسے بہنوں کی طرح پیار کرتی تھیں لیے دعوت اور دوسری تقریبات کے موقع پر اسے ساتھ رکھتی تھیں۔

لیاقت حسین نے نوبے کھانا کھایا پھر وہ لیٹنے کا کرہی رہا تھا کہ سراج کا فون آگیا۔

”کیسے ہو لیاقت حسین.....؟“

”وہی پہلا جیسا صاحب لیکن آپ نے اب ہر دیا ہے۔“ لیاقت حسین نے شکوہ کیا۔

”کچھ دفتر میں مصروفیات بڑھ گئی ہیں جس کی سے وقت نہیں نکال سکا ورنہ تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔“

”اس وقت کیسے یاد کیا، کیا میں آپ کے کسی آسکتا ہوں؟“

”ابھی نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز میں تمہاری ضرورت پیش آئے، ایس پی اورنگ زیب بھی بہت یاد کرتے ہیں۔“

”میں آپ کا خادم ہوں صاحب، جب ضرورت یاد کر لیجے گا۔“

سراج سے گفتگو کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے لیٹ کر گیا، فرحین کے خیال سے اس نے خواب گاہ کے دروازے کو بند نہیں کیا تھا، کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آنے لگی تو اس نے بیڈ سوچ سے دوسری بتیاں بج کر صرف ہلکے گلابی رنگ کا ایک ٹائٹ بلب جلنے دیا۔

دیر کروٹیں لینے کے بعد اس کے خراٹے بھی نشر ہونا شروع ہو گئے۔ بہت دنوں بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ سنیچر کے روز بستر پر تہا لینا تھا ورنہ یہ رات شادی کے بعد سے اس کے فرحین دونوں کے لیے بہت اہم ہوتی تھی۔

لیاقت حسین کب تک نیند کی دادیوں میں ڈوبا ہوا ہے یا نہیں رہا لیکن پھر شاید وہ خواب ہی کی کیفیت میں جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی سنان ویرانے میں کھنڈر کے درمیان کہیں پھنس گیا ہو جہاں ہر سو پتھر کے عجیب و غریب مجسمے منہ پھاڑ کر اسے نکل جانے کو آمادہ کر رہے تھے، وہ گھب اندھیرے میں ان کے درمیان سے بچتا بچتا نکلنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک قد آور کالا بھنگا انسان اپنی مکروہ شکل کے ساتھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔

لیاقت حسین کی خوفزدہ نظریں اس سیاہ قام مکروہ انسان کے چہرے پر مرکوز تھیں جب ایک قہقہہ اس کی قوت سماعت سے نکل آیا پھر کسی نے اسے لاکار کر کہا تھا۔

”مسلم..... آج تو پوری طرح ہمارے جال میں

ککشول

اس کے قریب بیٹھی تھی، اس کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جسے پہن کر وہ را حیلہ بیگم کی طرف گئی تھی۔

”تم..... تم کب آئیں.....؟“ لیاقت حسین نے خواب کی باتوں کو ذہن سے جھٹک کر فرحین کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔

”تیری خاطر بیگم صاحب سے بات بنا کر آئی ہوں..... چھوڑ تو سہی، لباس تبدیل کر لینے دے۔ دس پندرہ منٹ کا کہہ کر آئی ہوں، ابھی واپس بھی جانا ہے۔“

”ایک دن تو نے دفتر جاتے وقت میرا لباس خراب کیا تھا، آج تیری باری ہے۔“ لیاقت حسین نے فرحین کو پوری طرح دبوچ لیا، تو فرحین نے کہا۔

”دیکھ استری خراب ہو جائے گی..... ایک منٹ صبر کر لے، میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔“ فرحین نے کسمسا کر لیاقت حسین کے بازوؤں کے حصار سے لٹکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے نیم عریاں گداز جسم سے پھوٹی ہوئی مہک نے لیاقت حسین کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ فرحین پر حاوی ہو رہا تھا جب اس کے کانوں میں ایک ٹھوس آواز ابھری۔

”سنجھل جانا دان ورنہ دلدل میں گر جائے گا۔ موم جامہ کیا ہوا تعویذ خاموشی سے نکال کر عورت کے سینے پر رکھ دے۔“

لیاقت حسین کی پیش قدمی رک گئی، تعویذ سے متعلق اس کے ذہن میں ماں کی باتیں گونجنے لگیں۔ ایک بار پہلے بھی وہ فرحین کے دھوکے میں غلاطت میں گرتے گرتے بال بال بچا تھا۔ آج کسی غیبی آواز نے اسے بروقت سنبھالا دیا تھا۔ اس نے فرحین کو غور سے دیکھا پھر اسے ایک ہاتھ کے حصار میں جکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس دتی گھڑی کے پٹے کے نیچے دبا ہوا تعویذ نکالا تو فرحین کے روپ میں نظر آنے والی حسینہ نے مچلتے ہوئے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔

”لیاقت۔ اتنی زور سے نہ بھینچ۔ میرا دم..... گھٹ رہا ہے۔“

”انسان پر مستی سوار ہو تو پرانی عورت کو بھی من مانی پوری کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ تو، تو اپنی فرحین ہے۔“ لیاقت حسین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا پھر تعویذ عورت کے گداز سینے کے درمیان رکھا تو وہ یکھت ہڈیانی انداز میں چیخنے لگی۔

لیاقت حسین اچھل کر بستر سے نیچے آگیا، عورت کا جسم پاؤں کی جانب سے بتدریج سیاہ شکل اختیار کر کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ لیاقت حسین نے کمرے کی جی روشن کر دی، وہ پھٹی

پھنس گیا ہے، آج میں تیرے شریر کو دیوی کے چرنوں میں بلیدان کروں گا پھر تیرے خون سے اشان کر کے بھوانی کے سامنے اپنا وجہ کا اعلان کروں گا۔ تو بہت بھاگتا رہا، چھپتا رہا پھر تو آج تیری کھاٹ کھڑی ہونے کا سہ آگیا ہے۔“

لیاقت حسین دم سادھے کھڑا اس کرہہ الفطرت چولے کو دیکھ رہا تھا جب کسی نے نہایت نرم مگر ٹھوس آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”لیاقت پتر، تو ان گندی بدروحوں کی کوئی قلمت کر، اپنے خدا کو یاد کر۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، کوئی گندی طاقت تیرے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی۔“ لیاقت حسین نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ وہ لیاقت حسین کو تعویذ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی جب سیاہ بھنگا بیولے نے چیخ کر کہا۔ ”تو جو کوئی بھی ہے میرے راستے سے دور ہو جا نہیں تو، تو بھی جل کر بھسم ہو جائے گی۔“ جیلے کے ساتھ ساتھ اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے جھٹکا تو جنگلی جانوروں کے شورغل کی آواز چاروں طرف سے ابھرنے لگی۔ لیاقت حسین کی ماں کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

لیاقت حسین نے اپنی دتی گھڑی کے چرمی پٹے کو ٹٹولا۔ موم جامہ کیا ہوا تعویذ اب بھی پٹے کے نیچے موجود تھا۔ ”کیا کھوج رہا ہے مسلم۔ آج دھرتی کی کوئی شکلی تجھے شرن (پناہ) نہیں دے سکے گی۔ پر تاب نے تجھے جو شراب دینے کی ٹھانی تھی، دیوی کی کرپا سے وہ آج ضرور پوری ہوگی، تو نے میرے ایک منتر کو کھوٹا کر کے کسی کی جان بچالی تھی۔ آج تجھے اس کی سزا ادا ہو گئی پڑے گی۔“

پر تاب کا نام سن کر لیاقت حسین کے وجود میں چنگاریاں چمکنے لگیں، اس نے خدا کو دل سے یاد کیا پھر دل گڑا کر کے بولا۔ ”تم اپنی من مانی کر لو، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں نے جو بھی کیا تھا وہ کسی کی زندگی بچانے کی خاطر خدا کا نام لے کر کیا تھا۔ اسی لازوال قوت نے آج تک میری مدد کی تھی اور اب بھی وہی میری حفاظت کرے گا۔“

”سنے دیکھنا چھوڑ دے مورکھ۔ آج تو پوری طرح پر تاب کے بیروں کے چنگل میں پھنس گیا ہے اور..... اور تو جس دھرم کرم کی بات کر رہا ہے آج وہ بھی بھوانی کی کرپا سے نشت ہو جائے گا۔ ایک بار تو گندا اور پلید ہو گیا تو پھر کوئی شکلی تیری سہانچا بھی نہیں کرے گی۔“

لیاقت حسین نے جواب دینا چاہا لیکن کسی نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا، مدھم ٹائٹ بلب کی روشنی کے باوجود اس نے فرحین کو پہچان لیا جو

پچھنی نظروں سے عورت کے بھیانک انجام کو دیکھ رہا تھا جب دروازے کی جانب سے ایک مکروہ آواز ابھری۔
”مسلمے..... میری پجاریں کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔“
لیاقت حسین نے پلٹ کر دیکھا، دروازے کے پیچوں وچ پر تاب بھون سینہ تانے کھڑا، اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ پجاریں مدھوکی ہڈیانی چیخ بہ دستور درو دیوار سے ٹکرا رہی تھی، جب تنگ دھڑنگ سیاہ قام اور مکروہ صورت پر تاب نے دوبارہ بل کھا کر کہا۔

”میرا کہا مان لے مسلمے ورنہ تیرا انجام بھی بھیانک ہوگا۔ میں تیرے ہوتو سوتوں کو بھی دیکھ لوں گا جس شکتی نے تجھے پھیلی لگا رکھی ہے اس کی کھاٹ بھی کھڑی کر دوں گا۔“
لیاقت حسین کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب بجلی کا ایک کڑا کا ہوا، پر تاب بھون کے چہرے پر مردنی چھا گئی، وہ تیزی سے پلٹ کر باہر کی طرف بھاگا۔ لیاقت حسین اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تو وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔ پجاریں کی لاش جل کر کوئلہ ہو رہی تھی پھر اس نے راکھ کی شکل اختیار کی جس کے بعد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور راکھ کو بھی سمیٹ لے گیا۔ اجلی چادر پر ایک معمولی سی سلوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تعویذ بھی غائب ہو گیا تھا۔
جو بھی ہوا وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیاقت حسین نے اسی وقت غسل کر کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر پر تاب بھون کے بارے میں سوچنے لگا۔

سراج بھی اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے دفتر میں موجود تھا چنانچہ اس کی کالیں بھی اورنگ زیب ہی کے فون پر آرہی تھیں لیکن تمام کالیں ایک ہیڈ کاشیبل ریسیور پر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں ہی خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے جب پھر فون کی گھنٹی بجی اور حسب معمول ہیڈ کاشیبل نے کال ریسیور کی۔ اس بار اس نے یہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ دونوں افسران باہر گئے ہوئے ہیں لیکن دوسری طرف سے جو بات کہی گئی اسے سن کر ہیڈ کاشیبل نے ایک کاغذ پر جلدی سے ڈیل ایکس فور لکھ کر اورنگ زیب کے سامنے رکھتے ہوئے فون پر کہا تھا۔

”میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں جناب..... صاحب جیسے ہی واپس آئیں گے میں آپ کا پیغام.....“
اورنگ زیب نے کاغذ پر ڈیل ایکس فور لکھا دیکھ کر

ریسیور ہیڈ کاشیبل کے ہاتھ سے چھٹ لیا، معذرت کر ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ”آئی ایم سوری سر.....“
میڈیا کے علاوہ دوسرے لوگوں نے جینا عذاب کر رکھا ہے۔ ”جانتا ہوں.....“ دوسری سمت سے ایک بھاری کم آواز گونجی۔ ”لیکن، کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری پلاٹ کا میاب ہو جائے گی؟“
”آپ کا تعاون شامل رہا تو مجھے کامیابی کی پوری امید ہے۔“

”جو کچھ کرنا ہاتھ پیر بچا کر کرنا، تمہارا آکٹوپس بھی سے اپنے تعلقات کو کھنگال رہا ہے۔ ایک بات اور بھی ابھی کچھ دیر پہلے ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ کی کال آئی تھی آکٹوپس کو کسی طرح خبر مل گئی ہے کہ گزشتہ رات کی کارروائی اسی کے کمانڈوز نے کی تھی۔ کیا تم کو علم ہے کہ کونٹرل اسٹیشن اور تمہارا مطلوبہ مجرم دونوں کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں؟“
”جانتا ہوں سر..... اسی وجہ سے آکٹوپس نے اسے کال بھی کیا ہوگا۔“
”کیا مطلب؟“ دوسری جانب سے چونک و صاحت طلب کی گئی۔

جواب میں اورنگ زیب نے اپنی پلاننگ بتا دی۔ ”ہوئے جو کچھ کہا اسے سن کر سراج بھی چونکا تھا۔“
”میں تمہارے لیے صرف دعائی کر سکتا ہوں اورنگ زیب۔“ اس بار دوسری جانب سے بڑی اپنایت سے ”تم نے جو پلاننگ کی ہے وہ خدا کرے کامیاب ہوگی لیکن اگر..... آکٹوپس کو ایک لوز پوائنٹ بھی مل گیا تو تمہاری بسا پلٹ بھی سکتا ہے۔“

”اکھاڑے میں جیت صرف کسی ایک ہی پہلو ان کی ہوتی ہے سر..... لیکن میں نے جو ثبوت اب تک اکٹھا کر لیے ہیں اور جو ایکشن ابھی لینے ہیں ان کی کامیابی کے بعد پوری طرح قانون کے آہنی شکنجوں میں ہوگا۔“

”اوکے..... آئی وٹ یو گڈ لک۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا تو اورنگ زیب نے ریسیور کرڈیل رکھنے کے بجائے دو نمبر گھما کر لائن آنکج کر دی۔ ہیڈ کاشیبل کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے سراج نے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا سوالات گونج رہے ہیں؟“
”وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی مردہ آدمی کے بھیس میں کسی اور آدمی کے ذریعے کنول کو اغوا کرالینا ایک قابل تعریف عمل ہے لیکن کیا آپ کو امید ہے کہ وہ بھی آج

ککشول

کے حق میں بیان دے گی جبکہ وہ باقاعدہ آکٹوپس سے شادی بھی کر چکی ہے؟“
”ایسا ہی ہوگا اور یہ بھی ہمارے حق میں ایک پلس پوائنٹ ہوگا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم شاید یہ نہیں جانتے کہ کنول کے والد کو بھی اسی خون آشام آکٹوپس نے سر بازار موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا اور ایک مجبور عورت تریپ کر رہ گئی تھی۔ آج بھی اس نے زبان بند کر رکھی ہے، اس وقت بھی خاموش رہی تھی جب آکٹوپس نے کنول کے ساتھ محض محفوظ عیاشی کی خاطر نکاح بڑھوایا تھا۔“

”حیرت انگیز.....“ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”اتنے کم عرصے میں آپ نے آکٹوپس کے بارے میں اتنی ساری معلومات کیسے حاصل کر لیں؟ یہ بھی معلوم کر لیا کہ کونٹرل اسٹیشن اس کا کلاس فیلو رہ چکا ہے اور.....“

”تمہارے سارے سوالات کے جواب میں ایک بات واضح کر دوں تو شاید تم آسانی سے سب کچھ سمجھ لو گے۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”آکٹوپس کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خاطر مرکز کی جانب سے میرا انتخاب کیا گیا تھا چنانچہ میں نے یہاں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پیشتر ہی بہت ساری معلومات حاصل کر لی تھیں جو اب میرے لیے کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ تمہاری میڈیم روپی کے شوہر خالد ریاض کی موت میں بھی اسی..... آکٹوپس کا ہاتھ تھا، نہ ہوتا تو میڈیم اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کی خاطر انڈر ورلڈ کے ان تین آدمیوں کی خدمات بھی کبھی نہ حاصل کرتی جن میں سے دو مرچکے ہیں، صرف لوچن زندہ ہے اور..... شبہ کی ماں انجلا عرف انجم آرا کی موت بھی اسی انٹیلیس کی کمینگی تھی جو آج شیخ حامد کی صورت میں ایک عزت دار اور با اثر آدمی بنا بیٹھا نہ جانے کتنے شریف لوگوں کو اپنی خباثت سے پریشان کر رہا ہے۔“

اورنگ زیب بات کرتا رہا۔ سراج حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے گھورتا رہا پھر جب وہ خاموش ہوا تو سراج نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”آپ نے جہاں اتنی باتوں کا اعتراف کر لیا ہے وہاں ایک بات اور بتا دیں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں.....“ جواب میں اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”تم شاید شبہ کی بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہو؟“

”گویا آپ کو علم ہے کہ وہ کس طرح ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب کہاں ہوگی؟“
”ہاں..... مجھے اب بھی اس کی ایک ایک نقل و حرکت

کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ افضل خان کو بھی دھواں دھار فائرنگ کے تناو لے کے بعد میرے ہی اشارے پر محفوظ راستہ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سن لو کہ شہم اور افضل خان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ میری پلاننگ کیا تھی اور کیا ہے۔“
”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس بھی آپ کی تمام پلاننگ سے بے خبر ہوگا؟“
”اس کا اندازہ بھی مجھے ایک دو دن کے اندر ہو جائے گا۔“

جواب میں سراج کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ موبائل پر کسی کے نمبر روشن ہوئے۔ اورنگ زیب نے موبائل آن کرنے میں غیر معمولی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی نئی اطلاع..... آئی سی..... اوہ..... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اب بھی تمہارے ساتھ تعاون کرنے میں کسی ڈبل کراس کرنے کے منصوبے پر تو غور نہیں کر رہا..... اوکے..... تم وہاں پینچو میں کمانڈوز کے چیف آفیسر سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ اوہ یس..... ان دونوں کو ہر قیمت پر بچانا ہوگا۔“

اورنگ زیب نے موبائل بند کر کے جیب سے پھر وہی مخصوص آپریشن نکال لیا جو موبائل کی طرح تھا، ضروری بن دبانے کے بعد اسکرین پر پھر ایک سرخ نقطہ ابھر کر حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ اورنگ زیب ایک منٹ اسے بغور دیکھتا رہا پھر اس نے دوسرے بن دبا کر سڑکوں کا وہ جال دیکھا جس پر نقطہ ایک مخصوص سمت میں حرکت کر رہا تھا۔ سراج حیرت سے اس ڈیوائس کو دیکھ رہا تھا جب موبائل پر دوبارہ سنگٹل موصول ہوا۔ اورنگ زیب نے دوسرے ہاتھ سے موبائل آن کر کے کان سے لگایا، اس کی نظریں بہ دستور آپریشن کی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن موبائل پر جو اطلاع ملی اسے سن کر اس نے جواب میں صرف..... ”اوہ.....“ کہا پھر آپریشن کو میز پر رکھ کر اس نے بڑی سرعت سے کسی کے نمبر پیج کرنے شروع کیے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے غیر معمولی سنجیدگی سے سرسراہی آواز میں کہا تھا۔

”سر..... میں ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں..... جی ہاں، اٹ از ارجنٹ اینڈ ٹاپ پرائزٹی سر..... انڈر ورلڈ کا دہشت گرد اور زخمی وشتو دونوں ہمارے آدمیوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے ہیں۔ جی ہاں، ابھی ابھی اطلاع ملی ہے..... ایک دوسرا ہی زخمی بھی ہوئے ہیں، کچھ ذمے دار بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار ہیں لیکن بہر حال، یہ میرے لیے

ایک پریشان کن اطلاع ہے..... فوری طور پر میں درخواست کروں گا کہ تمام آن ڈیوٹی افسران اور کانسٹیبلز اسٹاف کو معطل کر دیا جائے اور زیر حراست رکھا جائے لیکن میرا نام درمیان میں نہ آئے تو مناسب ہوگا..... جی نہیں، شاید ابھی ہمارے ڈی آئی جی کو اس کی اطلاع نہیں ملی..... ٹھیکس.....

تھینک یو ویری میچ سر۔
کال ختم کر کے اورنگ زیب آپریشن ساتھ لیتا ہوا تیزی سے کرسی سے اٹھا۔ سراج اس کے ساتھ ہی دفتر سے نکلا، گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے دبی زبان میں پوچھا۔
”آپ کا کیا خیال ہے۔ لوچن اور وشنو کے فرار ہونے میں کس کا ہاتھ ملوث ہو سکتا ہے؟“

”یہ بعد میں دیکھا جائے گا..... فی الحال ہمیں شبنم اور اسلم ڈنکا کو بچانا ہے۔“ اورنگ زیب نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا، آکٹوپس نے جوابی کارروائی کے طور پر اب میری کچھ اہم شہادتوں کو ختم کرانے کا منصوبہ بنالیا ہے۔
”کیا آپ کو علم ہے کہ شبنم اس وقت کہاں ہوگی؟“

”ہاں..... وہ اس وقت آکٹوپس کے ایک زرخیز کتے کے ساتھ اسلم ڈنکا کی طرف جارہی ہے۔ اسے یقین دلایا گیا ہے کہ اسلم ڈنکا کو گولی مار دینے کے بعد وہ اس کی جگہ لے سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ اسلم کے مرتے ہی شبنم کو بھی گولی مار دی جائے گی۔“

”یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟“
”میرے تجربے اور..... اسے اس شخص نے اطلاع دی ہے جو اس وقت شبنم کے ساتھ ہے، یہ بھی سن لو کہ وہ اسلم ڈنکا کا خاص الخاص آدمی ہے۔ نہ ہوتا تو اس قدر اہم بات کو زبان سے نکالنے کی جرأت بھی نہ کرتا۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب کی زبانی پوری صورت حال معلوم ہو جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اورنگ زیب کی بے پناہ صلاحیتوں پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جب ایک نیا خیال بھی اس کے ذہن میں تیزی سے ابھرا۔
”کہیں لوچن اور وشنو کے فرار میں بھی تو اورنگ زیب کی کسی پلاننگ کا دخل نہیں تھا؟“

اس کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ یہ ظاہر وہ ابھی تک ”ہست و بود“ کی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ متحرک ہے لیکن کہاں؟ اس کا ذہن اس بات کی تصدیق کرنے سے قاصر تھا پھر ایک ٹھوس مردانہ آواز، اس کے کانوں میں پہلی بار واضح طور پر گونجی۔

”یہ مر گیا یا ابھی زندہ ہے؟“

”ابھی تک بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ زبانی آواز میں جواب ملا۔“ ہم نے اسے تکلیف کی شے سے نجات دلانے کی خاطر خواب آور انجکشن لگایا تھا۔“
”زخم کی کیا کیفیت ہے؟“ بہ دستور خشک لہجے پوچھا گیا۔

”قسمت اچھی تھی جو ہڈی چم گئی ورنہ زندگی لنگڑا تارہتا۔“

آوازیں اب افضل خاں کے ذہن میں واضح طور پر گونج رہی تھیں۔ اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ اب تک زندہ ہے لیکن آسمان سے آکر کہیں کھجور میں ضرور اتر گیا ہے، اس نے فوراً ہی آنکھ کھولنے کی غلطی نہیں کی۔ مدہوش ظاہر کرتا رہا مگر جب اس کے پیروں سے غالباً پٹیاں کھولی جارہی تھیں تب زخم میں شدید تکلیف کے احساس اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کراہتے ہوئے اس سفید کپڑوں میں ملیوس نرس کی نظر ڈالی جو اس کی بائیں ہڈی کی پٹیاں تقریباً کھول چکی تھی۔ وہ تکلیف اسے زخموں پر لگے کسی ٹیپ کے ادھیڑنے سے ہوئی تھی۔ اس کی کراہی آواز سن کر نرس کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔
”گھبراؤ نہیں..... ابھی تم زندہ ہو۔“ نرس نے آہستہ آہستہ ہمدردی کا اظہار کیا۔

”میں کہاں ہوں؟“
”خاموش رہو.....“ وہی مردانہ ٹھوس آواز دہرائی

جانب سے سرسراتی ہوئی ابھری پھر ایک درمیانہ قد کا شخص اس کے سامنے آگیا، اس کی نظروں میں بھی ملی جلی کیفیتیں گھڑم ہو رہی تھیں۔ افضل خاں نے فوری طور پر کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ اسے اس بات سے طمأنینہ کا احساس ضرور ہوا کہ وہ اس وقت کسی اسپتال میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں گزرے واقعات کی یلغار شروع ہو گئی۔
بگ باس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اسلم ڈنکا کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر اس نے جگا کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر تہا قاپو کرنے کی ٹھان لی تھی۔ امداد علی قاپو کر لینے کے بعد اسے اپنی کامیابی یعنی نظر آرہی تھی۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔ امداد کے فون کرنے پر جگانے اس سے ساحلی علاقے کے اسٹیک بار پر ملاقات کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا پھر..... وقت مقررہ پر جگا ایک خیراتی ادارے کی ایجوکیشن سے نکل کر سامنے آیا تو افضل خاں نے امداد علی سے بڑے خوفناک لہجے میں کہا تھا۔

کشکول

”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تم دونوں کو جہنم رسید کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔“
امداد علی کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے بائیں روف سے نکل کر بڑے دوستانہ انداز میں جگا سے بغلیں ہوا تھا جب افضل خاں نے سامنے آکر جگا کو لکڑا تھا۔ اسے اپنی کامیابی یعنی نظر آرہی تھی جب کسی نے پشت سے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ غیر متوقع شاندار کامیابی کے بعد نا کامی کے اس جھٹکے نے جیسے اس کے ذہن کو یکلخت مفلوج کر دیا۔
اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن اسلحہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد زخم میں ہونے والی شدید تکلیف نے اس کے سنبھلنے اور سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو بیکار کر دیا..... اس کی پلکوں کے نیچے گھپ اندھیرے تیرنے لگے۔ اس کا ذہن چکرایا تھا پھر وہ بے ہوشی سے دوچار ہو کر ساحل پر گر اٹھا اور..... اب ہوش آنے کے بعد وہ کسی اسپتال میں تھا جہاں اس کے زخم کا معائنہ کیا جا رہا تھا لیکن ڈاکٹر نظر آنے والے شخص کے سخت اور سرد طرز متحاطب نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی جگا یا امداد علی اسے نظر نہیں آئے۔ وہ ان کے بارے میں قیاس آرائی کر رہا تھا جب ڈاکٹر نے اس کی پشت پر کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا۔
”اس کو بستر پر لٹاؤ۔“

اس جملے کے بعد ہی افضل خاں کو خیال آیا کہ وہ اس وقت وہیل چیئر پر تھا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وہ وارڈ بوائے بھی سامنے آگیا جو اس کی وہیل چیئر چلا رہا تھا، اس نے ڈاکٹر کے حکم کی پیروی میں افضل خاں کو بڑی آسانی سے کرسی سے اٹھا کر قریبی بستر پر ڈال دیا جو مریضوں کے معائنے کے لیے مخصوص تھا۔

افضل خاں دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ زخم کے معائنے کے دوران نرس اس کو اسٹ کر تی رہی، ڈاکٹر نے زخموں کو دوبارہ صاف کر کے اس پر ضروری دوا بھی لگائیں پھر جتنی دیر میں وارڈ بوائے زخموں کی پٹی کرتا، نرس نے ڈاکٹر کے کہنے پر اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔
”باقی دونوں کا کیا حال ہے؟“ ڈاکٹر نے نرس کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر زخموں کا بہ غور معائنہ کرنے لگا۔
”وہ دونوں نارمل نظر آ رہے ہیں۔“

”اسے واپس لے جا کر ان دونوں کے پاس چھوڑ دو اور.....“ ڈاکٹر نے ایک بار پھر افضل خاں کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میجر نصرت کو باور کرا دینا کہ زخم ایسا نہیں ہے کہ یہ مر جائے..... ایک دو بیویوں کے بعد اس کی بھی

ضرورت نہیں ہوگی۔“ پھر وہ نرس کا جواب سنے بغیر کمرے سے لیفٹ رائٹ کرتا تیزی سے نکل گیا۔ وارڈ بوائے اور نرس نے افضل خاں کو ڈنڈا ڈولی کر کے پھر وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔ پانچ منٹ بعد مختلف راہدار یوں سے گزارنے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں تین اسٹول، ایک بیچ اور ایک آرام دہ کرسی کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ افضل خاں نے ایک ہی نظر میں پوری سچویشن کا بہ غور جائزہ لیا، اس کا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ وہ کسی باقاعدہ اسپتال میں نہیں تھا، کسی خاص ایجنسی یا گروہ کی تحویل میں تھا جہاں اس کے زخم کی مرہم پٹی شخص اس کو زندہ رکھنے کی خاطر کی گئی تھی۔ جگا اور امداد علی کے چہروں کے تاثرات کچھ اور کہہ رہے تھے۔ یہ ظاہر ان کے چہروں سے کسی تشویش کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وارڈ بوائے اسے وہیل چیئر سے بیچ پر منتقل کرنے کے بعد یاہر گیا تو دروازہ بھی باہر سے بولٹ کر دیا گیا۔ افضل خاں کا ذہن اس سچویشن کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب امداد علی کی سپاٹ اور خشک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”دیکھ لیا تو نے اپنی پختہ خانی کا نتیجہ..... تیرے ساتھ ہم بھی بلاوجہ گڑے میں آ گئے۔“
”ہم اس وقت کس کی تحویل میں ہیں؟“ افضل خاں نے مجبوراً سوال کر لیا۔

”تم.....“ جگانے اسے خوشخوار نظروں سے دیکھا۔
”تم اس کو بھی اپنی سسرال ہی سمجھو جہاں تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوگا جیسا پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی لانے پر اس کے سسرال والے کرتے ہیں۔“
افضل خاں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف جگا کو سرد نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

”ایک بات یاد رکھ ڈھیلے!“ امداد علی نے اپنی سابقہ اور ٹھیک پولیس والوں کی زبان استعمال کی۔ ”تو اب تک جس کھونٹے پر اچھل رہا تھا، اب وہ بھی تجھے ہتھیلی لگانے کی غلطی نہیں کرے گا۔ جانتا ہے کیوں؟..... ہم اس وقت ملٹری کی ہائی کمان کے چوہے دان میں پھنس گئے ہیں جہاں کسی کی دال نہیں گٹے گی، ایک ہی جلاب میں سارا کھایا یا پیابا ہر نکال لیا جائے گا۔“

”تمہیں اس کا اندازہ کیسے ہوا.....؟“ افضل خاں ملٹری کی ہائی کمان کے حوالے پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔
”بتی جل جانے دے۔ پھر جب اسی کال کو ٹھہری میں میجر نصرت کی عدالت دوبارہ سجے گی تو تجھے بھی آٹے وال کا

بھلاؤ معلوم ہو جائے گا۔“ جگانے بل کھا کر کہا۔ ”اس کی موٹی فائل میں سب کا اعمال نامہ درج ہے، تیرے اس حرامی پاس کا بھی جو تجھے چارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔“

افضل خان نے جگا اور امداد علی کو باری باری یہ غور دیکھا پھر غراتے ہوئے بولا۔ ”موٹی فائل میں تمہارے بھی سارے سابقہ کروت ضرور درج ہوں گے۔ کل جو سزا نہیں ملی وہ آج مل جائے گی پھر..... ساتھ ہی جیل میں چکی بھی گھم لیں گے۔“

”بات میری تیری نہیں ہے پاگل دے پتر.....“

امداد علی نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”اصل چکر بلی کے گلے میں گھنٹی ڈالنے کا ہے۔ میں نے پولیس کے محکمے میں ایو بس پاپڑ نہیں بیٹے ہیں۔ ہمیشہ تیل اور تیل کی دھار پر نظر رکھا کر رہی ہے۔“ اس نے ذرا مدھم آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”بات اب تیرے شیخ جی کی ڈگڈگی بجانے کی ہے۔ ملٹری کے بڑوں کو بھی شیخ ڈبا پیر کی ہسٹری شیٹ مکمل کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے۔ دو گواہوں اور وکیل کے بغیر نکاح بھی مکمل نہیں ہوتا۔ ہماری فکر میں دبلا ہونے کی مت سوچ۔ ہم نے شہادتوں کے خانے میں انگوٹھا لگانے کی سوچ لی ہے۔ تو اپنی فکر کر ورنہ کھاٹ کھڑی ہونے میں دیری بھی نہیں ہوگی..... شیخ کی پھیلی اب تیرے تھلے نہیں لگ سکے گی۔“

اس بار افضل خان نے امداد علی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

چار گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا، دو فوجی جوان ایک میز لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آرام دہ کرسی اٹھا کر میز کے ساتھ رکھی پھر لائٹس جلا کر خاموشی سے واپس چلے گئے، جگا اور امداد علی سنبھل کر بیٹھ گئے، افضل خان بہ دستور لیٹا رہا۔ دونوں فوجیوں کے جانے کے بعد ایک حوالدار ہاتھ میں موٹی سی فائل دبائے اندر آیا۔ اس نے فائل میز پر رکھ کر باری باری تینوں کو گہری نظروں سے دیکھا پھر افضل خان کو مخاطب کر کے کرخت لہجے میں بولا۔

”ایشن ہو کر شیخ باؤ ماسٹر، تمہاری میڈیکل رپورٹ بھی اسی فائل میں ہے۔ خوش قسمت ہو جو گولی نے ہڈی کو ہٹ نہیں کیا ورنہ اپنا ج بھی ہو سکتے تھے۔“

افضل خان خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ ہنسی بار کھلا تو جگا اور امداد علی بھی سنبھل کر سیدھے ہو گئے۔ والا میجر نصرت ہی تھا جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے، کمرے میں داخل ہو کر میجر نصرت کی تیز نظریں افضل خان کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ درمیانہ قد اور گٹھے ہوئے مالک تھا، اس کی عتقانی نظروں میں ذہانت کی مخصوص تھی۔ افضل خان کی نظریں بھی میجر سے چارہور ہی تھیں۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے نظریں جھکا لیں، میجر نصرت نظروں میں کوئی ایسی ہی خاص بات تھی جو وہ اس سے تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس کے وجود میں اٹھل شروع ہو گئی۔

میجر کچھ دیر کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا افضل خان کو گھورتا رہا پھر اس نے آرام کرسی پر بیٹھ کر موٹی فائل کھول لیا، کچھ دیر اس کے صفحات کو الٹا پلٹا رہا پھر ایک پر پہنچ کر وہ رک گیا، کاغذات کے اندراجات کو دیکھتا رہا اس نے نظریں اٹھا کر دوبارہ افضل خان کو دیکھا۔

”تمہارا اصل نام کیا ہے؟“ اس نے ٹھوس اور سخت لہجے میں سوال کیا۔

”محمد افضل.....“

”خان کا اضافہ کب اور کیسے ہوا.....؟“ میجر کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جو افضل خان کسمسا کر رہ گیا ذرا تھم کر بولا۔

”یہ نام میرے پاس نے ملازمت کے بعد رکھا تھا.....“

”ملازمت سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟“ میجر کی نظریں بہ دستور افضل خان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”پولیس کی نظروں سے چھپتا پھرتا تھا۔“ افضل خان نے اس بار اپنی مظلومیت کا اظہار کیا۔ ”میرے خلاف ایسے بے بنیاد کیس بنائے گئے تھے کہ کا براہ راست میری ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”آئی۔سی.....“ میجر نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”جس کیس میں تمہیں پھنسا یا جا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟“

”ایک بڑے وی آئی پی کی نو جوان لڑکی کے رپ کی چکر تھا۔“

”اس لڑکی کا نام گل رخ تھا جو میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اسے کالج سے واپس جاتے وقت راستے سے اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے اس کو ایک دین میں ڈال کر سینڈس پٹ لے گئے جہاں دو آدمیوں نے اس کی آبرو لوٹا

ککشول

اور تیسرا مووی بناتا رہا۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سے تین کروڑ کا مطالبہ کیا گیا۔ رقم مل جانے کے بعد اغوا کرنے والوں نے ٹیکسی کی واپسی کے لیے بھی سودے بازی کی لیکن ان کا اعتماد انہیں لے ڈوبا۔ پولیس کے ماؤس ٹریپ (MOUSE TRAP) میں ایک آدمی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ دوسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔“

”مجھے اتنی تفصیل نہیں معلوم لیکن پولیس نے میرا نام بھی اس کیس میں شامل کر لیا تھا۔“ افضل خان نے سنبھل کر معصوم بننے کی کوشش کی۔

”جس آدمی نے مووی بنائی تھی اس کا نام جانتے ہو.....؟“

”جناب..... جب میں اس کیس میں شامل ہی نہیں تھا تو کسی کا نام.....“

”میں بتاتا ہوں.....“ میجر زہر خند سے بولا۔ ”اس کا نام باسٹر ڈ..... بن آف اے بیج تھا۔“

افضل خان کسمسا کر اپنی معصومیت کا اظہار کر رہا تھا، جب میجر نصرت نے ایک تصویر فائل سے نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ افضل خان کی اپنی ہی تصویر تھی جسے ایسے مخصوص زاویے سے کھینچا گیا تھا کہ اس کے چہرے کے علاوہ ایک شخص کو لڑکی کو رپ کرتے ہوئے بھی پیش منظر میں رکھا گیا تھا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی خود افضل خان بھی چکر ا گیا۔

”میرے پاس وقت کم ہے افضل خان.....“ میجر نے بڑے زہریلے انداز میں بات آگے بڑھائی۔ ”اسی تصویر کے ذریعے تمہیں ملازمت ملی، پولیس کے ہاتھوں سے بچانے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ تمہاری کمرل ہسٹری کی فائل کو سر دخانے میں ڈلوادیا گیا جس میں تم پولیس کو درکار تھے، اب کیا کہو گے؟“

افضل خان نے جواب نہیں دیا، حالات اور تصویر کی ثبوت کی بنا پر اس نے خود کو ٹھنڈا ہی رکھنے کی ٹھان لی تھی۔

”اب تم کہاں ملازم ہو.....؟“

”فی الحال.....“

”ون منٹ.....“ میجر نصرت نے کرخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ ”یہ سوال انکواری نہیں ہے۔ ہیرا پھیری کرو گے تو پھر گلے گلے تک پھنسا جاؤ گے۔ سچ اگل دو گے تو کچھ رعایت بھی حاصل کر سکتے ہو..... اب جواب دو..... تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟..... جگا اور امداد علی سے تمہاری کیا ذاتی دشمنی تھی جو تم نے ایک کے ذریعے

دوسرے کو پھانسنے کی کوشش کی تھی؟“

”مجھے اس کی ہدایت اسلم ڈنکانے دی تھی۔ وہ بھی پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی فہرست میں شامل ہے۔“ افضل خان نے پھر بات گھمانے کی کوشش کی لیکن خود گھوم کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میجر نصرت کی انگلی کے اشارے کے ساتھ ہی حوالدار کا ہاتھ بھی گھوم گیا تھا، ضرب گدی پر لگی اور اتنی شدید تھی کہ افضل خان کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس ہاتھ میں لوہے سے زیادہ سختی اور وزن تھا۔

میجر کی کرخت آواز پھر ابھری۔ ”تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟“

”وہ بہت دن ہوئے مجھے ملازمت سے برطرف کر چکا ہے لیکن اس کے آدمی اب بھی اسی کے حوالے سے مجھے کام کرنے پر مجبور.....“

”ڈونٹ بیٹ اباؤٹ دی بش۔“ میجر کے تیور خطرناک ہونے لگے۔ ”اس بل ڈاگ کا نام کیا تھا؟“

”ش..... اے..... شیخ حامد۔“ افضل خان نے دہی زبان میں اقرار کر لیا۔

”گڈ.....“ میجر نصرت نے کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ابھی جو تصویر دکھائی گئی تھی وہ بھی اسی کے آدمیوں نے تمہیں پالتو کتوں کی طرح مالک کے اشاروں پر دم ہلانے کی خاطر اتاری تھی۔ فارون ریزن اونلی..... تاکہ تم بھونک نہ سکو..... انڈرا سٹینڈ۔“

افضل خان نے خاموشی ہی میں نجات سمجھی۔ میجر نصرت نے تیزی سے پلٹ کر امداد علی کی سمت دیکھا۔

”تمہارے سابقہ ریکارڈ میں زیادہ کچرا نہیں ہے لیکن..... پولیس کی ملازمت اور معمولی تنخواہ کے باوجود تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ تم نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ ہماری انفارمیشن کے مطابق جگا کو بھی تم ہی نے سرمایہ دے کر اسٹیبلائز کیا تھا؟“

”یہ سب مال غنیمت اور اوپر کی کمائی کا کرشمہ ہے صاحب بہادر۔“ امداد علی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”تھانے اور پکھریوں میں جس کی گوٹ بھی پھنسن جاتی تھی وہ شارٹ کٹ اختیار کرنے کی خاطر مال پانی خرچ کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا تھا۔ میں صرف اپنے تعلقات کو کیش کرتا تھا صاحب بہادر۔ البتہ لمبی رقم میں لمبی ڈنڈی مارنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ جب چار میسے جمع ہو گئے تو میں نے پولیس کی ملازمت پر بھی چار حروف بیج دے۔ یہ اوپر والے کی مہربانی تھی کہ دھندامند نہیں ہوا۔“ امداد علی نے بات جاری رکھی۔

”جہانگیر سے (جگا) سے پرانی یاری تھی صاحب بہادر اس لیے میں نے اسے بھی سید سے راستے پر لگانے کی خاطر.....“

”شیخ حامد سے تمہاری کیا دشمنی ہے.....؟“ میجر نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

”جگا کی وجہ سے وہ بلا فضول مجھ سے ادھار کھانے لگا ہے جناب ورنہ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔“

”مسٹر جہانگیر بیٹ.....“ میجر نے جگا کی طرف دیکھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ تم نے سید سے سادھے کا رو بار کے ساتھ کچھ غنڈے بھی پال رکھے ہیں جن کی خدمات منہ مانگی اجرت وصول کرنے کے بعد فروخت کرتے ہو؟“

”میں انکار نہیں کروں گا جناب۔“ جگا نے صاف گوئی سے کہا۔

”ایک بار پولیس کے رگڑے میں پھنسنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کی خاطر کچھ سرپھروں کی ٹولی بنائی ہے۔ نہ بنائی ہوتی تو شاید بے گناہ ہونے کے باوجود شیخ حامد کے عتاب کا شکار ہو گیا ہوتا۔ اس کے علاوہ پولیس کا بھتہ بھی دیتا رہتا ہوں۔“

میجر نصرت کچھ دیر جگا اور امداد علی کو کریدتا رہا پھر اس نے افضل خاں کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک زمین سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

”اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ اس نے دو ٹوک لہجے میں بات کی۔

”کیا اب بھی شیخ حامد کے اشاروں پر ناچو گے یا اس کے خلاف گواہی دینے کو ترجیح دو گے.....؟ تمہارے پاس کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں صاحب بہادر..... ملٹری والے جب دم پر پاؤں رکھ دیں تو حکومت کا تختہ بھی الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔“ امداد علی نے افضل خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ کس کھیت کی.....“

”شٹ اپ.....“ میجر نصرت نے ڈپٹ کر امداد سے کہا تو وہ ہاتھ باندھ کر سٹ گیا۔

افضل خاں کے چہرے سے قیمتی برس رہی تھی، وہ ابھی کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک جونیئر آفیسر نے اندر داخل ہو کر ہاتھ میں دبا کورڈ لیس میجر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سر..... چیف آف دی لائن۔“

میجر نے کورڈ لیس لے کر کانوں سے لگا لیا۔ اس کے

”ہیلو سر.....“ کہتے ہی دوسری جانب سے کہا گیا۔

”فوری طور پر ایس پی اورنگ زیب سے رابطہ قائم کرو۔ اس کے پاس تین اہم نظری اور موجود ہیں جو ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوں گی۔“

”کیا انہیں بھی میڈ کو اڑانا ہے؟“

”نہیں..... بی کوٹیک۔“ دوسری جانب سے مختصر جواب کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میجر نے کورڈ لیس جونیئر آفیسر کے حوالے کرتے ہوئے افضل خاں کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں صرف کل صبح تک کی مہلت اور دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو کہ تمہیں آخری جواب کیا دینا ہے۔ پھر اس سے پیشتر کہ افضل خاں کوئی جواب دیتا۔ میجر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ ایس پی اورنگ زیب سے فون پر گفتگو کر رہا تھا۔

~~~~~

چینی باشندے لوچن اور رام دیال کے فرار کی خبر کے ساتھ ان کی نگرانی پر مامور تمام چھوٹے بڑے افسران کی فوری معطلی کی خبر نے جہاں انجینی کے لوگوں کو حیران کر دیا، وہاں عوام کو بھی پولیس کے خلاف زہرا گلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہر جانب سے پولیس کی کارکردگی پر لعن طعن ہو رہی تھی، کاروباری حلقے کے افراد بھی شور مچا رہے تھے لیکن شیخ حامد اس خبر کو پڑھ کر بری طرح تلملارہا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات خود اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ وہ دونوں ایس پی اورنگ زیب جیسے دورانہدیش اور ایماندار آفیسر کی نگرانی میں ہونے کے بعد کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا شیطانی ذہن اس خبر کو آسانی سے من و عن تسلیم کر لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

شیخ حامد کو لوچن سے زیادہ رام دیال کی فکر تھی جسے اس نے آڑے وقتوں کے لیے آخری حربہ سمجھ کر بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ دشمن کی حیثیت سے پڑوسی ملک میں بھی اس کی دہشت گردی کا ڈنکا بج چکا تھا۔ بے شمار وارداتوں میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ایک بار بھی کسی انجینی کی لسٹ پر خطرناک مجرم کی حیثیت سے درج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا طریقہ واردات ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح عدالت سے صاف بچ نکلتا تھا لیکن اس کی اپنی بیوی ہی اس کے حق میں دشمن ثابت ہوئی تو اس کے پاس سرحد پار کر جانے کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ کلونت سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ عورتوں کی اس کے لیے کوئی کمی نہیں تھی لیکن کلونت کو گھر کی صاف ستھری ہانڈی تھی جسے نظر انداز کر کے اس نے کبھی باہر کی کسی ”چمپنی ڈش“ پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی بھول نہیں کی تھی لیکن جب ایک دن اس نے کلونت کو اپنے ہی ایک ساتھی کے ساتھ الٹ پلٹ کرتے دیکھ لیا تو اس سے

کشکول

برداشت نہ ہو سکا۔ رام دیال خود چشم دید گواہ تھا اس لیے اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی، کلونت کی بے وفائی نے اس کی ساری سوچ بوجھ اور دورانہدیشی چھین لی، اس نے اپنے ساتھی کے جسم کو گولیاں مار مار کر چھلنی کر دیا پھر اس نے کلونت کی طرف خونی نظروں سے گھورا۔

”میں فردوش ہوں رام دیال۔“ کلونت نے بسورتے ہوئے اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا۔ ”واگرو کی سوگند، میں اسے تیرا دوست سمجھ کر ہنس بول لیا کرتی تھی لیکن آج اس پاپی کے من میں شیطان آ گیا تھا، میں نے لاکھ بیتی کی پرنتو.....“

”مجھے تجھ پر پورا پورا دشواس ہے کلونت!“ رام دیال نے آگے بڑھ کر کلونت کے گدرائے ہوئے جسم کو ایک آخری بار اپنے بازوؤں میں جکڑ کر پیار کرنا چاہا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے کرپان نکال کر کلونت پر پے درپے وار کرنے شروع کر دیے۔ کلونت کے انگ، انگ سے خون کا فوارہ ایلنے لگا، وہ دہائی دیتی رہی لیکن جب تک رام دیال نے اسے کرپان مار مار کر ناقابل استعمال نہیں بنا دیا اس کا ہاتھ چلتا ہی رہا پھر جب کلونت کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے حلقوں سے اٹل کر باہر آ گئیں، وہ تھوڑا کے اس کے قدموں پر اونٹنی گر گئی تو رام دیال اس پر تھوک کر باہر جانے کے لیے پلٹا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ کلونت کی چیخ و پکار سے اس کے دروازے پر پورا محلہ جمع ہو گیا تھا۔ کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی تھی۔

رام دیال نے بازی پلٹتے دیکھی تو بھاگ کر چھت پر پہنچ گیا۔ ایک دوسرے سے ملی جلی چھتوں نے آسانیاں فراہم کر دیں، وہ ایک دوسرے کو پھلانگتا ہوا آخری مکان کی چھت تک پہنچ گیا۔ یہ اس گاؤں کا آخری مکان تھا جس سے چار فرلانگ دور پڑوسی ملک کی سرحد تھی۔ سرحد کے باشندے ایک دوسروں سے ضرورت کی چیزوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے اس لیے وہاں سختی بھی زیادہ نہیں تھی۔

رام دیال کو بارڈر کراس کرنے میں معمولی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جب اس نے اپنا بھرا ہوا بٹوا، سونے کی گھڑی، ہیرے کی انگلی کی علاوہ بدن کے قیمتی کپڑے بھی دائر پر لگا دیے تو اسے چیک کرنے والوں نے اپنی آنکھیں داغیں باغیں کر لیں۔ رام دیال پل بھر میں کوسوں کا فاصلہ طے کر کے آبادی تک پہنچ گیا۔ دورات تک وہ ایک واقف کار کے گھر ٹکرا رہا پھر وہاں سے بڑے شہر آ گیا جہاں قسمت نے یاوری کی تو بلیک ٹائگر نے اسے رام دیال کی حیثیت

سے شناخت کر لیا پھر بلیک ٹائگر کی سفارش پر ہی شیخ حامد نے اپنے برے دنوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ رام دیال کے بجائے اسے دوبارہ دشمن کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ دشمن کی حیثیت سے اس نے بلیک ٹائگر کے ساتھ مل کر کئی اہم اور خطرناک معاملات میں اپنے جوہر دکھائے تو شیخ حامد کی نظروں میں اس کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اس نے دشمن کو بہت سنبھال کر کسی خاص موقع پر استعمال کرنے کو محفوظ کر لیا تھا۔

اورنگ زیب کے ہاتھ لگ جانے کے بعد بھی شیخ حامد کو یقین تھا کہ دشمن کی اصلیت نہیں کھلے گی۔ اس کا جرم اتنا سنگین بھی نہیں تھا کہ قانون اسے لمبی سزا دیتا لیکن لوچن نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ یہ بات شیخ حامد کے علم میں نہیں آئی۔ اندر ہی اندر لوچن اور دشمن کے درمیان ایک چھڑی پک گئی لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ لوچن اس کے کسی مخالف گروہ کا نمائندہ ہے۔ دشمن یا رام دیال کی اصلیت کھل جانے کے بعد بات بگڑ بھی سکتی تھی۔

شیخ حامد کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے براہ راست مرکز میں اپنے ایک زرخیز اعلیٰ عہدے دار کو فون کیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے ادھر ادھر کی دوستانہ باتوں کے بعد چپختے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دواہم مجرموں کے فرار کے علاوہ ان کی نگرانی پر مامور عملے کی معطلی کی اطلاع آپ کو بھی ضرور ملی ہوگی؟“

”جی ہاں..... ڈی آئی جی نے انفارم کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں جلد دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ وہ دونوں براہ راست آپ کے ایس پی اورنگ زیب کی نگرانی میں تھے؟“

”جی ہاں..... اور اسی کے کہنے پر تمام عملے کو معطل بھی کیا گیا ہے۔“ دوسری جانب سے بے پردائی سے جواب دیا گیا۔

”جو افراد فرار ہوئے ہیں ان میں ایک چینی باشندہ ہے، لوچن جو انڈر رورلڈ کا آدمی ہے، جس نے میرے آفس کو آگ لگانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا اور دوسرا.....“ شیخ حامد نے کچھ توقف سے کہا۔ ”دوسرے کی اصلیت کا علم اگر پڑوسی ملک کو ہو گیا تو پھر یہ معاملہ بین الاقوامی طور پر بھی سنگین صورت اختیار کر سکتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ ”کون تھا وہ.....؟“



”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”تمہیں یہ یاد کرانے کی خاطر کہ اب ایس پی اورنگ زیب کا حلقہ تمہارے گرد آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔“

”میں شام کو شائع ہونے والے اخباروں کی بے سرو پا خبروں پر زیادہ غور نہیں کرتا۔“ شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔

”صبح کے اخباروں میں جو خبریں شائع ہوتی ہیں، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو..... کھل کر کہو.....“

”تم نے استاد کے بارے میں میرا کام آسان کر کے جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔“ اس بار سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”لوچن اور دوسرے قیدی کا فرار محض تمہاری آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ایک ڈراما ہے۔ جو پہریدار معطل ہوئے ہیں اس میں بھی تمہارے ایس پی کا خاص دخل ہے۔“

”تم نے جگا کو چھڑانے کی خاطر اب تک کیا تیر مار لیا ہے؟“ شیخ حامد نے بل کھا کر پوچھا۔

”ہم نے سارا پروگرام مکمل کر لیا ہے۔ دو روز بعد تم کو بھی حالات کا علم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں ایک آخری مشورہ اور دوں گا۔ عمل کرنا نہ کرنا تمہارے اختیار کی بات ہوگی۔“

”اس وقت کس مقصد سے فون کیا تھا.....؟“

”کھوپڑی کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کیا کرو شیخ حامد..... زیادہ گرمی کھانے سے ذہنی صلاحیتیں بھی آہستہ آہستہ تنگ آلود ہونے لگتی ہیں۔“ بی بی پروائی سے کہا گیا۔ ”قسمت ساتھ نہ دے تو پانے بھی وغا دے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے شبنم اور اسلم ڈنکا کے لیے جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی تمہاری جلد بازی تھی۔ تم شاید بھول گئے تھے کہ جو آدمی شبنم کو لے کر اسلم کی طرف گیا وہ اس کا خاص آدمی ہے اور..... خاص لوگ خاص خاص موقعوں پر ہی کام دکھاتے ہیں۔ دو روز بعد تمہاری خیریت دوبارہ دریافت کروں گا..... ہائی۔“

دوسری جانب سے ایک معنی خیز جملہ کہہ کر سلسلہ منقطع کیا گیا تو شیخ حامد فوراً ہی چونکا۔ اس نے کسی شے کے امکانات کو دور کرنے کی خاطر بار بار اسلم ڈنکا، شبنم اور تیسرے آدمی کو کال کیا لیکن دوسری جانب سے کسی نے کال رد نہیں کی۔ یہ بھی اس بات کی تصدیق تھی کہ فون پر اسے

## فن حنوط کاری

یہ مصریوں کا لاشیں محفوظ کرنے کا خاص فن تھا۔ وہ لوگ اس کام کے لیے مختلف روغن عرق، مسالے اور بیج استعمال کرتے تھے۔ یہ فن مصری تہذیب کے مٹنے کے ساتھ ہی مٹ گیا اور اب مصر میں کسی کو اس کی ترکیب معلوم نہیں۔ مصری اپنے مردوں کو پیٹ چاک کر کے معدہ، آنتیں، دل، پیچھڑے اور دیگر اعضا نکال دیتے، اس کے بعد اسے مذکورہ بالا اشیاء سے بنی مرہم یا پیسٹ لگا کر اس پر جراثیم کش محلول میں ڈوبی ہوئی سوئی پٹیاں لپیٹ دیتے تھے پھر لاش کا میک اپ کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اصل سے مشابہ نظر آنے لگتی تھی۔ پھر وہ اسے تابوت میں لٹا کر نکون نما اہرام میں رکھ دیتے تھے، اہرام کا ڈیزائن بھی ایسا تھا جس سے لاشیں تروتازہ رہتیں اور خراب نہ ہوتی تھیں۔ اس طرح وہ انہیں طویل عرصہ تک محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ان محفوظ شدہ لاشوں کو ”میاں“ کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

جو اطلاع ملی وہ غلط نہیں تھی۔

اسلم ڈنکا اور شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کا تصور ہی شیخ حامد کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ خبر کی تصدیق ہو جانے کے بعد وہ خاصی دیر تک بیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے کسی کے نمبر ڈائل کرنے کی خاطر فون کا ریسیور اٹھایا تھا کہ موبائل پر سنگل ملے۔ اسکرین پر جانے پہچانے نمبر نہیں تھے اس کے باوجود اس نے رخ بدلتے حالات کے پیش نظر کال اٹینڈ کرنے کو ترجیح دی۔

”کون بول رہا ہے؟“ مانک پر ایک نئی آواز سن کر اس نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”آپ کا خادم ہوں یاس۔“ دوسری جانب سے مانوس آواز سنائی دی۔ شیخ حامد وشنو کی آواز سن کر چونکا۔ ”تم..... تم اس وقت کہاں ہو.....؟“

”ایک انتہائی خطرناک مجرم جو انٹر پول کی فہرست میں بھی ہے لیکن ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا جاسکا، شاید اس لیے کہ ابھی تک قانون کے پاس اس پر ہاتھ ڈالنے کی خاطر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔“

”آپ کو اتنے اندر کی بات کس طرح معلوم ہوئی؟“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

”جب آپ حضرات نے اورنگ زیب کو یہاں تعینات کیا وہ بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔“ شیخ حامد کے شیطانی ذہن نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑ لی۔ بڑی چالاکی سے زہر چھڑکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں جو ایک ایس پی کے سامنے کھٹنے ٹیک دوں، اس کے کچھ چہیتے میری جیب میں بھی پڑے ہیں جو خاص خاص باتیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ چینی اور دوسرے شخص نے ایک دوسرے کو شاخت کر لیا تھا پھر.....“ شیخ حامد نے ایک لمحے کی معنی خیز خاموشی کے بعد سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے فرار میں بھی کوئی مصلحت یا ذاتی لالچ شامل رہی ہوگی۔“

”ایس پی ٹھوس اصولوں کا مالک ہے، اس کے علاوہ اس کے اپنے بھی کچھ تعلقات ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی سے بلاوجہ مرعوب نہیں ہوتا لیکن.....“ دوسری طرف سے ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کبھی غیر قانونی حرکت میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے آپ کے مخبر نے محض حالات کے پیش نظر موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر آپ کو ایک بے بنیاد ٹپ دے دی ہو؟“

”مجھے امید تھی کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔“ جواب میں شیخ حامد نے دبی زبان میں کہا۔ ”بہر حال، آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں اس کا دائرہ اختیار بھی خاص وسیع ہے۔ بھی موقع ملے تو پڑوسی ملک کے اپنے ہم منصب سے وشنو اور رام دیال کے نام لے کر ان کا باہمی تعلق دریافت کرنے کی زحمت ضرور گوارا کر لیجیے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آپ کو لوچن اور دوسرے فریق کے فرار ہونے میں کچھ اہم ہاتھ بھی ملوث نظر آجائیں۔“

”ون منٹ مائی ڈیر.....“ دوسری جانب سے یکھٹ سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”وشنو..... میرا خیال ہے کہ یہ نام میں پہلے بھی نہیں سن چکا ہوں۔ کہاں؟ اس وقت یاد نہیں آ رہا۔“

”آپ مصری شخصیت کے مالک ہیں جناب، میں

نے آپ کا خاص قیمتی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔“ شیخ حامد نے پہلی بار انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”بچہ سلام دعا کروں گا۔“

”نہیں مائی ڈیر..... تم نے اس وقت میرے ذہن کو کچھ الجھا دیا ہے، مجھے وشنو کے بارے میں اور بتاؤ..... پلیز۔“

”آپ کی ملٹری کے ذہین افسروں میں ایک کرنل احتشام کا بھی آتا ہے۔ اس سے رابطہ کر لیں، ممکن ہے وہ میرے مقابلے میں آپ کو زیادہ تفصیل سے آگاہ کر سکے۔ میں ایک دو دن میں..... دوبارہ کال کروں گا۔“

شیخ حامد نے رابطہ منقطع کر دیا، اس کے چہرے پر دستور غور و فکر کے گہرے تاثرات طاری تھے۔ اس کے ذہن کے آدمی آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے۔ بلیک ٹائیگر کی موت کے بعد سے قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جگا اور افضل خان کا ملٹری کی تحویل میں ہونا بھی اس کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں تھا، اورنگ زیب آہستہ آہستہ اس پر حاوی آنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے اپنے سوا کسی اور کی برتری منظور نہیں تھی، اسلم ڈنکا ایک کارآمد آدمی تھا لیکن وہ بھی افضل خان کو سمر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا شاید اسی لیے جگا اور امداد علی کو قابو کرنے کا پروگرام عین وقت پر خراب ہو گیا تھا۔ شیخ حامد کو اس پلٹتی ہوئی بازی کے پیچھے اسلم ڈنکا کا ہاتھ

محسوس ہوا تو اس نے شبنم کے ذریعے اسے بھی ٹھکانے لگانے کی سوچ لی تھی۔ ایک تیر سے اس نے کئی نشانے لینے کی کوشش کی تھی وہ اسی کی کامیابی کی خوشخبری سننے کا منتظر تھا۔ ابھی اس کے پالتو شکاری کتوں میں کچھ ایسے کارآمد لوگ بھی تھے جو بچے ہوئے مہروں کی جگہ لے سکتے تھے۔

اورنگ زیب کے شکوک و شبہات کو ختم کرنے کی وجہ سے اس نے اسلم ڈنکا اور شبنم دونوں کو ایک ہی جھٹکے میں راستے سے ہٹانے کی چال چلی تھی۔ اس کے بعد اس کے ذہن میں صرف وشنو کا نام تھا جو اورنگ زیب کے مقابلے میں کام آ سکتا تھا لیکن اس کے اور لوچن کے فرار ہو جانے کے بعد وہ مزید کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی اور قبائل کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے موبائل پر سنگل ملا، روشن اسکرین پر وہی نمبر نظر آ رہا تھا جس نے شیخ حامد کو یہ بتایا تھا کہ جگا، امداد علی اور افضل خان کسی ایجنسی کی تحویل میں تھے، اس کی اطلاع غلط بھی نہیں تھی۔ ایک لمحے تک وہ اس نمبر کو بے غور دیکھتا رہا پھر ٹھوس آواز میں بولا۔





## چوری

اقبال کاظمی

کبھی کبھی غیر اہم چیزیں زندگی کے لیے اتنی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں کہ انسان سر دھڑکی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ذک ویلوٹ کے کارناموں سے اگرچہ ایک دنیا واقف ہے مگر کچھ نہ کچھ ایسا بھی ہے جو اب تک عام پر نہ اسکا۔ اس بلی میں بھی کچھ ایسا ہی راز پوشیدہ تھا۔

**اصول پسندی کو حقیقت پسندی کے قالب میں ڈھالنے والے تک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ**

ناممکن کا لفظ اگرچہ تک ویلوٹ کی لغت میں نہیں تھا لیکن آج وہ بڑی سنجیدگی سے اس لفظ کے مفہوم پر غور کر رہا تھا۔ ماضی میں اس نے ایسے ایسے کارنامے کر دکھائے تھے جن پر پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ ناممکن کی مہر لگائی جاسکتی تھی مگر یک نے ثابت کر دکھایا تھا کہ اگر انسان میں صلاحیت اور حوصلہ ہو تو اس دنیا میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہوتا جسے ناممکن قرار دیا جاسکتا ہو۔ مگر آج وہ ہوٹل کے وسیع لان کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا وہ کسی کی چسکیاں

ہے جس کو صرف ایک آخری مہرہ اور پٹینا ہے، اس سے حساب چکنا کر لوں پھر کوئی چٹنا نہیں رہے گی۔“

”کس کی بات کر رہے ہو.....؟“ شیخ حامد آخری مہرے والی بات پر چونکا۔

”تمہارے اسی ایس پی کی جس نے جگا اور افضل خاں جیسے چوہوں کو شکار کرنے کا ٹانگہ رچایا تھا اور اب انجان بن رہا ہے۔“ اس بار بھی وہ بنگ لہجے میں کہا گیا۔ ”اس کی کھاٹ کھڑی کر دوں پھر من کو شانتی مل جائے گی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن تم جس دو غلے شخص پر بھروسہ کر رہے ہو وہ.....“

”آم کھانے کی بات کرو باس۔ بیڑوں کی گنتی کا دھیان من سے نکال دو۔ تمہارا کام بہت جلدی ہو جائے گا۔“

دوسری جانب سے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا تو شیخ حامد دانت پیس کر رہ گیا۔ جس نمبر سے کال کی گئی تھی اس کو اس نے دوبارہ آزمایا۔ مائیک پر ایک ہی جملہ بار بار سنائی دیا۔ ”آپ نے جس نمبر کو ملا یا ہے وہ کسی کے استعمال میں نہیں۔ مزید معلومات کے لیے ہماری کسٹمر سروس سے رابطہ قائم کریں۔“

شیخ حامد بری طرح ہیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے اس وقت وشنو کی تلاش تھی جو اس کے ہاتھ آکر دوبارہ چھوستر ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے تشویش ناک تھی کہ وشنو نے لوچن کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی تھی۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ وشنو کو جیل سے فرار ہونے کے بعد ان باتوں کا علم کس طرح ہو گیا کہ افضل خاں اور جگا کو فوج کے خفیہ ہاتھوں تک پہنچانے میں اورنگ زیب کا ہاتھ تھا۔ ان باتوں کا علم خود اسے بھی کسی نامعلوم فرد کے ذریعے ہوا تھا جو جگا کو ہر قیمت پر بچانے پر آمادہ تھا۔ ”وہ شخص کون تھا؟ اسے اورنگ زیب اور فوجی انٹیلی جنس کے گٹھ جوڑ کا علم کس طرح ہو گیا؟ یہ بات پورے یقین سے کس طرح کہی تھی کہ جگا کے بارے میں حالات کا فیصلہ دو دن کے اندر ہو جائے گا؟“

اور..... اس بات کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ لوچن اور وشنو کا فرار ہو جانا محض ایک ڈراما تھا؟ نیز جن پہرے داروں کو غفلت کا مرتکب سمجھ کر معطل کیا گیا اس میں بھی اورنگ زیب کے مشورے کا عمل دخل تھا؟“

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

”یہ نہیں بتا سکتا مالک لیکن جہاں بھی ہوں پوری طرح محفوظ ہوں۔“

”میں تم سے فوری طور پر ملنا پسند کروں گا۔ ایک اہم کام لینا ہے۔“

”ابھی ملاقات کا سے نہیں ہے باس لیکن اتنا دشواری رکھو کہ وشنو اب دوبارہ آسانی سے خاکی وردی والوں کے ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”تمہارے ساتھ اور کون ہے.....؟“ شیخ حامد نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔

”وہی جس کے ساتھ مل کر میں ایک اور ایک گیارہ ہو گیا ہوں۔“

”اس پر اعتماد نہ کرنا وشنو۔ وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔“

”پرانی بات ہے باس۔“ اطمینان سے جواب دیا گیا۔ ”جس پارٹی سے بھی ہو لیکن اب وہ میرا انگلیٹیا بن گیا ہے۔ ہم پہلے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قانون کو گنتی کا تاج نچا چکے ہیں۔ اب پھر وہی کھیل تماشاً شروع کرنا ہے۔ آپ کے دیس کے لوگوں اور خاکی وردی والوں کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ جیل کی سلاخیں وشنو کا راستہ کبھی کھوٹا نہیں کر سکتیں۔“

”مم..... میں، لوچن کی بات کر رہا ہوں۔“

”جانتا ہوں باس.....“ اس بار بہت جلدی میں کہا گیا۔ ”میرے پاس سے کم ہے، آپ اپنا کام بتاؤ اور دشواری رکھو کہ میں اب بھی آپ ہی کا ٹانگہ حلال ہوں۔ آپ نے اور سورگ باسی بلیک ٹائیگر نے میری جو سہائتا کی تھی وہ ابھی تک یاد ہے مجھے۔“

”تم اس چینی کو غلط سمجھ رہے ہو وشنو..... وہ تمہارا.....“

”اس کو بھول جاؤ باس.....“ دوبارہ جلد بازی میں جواب ملا۔ ”مجھے حکم دو تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟“

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ معاملات تمہاری سوچ سے زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔“

”یہ بھی کبھر ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ فوج کو ہتھیار لگانے کے لیے کس نے دعوت دی تھی لیکن اب وہ بھی نہیں بچے گا۔“ وشنو نے دھمکتے لہجے میں کہا۔ ”جس دن میں نے کلونٹ کے سندر شریر کو اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، اس دن وشنو بھی مر گیا تھا۔ اب کیول رام دیال زندہ



لیتے ہوئے اس لفظ کے معنی تلاش کر رہا تھا جسے بقول خود اس نے بھی لفظ نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں لفظ ناممکن کے ایک معنی ناکامی بھی ہو سکتے تھے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ زندگی میں پہلی بار اپنی کسی مہم کے سلسلے میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

تقریباً پندرہ روز قبل اس کے ایک موکل نے نیویارک میں ایک ہیئر کلب چرانے کے سلسلے میں اس کی خدمت حاصل کی تھی۔ پیٹر جون نامی اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تو ضرور رہی ہوگی۔ اس کا شمار بلاشبہ شہر کے چند گنے چنے دولت مندوں میں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی ایک دوست کا ہیئر کلب چوری کروانا چاہتا تھا۔ پیٹر جون کے کہنے کے مطابق یہ کلب اس نے تین سال قبل اپنی داشتہ لائی کو تحفے میں دیا تھا۔ لالی اب تک یہ سمجھتی رہی کہ پیٹر اس سے شادی کر لے گا۔ لیکن جب اس نے صاف انکار کر دیا تو لالی نے اسے دھمکی دے ڈالی کہ اگر پیٹر نے ایک ماہ کے اندر اندر اپنی بیوی نینسی کو طلاق دے کر اس سے شادی نہ کی تو وہ نینسی کو پیٹر اور اپنے تعلقات کے بارے میں سب کچھ بتا دے گی۔ لالی کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پیٹر نے اسے جو ہیئر کلب تحفے میں دیا تھا وہ نینسی کی ملکیت تھا اور اس نے پیٹر کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ انکار کی صورت میں وہ نہ صرف نینسی کو تمام حالات سے آگاہ کر دے گی بلکہ ثبوت کے طور پر وہ کلب بھی پیش کر دے گی۔ پیٹر جون کے یہ سارے ٹھٹھاٹ باٹ اپنی بیوی نینسی ہی کے مرہون منت تھے۔ شادی سے پہلے وہ ایک تلاش آدمی تھا لیکن پھر نینسی نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ اس کی بدولت پیٹر کو آج عزت اور شہرت کا یہ مقام حاصل تھا اور اب تو وہ کونسل کا ایکشن لڑنے کے تیاری بھی کر رہا تھا جس میں اس کی کامیابی یقینی تھی لیکن لالی کی وجہ سے اب یہ سب کچھ خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ شادی سے پہلے پیٹر اور نینسی میں ایک تحریری معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے پیٹر اس کی ہر چیز کا مالک تھا۔ وہ نینسی کی کروڑوں کی جائیداد کا بھی نگراں تھا اور نینسی نے کبھی اس سے حساب طلب نہیں کیا تھا۔ اس طرح اسے سیاہ سفید کا مالک کہا جاسکتا تھا لیکن یہ سب کچھ مشروط تھا۔ نینسی نے معاہدے میں یہ شرط بھی رکھی تھی کہ اگر کبھی پیٹر کے کسی دوسری عورت سے تعلقات ثابت ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ اس سے چھن جائے گا بلکہ نینسی بھی اس سے طلاق حاصل کر لے گی۔ پیٹر جانتا تھا کہ یہ سب کچھ چھن

جانے کا مطلب کیا ہوگا۔ وہ ایک بار پھر قصر مذلت کی گہرائیوں میں کھوجائے گا اور لالی اسے پستیوں میں دھکیلے پر تلی ہوئی تھی۔

پیٹر جون کے کہنے کے مطابق اس ہیئر کلب کی قیمت پچیس تیس ڈالرز سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی واپسی کے لیے اس نے لالی کو ایک گراں قدر رقم کی پیش کش کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس کلب کی عدم موجودگی میں لالی اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ جبکہ لالی کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ نینسی سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے۔ اس کے لیے اس نے پیٹر جون کو ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔ لالی کے پاس اگر کچھ دولت ہوتی تو پیٹر اس کے مطالبے پر غور کر سکتا تھا لیکن وہ تو خود دولت کی طلبگار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پیٹر کے ساتھ اس کے قدموں میں دولت کا بھی ڈھیر لگ جائے گا۔

پیٹر جون نے اپنا سب کچھ بچانے کے لیے نیک ویلوٹ کی خدمات حاصل کیں اور اس کی مقررہ فیس پچیس ہزار ڈالرز نقد ادا کر کے اسے پندرہ دن کے اندر اندر لالی سے وہ ہیئر کلب حاصل کرنے کی درخواست کی، نیک نے اسی روز منصوبہ بندی شروع کر دی۔ وہ آٹھ روز تک لالی کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران لالی نے وہ کلب ایک لمحہ کو بھی اپنے بالوں سے جدا نہیں کیا تھا۔ نیک کی منصوبہ بندی اگرچہ بڑی خوبصورت تھی لیکن لالی کی احتیاط اور دور رس رہنمائی سے اس کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اسے بھی غالباً اس کلب کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا اور شاید اس کی چھٹی حس اس سلسلے میں اسے خبردار بھی کر رہی تھی۔

نویں روز لالی اچانک ہی نیوجرسی روانہ ہو گئی۔ اگر نیک اس کی نگرانی نہ کر رہا ہوتا تو ٹاپا ہی رہ جاتا۔ اسے صرف ایک گھنٹا پہلے پتا چلا تھا۔ وہ گلو ریا کو اطلاع دیے بغیر لالی کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ لالی نے نیوجرسی میں صرف ایک روز قیام کیا تھا، اس سے اگلے روز وہ فلوریڈا روانہ ہو گئی۔ یہ نیک کی خوش قسمتی تھی کہ اس مرتبہ لالی نے بحری سفر کو ترجیح دی تھی۔ نیک کا خیال تھا کہ بحری سفر کے دوران اسے لالی کے کلب پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر اس مرتبہ بد قسمتی شروع ہی سے اس کے تعاقب میں تھی۔ سفر کے دوسرے روز شام کے وقت لالی جہاز کے عرشے کی رینگ کے قریب کھڑی تھی کہ یکایک اس کا پیر پھسلا اور وہ سمندر

میں جا گری۔ اس وقت عرشے پر نیک کے علاوہ صرف ایک عورت تھی جس نے لالی کو گرتے دیکھ کر شور مچا دیا۔ تیز رفتار جہاز رکتے رکتے بھی وہاں سے تقریباً ایک میل آگے نکل چکا تھا۔ مزید بد قسمتی یہ کہ اسی وقت بارش بھی شروع ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک لالی کی لاش تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر تاریکی اور بارش کے باعث کامیابی نہ ہو سکی اور جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ نیک کو اگرچہ علم تھا کہ سمندر میں گرتے وقت کلب لالی کے بالوں میں لگا ہوا تھا لیکن اسی رات اس نے لالی کے کہین کی تلاش بھی لے ڈالی جس میں ظاہر ہے اسے ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔

اگلی بندرگاہ پر نیک نے جہاز چھوڑ دیا اور طیارے پر نیویارک روانہ ہو گیا جہاں اسے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ پیٹر گزشتہ رات کار کے حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ اس اتفاق پر نیک کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔ اس کیس میں تین باتیں ہوتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کا شکار سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ مطلوبہ چیز چرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور تیسری بات یہ کہ اس کا موکل بھی ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ نیک ویلوٹ نے اگرچہ اپنی فیس پچیس ہزار ڈالرز پہلے ہی وصول کر لی تھی لیکن اس نے یہ فیس رکھنا گوارہ نہیں کیا۔ وہ پیٹر جون کی بیوہ کو بھی یہ رقم نہیں لوٹا سکتا تھا۔ اس نے اخراجات کاٹ کر باقی رقم ایک گمنام خیر کی حیثیت سے ایک محتاج خانے کو بھیج دی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کیس کے نتیجے کو اپنی ناکامی سمجھے یا کوئی اور مفہوم پہنائے۔

گلو ریا آج سہ پہر کسی کام سے مین ٹن گئی تھی اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد نیک ویلوٹ لان میں آ گیا تھا اور ایک گوشے میں تنہا بیٹھا بیڑی چسکیاں لیتے ہوئے اس کیس پر غور کر رہا تھا کہ اپنی پشت پر کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہی اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا دوسرے ہی لمحے وہ چونک گیا۔

وہ ایک دراز قامت عورت تھی۔ لمبے سیاہ ریشمی بال لہوؤں پر بھول رہے تھے۔ آتش رنگ کے سرخ لباس میں وہ شعلہ جوالہ نظر آرہی تھی۔ وہاں اگرچہ روشنی بہت کم تھی لیکن نیک نے پہلی ہی نظر میں اس کا تعصبی جائزہ لے لیا اور اسے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی غیر ملکی تھی

نیک کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

## سرگزشت

ماہنامہ

دسمبر 2012ء  
کی کہانیاں

### اختراع

اردو کے ایک بڑے ادیب کی سوانح حیات خوش نوا: پوری دنیا میں آواز کی بدولت تہلکہ مچا دینے والے گلوکار کا تذکرہ

### زور آور بھارت

ان دو پہلوان بھائیوں کا زندگی نامہ جو دشمنی کا شکار ہو گئے

### مہنگ

ایک معدوم ہوتی نسل جو پانی پر زندگی گزارتی ہے، خشکی پر رہنا اسے پسند نہیں

### خواب ہو گئے

عزم و استقلال اور قسمت کے گرد گھومتی ایک نوجوان کی دلچسپ آپ بیتی

### لکھنے والا

اور بھی بہت سے بچے واقعات، معلوماتی تحریریں

ہر شمارہ خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک لسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

حاصل شمارہ، حاصل شمارہ، حاصل شمارہ، حاصل شمارہ



اور پھر عورت کے لہجے نے اس امر کی تصدیق بھی کر دی۔  
”اگر میرا خیال غلط نہیں تو میں اس صدی کے عظیم ترین فنکار تک ویلوٹ سے مخاطب ہوں۔“ وہ شعلہ بدن و لہریب انداز میں مسکرائی۔

”فنکار!“ تک چونک گیا۔ ”میرا نام تک ویلوٹ ضرور ہے لیکن تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، کسی فن سے میرا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں.....“

”مجھے شبہ کہتے ہیں، مس شبہ۔“ عورت نے تعارف کرایا۔ ”میرا تعلق ایران سے ہے اور شکاگو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے ہر وہ شخص فنکار کہلانے کا مستحق ہے جو اپنے فن میں مہارت رکھتا ہو اور تمہارے بارے میں میری معلومات غلط نہیں ہو سکتیں۔ تم اپنا کام جس سلیقے اور ہنرمندی سے انجام دیتے ہو۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔“

”شاید تمہیں.....“  
”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔“ مس شبہ نے اسے ٹوک دیا۔ ”میں نے کم از کم دو ماہ تک تمہاری نگرانی کرائی ہے اور تمہارے بارے میں وہ سب کچھ جان چکی ہوں جو میں اپنے لیے ضروری سمجھتی تھی۔ تم میری معلومات کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ کیا یہ غلط ہے کہ چند روز قبل پیٹر جون نامی ایک دولت مند شخص نے لی نامی ایک عورت کے قبضے سے ہیزر کلپ چرانے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں اور اس وقت تم یہاں بیٹھے اپنی ناکامی کا ماتم کر رہے تھے؟“

”ناکامی۔“ تک نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایرانی عورت اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی، اس سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔ ”کیا تم اسے ناکامی کہہ سکتی ہو؟“

”در اصل اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ مس شبہ مسکرائی۔ ”لی نامی وہ عورت اگر سمندر کی لہروں کی نذر نہ ہو جاتی تو تم اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہو جاتے۔ کیا تمہارے لیے یہ خوشی کی بات نہیں کہ اپنے موکل کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئے؟“

”تم واقعی میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ بہر حال میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ فی الحال میں کسی کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اگر تم کوئی مسئلہ لے کر آئی ہو تو اس کے لیے تمہیں کم از کم چھ ماہ مزید انتظار کرنا پڑے گا۔“ تک ویلوٹ نے کہا۔

”اس وقت حالات بالکل مختلف ہوں گے۔“ مس شبہ بڑبڑائی۔ ”نہیں، میں اس قدر طویل انتظار نہیں کر سکتی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری فیس میں اضافہ کر سکتی ہوں۔“

تک ویلوٹ واقعی کام کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہن سے پچھلے کیس کے اثرات زائل کرنے کے لیے کم از کم دو ہفتے مکمل طور پر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن فیس میں اضافہ کے نام پر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ”کتنا اضافہ کر سکتی ہو؟“ اس نے شبہ کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”دس ہزار ڈالر۔“ اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ اگر تم چاہو تو میرے کیس میں تقریباً چالیس ہزار ڈالر کماسکتے ہو۔“

”میں کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میری مقررہ فیس سے زیادہ ادا کرے لیکن لوگ ہی اپنی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہوں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر تمہیں میرے بارے میں تمام معلومات کا دعویٰ ہے تو میری شرائط سے بھی آگاہ ہوگی؟“

”ہاں، جانتی ہوں کہ تم اپنی فیس پیشگی لیتے ہو اور کوئی ایسی چیز نہیں چراتے جس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو یا.....“  
”ٹھیک ہے!“ تک نے اسے مزید کہنے سے روک دیا۔ ”تم کیا چرانا چاہتی ہو؟“

”ہلی۔ اس کے لیے تمہیں جیکسن سٹی جانا پڑے گا۔“ شبہ نے جواب دیا۔

”ہلی!“ تک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آج تک لوگوں کے لیے جتنی بھی چیزیں چرائی تھیں ان کی کوئی نہ کوئی ایسی حیثیت ضرور تھی جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا لیکن ہلی سے کیا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہیں اس ایرانی لڑکی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ چالیس ہزار ڈالر میں تو کم از کم چار ہزار بلیاں خریدی جاسکتی تھیں۔

”کوئی خاص ہلی ہے۔ میرا مطلب ہے اس ہلی کی کوئی خاص اہمیت ہے جسے تم چوری کرنا چاہتی ہو؟“

”اس سلسلے میں تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ البتہ میں تمہیں ہلی کا حلیہ بتا سکتی ہوں۔“

”ہلی کا حلیہ۔“ تک نے اسے گھورا۔  
”ہاں، اگرچہ بہت سی بلیاں ایک جیسی ہو سکتی ہیں لیکن میری مطلوبہ ہلی قدرے مختلف ہے۔ ایرانی ہلی ہے۔ لہجہ سفید بالوں والی جس کی پیشانی پر دائیں آنکھ سے

ڈراڈ پر سیاہ بال ہیں۔ گنتی کے چند سیاہ بال جو ممکن ہے دور سے نظر نہ آسکیں۔ اس کے لیے تمہیں اس کے قریب جا کر دیکھنا پڑے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ وہ بہت خوشخوار قسم کی ہلی ہے۔“

”میں کئی خوشخوار عورتوں کو رام کر چکا ہوں۔ ہلی کی کیا حیثیت ہے لیکن کیا یہ نہیں بتاؤ گی کہ ان صاحبہ سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟“ تک نے سہراتے ہوئے کہا۔

”اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اس کام کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“ شبہ اس کے مزاح کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”اگر آمادہ نہ ہوتا تو اس وقت تم میرے پاس نہ بیٹھی ہوتیں۔“

شبہ اسے گھور کر رہ گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”تیرے ڈسین ڈرائیو۔ جیکسن سٹی۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جہاں میرے ہم وطن مقیم ہیں۔ اس کام کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں ہے لیکن یہ جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم سے کہاں رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے؟“ تک نے پوچھا۔

”یہاں میں اپنے ایک ہم وطن کے ہاں مقیم ہوں جو دوسروں سے میرا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا اس لیے تمہیں اپنا پتا اور فون نمبر بتانا بے کار ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ یہ چاہی اپنے پاس رکھ لو سینٹرل اسٹیشن کے لا کر نمبر ایک سو بیس میں تمہیں چالیس ہزار ڈالر کی رقم مل جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ چاہی اپنی دوست گلو یا کوڈے کو آج رات ہی جیکسن سٹی روانہ ہو جاؤ۔ گیارہ بج کر بیالیس منٹ پر جیکسن کے لیے ایک پرواز جانے والی ہے۔ اس کے بعد صبح سات بجے سے پہلے تمہیں کوئی براہ راست پرواز نہیں ملے گی۔“ شبہ نے پرس سے ایک چابی نکال کر میز پر رکھ دی۔

”گلو یا یہاں موجود نہیں۔ وہ مین مین گئی ہوئی ہے۔ لا کر سے رقم لینے میں خود جاؤں گا۔“ تک بولا۔

”گلو یا اب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اپنے فلیٹ پر پہنچ چکی ہے۔ بہر حال، میں تمہیں فوری روانگی پر مجبور نہیں کروں گی۔ تم اپنا پروگرام خود ترتیب دے سکتے ہو۔ میں تمہیں دن بعد کسی بھی وقت تم سے رابطہ قائم کروں گی۔“ شبہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

تک ویلوٹ نے گلاس اٹھا کر چسلی بھری اور عجیب سی نظروں سے شبہ کی طرف دیکھنے لگا جو قیامت کی چال چلتی ہوئی ہوٹل کی لابی کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے آخری گھنٹہ بھر گلاس میز پر رکھا اور خود بھی اٹھ گیا۔ دوسرے

ہی لمحے وہ بھی تیز تیز قدموں سے لابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود شبہ کی نظر نہیں آسکی تھی۔ لابی میں پہنچتے ہی گویا وہ فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ تک پیر جھٹکتا ہوا ایک فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی تصدیق ہوئی کہ گلو یا تقریباً ایک گھنٹہ پہلے مین مین سے واپس آ چکی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر تک سپر حانیو یارک سینٹرل اسٹیشن پہنچا۔ وہ راستے بھر اس ایرانی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جو محض ایک ہلی چرانے کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالر ادا کر رہی تھی۔ تک نے اپنے موکلوں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا لیکن شبہ نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا جو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس طرح وہ اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ تک جانتا تھا کہ ایران میں انقلاب کے بعد ہزاروں شاہ پسند امریکا آ گئے تھے اور ایران کی انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے منصوبہ بناتے رہتے تھے۔ لیکن یہ الگ بات تھی کہ آج تک ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ انقلاب کے بانی مذہبی رہنما کی گرفت شروع ہی سے بہت مضبوط رہی تھی اور سازشی عناصر عتاب سے بچنے کے لیے ملک چھوڑ چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ وہ غیر ممالک میں بیٹھ کر ایران کی انقلابی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے لیکن تک ویلوٹ کو امید تھی کہ ہلی کی چوری کے اس کیس میں کوئی سازش نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک سو بیس نمبر کا لا کر کھلتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں چالیس ہزار ڈالر کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی کے ساتھ جیکسن کے لیے ایک ہوائی ٹکٹ بھی موجود تھا۔ ٹکٹ پر تک ویلوٹ کا نام اور پرواز کا وقت گیارہ بج کر بیالیس منٹ درج تھا۔ شبہ نے اگرچہ اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ لا کر کی چابی گلو یا کوڈے کو خود جیکسن سٹی روانہ ہو جائے لیکن اس کے باوجود اسے یقین رہا ہوگا کہ لا کر تک خود کھولے گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی اس کی روانگی کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ گویا وہ تک کی فطرت سے بھی پوری طرح آگاہ تھی۔ رقم اور ٹکٹ نکال کر تک ویلوٹ اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں گلو یا اس کی منتظر تھی۔ تک نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ جب وہ ایک مختصر سانسزری بیگ لے کر گلو یا کے ساتھ فلیٹ سے باہر نکلا تو اسے یقین تھا کہ شبہ یا اس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کی نگرانی ضرور کر رہا ہوگا۔ شبہ نے جس انداز میں سے اپنے آپ کو پیش کیا تھا اس سے وہ خاصا محتاط ہو گیا تھا۔



ایرپورٹ پر پہنچ کر گوریہ نے اسے خدا حافظ کہا اور تک بیگ ہاتھ میں لٹکائے ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہو گیا جہاں کاؤنٹر سے اس نے ٹکٹ او کے کروایا اور لوگوں کے ہجوم میں نہلتا ہوا محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی چہرہ اس کی نظروں میں مشتبہ نہیں تھا لیکن وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے بیگ ایک سیٹ پر رکھا اور قریب بیٹھی ہوئی عورت کو بیگ کی حفاظت کے لیے کہتا ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے چند منٹ بعد وہ عقبی کھڑی سے کود کر اس لاؤنج کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا جو آنے والے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ اس لاؤنج میں آنے کے لیے بھی اسے ہاتھ روم کی کھڑکی کا سہارا لینا پڑا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لاؤنج سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ تک کو یہ سارا چکر چلانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ شہر پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ تمام تر چالاکیوں کے باوجود وہ اس کی سرگرمیوں پر نگاہ نہیں رکھ سکتی۔ پہلے چوراہے پر ایک کار کھڑی دیکھ کر اس نے ٹیکسی روک لی اور بل ادا کر کے تیز تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھ گیا۔ وہ گوریہ کی جگہ پر اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تک کے بیٹھے ہی گوریہ نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ جیکسن سٹی کی طرف تھا۔ ہوائی جہاز سے تک ویلوٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن کار میں یہی فاصلہ وہ صبح تک طے کر پاتے، تک نے اس مرتبہ گوریہ کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ اس کے لیے مددگار ثابت ہو سکے۔

صبح ساڑھے سات بجے وہ جیکسن سٹی پہنچ گئے۔ اس وقت اسٹیزنگ تک کے ہاتھ میں تھا۔ سب سے پہلے نظر آنے والے ہوٹل کے سامنے اس نے گاڑی روک لی اور انہیں ساتویں منزل پر ایک کمرال گیا۔ تازہ دم ہونے کے بعد انہوں نے ناشتا کیا اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ چند منٹ بعد ہی کمرے کی فضا میں گوریہ کے خزانے سنائی دیے گئے۔ تک پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی لیکن وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گوریہ بجے کے قریب تک نہایت خاموشی سے بستر سے اٹھ گیا، اس نے لباس تبدیل کیا اور آہٹ پیدا کیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ آٹومیٹک دروازہ خود بخود مقفل ہو گیا تھا اور چابی پلنگ کے قریب میز پر موجود تھی۔ اسے یقین تھا کہ بیدار ہونے کے بعد گوریہ اگر کمرے سے نکلنا بھی چاہے گی تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

تک ویلوٹ ایک مرتبہ پہلے بھی جیکسن سٹی آچکا تھا لیکن اس شہر کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ڈسٹریکٹس کی طرف ہے۔ وہ ہوٹل میں شہر کا نقشہ دیکھنا بھی بھول گیا تھا لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ جس کا حل تلاش نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارہ کیا جو اس سے چند گز آگے جا کر رکی۔ تک نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور کو ڈسٹریکٹس کی طرف اشارہ کر دیا۔

ڈسٹریکٹس شہر کے آخری سرے پر ثابت ہوا۔ اسے بلاشبہ شہر کا خوبصورت ترین علاقہ کہا جاسکتا تھا۔ تک نے چوراہے کے قریب ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ خوبصورت شاپنگ سینٹر سے آگے رہائشی علاقہ تھا۔ وسیع و عالی شان کوٹھیاں تھیں۔ تک کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ علاقہ شہر کے امرا کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ اوسط آمدنی والا کوئی شخص تو یہاں رہائش اختیار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تیرہ نمبر کی عمارت خاصی وسیع و عریض ثابت ہوئی۔ اس دو منزلہ عمارت کے چاروں طرف وسیع رقبے پر لان پھیلا ہوا تھا۔

چار دیواری اگرچہ زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کے اوپر تقریباً دس فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ تک کو اس باڑ کی ساخت سے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ رات کو ان خاردار تاروں میں برقی رو چھوڑ دی جاتی ہوگی۔ گیٹ پر خوف ناک صورت والا ایک محافظ بھی موجود تھا جو پتلون کی بیلٹ میں ریوالور اڑ سے اندر کی سمت ٹھہل رہا تھا۔ وہ کوئی ایرانی باشندہ ہی تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک بڑی سی تختی بھی آویزاں تھی جس پر کپاؤنڈ میں خونخوار کتوں کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے لوگوں کو دور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تک کے خیال میں یہ تختی بیکار ہی میں لگائی گئی تھی۔ کتے تو اندر ہوں گے لیکن لوگ تو گیٹ پر ٹھہلتے ہوئے خونخوار محافظ کی صورت دیکھ کر ہی گیٹ کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتے ہوں گے۔

تک ویلوٹ نہلتا ہوا ایک نسبتاً اونچی جگہ پر رک گیا جہاں سے کوٹھی کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف منزل کی بالکونی پر دو بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی اور نظر نہیں آیا۔ تک چند منٹ وہاں کھڑا جائزہ لیتا رہا پھر ایک طویل چکر کاٹ کر عمارت کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ اس طرف تنگ سی سڑک تھی جس کے پرلی طرف گنجان درخت تھے۔ سڑک انسان تھی۔ تک ایک

درخت پر چڑھ کر لان کا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ اس طرف سوئمنگ پول تھا جس کے کنارے گھاس پر تیراکی کے لباس میں ایک عورت پشت کے بل لیٹی سن ہاتھ لے رہی تھی۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ تھا لیکن اس عورت کے چہرے کے نقوش تک ویلوٹ کو بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً شہر کی ہم وطن ہی تھی۔ تک درخت کی شاخوں میں چھپا غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی اسے ایک اور عورت دکھائی دی جو ایک ٹرے ہاتھ میں اٹھائے مکان سے نکل کر پول کی طرف آ رہی تھی۔ وہ کوئی مقامی لڑکی تھی اور تک ویلوٹ کے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ ایرانی عورت کے قریب پہنچ کر اس نے ٹرے زمین پر رکھ دی اور ایک گلاس میں شراب انڈیل کر گلاس عورت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند چمکیاں لے کر اس نے گلاس ٹرے میں رکھا اور دوڑتے ہوئے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ مقامی لڑکی جو یقیناً ملازمہ تھی، کنارے پر کھڑی دلچسپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ پیرا کی کے کرب دکھانے کے بعد اس ایرانی عورت نے کنارے کے قریب پہنچ کر سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ملازمہ نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ تالاب کے ٹھنڈے پانی میں غوطے کھانے لگی۔ فضا ایرانی عورت کے ہتھکڑوں سے گونجنے لگی۔

تک درخت سے اتر آیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف چکر لگانے کے بعد بھی اسے محافظ کے علاوہ کوٹھی میں کوئی مرد نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ ایک طرف اس نے دو خونخوار کتوں کو ٹھہلتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔ تک کو یقین تھا کہ اگر کوئی کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو یہ خونخوار کتے آج ہی اس کا تپا پانچا کر دیں گے۔

تک ہوٹل واپس پہنچا تو گوریہ اس وقت بھی سو رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے گوریہ کو جگایا مگر وہ بیدار نہیں ہوئی اور صوفے پر بیٹھ کر سو چنے لگا کہ اس وسیع و عریض عمارت کے اندر رسائی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ اندر داخل ہوئے بغیر ہی تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ عمارت میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر خوف ناک صورت والا مسلح محافظ متعین تھا۔ بالفرض اگر وہ محافظ کو بچے دے کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جائے تو کتے اسے چرچھا کر رکھ دیں گے۔ مگر شہر نے اگرچہ اس کی مقررہ فیس سے دس ہزار ڈالر

زیادہ ادا کیے تھے لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اس مرتبہ واقعی اسے دانتوں پسینا آجائے گا۔ دو بجے کے لگ بھگ گوریہ بھی اٹھ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ کمرے ہی میں بیٹھے صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ تک نے اسے عمارت کے بارے میں بتایا تھا اور گوریہ کا بھی یہی خیال تھا کہ اس مرتبہ معاملہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

پانچ بجے کے قریب وہ دونوں ہوٹل سے نکل آئے۔ شہر کے مختلف حصوں کی سیر کرتے ہوئے وہ ڈسٹریکٹس پہنچ گئے۔ تک گوریہ کو وہ مکان دکھانا چاہتا تھا جہاں سے اسے ایرانی بی بی چرانا تھی۔ مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس مرتبہ تک کو دو آدمی بھی دکھائی دیے جو عمارت کے برآمدے کے سامنے بیٹھے میز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ خوبصورت عورت بھی تھی جسے وہ صبح سوئمنگ پول کے قریب دیکھ چکا تھا۔ البتہ وہ جوان ملازمہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تک کی نظریں اچانک دائیں طرف اٹھ گئیں جہاں دو بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکی تھی اور دوسرا لڑکا، لڑکی کی عمر سات سال اور لڑکے کی عمر کا اندازہ نو برس کے لگ بھگ لگایا جاسکتا تھا۔ دفعتاً لڑکی دوڑتی ہوئی مکان کی آڑ میں چلی گئی اور جب واپس لوٹی تو اس نے ہاتھوں میں روٹی کا ایک بڑا سا گالا اٹھا رکھا تھا۔ تک بڑی توجہ سے لڑکی کے ہاتھوں میں روٹی کے اس سفید گالے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اچانک ہی اچھل کر لڑکی کے ہاتھوں سے نکلنا اور دوڑتا ہوا پودوں کی آڑ میں چلا گیا۔ وہ لمبے بالوں والی بی بی تھی۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے دوڑی اور پھر وہ دونوں قد آدم پودوں کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

تک سمجھ گیا اسے یہی بی بی چرانا تھی جس کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالر کی ادائیگی کی گئی تھی۔ وہ دوبارہ اس طرف دیکھنے لگا جہاں وہ تینوں شراب نوشی میں مشغول تھے۔ اسی لمحے ملازمہ برآمدے سے نکل کر ان کے قریب پہنچ گئی۔ میز کے قریب پہنچ کر وہ کچھ دیر تک ایرانی عورت سے باتیں کرتی رہی پھر پختہ روش پر گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے محافظ نے اس سے کوئی بات بھی کی تھی جس پر لڑکی دلفریب انداز میں مسکرا کر رہ گئی تھی۔

اچانک ہی تک ویلوٹ کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مکان میں داخل ہونے کی ترکیب اس کے ذہن میں آگئی تھی۔ اس نے گوریہ کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ملازمہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے جو چوراہے کی طرف جا رہی تھی۔ چوراہے پر پہنچ کر تک نے گوریہ کو رخصت کر دیا اور خود بہ



دستور لڑی کے تعاقب میں لگا رہا جواب سن سیٹ بے وارڈ کی ایک کئی منزلہ عمارت کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ تک نے عمارت کے اندر بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ دوسری منزل کے ایک دروازے کے سامنے رکی اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا لئے گئی۔ تک راہداری میں آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر عقبی زینے سے اتر کر عمارت سے باہر آ گیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ فلیٹ اس لڑکی ہی کی ملکیت تھا جو اپنے کام سے چھٹی کرنے کے بعد واپس آ جاتی تھی۔

تک عقب سے گھوم کر ایک بار پھر عمارت کے سامنے آ گیا اور شرک کے اس پار ایک چھوٹے سے باروم میں ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے عمارت کے دروازے پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ میز کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی نظریں بہ دستور فلیٹ والی عمارت کے دروازے پر ہی مرکوز تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لڑکی عمارت سے باہر نکلی۔ بدلے ہوئے لباس میں وہ ایک لمحہ کوتوا سے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اگر اس نے پہلے ہی لڑکی کو غور سے نہ دیکھا ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور باروم سے نکل کر لڑکی کے تعاقب میں چل پڑا جو اس مرتبہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ وہ لڑکی ایک شراب خانے میں داخل ہو گئی تھی۔ تک باہر ہی رک گیا۔ پھر تقریباً دس منٹ بعد وہ بھی اندر داخل ہو کر جس نگاہوں سے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ لڑکی کو نے کی ایک میز پر تنہا بیٹھی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اس رخ پر بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ہیلو گلو ریا!“ تک نے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

لڑکی چونک کر مڑی، ایک اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار ابھر آئے۔ تک نے چونک جانے کی اداکاری کرتے ہوئے ایسا انداز میں اختیار کر لیا جیسے اس غلط فہمی پر معذرت خواہ ہو۔

”معاف کرنا خاتون! میں تمہیں اپنی دوست سمجھا۔ گلو ریا کی شکل صورت تم سے اس حد تک ملتی جلتی ہے کہ بڑی آسانی سے دھوکا کھا گیا۔“ وہ بولا۔

”میرا نام ارسلان ہے۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کر دیا۔

”گلد۔“ تک بھی معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ”اس کا مطلب ہے میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں، اگر آج کی شام ہم اچھے دوستوں کی طرح گزاریں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ

ہوگا۔ دراصل میں اس شہر میں اجنبی ہوں، تمہیں گلو ریا سے کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ کم از کم یوریت تو نہ ہوگی۔“

”اتفاق سے آج کی رات میں بھی فارغ ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔ اگر اچھا سا تھیل مل جائے تو تفریح کا لطف آ جاتا ہے۔ کیوں ہو گے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”تم مجھے یقیناً اچھا بلکہ بہت اچھا ساتھی پاؤ گی۔ ویسے اس وقت میں میز کو ترجیح دوں گا۔ اگر تم چاہو تو اس لیے شیمینٹ منگوا سکتی ہو۔ بل میرے ذمے رہے گا۔“ تک نے کہا اور ساتھ ہی دیٹرس کو بلا کر میز اور شیمینٹ کا آرڈر بھی دے دیا۔

ارسلان بہت کم گو ثابت ہوئی لیکن تک نے اس سے بہت کچھ اگلوایا۔ وہ تقریباً دو مہینے پہلے نیو جرسی سے آئی تھی۔ پانچ ہفتے ایک ریسٹورنٹ میں کام کیا پھر کسی وجہ سے اسے نکال دیا گیا۔ ایک ہفتے کی بیکاری کے بعد اسے مصدق نامی ایک ایرانی کے ہاں کام مل گیا جو ایران میں انقلاب آنے کے بعد سے یہاں مقیم تھا۔ مصدق اور اس کی فیملی کے بارے میں ارسلان کا خیال تھا کہ وہ لوگ بہت دولت مند ہونے کے ساتھ سخت گیر بھی ہیں۔ ان کے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے ہیں جو زیادہ ایرانی ہی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی امریکی بھی جاتا ہے۔ ایسے موقع پر ارسلان کو اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوں۔ ارسلان کے کہنے کے مطابق کوئی ملازمہ زیادہ عرصہ تک ان کے ہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کے ناروا سلوک کی وجہ سے اکثر ملازمانیں کام چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔ اسے خود اگرچہ یہاں کام کرتے ہوئے صرف پندرہ دن ہی ہوئے تھے لیکن اس مختصر عرصے میں وہ ان سے تنگ آ چکی تھی اور کسی دوسری جگہ کام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ارسلان کے کہنے کے مطابق آج مصدق کے ہاں کچھ خاص مہمان آنے والے تھے جس کی وجہ سے اسے رات بھر کی چھٹی دے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کوشی میں کھانا وغیرہ پکانے کے لیے صرف ایک اور ملازمہ تھی اور اس کا تعلق بھی ایران ہی سے تھا۔

”مجھے حیرت ہے تم جیسی خوددار لڑکی اب تک کیسے ان لوگوں کو برداشت کرتی رہی ہے؟“ تک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”جب تک کوئی اور کام نہ مل جائے اس وقت تک تو میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں اور پھر تنخواہ اتنی ہے کہ کسی اور جگہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ ارسلان نے جواب دیا۔

”کیا ملتا ہوگا؟“

”دوسو ڈالر فی ہفتہ۔“ ارسلان نے بتایا۔

تک واقعی چونک گیا۔ ایک گھریلو ملازمہ کو اتنی تنخواہ واقعی کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ چند لمحے ارسلان کی طرف دیکھتا رہا پھر ساحل پر چلنے کی تجویز پیش کی جسے ارسلان نے بلا جھجک قبول کر لیا۔ تک نے اٹھ کر بل ادا کیا اور دونوں شراب خانے سے باہر آ گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ ساحل پر ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ چونکہ پیرا کی کالباس لے کر نہیں آئے تھے اس لیے ایک طرف بیٹھ کر نظارہ کرنے لگے۔ تک اس سے کرید کرید کر کوشی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کا یہ خیال درست نکلا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے ہی چار دیواری پر تاروں کی باڑ میں برقی رودروڑ ادا جاتی تھی۔ رات بھر خونخوار کتے کیاؤنڈ میں گشت کرتے رہتے تھے۔

”تم..... یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو۔ کہیں چوری کا منصوبہ تو نہیں بنا رہے؟ اگر ایسا ہے تو بھول کر بھی کوشی میں گھسنے کی کوشش مت کرنا ورنہ زندہ واپس نہ آ سکو گے۔“ ارسلان نے کہا۔

”کیا میں صورت سے تمہیں چور نظر آتا ہوں؟“ تک نے اسے گھورا۔ ”یہ معلومات تو اس لیے حاصل کر رہا تھا کہ ممکن ہے کبھی مجھے وہاں ملازمت کرنے کا موقع ملے تو اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی نہ پاؤں۔“ تک نے جواب دیا۔

”یہ خیال بھی دل سے نکال دو، وہ مردوں کو ملازم نہیں رکھتے۔“ ارسلان بولی۔

تک ویلوٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے زبان کھولی تو ایک نئے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب جب وہ واپس جانے کے لیے اٹھے تو چند قدم چلنے کے بعد ہی تک ٹھنک کر رک گیا اور اس آدمی کو گھورنے لگا جو اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ ایسٹ برج پولیس کا سرائرساں لیفٹیننٹ چارلی ایسٹن تھا۔

چارلی ایسٹن پولیس کا واحد آدمی تھا جو تک ویلوٹ کی اصلیت سے آگاہ تھا۔ اسے علم تھا کہ تک بھاری معاوضہ لے کر چیزیں چراتا ہے۔ وہ شروع سے تک کی تاک میں تھا لیکن آج تک اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکا تھا اور اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر تک کا اس طرح ٹھنک جانا غیر فطری نہیں تھا۔

”ہیلو چارلی! یہاں کیسے؟“ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں تک۔“ چارلی ایسٹن نے اسے گھورا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس... معرکے پر آئے ہو؟“

”تمہاری مذاق کی عادت نہیں گئی۔“ تک نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چارلی، ارسلان کے سامنے اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس کے موجودہ مشن کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

”ایک کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں دو دن سے یہاں ہوں۔ شاید دو چار دن اور یہاں رہنا پڑے۔ اتفاق سے تمہیں دیکھ لیا۔ میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں اگر تم نے یہاں کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو پچھتاؤ گے۔ یہاں کی پولیس بعض معاملات میں میری احسان مند ہے، میرا ایک اشارہ تمہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہوگا۔“ ”تم غلط سمجھ رہے ہو چارلی! میں یہاں محض تفریح کے لیے آیا ہوں۔ دو چار روز بعد چلا جاؤں گا۔“ ”تفریح، گلو ریا کے بغیر؟“ چارلی ایسٹن نے اسے گھورا۔

”نہیں گلو ریا بھی میرے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک دوست سے ملنے چلی گئی تھی۔ میں اس طرف نکل آیا جہاں اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ آخر تفریح کے لیے کسی نہ کسی ساکھی کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے۔“ تک نے کہتے ہوئے مخصوص انداز میں آنکھ کا گوشہ دبایا۔

”ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا کہ کم از کم میری موجودگی میں تم کوئی حرکت نہ کرنے پاؤ۔“ چارلی ایسٹن کہتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

تک الجھ کر رہ گیا۔ چارلی ایسٹن سے ملاقات اس کے لیے پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر اس نے مقامی پولیس کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا تو اس کا یہ مشن یقیناً خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ لہذا اسے جو کچھ بھی کرنا تھا بہت جلد اور سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ارسلان سے حاصل ہونے والی معلومات اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

جب وہ ارسلان کے فلیٹ پر پہنچے تو بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ ارسلان نے اسے ایک جام پینے کے لیے روک لیا۔ اسی لمحہ تک کے دل میں وہ خیال ابھرا جو شراب خانے میں ارسلان کی باتیں سن کر اس کے دل میں آیا تھا۔ یہ پروگرام اس نے کل کے لیے بنایا تھا لیکن لیفٹیننٹ چارلی سے ملاقات کے بعد کسی قسم کی تاخیر اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس نے فوری طور پر اس



پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔  
”وہ سکی چلے گی؟“ ارسلان نے کیبنٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”ضرور چلے گی۔ لیکن اتنی عجلت بھی کیا ہے۔ میں چند منٹ یہاں رکنا چاہتا ہوں۔“ نک ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
”ٹھیک ہے۔ تب پھر میں لباس تبدیل کر لوں۔“ ارسلان کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر ارسلان نے بتی جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن سچ کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا جس سے مدہم روشنی دوسرے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ ملبوسات کی الماری سامنے ہی تھی۔ ارسلان نے الماری کھول کر کپڑے نکالے اور لباس تبدیل کرنے لگی۔ اچانک کال بیل کی آواز نے نک کو جھونکا دیا۔ ارسلان بھی جلدی سے میکسی پیمن کر کمرے سے باہر آگئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

نک کرسی پر بیٹھا کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی ارسلان کسی کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ غلط جگہ پر آگیا ہے۔ نک کو صورت حال کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچ گیا جہاں شراب کے نشے میں دھت ایک شخص زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نک نے ارسلان کو ایک طرف ہٹایا اور شرابی کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا زینے تک لے گیا۔ شرابی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نک نے بڑے اطمینان سے اسے میز جیوں پر دھکیل دیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس آگیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ شور سن کر راہداری میں کسی اور فلیٹ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ وہ تو اسے بعد میں ارسلان سے معلوم ہوا کہ اس راہداری میں صرف چار فلیٹ تھے جن میں سے ایک میں وہ خود رہائش پذیر تھی۔ سامنے والے فلیٹ کے باسی دو دن سے میا می گئے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ سے پہلے ان کی واپسی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ باقی دو فلیٹ خالی پڑے تھے۔ ارسلان کی ان معلومات نے نک کا کام کچھ اور بھی آسان بنا دیا۔

کمرے میں آکر ارسلان نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ایک اس کی طرف بڑھا دیا۔ گلاس اٹھانے سے پہلے نک اس طرح جیسیں ٹٹولنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

”سگریٹ ختم ہو گئے۔ مجھے باہر جانا پڑے گا۔“

”باہر جانے کی ضرورت نہیں، میرے پاس سگریٹ ہیں۔ ابھی لائی ہوں۔“ ارسلان کہتی ہوئی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جیسے ہی دروازے کی آڑ میں ہوئی نک نے کوٹ کی اندرنی جیب سے ایک چھوٹا سا کپسول نکال کر ارسلان کے گلاس میں ڈال دیا۔ تقریباً دو منٹ بعد ارسلان سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹرنے کر واپس آگئی۔ نک نے ایک سگریٹ سٹگایا اور وہ سکی کی چسکیوں کے ساتھ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

ارسلان کا گلاس آدھا بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جھول گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس فرش پر گر کر چٹکا چور ہو چکا تھا اور پٹی ہوئی شراب فرش پر پھیل گئی تھی۔ نک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ کپسول نے فوراً ہی اپنا کام کر دکھایا تھا اور اسے یقین تھا کہ ارسلان اب کم از کم صبح سات بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکے گی۔ اس نے ارسلان کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں پٹنگ پر لٹا دیا اور ڈرائنگ روم میں آکر اس میز کے قریب پہنچ گیا جس پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ اس نے فون کارڈ سیور اٹھایا اور ہونٹ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح پانچ بجے نک ویلوٹ اور گوریانے ہونٹ چھوڑ دیا۔ ہونٹ کے گیراج میں ان کی کار موجود تھی۔ شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نک نے گزشتہ روز ٹیکسیوں پر ہی گزارا تھا۔ جبکہ اس دوران گوریانے کو بھی گاڑی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ہونٹ سے رخصت ہونے کے بعد وہ کچھ دیر تک شہر کی سڑکیوں پر گھومتے رہے۔ پھر نک نے گاڑی کا رخ سن سیٹ بنے وارڈ کی طرف موڑ دیا۔ عمارت کے سامنے پارکنگ لائٹ پر گاڑی روکتے ہوئے نک نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا تھا، کوئی مشتبہ بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ گوریانے کو اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ گوریانے نے پچھلی سیٹ سے سوٹ کیس اٹھا لیا اور دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گئے۔ پوری عمارت سنائے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دوسری منزل پر تو کسی کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نک نے جیب سے چابی نکال کر ارسلان کے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔ نک سپدھے بیڈ روم میں گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ ارسلان بستر پر اسی حالت میں پڑی تھی جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

نک ویلوٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔

”جتنے میں چند منٹ باقی تھے اور کم از کم مزید ایک گھنٹے تک ارسلان کے ہوش میں آنے کی امید نہیں تھی۔ وہ پٹنگ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔“  
”اب یہ فلیٹ ہی ہمارے ہیڈ کوارٹر کا کام دے گا۔ یہاں کسی کی مداخلت کا خطرہ بھی نہیں ہے۔“ وہ بولا۔  
”لیکن لیغٹیننٹ چارلی اسٹن کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا اس نے مقامی پولیس کو شہر میں تمہاری موجودگی کے بارے میں آگاہ نہیں کر دیا ہوگا؟“ گوریانے تشویش کا اظہار کیا۔

”خدا شہ تو ہے لیکن میں اسے درد سر نہیں بنانا چاہتا۔ بہر حال پہلے تم ناشتا تیار کرو، اس کے بعد ہی کوئی پروگرام بنائیں گے۔ مجھے امید ہے فریج میں ضرورت کی چیزیں موجود ہوں گی۔“ نک پھر پھیلاتے ہوئے بولا۔

گوریانے پٹنگ میں چلی گئی۔ نک کا خیال درست ثابت ہوا۔ ضرورت کی ہر چیز پٹنگ میں موجود تھی۔ اس نے ناشتا تیار کیا اور پھر بیڈ روم ہی میں چھوٹی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے کے بعد نک کافی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ ارسلان کو بستر پر کسماتے ہوئے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے اسٹیل کا ایک چھوٹا سا بکس نکال لیا جس میں سرخ کے علاوہ ایک چھوٹی سی شیشی میں بے رنگ سا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ سیال سرخ میں بھر کر وہ پٹنگ کے قریب آگیا اور ارسلان کے بازو کا مسل ٹٹولنے لگا۔ اسی لمحے ارسلان نے آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ نک سوئی اس کے بازو میں پیوست کر چکا تھا اور اب بہت آہستہ آہستہ اسٹن دبا رہا تھا۔ سرخ میں بھرا ہوا سیال ارسلان کے جسم میں منتقل ہو گیا تو اس نے سوئی باہر کھینچ لی۔ ارسلان ایک بار بھر بے حس و حرکت ہو چکی تھی۔

”اب یہ سہ پہر چار بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی، تم کافی پیتے ہی روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے۔ اچھی طرح سمجھ چکی ہو۔ اس مشن کی کامیابی کا انحصار تمہاری ذہانت پر ہے۔ میں شام چھ بجے تمہاری رپورٹ کا انتظار کروں گا۔“ نک نے سرخ صاف کرتے ہوئے گوریانے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟“ گوریانے خدشے کا اظہار کیا۔

”یہ خدشہ بہر حال موجود ہے لیکن زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ تمہیں اپنے ہاں رکھ لیں گے۔ ارسلان کے اچانک غائب ہوجانے کی وجہ سے انہیں یقیناً ملازمہ کی ضرورت

ہوگی۔ امید ہے کہ ارسلان کا خط دیکھ کر وہ تمہارے بارے میں تحقیقات کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ لو، یہ خط احتیاط سے اپنے پاس رکھ لو۔“ نک نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

گوریانے نے خط کھول کر دیکھا۔ ظاہر ہے ارسلان کی طرف سے یہ جعلی خط تھا جو نک ویلوٹ نے بڑی مہارت سے تیار کیا تھا۔ اس خط میں ارسلان کی طرف سے مسٹر مصدق کو اطلاع دی گئی تھی کہ ماں کی بیماری کی اطلاع پا کر ارسلان کو فوری طور پر نیو جرسی جانا پڑا۔ وہ اپنی کزن گوریانے کو بھیج رہی ہے جو اس کی واپسی تک مسٹر مصدق کی فیملی کی خدمات انجام دے گی اور انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔

گوریانے نے خط پڑھ کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور کپ اٹھا کر کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ پھر ٹھیک آٹھ بجے وہ دونوں فلیٹ سے باہر نکل آئے۔ نک نے گوریانے کو مصدق کی کوٹھی سے تقریباً سو گز دور گاڑی سے اتار دیا اور اس وقت تک وہیں رکا رہا جب تک گوریانے گیسٹ پر نہ پہنچ گئی۔ وہ تقریباً پانچ منٹ گیسٹ پر کھڑی رہی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ محافظ نے شاید اندر سے اجازت ملنے کے بعد ہی گوریانے کو گیسٹ میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ گوریانے کی اس کامیابی پر نک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے گاڑی کو ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

نک کا وہ دن بڑی مصروفیت میں گزرا۔ دو بجے جب وہ ارسلان کے فلیٹ میں واپس پہنچا تو اس کے ہاتھ ایک پیکٹ بھی موجود تھا جس میں مختلف نوعیت کی چیزیں تھیں جو شہر کی مختلف دکانوں سے خریدی گئی تھیں۔ اس نے پیکٹ احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

چار بجے کے قریب اس نے بے ہوش ارسلان کو ایک اور انجکشن لگا دیا اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانتا تھا کہ ارسلان کی مسلسل بے ہوشی اس کے لیے نقصان دہ نہیں تھی۔ اس کے جسم میں منتقل ہونے والا یہ بے رنگ سیال اسے نہ صرف دنیا و مافیہا سے غافل رکھے ہوئے تھا بلکہ اسے وہ توانائی بھی فراہم کر رہا تھا جو کسی انسان کو صحت مند رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

نک کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گڑبڑا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ارسلان بہ دستور بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی آنکھ کیسے کھل گئی تھی۔ اسے زیادہ نہیں سوچنا پڑا، دوسرے ہی لمحے اپنی کلائی پر گھڑی کے عین نیچے سوئی کی چھین محسوس کر کے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ



آگئی۔ وہ وایج ٹرانسمیٹر پر سگنل تھا۔ اس چیمن سے بھی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے گھڑی اتار کر سگنل سے باہر بیچ لیا اور دونوں سویاں بارہ پر ملا دیں۔ اس کے ساتھ ہی گھڑی میں پوشیدہ نسخے سے ٹرانسمیٹر سے گلو ریا کی آواز سنائی دی۔

”گلو ریا اسپیکنگ، نگلی! کم آن دی لائن۔“

”یس، تک ریسونگ۔ کیا رپورٹ ہے گلو ریا۔ تمہیں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟“ تک نے گھڑی کو منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اس نسخے سے ٹرانسمیٹر پر پچاس میل کے دائرے میں بات کی جاسکتی تھی۔

”زیادہ نہیں۔“ مسٹر مصدق کو قائل کرنا پڑا تھا کہ میں واقعی ارسلہ کی کزن ہوں اور وہ اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع یا کرنیو جرسی جا چکی ہے جہاں سے چند روز بعد اس کی واپسی ہوگی۔“

”گڈ۔ کام کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ تک نے دریافت کیا۔

”یہ مکان واقعی خطرناک ہے۔ مسٹر مصدق اور اس کے بعض ہم وطن اپنے ملک کی انقلابی حکومت کے خلاف کسی قسم کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ دراصل دو مختلف پارٹیاں ہیں جو اپنے اپنے طور پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ مصدق کا تعلق اس پارٹی سے ہے جو.....“

”میں نے تمہیں وہاں سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا گلو ریا۔“ تک نے اسے ٹوک دیا۔

”سوری نگلی!“ گلو ریا معذرت آمیز لہجے میں بولی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”یہ مکان دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی منزل صرف مسٹر مصدق اور اس کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری منزل پر چھ کمرے ہیں۔ ایک کمرہ بچوں کے لیے مخصوص ہے، دوسرا مسٹر مصدق کے لیے۔ ارسلہ یعنی ملازمہ کا کمرہ بھی اسی منزل پر ہے جس کے پچھلی طرف دیوار کے بجائے اوپر سے نیچے تک جالی لگی ہوئی ہے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی چکر دار عقی زینہ ہے۔ مجھے بلی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ برف کی طرح سفید لمبے بالوں میں پیشانی پر دائیں آنکھ سے ذرا اوپر سیاہ رنگ کے دو چار بال بھی موجود ہیں۔“

”گڈ۔“ تک مسکرا دیا۔ ”کوٹھی کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتاؤ؟“

”محافظ دو ہیں۔ ایک دن کو ڈیوٹی دیتا ہے اور دوسرا رات کو۔ دن کو ڈیوٹی والا حافظ رات کو یہاں نہیں رہتا۔ دو بیل ٹیرنسل کے خونخوار کتے ہیں جو دن رات کپاؤ نڈ میں

ٹھپکتے رہتے ہیں۔ کپاؤ نڈ وال کے اوپر خاردار تاروں شام کا اندھیرا پھیلنے ہی برقی رو چھوڑ دی جاتی ہے جو صبح ہو نے تک جاری رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی حفاظتی انتظام نہیں ہے۔“

”بلی کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے؟“

”میرا مطلب ہے یہ لوگ بلی کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟“

”بلی کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے؟“

”اس کا سوچ الگ ہے۔“ گلو ریا نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”گڈ۔“ تک نے کہا۔ چند لمحے خاموش رہ کر پھر سوچنا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے گلو ریا! ہم زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔ کیوں نہ آج ہی رات مشن کے آخری مرحلے سے بھی منٹ لیا جائے؟“

”میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ مسٹر مصدق آج رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے واشنگٹن جا رہے ہیں۔ اس سے اچھا موقع شاید پھر کبھی نہ ملے۔“ گلو ریا نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اس کے لیے رات کا پچھلا پہر مناسب رہے گا۔ ٹھیک تین بجے۔“ تک بولا۔

”اوکے۔ تم مجھے تیار پاؤ گے۔“ گلو ریا کی آواز سنائی دی۔ تک چند لمحے اسے مزید کچھ ہدایات دیتا رہا پھر ٹرانسمیٹر آف کر کے گھڑی کو کلائی پر باندھا اور بے ہوش ارسلہ کی طرف دیکھتا ہوا قلیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رات کے دو بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ تک ارسلہ کی طرف دیکھا جس کے کم از کم دو گھنٹے تک ہوش آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ارسلہ کے نام ایک مختصر سی تحریر لکھی اور جب سے ایک ہزار ڈالر مالیت کے نوٹ نکال کر اس خط کے ساتھ ہی میز پر رکھ دیے اور ارسلہ پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ قلیٹ سے باہر نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے کندھے پر ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔

عمار کے سامنے والی سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھی۔ پارکنگ لائٹ پر پہنچ کر اس نے سوٹ کیس اور تھیلہ کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو پارکنگ لائٹ سے نکال لے گیا۔ اس کا رخ ڈیسن ڈرائیو کی طرف تھا۔

تک ویلوٹ نے مصدق کی کوٹھی کی طرف جانے کے لیے اس چھوٹی سڑک کا انتخاب کیا تھا جو دن میں بھی سناں رہتی تھی اور رات کے اس آخری پہر تو وہاں کسی قسم کے ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوٹھی کے عقب میں درختوں کے جھنڈ کے قریب اس نے گاڑی روکی تو تین بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ وہ تھیلہ لے کر کار سے اتر گیا اور کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ عمارت کی بالائی منزل کی دو کھڑکیوں سے ٹائٹ بلب کی مدھم روشنی جھلک رہی تھی، اس کے علاوہ پوری کوٹھی سنائے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ مین روڈ کی طرف گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا لیکن محافظ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ غالباً اپنے کیمین میں بیٹھا تھا۔

سنائے میں کبھی کبھار کتوں کے غرانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی جو کپاؤ نڈ میں ٹھہل رہے تھے۔

ٹھیک تین بجے تک ویلوٹ کو گھڑی کے نیچے کلائی پر سوئی کی چیمن محسوس ہوئی۔ اس نے گھڑی اتارے بغیر بن کھینچ کر سویاں ایڈجسٹ کیں اور گھڑی منہ کے قریب لاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

”یس، تک ویلوٹ۔“

”راستہ صاف ہے نگلی! میں نے سوچ آف کر دیا ہے، تم آسکتے ہو۔“ گھڑی کے ٹرانسمیٹر پر گلو ریا کی سرگوشیانہ آواز بھری۔

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ تم تیار رہنا۔“ تک نے کہتے ہوئے گھڑی کا بٹن دبایا اور دبے قدموں چلتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ گیا۔

پختہ دیوار چار فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر مزید دس فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کا جنگلا تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر تک نے تھیلے میں سے الیکٹریک ٹیسٹر نکالا اور اس کا اسکر یوڈ رائیو رنما حصہ جنگل کی ایک تار پر رکھ دیا۔

تار میں برقی رو نہیں تھی۔ اس نے تین چار تاروں کو آزما ڈالا۔ ٹیسٹر کا بلب نہیں جلا اس کا مطلب یہ تھا کہ گلو ریا ان تاروں کو برقی رو فراہم کرنے والا سوچ آف کر چکی تھی۔ اس نے ٹیسٹر تھیلے میں ڈال کر پلاٹر نکال لیا اور احتیاط سے تاریں کاٹنے لگا۔ چند تاریں کاٹنے سے جنگلے میں اتنا

خلا پیدا ہو گیا کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اس نے تھیلہ کندھے پر سنبھالا اور ایک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نہایت آہستگی سے اندر کود گیا۔ اگرچہ اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن دھب کی ہلکی سی آواز پھر بھی ابھری تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ دیک کر بیٹھ گیا اور تاریکی میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس لمحے فضا میں غراہٹ کی خوفناک آواز ابھری، تک ہوشیار ہو گیا۔ کسی کتے نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اب غراٹا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ تک کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا چند سیکنڈ بعد ہی اسے وہ کتا دکھائی دیا جو اس پر جھپٹ رہا تھا۔ تک نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گوشت کا ایک بڑا سا ٹھکڑا نکال لیا۔ کتا جیسے ہی قریب پہنچا تک نے گوشت کا ٹھکڑا اس کی طرف اچھال دیا لیکن اتنی دیر میں کتا اس پر چھانگ لگا چکا تھا۔ تک نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ کتا اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوف ناک غراہٹ نکلی۔ تک نے بڑی پھرتی سے گوشت کا ٹھکڑا اٹھا کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ گوشت کی خوشبو نے کتے کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا دی۔ اسی لمحے تک کو دوسرے کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ تک نے تھیلے میں سے گوشت کا ایک اور ٹھکڑا نکال لیا اور دوسرے کتے کا استقبال کرنے کو تیار ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد دوسرا کتا بھی گھاس پر بیٹھا گوشت پر منہ چلا رہا تھا۔

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔

عمار کے عقب میں چکر دار زینے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر محتاط انداز میں زینے پر چڑھنے لگا۔ زینے کے اختتام پر دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ چند لمحے اطراف کا جائزہ لیتا رہا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمانے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل

تک چند قدم دور بیٹھا بڑی دلچسپی سے کتوں کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتوں کے منہ سے تیز غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ مائڈ پڑنے لگیں اور پھر گوشت کے ٹھکڑے ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں کتے گھاس پر لڑھک گئے۔ تک نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور تھیلہ سنبھال کر تاریکی کا سہارا لیتا ہوا دبے قدموں عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گوشت کے ٹھکڑوں کو جس سیال میں تر کیا تھا وہ ان خونخوار کتوں کو کم از کم دو گھنٹوں تک بے ہوش رکھ سکتا تھا۔



رہا تھا۔ تک ویلوٹ نے ایک لمحہ انتظار کیا اور قریبی دروازہ کھول دیا۔ اس کمرے میں مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ دروازے کے عین سامنے والی دیوار جالی کی تھی جس سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آرہے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک آرام دہ بستر پر لمبے بالوں والی سفید رنگ کی وہ بلی مخواب تھی جس کی خاطر اسے یہ خطرات مول لینا پڑے تھے۔ تک نے تھیلے میں سے ایک چھوٹی اسپرے کن نکال لی اور بلی کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا بلی اٹھ کر غرائے لگی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے جھپٹ سکتی ہے۔ تک نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسپرے کن کا بٹن دبا دیا۔ بلی کے منہ پر ایک پھوار پڑی۔ وہ غرائی ہوئی اچھلی اور پھر بستر پر ڈھیر ہو کر بے حس و حرکت ہو گئی۔

تک ویلوٹ نے تھیلے سے پلاسٹک کا ایک اور تھیلا نکال لیا۔ بلی کو اس تھیلے میں منتقل کرنے سے پہلے اس نے پیشانی کو غور سے دیکھا۔ دائیں آنکھ سے کچھ اوپر چند سیاہ بال بھی نظر آرہے تھے۔ یہ بلاشبہ وہی بلی تھی جس کے لیے اسے چالیس ہزار ڈالر کی نقد ادائیگی کی گئی تھی۔

بلی کو تھیلے میں ڈال کر وہ جیسے ہی باہر نکلا راہداری کے آخری سرے پر ایک سائے کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک گیا لیکن اسے دیکھ لیا گیا تھا۔ اسی لمحے فضا میں ایک نسوانی آواز بھری۔

”کون ہے، وہاں کون ہے؟“  
تک ویلوٹ نے زینے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ چکر دار زینے پر اترنا اگرچہ خطرناک تھا لیکن وہ تھیلے کو سنبھالے دوڑتا چلا گیا۔ نیچے پہنچتے ہی اسے ایک اور سایہ اپنی طرف لپکتا دکھائی دیا۔

وہ گھور یا تھی جو اس کے انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ اسی لمحے فضا میں عورت کے چیخنے اور شور مچانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”نکی! بھاگو۔ محافظ نے اگر چیخوں کی یہ آوازیں لی تو وہ اندھا حد فائرنگ شروع کر دے گا۔“ گھور یا چلائی۔

تک ویلوٹ، گھور یا کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف دوڑا جہاں اس نے جنگلے کے تار کاٹے تھے۔ دیوار کے قریب دونوں کتے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پھاندتے وقت گھور یا نے کوئی سفید چیز اندر کی طرف اچھال دی۔

”یہ کیا تھا؟“ تک نے اس کے پیچھے چھلانگ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”فیوز کا کٹ آؤٹ جسے میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا تھا۔“ گھور یا نے جواب دیا۔

وہ دونوں کار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ کونھی کے لان سے اب شور کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ اسی لمحے فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی۔ محافظ نے شاید انہیں دیکھ لیا تھا لیکن تک نے وقت ضائع کیے بغیر گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ کار تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس کا رخ نیشنل ہائی وے کی طرف تھا۔

☆☆☆

شام کے سات بجے فون کی گھنٹی کی آوازیں کر تک کے ہونٹوں پر ممتی خیز مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس کا انداز غلط نہیں تھا۔ یہ مس شہپر کی کال تھی۔

”ہیلو مسٹر تک! تم اگرچہ میرے آدمی کو بچے دے کر ایر پورٹ سے غائب ہو گئے تھے لیکن مجھے تمہاری اتنی جلد واپسی کی توقع نہیں تھی۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہارے فلیٹ پر پہنچ رہی ہوں، بلی لینے کے لیے۔“  
”مجھے افسوس ہے مس شہپر کہ بلی آج تمہیں نہیں مل سکتی۔“ تک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں؟ آج کیوں نہیں مل سکتی؟“ شہپر کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ.....“  
”میں کوئی وجہ نہیں سننا چاہتی۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔“ شہپر کی آواز کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تک نے ریسیور رکھتے ہوئے بلی کی طرف دیکھا جو گھور یا کے بستر پر مخواب تھی۔ وہ لوگ آج دوپہر کے قریب واپس پہنچے تھے۔ گھور یا کو فلیٹ پر چھوڑ کر تک بلی سمیت کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی اب سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ہوئی تھی اور گھور یا یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہی رہ گئی تھی کہ وہ ایرنی بلی تک سے اس طرح مانوس ہو گئی تھی جیسے شروع ہی سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔

تک آتشدان کے قریب کرسی پر نیم دراز سا ہو گیا۔ گھور یا اس وقت دوسرے کمرے میں تھی۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد کال بیل بجی تو دروازہ تک ہی نے اٹھ کر کھولا تھا۔ وہ شہپر تھی جو دروازہ کھلتے ہی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ تک اسے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی شہپر کی نظر صوفے پر

مخواب بلی پر پڑی تھی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ اسی لمحے بلی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ بھی نکلی تھی۔ شہپر جھک کر بلی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بلی نے چاروں ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی سی لی اور اسی لمحے شہپر چونک گئی۔ وہ بلی پیٹ کر دیکھ رہی تھی جہاں سے کچھ بال کٹے ہوئے تھے اور بیٹھ جاتی تھی جیسے وہاں کوئی زخم رہا ہو۔

”یہ..... کیا..... یہ زخم کیسا ہے؟“ شہپر نے متوحش لہجے میں سے تک کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گھور یا بھی کمرے میں داخل ہو کر خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ زخم کیسا ہے؟ اس کے بارے میں مجھ سے بہتر تم جانتی ہو گی۔ یہی تمہاری مطلوبہ بلی ہے۔ اس کے زخمی ہونے کی وجہ سے ہی میں نے تمہیں آج یہاں آنے سے روکنا چاہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ زخم ٹھیک ہو جائے تو دو چار روز بعد بلی تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ تک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ زخم پہلے سے تھا یا.....؟“  
”ایک زخم پہلے تھا جو مندرجہ ہو چکا تھا۔ یہ تازہ زخم اس آپریشن کی وجہ سے ہوا ہے جو آج ہی میں نے کروایا تھا۔“  
”کیا مطلب؟“ شہپر نے اسے گھورا۔

”مس شہپر!“ تک اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہیں معلوم ہے میں ایسی کوئی چیز نہیں چراتا جس کی کوئی سیاسی، تاریخی یا مالی اہمیت ہو۔ میری ان شرائط سے واقف ہوتے ہوئے بھی تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ تمہیں دراصل اس بلی کی نہیں اس فلم کی ضرورت تھی جو آپریشن کے ذریعے اس کے پیٹ میں چھپائی گئی تھی۔ تم لوگ اپنے ملک کی انقلابی حکومت کے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہو؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن میں بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ تہران میں تمہارے آدمیوں نے انقلابی حکومت کے خلاف ایک خوفناک سازش تیار کی تھی۔ ایران میں رہتے ہوئے چونکہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں تھا اس لیے انہوں نے یہ ساری سازش ایک مائیکروفلم پر منتقل کر کے اسے آپریشن کے ذریعے بلی کے پیٹ میں محفوظ کر دیا اور وہ بلی تمہارے یہاں کے گروہ کے سربراہ مسٹر مصدق کے نام بھیج دی گئی۔ مگر بد قسمتی سے بلی مصدق نامی ایک اور ایرانی کے پاس پہنچ گئی جو ایران کی انقلابی حکومت کا خاص آدمی ہے اور انقلابی حکومت کے خلاف سازشوں کا سراغ لگانے کے سلسلے ہی میں یہاں مقیم

ہے، اسے بلی کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ اس نے کسی دوست کا تحفہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جاتا تو اب تک تم لوگوں کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ بہر حال مجھے کچھ شبہ تو اسی وقت ہو چکا تھا جب تم نے محض ایک بلی کے لیے چالیس ہزار ڈالر ادا کئے تھے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بلی کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے لیکن جب گھور یا نے بتایا کہ بلی چلتے چلتے اچانک رک کر چیخنے لگتی ہے تو میرے شہجے کو تقویت ملی۔ آج دوپہر یہاں واپس آتے ہی میں نے بلی کا ایک کمرے کروایا اور پھر آپریشن کے ذریعے یہ مائیکروفلم نکال لی جس میں ایران کی انقلابی حکومت کے خلاف وہ خوفناک سازش موجود ہے جس سے اگر حکومت کا تختہ نہ بھی الٹا جائے تو پورے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔ میں یہ فلم تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ تم نے بلی چرانے کے لیے کہا تھا، اسے شوق سے لے جاسکتی ہو۔“  
تک نے کہتے ہوئے جیب سے ایک ننھی سی فلم نکالی، اسے کھولا اور آتشدان میں اچھال دیا۔

شہپر آتشدان کی طرف لپکی لیکن اتنی سی دیر میں ہی شعلے مائیکروفلم کو خاکستر کر چکے تھے۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“ وہ تک کی طرف دیکھ کر چیخی۔

”وہی، جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ بلی حاضر ہے، چاہو تو ابھی لے جاسکتی ہو۔“ تک نے بلی کی طرف اشارہ کیا۔  
”اسے بھی اپنے ہی پاس رکھو، مجھے بلی کی ضرورت نہیں۔“ شہپر چیخی۔

”کوئی بات نہیں۔ ایک بلی پہلے ہی سے میرے پاس موجود ہے یہ دوسری بھی سہی۔“ تک نے مسکراتے ہوئے پہلے ایرانی بلی اور پھر گھور یا کی طرف دیکھا۔

شہپر اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے خونخوار نظروں سے تک کی طرف دیکھا اور پیر پختی ہوئی باہر نکل گئی۔ مگر گھور یا تک کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ غراتے ہوئے تک کی طرف بڑھی۔

”کیا کہا..... کیا کہا تھا تم نے نکی؟“  
”لک..... کچھ نہیں..... میرا مطلب ہے ایرانی بلی۔“ تک اچھل کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے کی فضا ان دونوں کے قہقہوں سے گونجنے لگی اور بستر پر بیٹھی ہوئی ایرانی بلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ گھور یا نے آگے بڑھ کر بلی کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔





## پہاڑا و جھل

ملک صندریات

کہتے ہیں کہ محبت پیروں کی ایسی زنجیر ہوتی ہے جو محبوب کو ادھر ادھر ہونے نہیں دیتی مگر... کبھی کبھی ایسی حماقتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں کہ یہی زنجیر بیڑیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایسے میں محبت، محبت نہیں بلکہ رسوائی بن جاتی ہے... کچھ ایسی ہی غلطیوں کا ارتکاب وہ بھی کر بیٹھے تھے لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ اس دور کی معاشرتی صورت حال عہد حاضر کی طرح بگڑی ہوئی نہ تھی۔ ورنہ آج ان کی اپنی سانس ان پر ہی بھاری ہو جاتی... کٹھن معاملے کو سہل بنانے کے لیے ملک صاحب کو ٹھیک ٹھاک محنت کرنا پڑی... کہ سچی محبت تو پردل کو بھاتی ہے۔

زندگی کے تازک دورا ہے پر مجرم کو مجرم بنانے والے پولیس افسر کی فرض شناسی

بعض لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں!

وہ اچانک آپ کے سامنے آکر کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ آپ چونک جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا جیس جاگ اٹھتا ہے اور جب وہ زبان کھولتے ہیں تو فضا میں سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ پوری توجہ سے ان کی بات سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جتنا بھی ایک ایسا ہی کردار تھا.....!

وہ ماہ جولائی کے اختتامی ایام تھے۔ ساون اپنے جوہن پر تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹو تو بارش ہو رہی ہے۔ صبح آنکھ کھلے تو بارش موجود اور دن بھر بھی گا ہے۔ یہ اپنی شکل دکھانے سے باز نہیں آرہی۔ معمولات زندگی بری طرح متاثر ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسی ہی ایک برساتی شام میں، میں تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ جتنا مجھ سے ملنے آگیا۔ اگر وہ پانچ، دس منٹ لیٹ ہو جاتا تو میں کمرے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکا ہوتا۔

کانشیل باسٹ نے کمرے میں آکر مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! ایک بندہ آپ سے ملاقات کرنے آیا ہے.....!“

”برستی بارش میں یہ کون مجھ سے ملنے آگیا!“ میں نے

سوالیہ نظر سے باسٹ کی جانب دیکھا۔ ”لگتا ہے، کوئی سنگین معاملہ ہی ہے ورنہ ایسی ایمر جنسی کی کیا ضرورت تھی.....“

”جناب! میں نے اسے کرایڈنے کی کوشش کی ہے۔“

کانشیل نے بتایا۔ ”لیکن وہ ایک ہی ضد پر اٹکا ہوا ہے کہ آپ سے مل کر ہی اپنی آمد کے بارے میں بتائے گا۔“

”ٹھیک ہے، بھیجیو اسے اندر۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”دیکھوں تو سہی، وہ ہے کون اور کون کا اطلاع لے کر آیا ہے۔“

”جی اچھا ملک صاحب!“ باسٹ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند سیکنڈ کے بعد جتنا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا ٹھکانا لک ایک ایسا شخص تھا جس کی شانسی علامات بڑی واضح تھیں۔ وہ ایک آنکھ سے محروم اور ایک ٹانگ سے معذور تھا اور یہ تمام تر محرومی و معذوری جسم کے بائیں حصے میں واقع ہوئی تھی۔ وہ جب لنگڑاتے ہوئے میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں چونک کر رہ گیا تھا ایک محروم اور معذور شخص کا بارش میں مجھ سے ملنے آنے کا ایک





مطلب تھا اور وہ یہ کہ میرے تھانے کی حدود میں کوئی بڑی گزربڑ ہو چکی تھی۔ میں نے تشویش بھری نظر سے اپنے سامنے بیٹھے جمّا کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! اگر معاملہ سنگین نہ ہوتا تو میں اتنی بارش میں کبھی آپ کے پاس نہ آتا۔“

”ہاں..... وہ تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن تمہارا لباس تو بالکل خشک ہے، کیا بارش نے تمہارا مزاج نہیں پوچھا؟“

”جناب، یہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔“ اس نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا مزاج بھی ضرور پوچھتی لیکن میں نے موسمِ جامہ اوڑھ رکھا تھا، اس لیے اس کی مہربانی سے محفوظ رہا ہوں۔“

گاؤں دیہات میں، بارش کے دوران میں لوگ عموماً موسمِ جامہ اوڑھ کر باہر نکلتے ہیں، یہ موسمِ جامہ کوئی خاص قسم کا اوڑھنا نہیں ہوتا بلکہ موسم کی، بڑے سائز کی پھلی کی ایک سائڈ لمبائی کے رخ پر کھول لی جاتی ہے اور کسی ٹوپے والے جے کے مانند اسے پہن لیا جاتا ہے۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”جمّا! وہ کون سا سنگین معاملہ ہے جس نے اس برسات کے موسم میں تمہیں تھانے آنے پر مجبور کر دیا ہے؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر چوکنا نظر سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا پھر وہی آواز میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! سخاوت کو چوان کی لڑکی غائب ہو گئی ہے۔“

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا اور میں اضطرابی انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”سخاوت کو چوان.....؟“

”جی ہاں!“ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ”سخاوت کی گم ہونے والی لڑکی کا نام نازی ہے جناب اور وہ آج صبح ہی سے لاپتا ہے۔“

”اب تو شام ہو رہی ہے۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”اگر نازی صبح سے لاپتا ہے تو اس کے باپ نے ابھی تک یہاں آکر رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی.....؟“

”ایک وجہ تو یہ بارش ہے تھانے دار صاحب!“ وہ آواز دبا کر بولا۔ ”اور دوسرا سبب عزت وغیرہ کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ سخاوت اپنے طور پر نازی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تک یہ خبر عام نہیں ہوئی۔ بس، مجھے کہیں سے پتا چل گیا ہے۔ سخاوت کی خواہش ہے کہ وہ اس

واقعے کی دھوم مچنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالے تاکہ پھر گاؤں والوں اور خصوصاً غائب والوں کو یہ نہ بتانا پڑے کی نازی کہاں گئی تھی اور اسے سے تلاش کیا گیا ہے۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تمہارا معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”کچھ نہیں جناب.....!“ وہ اپنی اگلی آنکھ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو جی بس، ہمدردی میں اس کی سستی خیز اطلاع دینے آ گیا ہوں۔“

”کس کی ہمدردی میں؟“ میں نے پوچھا۔ ”سخاوت کو چوان کی یا پولیس کی ہمدردی میں.....!“

”دونوں ہی کی سمجھ لیں سرکار.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کی کوشش سے سخاوت کی لڑکی جائے گی تو اس میں دونوں ہی کا فائدہ ہے نا۔ نازی خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائے گی اور آپ کے ریکارڈ میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو جائے گا۔“

”تمہاری فرض شناسی نے مجھے متاثر کیا ہے جمّا! میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تم ادھر آبادی میں رہتے ہو؟“

ان دنوں میری تعیناتی ایک ایسے تھانے میں تھی جس کی حدود میں قصبہ ایمن آباد بھی آتا تھا اور اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی مجھے لگ بھگ ایک ماہ ہی ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں جھنگ صدر کے ایک تھانے میں پیشہ دارانہ فرائض ادا کر رہا تھا۔ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ کی حدود میں آتا تھا۔

جمّا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”جناب! جی جی تو مجھے پتا چلا ہے کہ سخاوت کی لڑکی نازی سے غائب ہے۔“

یہ جواب اس بات کی تصدیق تھا کہ جمّا ایمن آبادی کار ہانسی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”تم کرتے کیا ہو؟“

”وہ جی، میں کریا نے کی ایک چھوٹی سی دکان چلاتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”تمہارا اصل نام کیا ہے؟“

”نام تو میرا جمال دین ہے جی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”لیکن سب مجھے جمّا جمّا ہی کہتے ہیں اور..... بعض تو ”جمّا جی نال“ بھی کہہ دیتے ہیں۔“

”تمہاری سخاوت علی کے ساتھ کوئی رشتہ داری

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے، گم ہونے والی لڑکی نازی تمہاری لڑکی تو نہیں.....؟“

”کچھ نہیں جناب۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”بس، محلے داری سمجھ لیں۔“

”ٹھیک ہے جمّا.....!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ اہم اطلاع دینے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس سلسلے میں فی الحال میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”کیا مطلب تھانے دار صاحب.....؟“ وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی چشم یک کے اطمینان کی خاطر کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے جمّا کہ جب تک نازی کے گھر والوں یعنی اس کے ورثا میں سے کوئی تھانے آکر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کرادے، میں نازی کی تلاش کے لیے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتا البتہ.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”البتہ، میں اپنے عملے کے ایک مقامی کانسٹیبل کو اس معاملے کی سن گن کے لیے مقرر کر دیتا ہوں تاکہ مجھے تازہ ترین حالات کا پتا چلتا رہے۔“

”ٹھیک ہے جناب! آپ اتنا ہی کر لیں۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”لیکن میرے سرگرم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”تم اپنی آنکھیں اور کان مسلسل کھلے رکھو گے اور جیسے ہی تمہیں کام کی کوئی بات معلوم ہو، تم سیدھا میرے پاس آکر بتاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟“

”بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں گھمانے کے بعد یہ اضافہ کیا۔ ”آپ اس سلسلے میں تو بالکل بے فکر ہو جائیں۔“

”شباباش!“ میں نے سراپنے والے انداز میں کہا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”تو آپ اب مجھے اجازت دیں۔ میں اپنی دکان پر گشتی کو بخاکر آیا ہوں۔“

”یہ گشتی کون ہے؟“ میں نے رواروی میں پوچھ لیا۔ ”گشتی میرا آٹھ سالہ بیٹا ہے جناب.....“ جمّا نے بتایا۔ ”نام تو اس کا نصیر ہے جی لیکن لوگ اسے گشتی کہہ کر بلاتے ہیں۔“ لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”وہ بچپن میں بالکل بگوشتے (ناشپاتی) کی طرح کا تھا اسی لیے گشتی مشہور ہو گیا اور..... ابھی بھی وہ ایسا ہی ہے۔“

میں نے جمال دین عرف جمّا کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جس طرح لنگڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا تھا بالکل ویسے ہی لنگڑاتے ہوئے واپس چلا گیا اور جاتے جاتے مجھ سے ایک وعدہ بھی لے گیا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا تو اس نے درخواست آمیز انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

”تھانے دار صاحب! میں تو سخاوت کی بھلائی کے لیے آپ کو اطلاع دینے آ گیا ہوں لیکن میرا نام کہیں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سخاوت کا دل میری طرف سے میلا ہو۔ وہ جس معاملے کو چھپا رہا ہے، میں اس کو کھولنے والا مشہور ہو گیا تو وہ مجھ سے ناراض بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں تمہاری مجبوری کا خیال رکھوں گا۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم مطمئن ہو کر جاؤ اور مزے سے دکان داری کرو۔“

وہ اپنی تشکر سے لبریز اگلی آنکھ سے مجھے دیکھنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل باسط کو اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔ ”کیا کانسٹیبل نوازش ڈیوٹی پر آ گیا ہے؟“

نوازش نامی یہ کانسٹیبل مقامی تھا، یعنی اس کی رہائش ادھر ایمن آباد ہی میں تھی۔ وہ آج کل شبینہ ڈیوٹی کر رہا تھا۔ باسط نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”نہیں جناب! ابھی تک تو نہیں پہنچا۔ نام تو ہو گیا ہے۔ بس، آنے ہی والا ہوگا۔“

”وہ جیسے ہی آئے، اسے میرے پاس بھیج دینا۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بہت ہی ضروری کام ہے اس سے.....“

”اس لنگڑے نے کہیں نوازش کی کوئی شکایت وغیرہ تو نہیں کر دی۔“ باسط نے ٹٹولنے والی نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”ملک صاحب! خیریت تو ہے نا.....“ اس کی آنکھوں میں تشویش بھر گئی۔ ”یہ لنگڑا تھا کون؟“

”کیا تم اسے جانتے نہیں ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں جناب!“ باسط نے نفی میں گردن ہلائی۔

”میں نے اسے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے لیکن یہ بندہ مجھے بڑا ہی عجیب سا لگا ہے۔“

”عجیب سا.....!“ میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“



”جانتے نہیں جناب، آپ میری بات کو مذاق سمجھیں گے۔“ وہ ہنسی سے آمیز انداز میں بولا۔ ”لیکن میں نے جو دیکھا ہے، وہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا۔“

”تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے باسٹ؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”ملک صاحب! جب یہ بندہ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو میں نے اسے باقاعدہ لنگڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”ہاں، وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔“ میں نے اضطرابی انداز میں قطع کلامی کی۔ ”وہ میرے کمرے میں لنگڑاتے ہوئے ہی آیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”یہ ایک اتفاق ہے کہ جب وہ شخص تھانے سے رخصت ہو رہا تھا تو بھی میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے اور بھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ڈراما کر رہا ہے۔“

”کس قسم کا ڈراما؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے سوال کر دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ لنگڑا نہیں۔“

”کیا..... کیا مطلب؟“

”وہ جب تھانے کی عمارت سے نکل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ رہا تھا تو میں نے اسے غور سے دیکھا ہے جناب۔“ باسٹ انکشاف انگیز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ چند قدم تو لنگڑا ہٹ بھری چال کے ساتھ آگے بڑھا پھر جب وہ اپنے گھوڑے سے اٹھ، دس فٹ کے فاصلے پر تھا تو اس کی چال بالکل نارمل ہو گئی۔ وہ اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا اور گھوڑے کو چلاتے ہوئے جی ٹی روڈ کی طرف بڑھ گیا تھا، اسی وقت آپ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ آگے کس سمت گیا ہے۔“

باسٹ ایک ایسی بات بتا رہا تھا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر جہا ایمین آباد ہی کا وسٹیک تھا تو پھر اسے جی ٹی روڈ کی جانب جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی کریانے کی دکان کھلی چھوڑ کر آیا تھا اسی لیے اسے واپسی کی بھی جلدی تھی لہذا اسے تو فی الفور اپنی دکان پر یعنی ایمین آباد کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہیے تھا اور کانسٹیبل باسٹ کوئی اور ہی کہانی سن رہا تھا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھنے میں کوئی مغالطہ ہوا ہو؟“ میں نے باسٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”بارش کے سبب اس کی چال میں تیزی آگئی ہو اور تمہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ لنگڑا نہیں رہا ہو بلکہ کسی صحت مند ناگوں والے انسان کی طرح چل کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھا ہو۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!“ وہ یقین سے بولا۔ ”میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“

”جوبھی دیکھا وہی آپ کو بتایا ہے۔ میری بات کا کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے جناب۔“

”ٹھیک ہے، میں اس بندے کو چیک کروں گا۔“

”تم باسٹ کو میٹھے ہوئے کہا۔“ تم اب جاؤ اور نوازش ہی تھانے پہنچے، اسے فوراً میرے کمرے میں بھیج دینا۔“

”اوکے سر.....!“ وہ مجھے سلیوٹ کر کے واپس چلا گیا۔

میں دراصل نوازش کو اپنے پاس بلا کر سخاوت کی شدہ بیٹی نازی کے بارے میں استفسار کرنے کا ارادہ

تھا۔ جہا کی اطلاع کے مطابق نازی آج صبح ہی سے تھی۔ نوازش چونکہ ایمین آباد ہی کا رہنے والا تھا لہذا نازی کی گمشدگی کے حوالے سے اس سے زیادہ معتبر خبر کوئی دے نہیں سکتا تھا جبکہ وہ دن بھر گھر میں بھی رہا تھا لیکن نے ابھی جہا کی لنگڑا ہٹ کے ذیل میں جو سنسنی خیز خبریں سنیں

کیا تھا اس کی روشنی میں جہا قابل بھروسہ نہیں رہتا تھا۔ جب وہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا تو پھر اس کی فراہم کردہ اطلاع کو کیوں کر معتبر سمجھا اور جانا جاسکتا تھا۔

میرا ذہن کئی زاویوں پر بہ یک وقت سوچتے ہوئے خاصا الجھ سا گیا تھا اور اس الجھن کو ایک ہی شخص دور کر سکتا تھا اور وہ تھا کانسٹیبل نوازش..... میں بڑی بے تابی سے اس آمد کا انتظار کرنے لگا۔

جب مزید ایک گھنٹے تک بھی نوازش تھانے پہنچا اور ہی نازی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کی خاطر نے ادھر کا رخ کیا تو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آگیا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کی عمارت کے چھوڑے واقع تھا۔

نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں یہی کہا جاسکتا تھا کہ کانسٹیبل باسٹ نے جہا کی چال کے بارے میں جو خبر جاری کیا تھا، وہ بے وزن نہیں تھا۔

میں نے حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد رات کھانا کھایا اور برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ گیا۔ سوچتا تھا کہ کمرے کے اندر سویا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوارٹر کے میں لیٹنا ممکن تھا۔ کمرے میں ٹھن، گرمی اور چھپرے صحن میں بارش برس رہی تھی لہذا آج کل اکثر راتیں برآمدے ہی میں گزر رہی تھیں۔

میں خود تو کوارٹر کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا اور وہاں

جہا کی اطلاع کے مطابق نازی آج صبح ہی سے تھی۔ نوازش چونکہ ایمین آباد ہی کا رہنے والا تھا لہذا نازی کی گمشدگی کے حوالے سے اس سے زیادہ معتبر خبر کوئی دے نہیں سکتا تھا جبکہ وہ دن بھر گھر میں بھی رہا تھا لیکن نے ابھی جہا کی لنگڑا ہٹ کے ذیل میں جو سنسنی خیز خبریں سنیں

کیا تھا اس کی روشنی میں جہا قابل بھروسہ نہیں رہتا تھا۔ جب وہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا تو پھر اس کی فراہم کردہ اطلاع کو کیوں کر معتبر سمجھا اور جانا جاسکتا تھا۔

میرا ذہن کئی زاویوں پر بہ یک وقت سوچتے ہوئے خاصا الجھ سا گیا تھا اور اس الجھن کو ایک ہی شخص دور کر سکتا تھا اور وہ تھا کانسٹیبل نوازش..... میں بڑی بے تابی سے اس آمد کا انتظار کرنے لگا۔

جب مزید ایک گھنٹے تک بھی نوازش تھانے پہنچا اور ہی نازی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کی خاطر نے ادھر کا رخ کیا تو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آگیا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کی عمارت کے چھوڑے واقع تھا۔

نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں یہی کہا جاسکتا تھا کہ کانسٹیبل باسٹ نے جہا کی چال کے بارے میں جو خبر جاری کیا تھا، وہ بے وزن نہیں تھا۔

میں نے حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد رات کھانا کھایا اور برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ گیا۔ سوچتا تھا کہ کمرے کے اندر سویا جا سکتا تھا اور نہ ہی کوارٹر کے میں لیٹنا ممکن تھا۔ کمرے میں ٹھن، گرمی اور چھپرے صحن میں بارش برس رہی تھی لہذا آج کل اکثر راتیں برآمدے ہی میں گزر رہی تھیں۔

میں خود تو کوارٹر کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا اور وہاں

جہا کی اطلاع کے مطابق نازی آج صبح ہی سے تھی۔ نوازش چونکہ ایمین آباد ہی کا رہنے والا تھا لہذا نازی کی گمشدگی کے حوالے سے اس سے زیادہ معتبر خبر کوئی دے نہیں سکتا تھا جبکہ وہ دن بھر گھر میں بھی رہا تھا لیکن نے ابھی جہا کی لنگڑا ہٹ کے ذیل میں جو سنسنی خیز خبریں سنیں

کیا تھا اس کی روشنی میں جہا قابل بھروسہ نہیں رہتا تھا۔ جب وہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا تو پھر اس کی فراہم کردہ اطلاع کو کیوں کر معتبر سمجھا اور جانا جاسکتا تھا۔

دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

”باسٹ نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے.....“ وہ کوارٹر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں ملک صاحب..... آج مجھے ڈیوٹی پر آنے میں کافی دیر ہو گئی ہے۔“

اس کے بعد وہ مجھے بتانے لگا کہ اس تاخیر کا سبب کیا تھا۔ بارش نے اس کے گھر کی ایک دو چھتوں کے ساتھ خاصی گڑبڑ کر دی تھی اور وہ ان کی ترقی کو روکنے میں ایسا مصروف تھا لہذا وقت پر تھانے نہ پہنچ سکا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ اس دوران میں ہم چلتے ہوئے برآمدے میں آگئے تھے جہاں میری چار پائی کے ساتھ ہی دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کرسی سنبھال لی اور دوسری پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد کہا۔

”تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے، میں واقعی تمہیں بڑی شدت کے ساتھ یاد کر رہا تھا۔“

”ملک صاحب! خیریت تو ہے نا.....؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

”ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آگے کیا ہوگا اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”آپ تو مجھے ڈرا رہے ہیں جناب.....!“ اس کی پریشانی دو چند ہو گئی۔ ”کچھ بتائیں تو سہی، آخر معاملہ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں..... بلکہ میں پورا معاملہ ہی تمہارے سامنے کھول دیتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ باسٹ نے تمہیں کیا کہانی سنائی ہے؟“

”اس نے تو یہی بتایا ہے کہ آج شام میں ایک کانا اور لنگڑا گھڑ سوار تھانے آیا تھا۔“ نوازش نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس شخص نے آپ سے میری کوئی شکایت کی ہے اسی لیے آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ وہ کہانی ہے جو میں نے باسٹ کو ٹالنے کے لیے سنائی تھی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔“

”اور حقیقت کیا ہے ملک صاحب.....؟“ اس کی پریشانی منزل بہ منزل عروج کی طرف جاری تھی۔ ”وہ گھڑ سوار تھا کون..... میں تو کسی لنگڑے اور کانے شخص کو نہیں جانتا۔“

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”نوازش! کیا تم ایمین آباد میں

ساٹنے کانسٹیبل نوازش کھڑا تھا۔ میں نے اسے راست







مرد نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں سخاوت علی ہوں جی۔“ اس نے بھرائی ہوئی

آواز میں بتایا پھر اپنی ساتھی عورت کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے بولا۔ ”یہ میری گھر والی بشری ہے جناب۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آپ دونوں کا تعارف تو ہو گیا۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب یہ بھی بتادیں کہ

کون سی پریشانی آپ کو کھینچ کر تھانے لے آئی ہے؟“

”ہماری پریشانی نازلی کی وجہ سے ہے تھانے دار

صاحب۔۔۔۔۔“ بشری گلوگیر آواز میں بولی۔ ”وہ رات سے

کہیں غائب ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں گئی۔ ہم

اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جیسے پاگل ہو گئے ہیں۔“

”نازلی ہماری بیٹی ہے جناب!“ بشری کے خاموش

ہوتے ہی سخاوت نے بتایا۔ ”مجھے میں نہیں آرہا کہ اسے

زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے۔ ہم نے پورا ایمن آباد

چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ساری رات

ہم نے جاگ کر گزاری ہے۔۔۔۔۔“

”آپ کی بیٹی کی عمر کیا ہے؟“ میں نے باری باری

ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”ان سردیوں میں وہ پورے بائیس سال کی

ہو جائے گی جناب۔“ بشری نے بتایا۔

”آخری بار نازلی کو آپ لوگوں نے کب اور کہاں

دیکھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جما کی اطلاع کے مطابق نازلی گزشتہ روز صبح گھر سے

غائب ہوئی تھی۔ یہ اطلاع سراسر غلط تھی کیونکہ کاشیمل

نوازش نے کل سہ پہر نازلی کو اپنی گلی میں کھڑے دیکھا تھا۔

نوازش اور سخاوت کو چوان ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ اب

دیکھنا یہ تھا کہ نازلی کے والدین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں سخاوت نے بتایا۔

”مغرب کی اذان کے وقت تو وہ گھر میں ہی تھی۔ جب میں

مسجد کی طرف گیا تو اسے گھر کے اندر ہی دیکھا تھا اور جب

واپس آیا تو وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔“

”جب تم مغرب کی نماز کے لیے گھر سے نکلے تو اس

وقت نازلی کے علاوہ اور کون کون گھر کے اندر موجود تھا؟“

میں نے سخاوت کو چوان سے پوچھا۔

”بشری تھی اور۔۔۔۔۔ خالد تھا۔۔۔۔۔“ اس نے جواب

دیا۔ ”بشری اور نازلی دونوں گھر کے اندر تھیں اور میرا چھوٹا

بیٹا خالد باہر دروازے کے سامنے گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں

نے اسے گھر جانے کے لیے کہا۔ جب وہ دروازے

اندر داخل ہو گیا تو میں مسجد کی طرف چلا گیا تھا۔“

”جما مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے میرے

تھا یعنی جب وہ تھانے میں بیٹھا مجھے نازلی کی گمشدگی

سنارہا تھا اس وقت نازلی اپنے گھر پر موجود تھی۔ اس

فوری طور پر ایک بات ذہن میں آئی تھی کہ عین ممکن

نازلی کی گمشدگی میں اسی کانے جما کا ہاتھ ہو۔

”اور جب تم مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد

سے واپس آئے تو نازلی گھر میں موجود نہیں تھی۔“

دوبارہ سخاوت کو چوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے

”تم نے ابھی مجھے یہی بتایا ہے نا۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں، تھانے دار صاحب!“ اس نے اثبات

گردن ہلائی۔ ”یہی حقیقت ہے جو میں نے بیان کی ہے

میں نے اپنا رخ بشری کی طرف پھیرا اور سوال

”اب تم مجھے بتاؤ کہ نازلی کہاں چلی گئی۔ سخاوت تو اسے

میں چھوڑ کر گیا تھا اور جب یہ واپس آیا تو وہ غائب تھی۔

دوران میں تم تو گھر پر تھیں نا۔۔۔۔۔؟“

”جی تھانے دار صاحب، میں گھر میں تھی۔“ اس

تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”اس وقت بارش رکا

تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور کہا کہ دس منٹ کے لیے

کے گھر جا رہی ہے۔ ابھی واپس آجائے گی اور۔۔۔۔۔ وہ

تک واپس نہیں آئی۔“ بات ختم کرتے کرتے اس کی

زندہ گئی۔

”کیا تم لوگوں نے نازلی کو عارفہ کے گھر میں تلاش

میں نے استفسار کیا۔ ”اور یہ بھی بتائیں کہ عارفہ کون ہے

بشری کے مطابق، عارفہ، صفیہ نامی ایک بیوہ

تھی۔ صفیہ کا گھر ان کی پچھلی گلی میں تھا۔ یہ تفصیل

کرنے کے بعد بشری نے بتایا۔

”جی سب سے پہلے تو ہم نے وہیں دیکھا تھا

نازلی وہاں نہیں تھی۔“

”عارفہ نے کیا بتایا۔۔۔۔۔؟“

”عارفہ کا کہنا ہے کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد

اس کے گھر سے چلی گئی تھی۔“ بشری نے جواب دیا۔

وہ ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچی تھانے دار صاحب۔

”کیا وہ پہلے بھی عارفہ کے گھر جاتی رہتی تھی؟“

”جی۔۔۔۔۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ سخاوت نے

دیا۔ ”عارفہ اور نازلی آپس میں سہیلیاں ہیں۔ دونوں

ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتی ہیں۔“

پہاڑ اوجھل

”نازلی مغرب کی اذان کے وقت عارفہ کے گھر

میں۔۔۔۔۔ میں نے پرسوج لہجے میں کہا۔ ”پندرہ بیس منٹ

وہاں بیٹھی اور ان لوگوں کے بیان کے مطابق وہ اپنے گھر

واپس آگئی لیکن آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گھر نہیں پہنچی۔

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں، یہی صورت حال ہے۔“ سخاوت نے

کمزوری آواز میں کہا۔

”تم لوگوں نے نازلی کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے؟“

”یہ پوچھیں کہ کہاں تلاش نہیں کیا۔۔۔۔۔ وہ بولا۔ ”ہم نے

اسے پورے ایمن آباد میں ڈھونڈا ہے مگر وہ کہیں نہیں ملی۔“

”اور ایمن آباد کے باہر۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ نظر

سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”باہر وہ کہاں جاسکتی ہے تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔!“

سخاوت بے چارگی سے بولا۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ میں نے وضاحت کرتے

ہوئے کہا۔ ”ایمن آباد سے باہر آپ لوگوں کے رشتے دار وغیرہ

توہوں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ کسی رشتے دار کے گھر چلی گئی ہو؟“

یہ سوال میں نے محض خانہ پری کے لیے کیا تھا تاکہ

اس امکانی گوشے پر بھی کچھ روشنی پڑ جائے ورنہ اس بات

کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ میری توقع کے عین

مطابق بشری نے جواب دیا۔

”اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار

صاحب۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ”آج تک وہ

انگلی کہیں نہیں گئی۔ اگر اسے ایمن آباد سے باہر کہیں جانا بھی

تھا تو وہ ہمیں بتاتی۔ اس طرح چپ چاپ خود ہی منہ اٹھا کر

وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“ وہ لہجے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو جناب۔۔۔۔۔ یہ کوئی اور ہی پتہ لگتا ہے۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ میں نے ٹٹولتی ہوئی

نظر سے بشری کی طرف دیکھا۔

”کسی نے اسے اغوا۔۔۔۔۔!“ وہ اس سے آگے کچھ نہ

بول سکی۔

”ہم اس پہلو پر بھی بات کریں گے۔“ میں نے

گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پہلے آپ لوگ مجھے اس بات کا

جواب دیں کہ ایمن آباد سے باہر آپ کے رشتے دار اور

کہاں کہاں رہتے ہیں؟“

”بشری کا تو کوئی رشتے دار اس دنیا میں ہے نہیں

تھانے دار صاحب۔“ سخاوت کو چوان نے بڑی رसान سے

جواب دیا۔ ”اور میرا بھی صرف ایک بڑا بھائی اور ایک

چھوٹی بہن ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔۔۔۔۔“

”کیا تمہارے یہ بھائی بہن ادھر ایمن آباد ہی میں

رہتے ہیں؟“

”نہیں جی۔۔۔۔۔“ سخاوت نے نفی میں گردن ہلائی اور

بتایا۔ ”بھائی امانت علی تو موضع ہندو چک میں رہتا ہے اور

میری چھوٹی بہن زینت ادھر کاموکی میں رہتی ہے۔“

”ہندو چک“ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ایمن آباد

کے تقریباً شمال مشرق میں واقع تھا جبکہ کاموکی نامی قصبہ

ایمن آباد کے جنوب میں واقع تھا۔ اگر گوجرانوالہ سے

لاہور کی طرف سفر کریں تو اپر چناب نہر عبور کرنے کے بعد

قصبہ ایمن آباد آتا تھا۔ اس کے بعد کاموکی، پھر مرید کے،

شاہدرہ اور دریائے راوی عبور کرنے کے بعد لاہور۔ ایمن

آباد، کاموکی، مرید کے، شاہدرہ۔۔۔۔۔ سب جی ٹی روڈ پر واقع

تھے۔ کاموکی اور مرید کے کی غلہ منڈیاں بہت مشہور تھیں۔

”ہاں بھی بشری۔۔۔۔۔!“ میں نے گمشدہ نازلی کی ماں

کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں

نازلی ہندو چک کی طرف گئی ہے اور نہ ہی اس نے کاموکی کا

رخ کیا ہے بلکہ تم اس رخ پر سوچ رہی ہو کہ شاید اسے کسی

نے اغوا کر لیا ہے۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“

”جی۔۔۔۔۔!“ اس نے اثباتی انداز میں پلکیں

چھپکائیں۔

میں ان میاں بیوی سے گفتگو کے دوران میں اہم

پوائنٹس ایک کاغذ پر نوٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔ بشری کے

جواب پر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جب کوئی شخص اچانک منظر سے غائب ہو جاتا ہے

اور ڈھونڈنے پر دستیاب نہیں ہوتا تو ذہن اس کے اغوا یا قتل

کی طرف جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کا کام

کوئی سجن دوست نہیں کر سکتا بلکہ یہ کسی دشمن کی کارروائی سمجھی

جاتی ہے۔ اب آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ۔۔۔۔۔“ میں نے

لحائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”دشمن۔۔۔۔۔!“ سخاوت نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے

دیکھا۔ ”ہمارا تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔“

”اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔“ سخاوت نے بڑے

مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں تو ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جو

دشمنی نکالنے کے لیے نازلی کو اغوا کر لے۔۔۔۔۔“







میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ مجھے نازی کی سہیلی عارفہ سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔“

انہوں نے اطمینان سے گردن ہلائی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد، میں نے کانسٹیبل نوازش کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب بشریٰ اور سخاوت علی میرے کمرے میں آئے تھے تو میں نے نوازش کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے ان میاں بیوی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور آخر میں سوال کیا۔

”اب بتاؤ، تم کیا کہتے ہو سچ اس مسئلے کے۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں؟“

”مجھے ایک سوا ایک فیصد یقین ہے ملک صاحب.....!“ وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ”نازی کی گمشدگی میں اسی خبیث کانے کا ہاتھ ہے جس نے آپ کو اپنا نام بچا دیا تھا۔“ ”سارے اشارے تو اسی کی طرف جارہے ہیں۔“ میں نے گھبرانداز میں کہا۔ ”لیکن یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ کوئی مجرم اتنا ہمت والا بھی ہو سکتا ہے کہ شام میں تھانے آکر مجھے نازی کی گمشدگی کی اطلاع بھی دے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ نازی کو اغوا بھی کر کے لے جائے؟“ ”آپ اسے دوسرے زاویے سے دیکھیں ملک صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”کون سا دوسرا زاویہ؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔ اس نے بتایا۔ ”وہ کا نا بہادر یا ہمت والا تھا یا نہیں، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک چالاک اور ہوشیار مجرم تھا اور اس واردات میں کوئی اس کا شریک کار بھی رہا تھا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو رکھا تو میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”وہ تھانے میں بیٹھ کر آپ کو نازی کی گمشدگی کی کہانی سناتا رہا اور دوسری طرف اس کے ساتھی نے اپنا کام دکھا دیا ہوگا۔ پھر دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق کہیں ملے ہوں گے اور اپنی منزل کی جانب بڑھ گئے ہوں۔“

”تمہاری اس تھیوری میں اچھا خاصا کرنت تو ہے۔“ میں نے سوچتی ہوئی نظر سے نوازش کی طرف دیکھا۔ ”لیکن اب تک جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ نازی کو اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ جہاں بھی گئی ہے اور جس کے ساتھ بھی گئی ہے اس میں اس

کی مرضی بھی شامل تھی.....“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب کسی شخص کو اغوا کیا جاتا ہے تو اس کا رد و احوال کے نشانات بھی ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس عمل میں مغوی کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اٹھالے جانے کے خلاف کم یا زیادہ مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ یقیناً اغوا کی صورت میں نازی کو بھی اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا لیکن اسے شواہد کہیں بھی نہیں ملے۔ وہ اپنی سہیلی سے ملنے پچھلی گلی میں گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔“

نوازش کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”ملک صاحب! وہ کون سی سہیلی کے گھر گئی تھی؟“

”انہوں نے اس سہیلی کا نام عارفہ بتایا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”عارفہ کا گھر پچھلی گلی میں ہے۔ وہ کسی بیوہ کی بیٹی ہے۔“

”ہاں، ہاں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”صفیہ نامی وہ عورت مطلقہ اور بیوہ ہے۔“

”مطلقہ اور بیوہ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے ملک صاحب.....!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”صفیہ نے کوئی سولہ سترہ سال پہلے رحمان نامی ایک زمیندار سے شادی کی تھی جو پکی والا میں رہتا تھا، عارفہ اسی رحمان کی اولاد ہے۔ شادی کے دو سال بعد ہی صفیہ کو طلاق ہو گئی اور وہ پہلی والا سے واپس ایمن آباد آ گئی۔ چند سال بعد، اس نے خاور نامی ایک بندے سے شادی کر لی جس سے اس کا ایک بیٹا انور ہے۔ خاور کا تعلق ایمن آباد ہی سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے خاور کا انتقال ہو گیا اور اب صفیہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ میری پچھلی گلی میں رہتی ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”صفیہ کا بیٹا انور تو ابھی چھوٹا ہی ہوگا؟“

”جی، وہ سات آٹھ سال کا ہے۔“

”پھر ان لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”خاور مرتے وقت ان کے لیے ایک دکان اور آٹھ ایکڑ زمین چھوڑ گیا تھا۔“ نوازش نے بتایا۔ ”اس آٹھ ایکڑ اراضی کو صفیہ نے ٹھیکے پر دے رکھا ہے جہاں سے حاصل ہونے والے اناج اور آمدنی سے ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔“

پہاڑ اوجھل

پھر رہائش کے لیے ذاتی گھر ہے اس لیے زیادہ مسائل نہیں ہیں ان لوگوں کے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے، میں باسط کو اپنے ساتھ لے کر سخاوت کو چوان کے گھر جا رہا ہوں۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تم اس مشن پر روانہ ہو جاؤ جس کے حوالے سے ہم نے رات میں گفتگو کی تھی.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے دروازے سے باہر دیکھا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آج بارش کو ابھی تک برسنا یاد نہیں آیا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام نمٹا لیتا چاہیے۔“

”جی ملک صاحب! یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تو یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ آج بارش ہوگی ہی نہیں۔ آسمان کی شکل رونے والی بنی ہوئی ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے جناب.....“

”بس تو پھر تم روانہ ہو جاؤ۔“ میں نے ختمی انداز میں کہا۔ ”اور میں بھی نکل رہا ہوں۔“

ہمارے درمیان، رات والی میننگ میں یہ طے ہو گیا تھا کہ آج صبح نوازش گھوم پھر کر کانے گھڑسوار کے بارے میں معلومات جمع کرے گا۔ اس بات میں تو اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک چشم لکڑا گھڑسوار ایمن آباد سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ برستی بارش میں جب مجھ سے ملنے آیا تھا اور مجھ سے مل کر جب وہ واپس گیا تھا تو یقینی طور پر کچھ لوگوں نے اسے آتے اور جاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ کانسٹیبل باسط کے دعوے کے مطابق وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جی ٹی وی روڈ کی جانب گیا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ جی ٹی وی روڈ پر چڑھنے کے بعد لاہور کی سمت گیا تھا یا اس نے گوجرانوالہ کا رخ کیا تھا۔ گوجرانوالہ، ایمن آباد کے شمال میں اور لاہور جنوب میں واقع تھا۔ کانے جٹا کے بارے میں تحقیق کی ذمہ داری میں نے نوازش کو سونپی تھی۔

سخاوت علی کو چوان کا گھر درمیانے سائز کا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس گھر کا تحقیقی جائزہ لے لیا تھا۔ وہ تین کمروں اور صحن پر مشتمل ایک روایتی سادیہائی مکان تھا۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو مکان کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے تھے جبکہ تیسرا کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور یہ گھر کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی سامنے والے حصے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی

خانہ اور غسل خانہ ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور اسی دیوار کے آخری سرے پر چھپر کے نیچے ایک کنڈلی رکھی نظر آ رہی تھی۔ اس چھپر اور کنڈلی کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی وقت محسوس نہ ہوئی کہ سخاوت کو چوان بہ وقت ضرورت اپنے گھوڑے کو اس چھپر کے نیچے باندھتا ہوگا۔

میں نے سخاوت اور بشریٰ کی راہنمائی میں گھر کا معائنہ کر لیا تو مجھے پتا چلا کہ عقی دوئوں کمروں میں سے ایک میں تو بشریٰ اور سخاوت نے رہائش اختیار کر رکھی تھی جبکہ اس کے برابر والے کمرے میں نازی، خالد کا بھیرا تھا۔ خالد کی عمر لگ بھگ دس سال رہی ہوگی۔ ان دونوں بھائی بہن میں صبح وشام ”تو تو، میں میں“ بھی ہوتی رہتی تھی اور وہ مل کر ایک ساتھ بھی رہتے تھے۔ نازی کی گمشدگی نے خالد کو اداس کر دیا تھا۔

بیٹھک میں کسی نے ڈیرا نہیں ڈال رکھا تھا۔ وہ مہمانوں کو بٹھانے اور خاطر تواضع کرنے کے استعمال میں آتی تھی۔ رکی بات چیت اور پوچھ گچھ کے بعد میں نے سخاوت سے کہا۔

”میں اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں نازی کا سامان رکھا ہوا ہے۔“

”سامان کیا ہے جی.....“ بشریٰ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ایک سوٹ کیس ہے جناب جس میں وہ اپنے کپڑے وغیرہ رکھتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں وہی سوٹ کیس دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

جب سے میرے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا کہ نازی کی گمشدگی میں اس کی اپنی مرضی شامل ہے اسی لمحے سے میرے اندر رہ رہ کر ایک آواز اٹھتی تھی اور وہ یہ کہ نازی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے، اس کے گھر کے اندر ہی سے کوئی سراغ ملے گا۔ اسی جستجو کے پیش نظر میں نے اس کا سامان دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، میں سخاوت کو چوان کی معیت میں نازی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ ایک عام سا کمرہ تھا، چار دیواریوں والا..... دو دیواریوں کے ساتھ دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چار پائیاں یقیناً خالد اور نازی کے لیے تھیں کیونکہ اس کمرے پر انہی دونوں کا قبضہ بتایا جاتا تھا۔ کمرے کی تیسرے دیوار میں داخلی دروازہ بنا ہوا تھا جبکہ چوتھی دیوار کے ساتھ ایک بڑی جستی پٹی رکھی نظر آ رہی تھی۔ اس پٹی



”تو تمہارے خیال میں یہ انگوٹھی اور رومال میں نے نازلی کے سوٹ کیس میں رکھا تھا.....؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا جی.....!“ وہ بے چارگی سے مجھے ہنسنے لگی۔

اس دوران میں سخاوت علی خاموش کھڑا ہم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن رہا تھا۔ اس کی نگاہ بھی میرے چہرے پر اور کبھی بشری کے چہرے پر ٹھہر جاتی تھی۔ موجودہ صورت حال نے گویا اسے گنگ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے مذکورہ ریشمی رومال کو بشری کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس“ ”این“ کا تو سیدھا سیدھا مطلب ہے، نازلی اور باقی رہ گیا۔ ”اے“..... مجھے اسی ”اے“ کی تلاش ہے.....“ میں نے لچاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایسا لڑکا جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے، یہ رومال اور انگوٹھی اسی لڑکے نے نازلی کو دیے ہوں گے۔ ان دونوں کے بیچ محبت والی کہانی چل رہی تھی اور..... اور نازلی کی گمشدگی میں بھی اسی محبت کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔“

”لیکن تمہانے دار صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ.....“ سخاوت علی کچھ کہتے کہتے اچانک رگ گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیا ممکن ہے سخاوت علی؟“

”وہ جناب..... عارفہ کا نام بھی تو عین سے شروع ہوتا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”نازلی اور عارفہ بڑی بچی سہیلیاں ہیں اور ان میں بہت زیادہ محبت بھی ہے، ممکن ہے یہ رومال عارفہ ہی نے نازلی کو تحفے میں دیا ہو۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے سخاوت علی!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ وزن اس قدر نہیں ہے کہ میری سوچ اس سے متاثر ہو جائے۔ بہر حال.....“ میں نے لچاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں سے اٹھنے کے بعد عارفہ کے گھر جا رہا ہوں۔ میں اسے بھی چیک کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر یہ رومال اسی نے نازلی کو دیا تھا تو پتا چل جائے گا۔“

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بشری نے جلدی سے کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں جی.....“

”اس کی ضرورت نہیں بشری.....!“ میں نے قطع کلامی

ندامت کے بوجھ سے اس کی آواز کٹ کر رہ گئی تھی۔

”جب میں نے پوچھا تھا کہ.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”نازلی کسی لڑکے کو پسند تو نہیں کرتی تھی یا کوئی لڑکا اس میں دلچسپی تو نہیں لے رہا تھا تو آپ دونوں میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا تھا..... ہیں نا؟“

”میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جناب کہ نازلی کے اس معاملے کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔“ وہ روہانسا ہو گیا پھر شکستہ لہجے میں بولا۔ ”ٹھہریں، میں بشری کو بلا کر لانا ہوں۔“

سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والی اشیاء کو دیکھ کر سخاوت کے چہرے پر خفت اور ندامت کے جو تاثرات ابھرے تھے وہ ایک فطری رد عمل تھا۔ یہ انکشاف ہی اتنا سنسنی خیز اور خطرناک تھا کہ کسی بھی شریف انفس باپ کو شرمندگی کی دلدل میں دھنسانے کے لیے کافی تھا۔ میں سخاوت کی جذباتی کیفیت اور مجروح احساسات کو بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ ان لحاظات میں اس نے کسی قسم کی اداکاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ رویہ اس کے دلی جذبات کی سچی ترجمانی تھا۔ بیٹی کے خفیہ معاملے سے آگاہ ہونے کے بعد وہ یکا یک ایک بے بس، لاچار اور بوڑھا باپ نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی بیوی بشری کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس دوران میں، میں نے چاندی کی انگوٹھی اور ریشمی رومال کا ہر پہلو سے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا، جب میں نے مختصر الفاظ میں بشری کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے تمہانے داری جی.....“

”ہو سکتا نہیں بلکہ..... یہ ہو چکا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”سارے ثبوت تمہارے سامنے ہیں، تم اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتی ہو.....“

”پر جناب..... نازلی تو ایسی لڑکی نہیں تھی۔“

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

”وہ ایسی بھی یا نہیں، اب یہ اتنا اہم نہیں رہا۔ سوٹ کیس کی تہ سے برآمد ہونے والے یہ واضح ثبوت اسے کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ظاہر کرتے ہیں یا تو تم اپنی بیٹی کو سمجھ نہیں پاتی ہو اور یا پھر تمہیں سب پتا ہے اور تم جان بوجھ کر نازلی کے اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”ایسی بات نہیں ہے جناب.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

میں کوئی چیز رکھنے سے پہلے نیچے اخبار وغیرہ بچھا دیتے تھا۔ نازلی نے بھی اپنے سوٹ کیس میں کچھ ایسا ہی کر رکھا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں وہ اخبارات ہٹا کر دیکھا۔ گوہر مقصود میرے ہاتھ لگ گیا۔

ان تہ شدہ بچھے ہوئے اخبارات کے نیچے سے دو چیزیں برآمد ہوئیں جنہیں دیکھ کر میں نہ صرف چونک اٹھا بلکہ میرے رگ و پے میں سنسنی بھی دوڑ گئی تھی۔ ان دو چیزوں میں خیز اشیا میں ایک تو تہ شدہ ریشمی رومال تھا اور دوسری چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ چاندی کی اس زنانہ انگوٹھی میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ بھی جڑا ہوا تھا جو کسی بھی قیمت پر یا تو نہ نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ کاغذ یا پلاسٹک کا ایک ٹکڑا تھا۔

میں نے تہ شدہ رومال کو کھول کر دیکھا تو اس کے اندر موجودہ مسئلے کا حل مجھے صاف نظر آ گیا۔ مذکورہ رومال کے ایک کونے پر رنگین دھاگے کی مدد سے ایک خوب صورت پھول کاڑھا گیا تھا جبکہ دوسرے کونے میں دو دل پہلو پہلو بنے ہوئے تھے۔ ایک دل کے اندر انگریزی حرف اے (A) اور دوسرے دل کے اندر (N) بھی کاڑھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دونوں کے اندر کڑھے ہوئے یہ A اور N کسی محبت کی کہانی کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ یہ رومال چونکہ نازلی کے سوٹ کیس کے اندر سے دستیاب ہوا تھا اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ چھپا کر رکھا گیا تھا لہذا میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ (N) کا مطلب تو نازلی ہے اگر میں (A) نام والے کسی مرد کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاں تو یہ کیس چمکی بجاتے میں حل ہو سکتا تھا۔ میرے فوری انداز سے کے مطابق چاندی کی وہ انگوٹھی کسی (A) نے نازلی کو محبت کے تحفے کے طور پر دی تھی اور نازلی نے یہ ریشمی رومال اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسی (A) کے لیے کاڑھا تھا۔

میں نے یہ دونوں چیزیں سخاوت علی کو دکھائیں اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے سخاوت.....؟“

میرے ساتھ ہی وہ بھی رومال اور انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے بسی، تذبذب اور الجھن کے تاثرات نمودار ہوتے دیکھے۔ بڑی ہمت کر کے کمزوری سی آواز میں بولا۔

”تمہانے دار صاحب..... میں اس بارے میں نہیں جانتا۔“

”اس معاملے کو تو سمجھ رہے ہونا؟“ میں نے معنی خیز انداز میں ریشمی رومال والے دونوں پر انگلی رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی..... یہ تو..... صاف..... نظر آ رہا ہے۔“

کے اوپر دو تین صندوق بھی پڑے ہوئے تھے۔ جستی بیٹی یقیناً لفافوں اور گلدوں وغیرہ کے لیے استعمال ہو رہی تھی اور صندوقوں میں کپڑے ہوں گے۔

سخاوت علی نے ایک سوٹ کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ”تمہانے دار صاحب! نازلی کا سامان اس بجے کے اندر ہے۔“

مذکورہ سوٹ کیس ریگزن کا بنا ہوا تھا جس پر چیک دار رنگین پرنٹ تھا اور یہ سوٹ کیس، جستی صندوقوں کے پہلو میں، بیٹی کے اوپر رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت کمرے میں میرے اور سخاوت علی کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ بشری بارش کے حوالے سے کسی گھریلو مسئلے میں الجھ گئی تھی کیونکہ باہر ایک مرتبہ پھر برسات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

میں نے سخاوت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سخاوت! نازلی کے سامان والے سوٹ کیس کو نیچے تو اتارو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، کم ہو جانے والی لڑکی نے اس کے اندر کیا بھر رکھا ہے.....؟“

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ سوٹ کیس کو بیٹی کے اوپر سے اتار کر نازلی کے بستر پر رکھ دیا۔

”اسے کھولو.....“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”اور اس کے اندر موجود سامان کو ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کر دو۔“

وہ ایک بار پھر میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ سوٹ کیس کے اندر زیادہ تر نازلی کے پہننے والے کپڑے ہی رکھے نظر آ رہے ہیں۔ سخاوت ایک ایک کپڑا نکال کر مجھے دیتا جا رہا تھا اور میں اس کپڑے کی ٹیس کھول کر اور اچھی طرح جھٹک کر اپنی تسلی کرتا جا رہا تھا، پھر میں ”کلیئر“ کپڑے کو دوسری جانب رکھ دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سوٹ کیس خالی ہو گیا لیکن ایسی کوئی بھی اہم شے تھی نہ چڑھی جسے میں نازلی کی تلاش میں استعمال کر سکتا۔

سوٹ کیس کے ڈھکنے کی اندرونی جانب جو دو پاکٹ بنی ہوئی تھیں، میں نے انہیں بھی کھنگال ڈالا لیکن نتیجہ وہی، ڈھاک کے تین پات.....!

اچانک ایک برق رفتار خیال میرے ذہن سے گزرا اور میں بدست خود سوٹ کیس کے ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔

یہ خیال ان اخبارات کو دیکھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا جو سوٹ کیس کی تہ میں بچھائے گئے تھے۔ وہ گزری ہوئی تاریخوں کے پرانے اخبارات تھے۔ لوگ عموماً یہ حرکت کرتے ہیں کہ سوٹ کیس، درازوں اور شیلف وغیرہ



کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم اپنے چھوٹے بیٹے کو میرے ساتھ بھیج دو..... راہنمائی کے لیے۔“

ان کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا چنانچہ بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گئے۔ میں نازلی کے چھوٹے بھائی دس سالہ خالد کے ہمراہ عارفہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بارش کا سلسلہ ہنوز جاری و ساری تھا تاہم فی الوقت یہ معاملہ شخص بوند باندی تک ہی محدود تھا۔ میں نے بشریٰ کو اپنے ساتھ لانے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ میں عارفہ سے بالکل علیحدگی میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اگر بشریٰ اور سخاوت میں سے کوئی موجود ہوتا تو اس مات کا امکان بہر حال رہتا کہ عارفہ مجھے کھل کر کچھ بتانہ پائی۔ عارفہ کا گھر چونکہ کچھلی گلی ہی میں واقع تھا لہذا وہاں تک رسائی میں بہ مشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔

جب خالد نے مطلوبہ مکان کی نشاندہی کر دی تو میں نے اسے بھی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا تھا جس کے لیے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر عارفہ کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں عارفہ کی بیٹھک میں موجود تھا۔

کانشیل نوازش نے مجھے عارفہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ من و عن درست ثابت ہوئیں۔ نازلی کی گمشدگی والا معاملہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا تھا۔ میں نے ذاتی تعارف کے بعد جب عارفہ کی ماں صفیہ کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو وہ بڑی فکر مندی سے بولی۔

”تھانے دار صاحب! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ تازی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ کل شام میں تو وہ یہاں سے بھلی چٹنی کٹی تھی۔“

”یہاں سے وہ بھلی چٹکی رخصت ہوئی لیکن اپنے گھر نہیں پہنچی.....“ میں نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور جہاں تک اس کے کہیں غائب ہو جانے کا تعلق ہے تو اس کا پتا ابھی لگا لیتا ہوں میں.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے معنی خیز انداز میں عارفہ کی طرف دیکھا پھر اس سے سوال کیا۔

”کیوں عارفہ..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“  
 ”مم..... مجھے..... کیا پتا جی.....!“ وہ گڑبڑائے  
 ہوئے لہجے میں بولی۔

عارفہ کی عمر مجھے پندرہ سال کے قریب بتائی گئی  
لیکن ماشا اللہ! اس نے صحت ایسی پائی تھی کہ اٹھارہ برس  
نظر آتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے  
لہجے میں پوچھا۔

”سمہیں کیا پتا نہیں عارفہ.....؟“  
 ”وہ جی..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ.....“ وہ لڑکھڑاہے  
 آمیز لہجے میں بولی۔ ”مجھے کیا پتا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں  
 یا غلط.....!“

”ہوں.....!“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سمجھا کہ تمہیں اس بات کا پتا نہیں کہ تازلی کہاں غائب ہوئی ہے.....؟“

”مجھے..... اس کا بھی کچھ پتا نہیں جی.....!“ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

”تھانے دار صاحب! آپ تو میری بچی کو اس طرح گھوڑ رہے ہیں جیسے نازلی کو اسی نے کہیں گم کر دیا ہو۔“ صفحہ ۱۰۰ نے ابھن زدہ لہجے میں کہا۔

”اگر اس نے کم نہیں بھی کیا تو.....“ میں نے صفیہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ کم از کم اتنا ضرور جائز ہے کہ وہ کہاں غائب ہوئی ہے.....؟“

میں نے حالات و واقعات کے پیش نظر تفتیش کے اندھیرے میں اندازے کا ایک تیر چھوڑا تو صفیہ متعجب انداز میں مجھے دیکھنے لگی پھر قدرے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”تھانے دار صاحب! اگر عارفہ کو اس بات کا پتا ہو تو وہ اب تک ضرور بتا چکی ہوتی۔ کل رات ہی سے ناز کے ماں باپ اس قدر پریشان ہیں کہ بس، میں آپ کو نہیں سکتی۔“

”تم نہیں بھی بتاؤ تو مجھے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ اب آپ لوگوں کے ساتھ ساتھ میں خود بھی بہت پریشان ہوں گا۔“

وں اور میری پریشانی اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک میں الف یا عین سے شروع ہونے والے نامی بندے کو گرفتار نہیں کر لوں گا۔“

اس وقت میرے، عارفہ اور اس کی ماں صفیہ کے  
 بٹھک میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عارفہ کا چھوٹا بھائی  
 اسی بچوں کے ساتھ انہی کے گھر میں کھیل رہا تھا۔  
 بری وضاحت پر بری طرح چونک اٹھی تھی۔

”یہ الف اور عین کا کیا چکر ہے تمہانے دار صاحب  
 نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔



”تھانے دار صاحب! آپ عارفہ کی صحت پر نہ جائیں۔ میری بچی بہت ہی حساس اور دل کی کمزور ہے۔ آپ کی خوف ناک باتیں کہیں اس کے دماغ پر کوئی الٹا اثر نہ کر دیں۔“

”مجھے تو کوئی شوق نہیں ہے اسے تھانے لے کر جانے کا۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”لیکن اگر یہ مجھ سے تعاون نہیں کرے گی تو پھر مجھے مجبوراً یہ قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔“

”آپ کو کس بنا پر یقین ہے کہ نازی کا کسی لڑکے سے کوئی چکر تھا۔“ صفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”اور یہ کہ عارفہ ان کے چکر سے بھی واقف ہے.....؟“

”میں نے تھوڑی دیر پہلے دو ٹھوس ثبوت ہاتھ لگنے کی بات کی تھی۔“ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”انہی ثبوت کی بنا پر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نازی کسی ایسے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی جس کا نام الف یا عین سے شروع ہوتا ہے۔“

”سخاوت اور اس کی گھر والی نے اس سلسلے میں کیا بتایا ہے؟“ صفیہ نے ایک اہم سوال کیا۔

”انہوں نے اس معاملے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے نازی کی رازدار سیکلی سے معلومات حاصل کرنے میں یہاں پہنچا ہوں۔“

”کیا وہ دونوں ٹھوس ثبوت آپ مجھے دکھا سکتے ہیں؟“ صفیہ نے پوچھا۔

”بالکل دکھا سکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سے چاندی کی انگلی نکال لی پھر اسے صفیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ مجھے نازی کے سوٹ کیس میں سے ملی ہے۔“

صفیہ نے مذکورہ انگلی کو اپنے ہاتھ میں لے کر گھما پھرا کر دیکھا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو یہ انگلی نازی کے ہاتھ میں کبھی نظر نہیں آئی۔“

”خفیہ محبت کی نشانیوں کو استعمال میں نہیں لایا جاتا صفیہ بی بی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ محبت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔“

میرے اس تبصرے پر صفیہ نے سوالیہ نظر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم نے کبھی اس انگلی کو نازی کے پاس دیکھا تھا.....؟“

”آں.....!“ وہ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں.....!“

”کس کام سے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

”وہ جی..... میں سرہانے کا غلاف کاڑھ رہی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کوئی نیا ڈیزائن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، سو چاکہ نازی سے مشورہ کر لوں۔ میں نے اسی قصد سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔“

”تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نازی کو سلائی کڑھائی کا بڑا تجربہ تھا؟“

”جی ہاں، وہ امور خانہ داری کی بہت ماہر ہے۔“ لفظ ”کڑھائی“ سے میرا ذہن فوراً اس ریشمی رومال کی جانب چلا گیا تھا جو گمشدہ نازی کے سوٹ کیس میں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے وقت چاندی کی انگلی اور ریشمی رومال اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

”عارفہ!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو لوگ کسی بھی ہنر کے ماہر ہوتے ہیں ان کے کام کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے جو سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے کاموں میں بالکل الگ پہچانا جاسکتا ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ٹٹولنے والی نظر سے عارفہ کو دیکھا پھر سوال کیا۔

”کیا نازی کی کڑھائی کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہے؟“

”جی ہاں..... بالکل ہے!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”ہمارے محلے میں نازی سے زیادہ صاف کڑھائی اور کوئی لڑکی کر ہی نہیں سکتی۔“

”گویا تم نازی کے ہاتھ کے کام کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان سکتی ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے فی الحال سوالات کے زاویے کو تھوڑا سا تبدیل کر دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیجیج بتاؤ عارفہ! نازی کا کس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟“

”وہ جی..... وہ بے حد گھبراہٹ میں تھا۔“ میں نے اس کا مطلب ہے، شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ میں نے خاصے خطرناک انداز میں کہا۔

”باقی کی پوچھ گچھ کے لیے تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر جانا پڑے گا۔“

عارفہ کبھی ہوئی نظر سے اپنی ماں کو ٹکنے لگی۔ صفیہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں صفیہ! ایسی ہی بات ہے۔ دو ثبوت میرے لگے ہیں۔ بس، عارفہ سے ان کی تصدیق کرنا ہے۔ مجھے ہے، عارفہ اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔ یہ اس گہری اور رازدار سیکلی ہے..... اس کی محبت سے بھی بہت واقف ہوگی۔ عارفہ کے تعاون سے میرا کام آسان ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں پہلی فرصت میں نازی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”کون سے دو ثبوت؟“ صفیہ اور عارفہ نے یہ زبان پوچھا۔

میں نے سرسختی ان کے اس سنسنی خیز سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور براہ راست عارفہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ بات درست ہے کہ کل شام میں، مغرب کی اذان سے چند لمحے پہلے گمشدہ نازی تم سے ملنے یہاں آئی تھی؟“

”جی ہاں، وہ آئی تھی!“ عارفہ کے بجائے صفیہ نے تصدیقی انداز میں جواب دیا۔

”صفیہ بی بی!“ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”جب تک میں تم سے کوئی سوال نہ کروں، تم بالکل خاموش بیٹھی رہو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہوتا.....؟“

”جی چنگی طراں سمجھ گئی۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اب میں چپ رہوں گی تھانے دار صاحب.....!“

”شاباش!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم ایک تجربہ کار اور بردبار عورت ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی عقل مندی کے مظاہرے کی توقع تھی۔“

صفیہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں عارفہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”تمہاری والدہ نے اس بات کی تصدیق تو کر دی کہ گزشتہ شام نازی تم سے ملنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ کیا وہ خود ہی تمہارے گھر آئی تھی یا تم نے خاص طور پر اسے بلایا تھا؟“

اس سوال کا جواب مجھے پہلے سے معلوم تھا لیکن اب بھی میں عارفہ کی زبان سے اس کی تصدیق یا تردید چاہتا تھا کیونکہ آگے آنے والے بیش تر سوالات کا دارومدار اسی تصدیق یا تردید پر تھا۔

عارفہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”جی ہاں..... وہ میرے بلانے پر ہی یہاں آئی تھی۔“

”کیا تم نے اسے کسی خاص کام سے بلایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“

عارفہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں جس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میرے اندازے کے مطابق، وہ نازی کی گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ دال میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔

صفیہ نے بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تھانے دار جی! آپ تو اس طرح بات کر رہے ہیں جیسے نازی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی بہت ہی مضبوط ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ہو.....؟“

اپنی اس بات سے صفیہ نامی وہ عورت مجھے خاصی سمجھ دار اور عقل مند محسوس ہوئی۔ کوئی عام عورت اتنا درست اندازہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش نے مجھے بتایا ہے کہ نازی اپنی مرضی اور رضامندی سے غائب ہوئی ہے اور اس کے گمشدگی والے اس عمل میں جس لڑکے نے اس کا ساتھ دیا ہے اس کا نام یا تو الف سے شروع ہوتا ہے یا پھر عین سے.....!“

ریشمی رومال اور چاندی کی انگلی کی دستیابی کے بعد نازی کی گمشدگی کے حوالے سے میرا ایک مخصوص ذہن بن گیا تھا اور اسی ذہنیت کے تحت میں نازی کی تلاش کے کام کو آگے بڑھا رہا تھا۔

”لیکن تھانے دار جی.....“ صفیہ نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ”الف اور عین سے شروع ہونے والے نام تو درجنوں بلکہ سیکڑوں ہوں گے۔ آپ کس طرح پتا چلائیں گے کہ نازی کی گمشدگی میں کون بندہ ملوث ہے؟“

”اس سلسلے میں، تمہاری بیٹی عارفہ میری مدد کرے گی۔“ میں نے گھمبیر انداز میں کہا پھر عارفہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میری مدد کرو گی نا.....؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس رنگ نے مجھے بتا دیا کہ میرے اس سوال نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نکل کر کلفت زدہ لہجے میں بولی۔

”مم..... میں کیا..... مدد کر سکتی ہوں جی..... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں..... وہ کہاں گئی ہے.....!“

”یہ پتا میں خود چلا لوں گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف مجھے یہ بتاؤ گی کہ الف یا عین نام والے کس بندے سے اس کا عشق وغیرہ چل رہا تھا.....؟“



### جدید محاورے

☆ اندھا کیا چاہے..... دولینس  
☆ ہر کامیاب شاگرد کے پیچھے نفل کا ہاتھ ہوتا ہے  
☆ کامیابی کا راز..... کسی بھی لڑکی کے مشورے پر عمل نہ کرنا۔  
☆ آبجی کے بل..... مجھے مار.....  
☆ ایک انار..... سوکڑے۔  
☆ کھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ڈبہ بیڑھا کر لیں۔  
☆ سولن کی..... ایک ہیرو کی۔  
مرسلہ: محمد جاوید راؤ، گلاب علی، بہاولنگر

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ اس کے الفاظ اور انداز سے اعتماد جھٹکتا تھا۔ میں نے یہ دستور سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔  
”کیا اس نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا کہ گزشتہ روز بھولا اس سے ملنے کے لیے ایمین آباد آنے والا ہے؟“  
”نہیں جی، اس نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔“  
”تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ بھولا کبھی یہاں آیا ہو؟“  
اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”جناب! جہاں تک میں جانتی ہوں یا نازی نے مجھے جتنا بتایا ہے اس کے مطابق تو بھولا، نازی سے ملنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ یہ جب اپنی پھوپھو کے پاس کاموکی جایا کرتی تھی تو وہاں ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔“  
میں نے گھما پھرا کر اسی حوالے سے مزید دو چار سوالات کیے لیکن کوئی نیا یا زیادہ حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نازی کی حالیہ گمشدگی یا اپنی مرضی سے فرار کے بارے میں عارفہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ جس حد تک مجھے معلومات فراہم کر سکتی تھی، وہ اس نے کر دی تھی۔ میں اس سے جو کچھ بھی اگلو انے میں کامیاب ہو سکا، اس سے میری تفتیش کے لیے ایک واضح راہ متعین ہو گئی تھی۔ میں نے ان الفاظ کے ساتھ عارفہ کو فارغ کر دیا۔  
”دیکھو عارفہ! تم ایک اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ تم نے مجھے جو کچھ بھی بتایا ہے اس پر میں نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بعد میں، ان میں سے کوئی

”بھولا!“ صفیہ نے الجھن زدہ نظر سے عارفہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے۔ میں تو کسی مسلم یا بھولا کو نہیں جانتی؟“  
عارفہ کے انکشاف کے بعد (A) والا معاملہ تو بالکل صاف ہو گیا تھا۔ (N) سے نازی اور (A) سے مسلم۔ لیکن ابھی بھی مجھے اس سے بہت ساری باتیں پوچھنا تھیں۔ اپنی ماں کے سوال کے جواب میں عارفہ نے بتایا۔  
”بھولا کو میں نے بھی نہیں دیکھا۔ بس، نازی کی زبان ہی سے اس کا نام سنا ہے۔“  
میں نے عارفہ سے ایک اہم سوال کیا۔ ”اس مسلم عرف بھولا کو نہ تو تم نے دیکھا ہے اور نہ ہی تمہاری ماں اسے جانتی ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بندہ ایمین آباد کا رہنے والا نہیں۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟“  
”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”بھولا ادھر کاموکی میں رہتا ہے۔“  
”کاموکی“ کے نام پر میں چونک اٹھا۔ میری معلومات کے مطابق، نازی کی پھوپھی زینت کاموکی میں رہتی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں عارفہ سے پوچھا۔  
”کاموکی میں کس جگہ.....؟“  
”جگہ کا تو مجھے پتا نہیں جناب.....“ وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ ”نازی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ بھولا اس کی کاموکی والی پھوپھی کے پڑوس میں رہتا ہے۔“  
”تم کتنی گھنی ہو عارفہ.....!“ صفیہ نے تیز نظر سے اپنی بیٹی کو گھورا۔ ”تم دونوں سہیلیاں اتنا خطرناک کھیل، کھیل رہی تھیں اور مجھے کوئی خبر بھی نہیں.....؟“  
”میں اس کے ساتھ شامل نہیں تھی اماں۔“ عارفہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ سارا چکر نازی کا تھا۔ بس، میں اس کے معاملے سے واقف ہو گئی تھی۔“  
”اس سے زیادہ گھنی تو وہ نازی تھی۔“ میں نے صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ماں باپ کو تو اس کے کرتوتوں کا کچھ پتا نہیں۔“  
صفیہ نے تھانے دار بننے کی کوشش کرتے ہوئے عارفہ سے سوال کیا۔ ”نازی اور بھولا کا چکر کب سے چل رہا تھا؟“  
”مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں۔“ وہ جواباً بولی۔ ”نازی نے دو تین ماہ پہلے ہی مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔“  
”کیا کل شام میں بھولا یہاں ایمین آباد..... آیا تھا؟“  
میں نے عارفہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔  
”مجھے نہیں پتا جی.....!“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

لحاتی توقف کے بعد بڑے سنگین الفاظ میں اضافہ کیا۔  
”عارفہ! میں تمہیں سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر سمجھ لو۔ میں سختی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“  
”جی..... میں نے پہچان لیا ہے۔“ وہ اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ کڑھائی نازی ہی کے ہاتھ کی ہے۔“  
”نازی نے یہ رومال کس کے لیے کاڑھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔  
وہ ہچکچا کر دائیں بائیں ہونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کوئی گڑبڑ نہیں عارفہ..... میں جانتا ہوں کہ تم نے اس کڑھائی ہی کو نہیں بلکہ رومال کو بھی پہچان لیا ہے..... تم اس رومال کو نازی کے پاس پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“  
”جی.....!“ وہ اقراری لہجے میں بولی۔ ”نازی نے یہ رومال مجھے دکھایا تھا۔“  
”اور وہ چاندی کی زنا ناگٹھی؟“  
”وہ بھی.....!“  
”اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ چاندی کی ناگٹھی کس نے نازی کو دی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اور نازی نے یہ ریشمی رومال کس کو دینے کے لیے کاڑھا تھا؟“  
صفیہ بڑی دیر سے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ریشمی رومال اور چاندی کی ناگٹھی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے دو دل اور انگریزی حروف (N) اور (A) کی بھی وضاحت کر دی۔ اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی اور میرے خاموش ہونے پر عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے حکمانہ انداز میں بولی۔  
”عارفہ! تمہیں جو کچھ پتا ہے، صاف صاف تھانے دار جی کو بتا دو ورنہ یہ تو تمہیں بعد میں تھانے لے کر جائیں گے، میں ابھی سے تمہیں کوٹنا شروع کر دوں گی۔ اس بد بخت نازی نے تمہیں کن چکروں میں ڈال رکھا ہے۔“  
حقیقت حال سے واقفیت کے بعد صفیہ بڑے جلال میں آگئی تھی اور اس کے اس رویے سے میرا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔ جب دونوں جانب سے چڑھائی دیکھی تو عارفہ کی ہمت جواب دے گئی اور اسے اقرار کرتے ہی بنی۔  
”اس لڑکے کا نام مسلم ہے.....“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن سب اسے ”بھولا“ کہتے ہیں۔“

”عارفہ!“ میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔  
”بالکل واضح جواب دو۔ ہاں یا نہ.....؟“  
”جی..... مجھے یاد آ رہا ہے کہ..... نازی نے ایک بار مجھے یہ ناگٹھی دکھائی تو تھی۔“ وہ پرسوج انداز میں بولی۔ ”لیکن اب یہ یاد نہیں کہ اس ناگٹھی کے حوالے سے اس نے مجھے بتایا کیا تھا۔“  
عارفہ کا لہجہ اور انداز اس بات کی چغلی کھارہا تھا کہ وہ دیدہ و دانستہ اپنی سہیلی کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب میں اسے آسانی سے فرار کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔  
”یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بھی ہے میرے پاس.....“ میں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر تہ شدہ ریشمی رومال نکال لیا اور اسے عارفہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے کھول کر دیکھو۔“  
”یہ کیا ہے جی؟“ اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں وہ تہ شدہ رومال میرے ہاتھ سے لے لیا۔  
”کھول کر دیکھو گی تو پندرہواں طبق روشن ہو جائے گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس میں دو دراز گئی ہوئی یادداشت کو واپس لانے کا فارمولا بند ہے۔“  
صفیہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اپنی بیٹی عارفہ کو دیکھ رہی تھی تاہم میری ہدایت کا خیال رکھتے ہوئے اس نے ہمارے بیچ کسی قسم کی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ عارفہ نے جیسے ہی ریشمی رومال کھول کر دیکھا، اسے ایک جھٹکا سا لگا، مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ اس سے پہلے بھی مذکورہ رومال کو دیکھ چکی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر شناسائی کے بڑے واضح آثار ابھرتے دیکھے تھے۔  
”یادداشت واپس آگئی یا تھانے چلیں عارفہ.....؟“  
میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔  
”اس رومال میں ہے کیا جی، ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔“ صفیہ کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔  
وہ ایک ایسے زاویے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ عارفہ کے ہاتھ میں موجود رومال کو پوری تفصیل کے ساتھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تھانے کے ذکر پر اس کی پریشانی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔ میں نے اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے عارفہ سے کہا۔ ”تم تو نازی کے ہاتھ کی کڑھائی کو دیکھتے ہی پہچان لینے کی دعوے دار ہو۔ اس رومال پر جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟“ میں نے



بات غلط ثابت نہیں ہوگی..... میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

”میں تم سے یہ امید رکھ سکتا ہوں تاکہ تم نے مجھے سب کچھ سولہ آنے بچ بتایا ہے؟“

”جی ہاں..... میں نے آپ سے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو یقین نہیں آ رہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو بھی تیار ہوں۔“

”قسم کھانے کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری بات کا ایسے ہی بڑا اعتبار ہے۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی قسم کھا لینے سے چیزوں کی حقیقت تھوڑی تبدیل ہو جاتی ہے۔ سچ ہر حال میں سچ اور جھوٹ ہر حالت میں جھوٹ ہی رہتا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!“ صفیہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے تائیدی انداز میں بولی۔ ”مجھے زندگی میں بارہا اس حقیقت کا تجربہ ہوا ہے۔“

میں نے اس تعاون پر ان ماں بیٹی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر دوبارہ گمشدہ نازلی کے گھر آ گیا۔

دو پہر کے بعد کاشیمل نوازش واپس آ گیا۔ وہ لنگڑے جٹا کے بارے میں ایک سسنی خیر تحقیق کر کے لوٹا تھا۔ اس نے پورے ایمن آباد میں گھوم پھر کر اور مختلف لوگوں سے پوچھ پچھ کر کے یہ معلوم کر لیا تھا کہ گزشتہ شام وہ کانا گھڑ سوار جمال دین عرف جما مجھ سے ملاقات کے بعد کس طرف گیا تھا۔ نوازش کے انکشاف نے اس کیس کی ایک واضح شکل نکال دی تھی۔ اس کے مطابق، وہ کانا جما اپنے گھوڑے پر سوار کاموکی کی جانب گیا تھا۔

میں نے صفیہ کے گھر سے اٹھ کر سخاوت علی اور بشری سے دوبارہ ملاقات کی تھی اور انہیں نازلی کے مصدقہ کارنامے سے بھی آگاہ کیا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ نازلی کا کوئی ایسا ویسا چکر بھی ہو سکتا ہے لیکن چاندی کی انگوٹھی، ریشمی رومال اور سب سے بڑھ کر عارفہ کی گواہی کے آگے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکے اور یہ کہہ کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی کہ..... خدا گواہ ہے، ہمیں نازلی کے اس معاملے کی کوئی خبر نہیں.....!

میں نے ان سے کاموکی والے اسلم عرف بھولا کے

بارے میں بھی استفسار کیا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ سخاوت علی چھوٹی بہن زینت کے پڑوس میں اللہ دتا اور رحمت بی بی گھر ہے۔ اللہ دتا کے لڑکے کا نام بھولا ہی تھا۔ گویا عارفہ کے انکشاف کی تصدیق ہو گئی لیکن اس سلسلے کی ایک کڑی ابھی تک میرے ذہن میں چبھن پیدا کر رہی تھی۔ سخاوت اور بشری نے اسلم عرف بھولا کا جو حلیہ اور وضع قطع بیان کی تھی وہ جٹا سے قطعی مختلف تھی..... اس کا واضح طور پر ایک مطلب تھا کہ کانا جما اور بھولا دو بالکل مختلف اور الگ کردار تھے اور عین ممکن تھا..... یہ دونوں آپس میں دوست ہوں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان میں شدید نوعیت کی دشمنی ہو۔

میں نے سخاوت علی کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کی کاموکی والی بہن کے گھر کا مکمل پتا اچھی طرح سمجھ لیا تھا کیونکہ نازلی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسلم عرف بھولا کو زیر تفتیش لانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

ہم دونوں اس وقت بیٹھے اسی معاملے پر غور و فکر کر رہے تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں فی الفور کاموکی کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے کہا۔

”نوازش! اس برسی بارش میں، گھوڑوں پر سوار ہو کر کاموکی کا رخ کرنا تو عقل مندی نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی دوسرا ہی ذریعہ اختیار کرنا ہوگا۔“

”دوسرا ذریعہ تانگا ہو سکتا ہے ملک صاحب۔“ وہ تجویز دینے والے انداز میں بولا۔ ”آپ کہیں تو میں سخاوت علی کو لے کر آ جاتا ہوں۔“

سخاوت علی کے نام پر میں چونک اٹھا اور مجھے یاد آیا کہ وہ کو جوانی کرتا تھا۔ اس افراتفری میں میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ سخاوت کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ کاموکی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سخاوت علی کے تانگے سے زیادہ مناسب اور کوئی سواری نہیں ہو سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے.....“ میں نے نوازش سے کہا۔ ”تم فوراً سخاوت علی کو اس کے تانگے سمیت پکڑ لاؤ۔ ہم ابھی کاموکی روانہ ہو رہے ہیں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ آج بارش کا زور کل کی نسبت تو کم تھا لیکن وہ دھندلے وقفے سے اپنا فریضہ پورا کرنے سے نہیں چھوٹی تھی۔ کبھی بوند باندی کی شکل میں، کبھی بوجھار کی صورت، کبھی چند چھینٹوں کے روپ میں تو کبھی موسلا دھار..... وہ اپنا جلو دکھا ہی رہی تھی۔ ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ جب ہم کاموکی کی جانب روانہ ہونے لگے تو یہ بوند باندی کے ڈھب پر چل رہی تھی۔

پھاڑ اوجھل

تھوڑی ہی دیر میں کاشیمل نوازش، سخاوت علی کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ بیٹی کی کشدگی کے غم میں نڈھال ہو رہا تھا اور جلد از جلد اس کی بازیابی کا خواہاں تھا۔ لہذا میری بات فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر پانچ منٹ بعد ہی ہم تینوں تانگے میں بیٹھ کر کاموکی کی جانب روانہ ہو گئے۔ سخاوت کو چوان اور کاشیمل نوازش اگلی سیٹ پر تھے اور میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد، ہم بہ خیر وعافیت کاموکی پہنچ گئے۔

ہم سیدھے سخاوت کی بہن زینت کے گھر گئے اور انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر سب کو سخت افسوس ہوا کہ نازلی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ میں نے خاص طور پر زینت کی دو بڑی بیٹیوں سے پوچھ گچھ کی۔ موضوع تفتیش نازلی اور بھولا کا باہمی ”معاملہ“ ہی تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی اس چکر سے واقف نہ ہو، اگر واقعی یہ کوئی چکر تھا تو.....!

تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں اٹھا اور بھولا کے گھر کا دروازہ کھٹکھا ڈالا۔ زینت اور اللہ دتا کے گھروں کے دروازے پہلو بہ پہلو تھے۔ اس وقت میرے ساتھ نوازش بھی تھا۔ ہم دونوں پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ سخاوت علی کو ہم نے گھر کے اندر ہی چھوڑ دیا تھا۔

دروازہ اسلم عرف بھولا کی ماں رحمت بی بی نے کھولا۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ بھولا ان میاں بیوی کی اکلوتی اولاد تھا۔ دو پولیس والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر رحمت بی بی گھبرا گئی۔

گھر کے اندر پہنچ کر جب میں نے اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو اس کی گھبراہٹ وحشت میں بدل گئی۔ وہ بڑی تیزی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”بھولا تو بہت ہی بی با بچہ ہے جی..... وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے.....“

”وہ کتنا بھولا اور بی با ہے، اس بات کا پتا تو اس وقت چلے گا جب وہ میرے ہاتھ آئے گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟“

”وہ تو جی..... کل صبح سے لاہور گیا ہوا ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔ ”دو تین دن کے بعد واپس آئے گا۔“

بھولا کا کاموکی میں موجود نہ ہونا بھی اسی امر پر دلالت کرتا تھا کہ نازلی کی کشدگی میں سراسر اسی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

میں نے کڑے لہجے میں رحمت بی بی سے پوچھا۔

”وہ لاہور کیا کرنے گیا ہے؟“

”اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے جی۔“

”لاہور میں اس کا دوست کس جگہ رہتا ہے؟“

”مجھے نہیں پتا جی..... وہ اپنے باپ کو بتا کر گیا ہے۔“

”اللہ دتا اس وقت کہاں ملے گا؟“ میں نے بھولا کے باپ کے بارے میں پوچھا۔

”وہ منڈی میں ہے جی۔“ رحمت بی بی نے بتایا۔

”شام کو ہی واپس آئے گا۔“

اللہ دتا کاموکی کی غلہ منڈی میں کام کرتا تھا۔ میں نے

رحمت بی بی کے ساتھ مزید وقت صرف کرنا مناسب نہ جانا اور نوازش علی کو لے کر غلہ منڈی پہنچ گیا۔ اس جانب کا رخ کرتے وقت میں نے سخاوت علی کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ اپنی بہن کے گھر میں رک کر میرا انتظار کرے گا۔

غلہ منڈی کاموکی پہنچ کر میں نے اس آڑھتی کی دکان تلاش کی جہاں اللہ دتا کام کرتا تھا۔ مذکورہ آڑھتی کا نام شوکت حسین تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں شوکت حسین آڑھتی کی دکان پر اللہ دتا کے روبرو تھا۔

میری بات سن کر اللہ دتا پریشان ہو گیا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا جناب.....!“

”تمہاری یقینی اور بے یقینی کا فیصلہ انشا اللہ! آج ہی کی تاریخ میں ہو جائے گا اللہ دتا!“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم ابھی اور اسی وقت بھولا کی تلاش میں لاہور روانہ ہو رہے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے..... تم ہی ہمیں بھولا کے دوست کے گھر تک پہنچاؤ گے..... میری بات سمجھ رہے ہونا.....؟“

”جی، سمجھ رہا ہوں۔“ وہ بے چارگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اس موقع پر آڑھتی شوکت حسین نے قانون کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔ جب میں اللہ دتا کو صورت حال کی یقینی سے آگاہ کر رہا تھا تو شوکت حسین بھی ہمارے پاس ہی موجود تھا۔ پوری بات سننے اور اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

”ملک صاحب! اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنی کار میں لاہور پہنچا سکتا ہوں۔ لاری یا بس میں لاہور پہنچنے میں آپ کو کافی وقت لگ جائے گا پھر بس اسٹینڈ سے بھولا تک رسائی حاصل کرنے میں بھی اچھا خاصا وقت لگے گا



## خوئے نہاں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

شک زہر بن کر رگوں میں اترے یا ناگ بن کر دستار ہے، ہر صورت میں دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے... یہاں تو کتنی ہی معصوم زندگیاں دائو پر لگی ہوئی تھیں۔ محبت جب نفرت میں ڈھل جائے تو صرف دل مردہ ہوتے ہیں مگر جب... نفرت کی چنگاری شبہات کے الاٹھ میں بھڑک اٹھے تو کتنی گھر جل کر راکھ کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔

وڈیرا شاہی نظام کا ایک لرزہ خیز منظر



”نہ بابانہ..... میں تو تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے تم جیسے وڈیرے زادوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“  
رافعہ نے مصنوعی پن سے اور قدرے تاؤ دلانے والے انداز میں اپنے سامنے بے قرار سے بیٹھے آغل خان سے کہا تو جواباً اس کے سرخ و سفید اور بھرے بھرے پروقار چہرے پر خفگی طاری ہو گئی۔ وہ جھنجھلا سا گیا تھا بلکہ اس کی بات پر..... اسے تاؤ آ گیا تھا۔ وہ تھا بھی کچھ ایسی ہی طبیعت کا..... آتش مزاج..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دم بھڑک

ساتھ گھر لے جاؤ گے لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ بھولا جیل کے اندر سزا کاٹے گا اور نازی گھر کے اندر بیٹھ کر.....!“  
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب.....!“  
گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”نازی کو آپ کیوں مزادیں گے؟“  
”نازی کو میں نہیں بلکہ یہ معاشرہ سزا دے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جوڑ کی ایک مرتبہ گھر سے بے برگ جاتی ہے پھر معاشرہ اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ میں سے اس کا کوئی معقول رشتہ نہیں آتا۔ کیا میں غلط نہ رہا ہوں؟“

”نہیں جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ سخاوت نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اللہ دتا بھی تائیدی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ لوگ میرے مشورے پر عمل کے لیے تیار ہو جاؤ تو اس پیچیدہ مسئلے کو ادھر تھانے ہی میں حل کیا جاسکتا ہے۔“

”جی، آپ حکم کریں.....!“ وہ بہ یک زبان بولے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی محبت کی تکمیل کے لیے بہت ہی غلط قدم اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اگر ہم سب مل کر ان کی غلطی کو معاف کر دیں تو ان کی زندگی بڑی عزت سے گزر سکتی ہے۔“

”آپ کا اشارہ ان کی شادی کی طرف ہے.....؟“ اللہ دتا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بالکل..... میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر سخاوت علی کی طرف دیکھتے ہوئے بوجھا۔ ”تمہیں نازی اور بھولا کی شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں سخاوت علی.....؟“

حالات نے ان تمام کرداروں کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ کسی کی زبان میری تجویز سے انکار کی محتمل نہیں ہو سکتی تھی لہذا ایک ماہ کے اندر ہی دونوں خاندانوں نے میرے مشورے پر عمل کر ڈالا۔

اس موقع پر بھولا اور نازی کی خوشی دیدنی تھی۔

دل و جان سے میرے احسان مند تھے کہ میں نے دو محبت کرنے والوں کو قانوناً اور شرعاً ایک دوسرے سے باندھ دیا تھا۔

چند روز کے بعد کاٹا بھٹا دوبارہ میرے پاس آیا اور اس نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ کبھی فرصت ملی تو یہ کہانی بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

(تحریر: حسام بٹ)

جبکہ.....“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جبکہ میری کار میں آپ لوگ آدھے وقت میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“

میں نے چشم زدن میں آدھی شوکت حسین کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ہم لوگ کاموکی سے لاہور کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

لاہور کا دورہ بڑا کامیاب ثابت ہوا تھا۔

میں اس وقت اپنے تھانے میں بیٹھا تھا نے داری کر رہا تھا۔ نازی اور بھولا میرے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے باپ بھی ایک طرف بیچ پر بیٹھے خفگی آمیز نظروں سے انہیں گاہے بگاہے دیکھ رہے تھے اور باہر بارش اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا اور اس گھب تاریکی میں برستی بارش کی آواز بڑا عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

لاہور میں بھولا کے دوست کا گھر تلاش کرنے میں مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ منظور احمد نامی وہ شخص کرشن نگر کے علاقے میں رہتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جب ہم نے منظور احمد کے گھر پر چھاپا مارا تو نازی اور بھولا گھر کے اندر موجود تھے۔ اس تمام تر کارروائی میں آدھی شوکت حسین نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ واپسی میں مجھے تھانے پہنچانے کے بعد ہی اپنے گھر گیا تھا۔

جب ہم لوگ نازی اور بھولا کو لے کر لاہور سے واپس آ رہے تھے تو ہم نے کاموکی سے سخاوت علی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

جب کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے تو پھر اس سے آگے کا کیس بہت سیدھا اور آسان ہو جاتا ہے۔ نازی اور بھولا کی ندامت کے بوجھ سے جھگی ہوئی گردنیں اقبال جرم کی عمدہ مثال تھیں لیکن میں نے اس اظہار شرمندگی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی زبان سے بھی تسلیم کرایا کہ یہ مجرمانہ حماقت ان سے سرزد ہوئی تھی۔

میں نے اللہ دتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھولا نے نازی کو گھر سے بھگا کر جو جرم کیا ہے اس کے لیے میں اسے سیدھا جیل بھجوا سکتا ہوں۔“

وہ سرا سیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے روئے سخن سخاوت علی کی طرف موڑا اور یہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”بھولا جیل چلا جائے گا اور نازی کو تم اپنے







”اور..... میں جب تک چولہا جھونکتے بڑھی ہو جاؤں گی۔“ رافیہ نے درمیان سے اس کا جملہ اچک لیا تو وہ اس کی جانب مایوسی سے تنکے لگا۔ تذلیل کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ اور یہی وہ چاہتی تھی۔

”رافیہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں اس ساری تذلیل کے باوجود..... کہ یہ ایک اعلیٰ و ارفع محبت کی معراج ہے اور پیمانہ بھی خدا حافظ۔“

توفیق کو دیکھ کر رافیہ کو اپنی غربت اور بے مائیگی کا زیادہ ہی احساس ہوتا تھا۔ توفیق حسب توفیق اسے رجھانے اور میدان حسن مارنے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتا رہتا تھا۔ اس کے ارادے مضبوط تھے مگر کم از کم رافیہ کو ریت کی دیوار ہی محسوس ہوتے تھے رافیہ کے خیال کے مطابق وہ چھ سات ہزار کی نوکری سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بی ایس سی کیا تھا۔ محلے میں ہی اس کا کرائے کا گھر تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا، باپ کلرک تھا جو رٹائر ہونے والا تھا۔ رافیہ اور بوا کی گزر بسر بھی بس شتم پشتم تھی۔ رافیہ کے ابو نے اپنا بیہ کر دیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد بیہ کمپنی والوں نے ایک خاطر خواہ رقم دی تھی جس سے فکس ڈپازٹ سرٹیفیکیٹس خرید لیے گئے تھے اور مایانہ آنے والے انٹرسٹ سے ان کی بس ٹھیک ہی گزر بسر ہوتی تھی۔

بہر طور اس دن کے بعد سے توفیق نے اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کی کوشش یا ہمت نہیں کی تھی۔ رافیہ نے گویا اپنے تئیں اسے اچھا سبق سکھایا تھا یوں رافیہ نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا تاہم اس کا خیال تھا کہ توفیق کی ٹھیک ٹھاک نکور کرنے کے بعد شاید وہ پہلے کی طرح ان کے کام نہیں آئے گا مگر بعد میں رافیہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی جب اس نے اسے اسی طرح اپنے گھر کا سودا سلف لاتے اور باہر کے چھوٹے موٹے کام کرتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

ایم اے فاضل کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی رافیہ نے جیسے دھماکا کر دیا، اس کا اکل فیصلہ بوا اور توفیق کے لیے دھماکا ہی ثابت ہوا تھا۔ یعنی آغل خان سے شادی کا حتیٰ فیصلہ..... بوا پریشان بلکہ ہراساں ہو گئی تھیں۔ جبکہ توفیق کا چہرہ اتر گیا تھا۔

بے جاری بوا نے رافیہ کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سمجھایا بھی تھا۔ ”بیٹی! پہلے تو توفیق سے شادی نہ کر کسی اور سے ہی کر لے لیکن مجھے جانے کیوں اس رئیس زادے سے تیرا بیاہ بہتر محسوس نہیں

ہو رہا ہے یہ اور ہی دماغ اور سوچ کے لوگ ہوتے ہیں۔ رافیہ بوا کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی ”ارے بوا! خان ایسا نہیں ہے وہ ایک پڑھ لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا ہے مگر بوا کی تسلی نہ ہوئی تاہم انہوں نے بھی چپ سادہ رافیہ کی شادی آغل خان سے ہو گئی۔

شادی سے پہلے رافیہ نے اس سے یہ بات منوال کہ وہ اس کے آبائی گوٹھ کی حویلی کے بجائے شہر میں کی شاندار کوشی بنگھر ہاؤس میں رہے گی اس لیے آغل خان اسے اپنی دلہن بنا کر وعدے کے مطابق بنگھر ہاؤس میں لے گیا۔ گوٹھ سے اس کے ماں باپ کے علاوہ دیگر رشتے دار شریک ہوئے تھے۔

غرض آغل خان سے شادی کر کے رافیہ بہت تھی۔ گویا اس نے اپنے خوش آئند خوابوں کی جیسی تعبیر وہی پائی تھی۔ شادی کے ابتدائی دن خوب سیر ہوئے۔ بنگھر ہاؤس جیسی عالی شان کوشی میں رافیہ خود تصور کرنے لگی تھی۔ ہر وقت نوکر چاکر ہاتھ باندھے کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے تھے۔ ایک روز آغل خان رافیہ کو بے صدا صرا گوٹھ کا بھی چکر لگانے کو کہا۔

”میں وہاں نہیں جاؤ گی، کیا تم نے اپنا بھلا دیا؟“ وہ منہ پھلا کے بولی تو آغل خان نے بڑے بھرے انداز میں رافیہ کو خود سے لگا کے کہا۔

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا کہ میں وعدہ توڑ کر تم سے ہو جاؤں۔“

”تو پھر گوٹھ جانے کا کیوں کہتے ہو؟“ رافیہ دلار سے کہا تو آغل خان نے ایک بڑی مست سی جھانک کرتے ہوئے کہا۔

”ارے بابا! میں کون سا ہمیشہ کے لیے تمہیں رہنے کا کہہ رہا ہوں، چند دنوں کے لیے بابا سائیں اور جانی کی خواہش ہے۔ پلیز فری جان! میری خاطر صرف دنوں کے لیے۔“

رافیہ نے دینیشن مسکراہٹ کے ساتھ اثبات سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گوٹھ جانے کے لیے یہ دونوں ایک نئے ڈبل کمین انٹرکولر میں روانہ ہوئے۔ اس گاڑی میں رافیہ کو یوں لگا تھا جیسے وہ کسی ٹھنڈے ٹھاراڑن پر سوار ہو ایسی شاہانہ زندگی کا ہی تو رافیہ نے خواب اور آج اس کی تعبیر پار ہی تھی۔

وہ دوڑھائی گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد آبائی حویلی پہنچ گئے۔ یہاں بھی رافیہ نے سب کو اپنے آگے پیچھے سمجھتے ہوئے بایا تھا۔ بے شمار نوکر چاکر تھے جو اسے چھوٹی وڈیرنی..... چھوٹی وڈیرنی کہتے نہیں سمجھتے تھے۔ آغل خان کا باپ موچا خان ایک ساٹھا پٹھا شخص تھا۔ رافیہ کو وہ بڑی دہدہ والی شخصیت دکھائی دیے تھے۔ خاصے سخت گیر اور رعوت مزاج بھی محسوس ہوئے، مگر رافیہ کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مشفقانہ رہا تھا۔ پھر بھی ان کی نرم خوئی میں ایک عجیب طرح کی سخت گیری محسوس ہوتی تھی جو شاید ان کے شاہانہ مزاج کا حصہ ہی تھی۔ رافیہ کو اپنی ساس بھی اچھی خاتون محسوس ہوئی تھیں۔ وہاں رہتے ہوئے آغل اور رافیہ کو ایک ہفتہ بیت گیا۔ اس دوران آغل خان نے اسے اپنی زمینیں بھی دکھائی تھیں۔ رافیہ تو پہلے دن ہی ایک ہی جگہ یعنی حویلی میں خود کو محصور پا کر بیزار ہونے لگی تھی اور آغل خان تھا کہ واپس شہر جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر ایک دن رافیہ نے اس کا شکوہ کر ہی ڈالا۔

”یہ کیا بھی، آغل! تم تو مجھے ایک آدھ روز کا کہہ کر یہاں لائے تھے۔ اب یہ دوسرا ہفتہ ہونے کو آ رہا ہے، مجھے تو یہاں پہلے ہی دن سے بڑی گھنٹی محسوس ہو رہی ہے۔“ اس کی بات پر وہ بڑی حلاوت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”ارے بھی تو کیا ہوا۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے بھی تم یہاں بوریٹ محسوس کر رہی ہو؟“

جواباً رافیہ نے منہ بنا لیا تو وہ جیسے اسے مناتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو فری! میں ماں باپ کا واحد سہارا ہوں اور ان کا بازو بھی۔ بس تھوڑا اور انتظار کر لو، فصل اترنے والی ہے اس کے بعد چلیں گے واپس شہر۔“

”وہ تو ٹھیک ہے آغل لیکن میں اس ماحول کی عادی نہیں ہوں۔“ رافیہ نے بیزاری سے کہا تو آغل خان نے پہلی بار بڑے عجیب سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”فری! تمہیں اب خود کو ایسے ماحول کا عادی بنالینا چاہیے۔ یہ سن کر رافیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس وقت وہ اسے بدلا بلا سا محسوس ہوا تاہم وہ خاموش رہی۔

رافیہ نے سوچا کہ چلو مزید کچھ دن یہاں رہنے میں کوئی قیامت نہیں۔ آخر اتنے بڑے گھر کی بہو ہوں۔ مجھے یہاں بھی کچھ روز گزارنے چاہئیں۔ تاہم ایک بات اسے سخت کھینچنے لگی تھی کہ اس کے سرسرنے آغل کو اب اپنے زمینی معاملات میں کچھ زیادہ ہی الجھا دیا تھا۔ اب آغل کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ صبح سویرے اپنے کمداروں کے ساتھ

## کھل کر مسکرائیں

استاد (شاگرد سے) ”جانوروں کے بال کیوں ہوتے ہیں۔“

شاگرد۔ ”جناب جنگل میں چامت کرنے کا کوئی انتظام جو نہیں ہوتا۔“

☆☆☆

پروفیسر صاحب کی بیوی نے مسکراتے ہوئے پروفیسر سے کہا۔ ”دیکھیے میں آپ کے لیے بازار سے ایک سوٹ لائی ہوں۔“

پروفیسر نے حیرت سے پوچھا۔ ”آج تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”خیال کیوں نہ آتا تین ساڑھیاں خریدنے پر مفت جو مل رہا تھا۔“

☆☆☆

ایک دوست دوسرے دوست کے گھر گیا تو میزبان نے پوچھا۔ ”بھئی تم تکلف مت کرنا، بولو چائے پیو گے یا ٹھنڈا؟“

مہمان۔ ”جب تک چائے بنے ٹھنڈا دے دو۔“

☆☆☆

ایک شخص کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سرال گیا۔ سرال والوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارت دیکھ کر اس نے ایک بورڈ اپنے سرال والوں کے باہر آویزاں کر دیا۔ ”سرال جنت کا نمونہ ہے۔“

اس گھر کے دوسرے داماد نے جس کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا جب یہ بورڈ پڑھا تو اس نے اس تحریر کے نیچے لکھ دیا۔

”چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔“

مراسلہ: سعید عباسی، نامعلوم مقام



زمینوں کی طرف نکل جاتا اور شام کو حویلی لوٹا، واپس آنے کے بعد بھی خاصی دیر تک وہ اپنے باپ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا اور پھر جب وہ رافعیہ کے پاس آتا تو اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ اس سے کوئی بات تک کرنے کا یا راندہ ہوتا۔ اس دن کے بعد سے رافعیہ میں آغل خان سے کوئی شکوہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

☆☆☆

رافعیہ کو اپنی بوا کا بھی خیال آتا تھا۔ وہ بے چاری رافعیہ کی شادی کے بعد تنہا ہو گئی تھیں۔ حالانکہ اس نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھی ساتھ ہی تنہا رہاؤں چل کر رہیں مگر انہوں نے ٹال دیا تھا۔

البتہ اب بھی وہ رافعیہ کا عاشق نامراد توفیق بوا کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ رافعیہ کو اب کچھ کچھ اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ واقعی توفیق ایک اچھا انسان تھا ورنہ رافعیہ سے ناامید ہونے کے بعد وہ بوا سے بھی ناتا توڑ سکتا تھا مگر ایسا اس نے کیا نہیں تھا۔ وہ رافعیہ کی شادی کے بعد بھی ان کی پوری دیکھ بھال کر رہا تھا۔

بہر طور رافعیہ خود کو حویلی میں قیدی کی طرح وقت گزارتے ہوئے محسوس کرنے لگی، آغل خان کے پاس تو اس کے لیے جیسے وقت ہی نہ رہا تھا۔ پھر اس دوران غلامو کی موجودگی نے رافعیہ کو کسی حد تک سہارا دیا تھا۔ وہ ایک گول مٹول سانو عمر لڑکا تھا۔ معصوم سا۔ اس کی معصومیت اور بھولپن سے ہی رافعیہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ بڑا پیارا لڑکا تھا۔ یہ مشکل چودہ پندرہ سال کا ہوگا۔ وہ حویلی کے ایک بہت ہی پرانے اور بااعتماد مرحوم ملازم کا بیٹا تھا۔ وہ حویلی میں کام کرتا تھا اور ادھر ہی رہتا تھا۔ وہ بڑی پیاری پیاری اور معصوم سی باتیں کرتا تھا۔ چھوٹی عمر کے باوجود وہ اچھے خاصے ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ وہ رافعیہ کو بڑے پیار سے چھوٹی وڈیرنی کہا کرتا تھا۔ مگر پھر بعد میں رافعیہ کے متح کرنے پر وہ اسے ادی جیجیل کہنے لگا۔ رافعیہ نے ایک دن یونہی اس سے پوچھا: ”غلامو! یہ ادی تو میری سمجھ میں آتا ہے جس کا مطلب بہن ہوتا ہے مگر یہ تم ادی کے ساتھ جیجیل لگاتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟“

اس کی بات پر غلامو نہایت معصومانہ انداز سے بولا۔ ”ادی جیجیل کا مطلب ہوتا ہے، پیاری، تم میری ادی جیجیل ہونا، یعنی پیاری بہن۔“

رافعیہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی، غلامو کی صورت میں اسے ایک محبت کرنے والا بھائی مل گیا تھا۔ جب رافعیہ حویلی

میں زیادہ پور ہونے لگتی تو اکثر غلامو کے ساتھ باہر سیر کرایا کرتی تھی۔ آغل خان کا یہ گوشت بہت پر فضا تھا۔ آج آغاز سرما تھا مگر رافعیہ نے ساتھ یہاں قیامت خیز پڑتی ہے۔ بہر طور، غلامو اکثر اسے گوشت کے جوڑے میں جہاں گندم اور مٹر کی فصلیں لہلہاتی تھیں، وہاں ایک ندی کی طرف لے جایا کرتا تھا اس نے رافعیہ کو اس ندی کے متعلق بتایا تھا کہ یہ گانج ندی ہے یہاں کی کھیتی باڑی کا ترانہ اس ندی پر تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب غلامو کے ساتھ سیر کو نکلتی تو آغل خان بھی اتفاق سے راستے میں کہیں مل جاتا تھا۔

ایک دن آغل خان نے اس سے بڑے عجیب لے میں کہا۔

”رافعیہ! یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ تمہیں یہاں سیر کرنا زیب نہیں دیتا اور وہ بھی ایک معمولی نوکر کے ساتھ۔“

”تو پھر کس کے ساتھ میں باہر جاؤں؟“ رافعیہ نے ترخ کر کہا۔ ”تمہارے پاس تو میرے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی غلامو کو میں نوکر نہیں سمجھتی بلکہ میں اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہوں۔“

اس جواب پر وہ استہزاء سے لہجے میں بولا۔

”ہونہہ..... بھائی!“

لفظ بھائی کو اس نے قدرے چبا کر ادا کیا تھا۔ اختیار نہ جانے کس خیال کے تحت رافعیہ کو اپنے اندر عجیب کی سنسنی کا احساس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت آغل خان کے چہرے پر عجیب سا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں غلط تھا۔ اس وقت جانے کیوں رافعیہ کی بات یاد آنے لگی، انہوں نے ایک دن رافعیہ سے کہا تھا۔ ”یہ اور ہی دماغ اور سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔“

”تو کیا آغل..... میرے اور غلامو کے تعلق کو شے نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔“ مگر یہ شبہ اور شک کا زہر تو ہر مرد اندر موجود ہوتا ہے۔ ”نہیں نہیں میرا آغل ایسا نہیں..... میری اس سے اچھی انڈراستینڈنگ ہے۔ وہ عام مردوں سے ہٹ کر کے مجھ سے محبت کرتا ہے۔“ رافعیہ خود سے تکرار میں الجھ جاتی۔

اور..... پھر اس روز واقعی رافعیہ کی زندگی میں خوفناک طوفان آ گیا۔

☆☆☆

غلامو سخت بیمار پڑ گیا تھا۔ اس بے چارے کا دنیا میں ادی کوئی نہ تھا جو

جوار داری کرتا، بیماری کی حالت میں بھی اس غریب معصوم کو نہیں بٹھایا تھا اسے آرام کروانے کے بجائے حویلی کا کام لیا جا رہا تھا۔ رافعیہ نے اس حویلی میں جہاں دوسری بہت سی باتیں لوٹ کی تھیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھی کہ نوکروں اور ملازموں کے ساتھ یہاں بڑا حقیر آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ بلکہ اکثر تو بیگار کا ٹاکرے تھے۔ وہ جھوٹا کھاتے اور اتارن پہتا کرتے تھے۔ لیکن حویلی ہی کے سین زدہ کونوں کھدروں میں پڑے رہتے تھے، غلامو..... کو بھی رافعیہ نے ایک ایسے ہی سین زدہ کمرے میں بخار میں بھٹکتے ہوئے پایا تھا۔ رافعیہ کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے دیکھا وہ بہت سہا ہوا تھا۔

”غلامو! تمہیں اتنا شدید بخار ہے تم نے کوئی دوا نہیں لی۔“ رافعیہ نے دکتے دل سے پوچھا۔

”ادی جیجیل! مجھے بھلا کون دوائی دے گا۔ میرا تو کوئی نہیں، ہم غریبوں کی زندگی تو بس ایسی ہی ہوتی ہے کام کر۔ تو مل کے تیل کی طرح، بیمار پڑ جائیں تو کوئی پرسان حال نہیں۔“

اس کے معصومانہ لہجے میں گہرے دکھ کی کاٹ تھی، رافعیہ کا دل بے اختیار پیچ گیا پھر اس سے بولی۔

”غلامو! تم خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو، کیا میں تمہاری بہن نہیں ہوں۔ تمہاری ادی جیجیل!“

وہ پھٹکے سے انداز میں مسکرایا تھا۔ رافعیہ نے فوراً ایک ملازم کے ساتھ غلامو کو حکیم جی کے مطب بھیجا اور کچھ پیسے بھی اسے دیے ایک دو روز بعد وہ بھلا چنگا ہو گیا۔ اس میں رافعیہ کی خصوصی دیکھ بھال کا ہی حصہ تھا۔ پھر مگر پتا نہیں کیوں آغل کو یہ بات بری طرح کھلنے لگی تھی۔ رافعیہ کو اس کی وجہ نہیں سمجھ آ رہی تھی کہ اسے بھلا اس معصوم بچے سے کیا پر خاش تھی۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ غلامو، رافعیہ سے کھینچا کھینچا سا رہنے لگا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے کے لیے جانا تو ایک طرف رہا اس نے رافعیہ سے ملنا حتیٰ کہ بات کرنا بھی اب ترک کر دیا تھا۔ رافعیہ کو اس کی اچانک بے اعتنائی پر حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہوا، آخر کار ایک روز رافعیہ نے غلامو کو اپنے کمرے میں بلا کر پوچھ ہی لیا۔

”غلامو! کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کچھ ناراض لگتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے رافعیہ نے غلامو کے چہرے کو بھانپتی ہوئی نگاہوں سے بھی دیکھا تو اسے وہاں معصومیت اور بے بسی کے تاثرات محسوس ہوئے تب اس نے دیکھا کہ غلامو کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُٹھ آئے اور وہ رندہ ہوئے لہجے

## تخت زرنگار

یہ فرعون تو تخت آمون کا تخت خاص ہے جو سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پشت پر ایک ماہر جوہری اور کامل نقاش کی کاریگری سے تخت آمون کو تخت نشین دکھایا گیا ہے۔ نوجوان بادشاہ کے سامنے اس کی ملکہ کھڑی ہے جس نے بائیں ہاتھ میں ایک منتقل مرتبان اٹھایا ہوا ہے اور دایاں ہاتھ نزاکت سے سر تاج کے کندھے پر رکھا ہوا ہے۔ سورج دیوتا کی شعاعیں ان پر روشنی ڈال رہی ہیں گویا ان دونوں پر نعمتوں کی بارش کر رہی ہیں۔ تخت کے چاروں طرف ہیرے و جواہر، نیلم، زمرد، پکھراج جڑے ہوئے ہیں اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم زندہ اس فرعون کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ابھی بگل بجے گا اور نقارے خون و قوت و زندگی کے الفاظ پکاریں گے۔ اس کے ساتھ ہی سر پر دہراتا تاج سجاتے جوئیں سالہ بادشاہ نمودار ہوگا۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی میں بولا۔

”ادی جیجیل! بات کسی کو بتانا مت۔ مجھے دراصل چھوٹے سائیں (آغل خان) نے ہی آپ کے ساتھ رہنے اور بات کرنے کو سختی سے منع کیا ہے۔ پرادی..... تم..... میں تو تمہیں واقعی آپڑیں بہن سمجھتا ہوں۔ کیا ہم غریبوں کی بہن نہیں ہو سکتی۔“ اس نے آخر میں اس قدر معصومیت سے کہا کہ رافعیہ نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے آغل خان دونوں کو جلتی سلتی نظروں سے گھور رہا تھا۔

نظر دھوکا دیتی ہے۔ جو منظر دکھاتی ہے، ضروری نہیں وہ سچ ہو، سچ سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔ رافعیہ نے غلامو کو بھائی کے مقدس رشتے سے گلے لگایا تھا۔ یہ سوچ سچ تھی اور آغل خان کی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ گلے ملتے دیکھ رہی تھیں۔ مگر سچ اور حقیقت کیا تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ رافعیہ اور غلامو کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔ مگر بے چارہ معصوم غلامو اسے دیکھ کر ایک دم پرے ہو گیا اور خوف زدہ نظروں سے آغل خان کی طرف دیکھنے لگا، خود رافعیہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے



شوہر کے تیر خراب نظر آرہے تھے۔ آغل کے بغل میں بولسٹر جھول رہا تھا۔ اندر بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ کمرے کی فضا یکھٹ ہی رہی ہو گئی تھی۔ پھر اس میں آغل خان کی سنسائی آواز ابھری۔

”مجھے پہلے ہی تم دونوں پر شک تھا۔ واہ..... رافعیہ بی بی تم نے اپنی یوریت دور کرنے کا خوب سامان کر رکھا تھا ایک حقیر ملازم کے ساتھ۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم آغل! ہوش کے ناخن لو۔“ رافعیہ یک دم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تمہیں شرم آنی چاہیے اپنی بیوی پر ایسا گندالزام لگاتے ہوئے، غلامو۔۔۔ بھائی جیسا ہے۔“

”خوب! وہ استہزاء یہ انداز میں بولا۔“ بھائی کی آڑ میں ہی ایسے گل کھلاتی ہیں تمہارے جیسی عورتیں۔ تم دونوں اب کاروکاری ہو، بدکار ہو۔ تم دونوں کو اب ایک ساتھ ہی مرنا ہوگا۔“

یہ کہتے ہی اس کا ایک ہاتھ اپنی بولسٹری طرف بڑھا اٹھائے راہ غلامو شاید اس کا خطرناک ارادہ بھانپ کر آگے لپکا جانے اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی تھی کہ گل اس کے آغل اپنا پستول ان پر سیدھا کرتا، غلامو بڑی زور سے اس کے ساتھ لگرایا۔ آغل خان کو شاید اپنے اس حقیر غلام سے اتنی جرأت کی توقع نہ تھی۔ نتیجتاً وہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑایا اور توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے سیدھا فرش پر آگرا اس وقت غلامو نے رافعیہ کا ہاتھ تھام لیا اور چلا کر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”ادی جیجیل! فوراً یہاں سے بھاگ چلو ورنہ خیر نہیں۔“

رافعیہ بھی اس وقت تک صورت حال کی شدت کو بھانپ ہی تھی۔ فوراً ہی غلامو کے ساتھ کمرے سے باہر دوڑ پڑی پھر وہ دونوں وہاں رکے نہیں، غلامو نے کمرے سے نکلنے وقت ایک عقل مندی کی تھی، اس کا دروازہ بند کر کے آغل خان کو کچھ وقت کے لیے وہاں محدود کر دیا تھا۔ حویلی کے ملازمین کی نظروں سے بچتے ہوئے وہ باہر نکلے اور اندھا دھند دوڑے۔ بالآخر شہر جانے والی سڑک پر آ کے ہی دم لیا۔ وہاں سے وہ حیدر آباد شہر جانے والی ایک مسافر لاری میں سوار ہو گئے پھر سیدھا بوا کے گھر آ کر ہی ان دونوں نے دم لیا۔

بوا ان کی ہیئت کد کی دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ رافعیہ نے انہیں ساری رام کھانا ڈالی تو وہ بھی بری طرح دہل گئیں اور ہراساں لہجے میں بولیں۔

”بیٹی! یہ تو بہت برا ہو گیا، بہت برا ہو گیا۔“

”نہیں بوا! جو ہوا صحیح ہوا۔“ رافعیہ اب خود کو قدر سے سنبھال چکی تھی۔ ”اچھا ہوا بوا کہ آغل خان کے چہرے سے معصومیت کا نقاب اتر گیا۔“ مگر بوا کی پریشانی پھر بھی کم نہیں ہوئی، ادھر غلامو بھی مسلسل اضطراب کا شکار تھا۔ وہ معصوم اب خوف میں جکڑا ہوا تھا۔ جبکہ رافعیہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ شہر آ کر زیادہ محفوظ ہو گئی تھی۔

”بیٹی! میں نے کہا تھا نا کہ رئیس زادے لوگ اور ہی دماغ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ کم بخت آغل خان تمہارا یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میں ایسوں کی جاہلانہ اور خونی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ بوا نے تفرانہ لہجے میں رافعیہ سے کہا۔

غلامو بھی ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے متشکر انداز میں بولا۔ ”ہاں، ادی جیجیل! چھوٹے سائیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔“ اب پہلی بار رافعیہ کو انجانے اور خوفناک اندیشوں نے جکڑ لیا۔

”میرا خیال ہے ہمیں پولیس کی مدد لینی چاہیے۔“ رافعیہ نے قدرے توقف کے بعد تجویز پیش کی تب بوا نے بھی چند ثانیوں کی پرسوج خاموشی کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہی بہتر رہے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں بھائی امتیاز احمد سے ملنا پڑے گا۔“

امتیاز احمد کے نام پر رافعیہ چونک سی گئی۔ بات ہی ایسی تھی کیونکہ امتیاز صاحب توفیق کے والد تھے۔ رافعیہ کو کچھ سوچ کر شرمندگی کا احساس ہوا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کیونکہ غلامو کی زندگی کا بھی سوال تھا چارہ یہ سب امتیاز صاحب کے گھر گئے۔ وہ بہت ہمدرد انسان تھے۔ رافعیہ کی ساری کہانی سنتے ہی فوراً متعلقہ تھانے ان سب کو لے کر پہنچ گئے۔

بولسٹر، رافعیہ کی روداد سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ غالباً اسے بھی حالات کی سنگینی کا انداز تھا۔ تاہم اس نے ان کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ ضرور کر لیا۔

اس دوران رافعیہ نے عدالت میں خلع کی درخواست دائر کر دی۔

ادھر آغل خان نے عدالتی نوٹس ملنے پر بہت کوشش کی کہ یہ معاملہ ان کے روایتی طریقے یعنی راجواڑیں (جرگے) میں حل ہو مگر رافعیہ نے پہلے ہی عدالت میں سختی سے اس بات سے انکار کر ڈالا تھا۔ یوں بھی جرگے پابندی

کا قانون چند ماہ پہلے ہی نافذ کیا جا چکا تھا لہذا عدالت نے چند پیشیوں میں ہی فیصلہ رافعیہ کے حق میں دے دیا اور اسے خلع مل گئی، رافعیہ بہت خوش تھی بوانے بھی گویا سکھ کا سانس لیا تھا کہ آغل خان جیسے سفاک اور پڑھے لکھے جاہل آدمی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ البتہ غلامو نجانے کیوں چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔ اس نے کسی خوشی کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک روز رافعیہ کا توفیق سے سامنا ہوا۔ ندامت کا باعث رافعیہ کو اس سے نظریں ملانے تک کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ وہی توفیق تھا جسے وہ ہر وقت نہایت بے رحمی سے تنہیک کا نشانہ بنائے رکھتی تھی اور اب وہ خود تصویر ذلت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ گویا توفیق سے بہ زبان خاموشی کہہ رہی ہو کہ اب تمہاری باری ہے۔

مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

”رافعیہ! یہ سارے تقدیر کے الٹ پھیر ہیں یقیناً جاز مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اللہ جانتا ہے میں نے تمہاری خوشیوں کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ ہم کسی پر اپنی سوچ مسلط تو نہیں کر سکتے۔ تمہیں شاہانہ زندگی پسند تھی مگر میرے پاس یہ سب نہ تھا۔ اب یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تمہیں میری بات سمجھ آ جاتی یا پھر..... خیر چھوڑ دو۔“ وہ چپ ہو گیا۔

رافعیہ کو یوں لگا جیسے وہ گھڑوں آب ندامت میں نہا گئی ہو۔ پھر شکست سی آواز میں بولی۔ ”توفیق! میں تو شاید تم سے اب معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں رہی ہوں! یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی آواز بھرا گئی آنکھیں بھرا آئیں۔ تب توفیق چند قدم آگے بڑھا اور رافعیہ کا احساس ندامت کے مارے جھکا سر ٹھوڑی سے تھام کر بولا۔ ”تم کس قابل ہو یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے۔“

”میں اب تمہارے قابل نہیں رہی توفیق! وہ رووی۔

”میں تم سے صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ کیا میں اب تمہارے قابل ہوں یا نہیں۔“ توفیق نے اس کی طرف دیکھ کر گہری متانت سے کہا اور رافعیہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کا پچالہ اپنے چہرے پہ رکھ لیا اور سک سک کر رو پڑی۔ توفیق نے اسے دھیرے سے خود سے لگا لیا۔ رافعیہ نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

☆ ☆ ☆

تقدیر کا الٹ پھیر اسی کو تو کہتے ہیں، منزل تک پہنچنے یا پہنچانے والے راستے ضروری نہیں کہ سیدھے سبھاؤ ہوں۔ وہ

ٹیڑھے میڑھے بھی ہوتے ہیں اور انسان ہر موڑ کو اپنی منزل سمجھنے کے مقابلے میں مبتلا رہتا ہے۔ رافعیہ نے بھی آغل خان کو اپنی منزل سمجھا تھا مگر وہ تو محض ٹیڑھے سے راستے کا ایک تنگ موڑ ثابت ہوا تھا۔ منزل تو اسے اب ملی تھی جب توفیق سے شادی کر کے ہی اس نے اپنی اصل منزل پائی تھی۔

وہ شام کا وقت تھا۔ اس روز رافعیہ اور توفیق بوا سے ملنے گھر آئے۔ غلامو اب بوا کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔ یہ سب لوگ محن میں ہی بیٹھے تھے اور بہت خوش تھے کہ اچانک گھر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ سب بری طرح چونک پڑے۔ دروازے پر چند ڈھانٹا پوش افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے اپنی پستول کا رخ رافعیہ کی طرف کر لیا، جب تک یہ کچھ سمجھتے اچانک غلامو نے مذکورہ پستول بدست ڈھانٹا پوش پر چھلانگ لگا دی۔ مگر اس اثنا میں وہ ڈھانٹا پوش پستول کا ٹرایگرڈ باچکا تھا۔ محن کی محدود فضا میں زوردار دھماکا ہوا۔ گولی رافعیہ کو لگنے کے بجائے غلامو کے جا لگی مگر اس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بھی غلامو نے قاتل ڈھانٹا پوش کو اپنے ساتھ ہی رگید ڈالا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح اس نے زخمی ہونے کے باوجود اس ڈھانٹا پوش کا پستول چھین کر اسے گولی ماری اور پھر دوسرا اس کی گولی کا نشانہ بن کر گرا اس پر قاتل کرنے کو پر تول رہا تھا۔ گلی میں شور مچ گیا۔ باقی دو ڈھانٹا پوش اپنے دونوں ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بدحواس ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سب زمین پر پڑے آخری سانسیں لیتے غلامو کی طرف متوجہ ہوئے۔

”غلامو! میرے بھائی یہ..... یہ تو نے کیا کر دیا؟“

رافعیہ اسے خون میں غلطاں پا کر چیخ اٹھی۔

وہ ٹوٹی ہوئی سانسوں کے درمیان یہ مشکل بولا۔ ”آ..... ادی..... جج..... ججیل..... کس..... سدا سبھی رہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رافعیہ کے سر تک لانا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ نیچے گر گیا۔ اور غلاموں کی گردن بھی ایک طرف کو ڈھلک گئی، وہ اپنی بہن پر قربان ہو کے ثابت کر چکا تھا کہ بھائی بہن کے رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے۔

رافعیہ کے حلق سے شدت غم کے مارے بڑی کرب ناک چیخ برآمد ہوئی تھی۔ جس قاتل ڈھانٹا پوش کی گولی کا غلامو نشانہ بنا تھا، بعد میں اس کے چہرے سے ڈھانٹا ہٹایا گیا تو وہ چہرہ آغل خان کا تھا۔



## مذہبی شہر و سخن

✽ یاسر علی راجپوت..... تحصیل گوجرہ، نواں لاہور  
اگر ڈھونڈے یہ دنیا ٹائیے محمد ﷺ  
ثانی تو بڑی چیز ہے سایہ نہ ملے گا  
✽ محمد نوید خان..... حیدر آباد  
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی  
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے  
قیامت ہے کہ ہووے مدنی کا ہمسفر غالب  
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے  
✽ طارق کلیر اینڈ کرم علی چوہان..... نور پور تھل  
تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے میرا  
تو سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

✽ سعید عباسی..... نامعلوم مقام  
ہمیں بھی دکھ تو بہت ہے مگر یہ جھوٹ نہیں  
بھلا نہ دیتے اسے ہم تو مر گئے ہوتے  
✽ بابر عباس..... گلپانہ روڈ، کھاریاں  
یاد ہے جب باتوں باتوں میں گزر جاتی تھی رات  
اس قدر اک دوسرے میں محو ہو جاتے تھے ہم  
وقت کی پابندیاں، جذبات میں حائل نہ تھیں  
کیا خبر تھی کس طرح کس وقت سو جاتے تھے ہم  
✽ محمد بوٹا سیٹھی..... رتی ٹبی، صفدر آباد  
پیار کر کے مول لے لی عمر بھر کی بے بسی  
دل نہ پھر قابو میں آیا آپ پر آنے کے بعد  
✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی  
شہنشاہی لہجہ ہے آہستہ غزل پڑھنا  
تنگی کی کہانی ہے پھولوں کی زبانی ہے  
✽ تفسیر عباس بابر..... اوکاڑہ  
پوچھو یزید سے کہ تیرا راج کہاں ہے  
وہ خون سے آلودہ تیرا تاج کہاں ہے  
زندہ ہیں حسین ابن علی زندہ رہیں گے  
اعت کے سوا ذکر تیرا آج کہاں ہے



✽ حسین عباس، مکمل عباس..... گلپانہ روڈ، کھاریاں  
بھولتا ہوں لاکھ لیکن یاد آتی ہے مجھے!  
ہو گئی تھی نوجوانی میں مجھ سے ایک بھول!  
✽ صوبیہ تفسیر بابر..... اوکاڑہ  
حسین کشاتا ہے سر کرب و بلا!  
عشق جب دین کو پیغام بقا دیتا ہے  
عشق رقم جو کرتا ہے کبھی ابواب وفا!  
تو نہر فرات پہ بازو بھی کٹا دیتا ہے  
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ناؤن، خاندوال  
پھر کسی پیار کے صحرا میں مجھے نیند آجائے  
اور پھر میں خواب میں مانگوں تجھے پانی کی طرح  
✽ عون عباس بابر..... اوکاڑہ  
محبت منفرد میری، تمنا چار سو تیری  
مگر تم ہو کبھی اس کے، کبھی اس کے سوائے میرے

✽ رانا محمد عامر شاہ..... میاں چنوں  
بھی اک خواب کا جاگا ہوا منظر ہی نہ ہو  
خیرے ہاتھوں میں میرا ہاتھ کہاں ممکن ہے  
✽ محمد جاوید راؤ..... بہاولنگر  
نہ عشق یا ادب رہا، نہ حسن یا احیا رہا  
ہوں کی دھوم دھام ہے مگر مگر گلی گلی  
✽ احمد خان توحیدی..... پاکستان اسٹیل، کراچی  
قریب تر ہے جو فکر و خیال میں میرے  
وہی ہے دور بہت دور آسمان کی طرح  
✽ سعدیہ بخاری..... چاہ ماڑی لنک روڈ، انک  
چند لمحوں کی رفاقت غنیمت ہے کہ پھر  
چند لمحوں میں شیرازہ بکھر جائے گا  
اپنی یادوں کو سمیٹ لے پھٹرنے والے  
کسے معلوم پھر کون کدھر جائے گا  
✽ غلام رسول خان..... لاہور  
تمام پتھر جلا کر اپنے ہاتھوں سے  
عجیب شخص ہے سائے تلاش کرتا ہے  
✽ ڈاکٹر ایچ اے لطیف..... فقیر والی  
حسرتوں اور خوابوں کا کارواں ہے زندگی  
کون کہتا ہے فقط راز نہاں ہے زندگی  
✽ ساجدہ راجا..... ساہیوال، ضلع سرگودھا  
دوستوں کے ہجوم میں ناصر  
میرے اندر کا شخص تنہا ہے  
✽ آغا محمد زبیر..... پشاور  
یاد آتے ہیں آج اپنے گناہ کیا کیا  
پہلا یہ کہ محبت کر لی آخر یہ کہ ان سے کر لی  
✽ محمد امجد ریاض..... ضلع ساہیوال  
صاحب عقل ہو اک مشورہ مخلصانہ چاہیے  
زندگی سے تنگ ہوں خود کشی کروں یا عشق؟  
✽ مقبول عاشق..... ضلع خوشاب  
وہ مجھے بھولنے کی فکر میں ہے  
یہ میری فتح ہے شکست نہیں  
✽ مولا بخش..... بہاولپور  
ذہن گریہ نے مجھے تھام تو رکھا ہے مگر  
مجھ سے تاوان میں آنکھوں کی جلن مانگتا ہے

✽ یاسمین..... بہاولنگر  
دنیا سے جا رہا ہوں چھپا کر کفن میں منہ  
افسوس بعد مرنے کے آئی حیا مجھے  
✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی  
آسمانوں میں وہ مصروف بہت ہے یا پھر  
بانجھ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے!  
✽ افرخان..... پشاور  
چلو یہ اشک ہی موتی سمجھ کے بیچ آئیں  
کسی طرح تو ہمیں روزگار کرنا ہے  
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال  
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی  
دونوں کو اس ادا میں رضامند کر گئی  
✽ محمد جاوید بلوچ..... تحصیل علی پور  
خراش ڈال نہ جائے گلوں کے چہروں پر  
ہوا کے ہاتھ میں نشتر دکھائی دیتا ہے  
✽ بشیر احمد بھٹی..... فوجی بستی، بہاول پور  
ایک پتھر ادھر آیا تو اس سوچ میں ہوں  
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے  
✽ عدنان یوسف..... بنوں  
قضا ہو گئے ہم سے سجدے بھی سارے  
اے عشق سچ بتا کہیں تو کافر تو نہیں  
✽ اورلیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی  
یہ سوچ کر کوئی عہد وفا کرو ہم سے  
ہم ایک وعدے پہ عمریں گزار دیتے ہیں  
✽ طاہر الدین بیگ..... میر پور خاص  
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں  
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں  
✽ اطہر علی..... کراچی  
جب بھی گئے عذاب در و بام تھے وہی  
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہیے  
✽ احسان سحر..... میانوالی  
تو پھول ہے گلاب کا  
میں عاشق ترے شباب کا  
تیری تصویر مرے دل میں ہے  
کیا فائدہ اس نقاب کا





اس پر شور ماحول اور بھاگتی دوڑتی زندگی سے  
چند پرسکون لمحات کشید کرنے کے لیے انسان کو  
کتنی تگ و دو کرنا پڑتی ہے، زیر نظر کہانی میں ان  
مشکلات کی بھرپور عکاسی تو ہے مگر کہیں کہیں  
اپنی کوتاہی بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے  
انسان خود اپنا سکون برباد کرتا دکھائی دیتا  
ہے... بہر حال پھر بھی زندگی کہیں نہ کہیں  
اسے گوشہ عافیت فراہم کر ہی دیتی ہے۔

## گوشہ عافیت

تنویر ریاض

کیمرے کے ماتر آنکھ بند کر کے مشکلات سے فرار حاصل کرتے والوں کا قصہ

بنا رہی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اسے یہ کرا دیتا ہی  
نہیں چاہتی تھی۔  
”تمہیں الگ کمرے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا لوگ  
روم تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟“  
وائٹ نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ لوگ  
روم میں اسے وہ سکون اور تنہائی میسر نہیں جس کا وہ خواہاں  
ہے۔ لوگ روم اس کا نہیں بلکہ رکھ کا ہے بلکہ وہ اس گھر کے  
ہر حصے پر قابض تھی۔ ماسٹر بیڈ روم، کچن، گیٹ روم، سیونگ  
روم (جہاں وہ بیٹھ کر بھی کبھار سلائی کیا کرتی تھی)  
روزگار ڈن، لان، سب کچھ رکھ کا ہی تھا۔ وائٹ کی حیثیت  
محض ایک کرایہ دار کی سی تھی جو اپنی پنشن اور سوشل سیکوریٹی

وہ اس گھر کا سب سے چھوٹا کرا تھا جس میں اس کی  
گناہیں رہا کرتی تھی لیکن اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے ہی وہ سان  
فرانسسکو کے ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ وائٹ کو ہمیشہ  
سے یقین تھا کہ کیٹی کے جانے کے بعد وہ اسے اپنا خلوت  
خانہ بنالے گا لیکن اس کی بیوی رکھنے اسے یہ کمرہ اسے  
صاف انکار کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کمرے کو اسی  
حالت میں رہنے دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس حق لڑکی یعنی  
کیٹی کو جلد یا بدیر اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ گھر  
واپس آجائے۔ جبکہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس  
سے پہلے نام بھی سن بلوغت کو پہنچے ہی گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور  
گناہیں لوٹ کر نہیں آیا۔ وائٹ جانتا تھا کہ رکھ محض بہانہ

✽ صفدر شاہ..... پاکستان اسٹیل مل  
یہ بھی سچ ہے کہ محبت یہ نہیں میں مجبور  
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں  
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
خود اپنے سائے کے آگے کھڑا ہوں ہاتھ پھیلائے  
طلب دنیا سے کیا کرتا، میں سائل ہوں فقط اپنا  
✽ مدحت..... کراچی  
پاس رہنا ہے تو پھر مجھ سے یہ دوری کیسی  
دور رہنا ہے تو پھر دل میں سماتے کیوں ہو  
✽ حنا..... کراچی  
یہ مشاہدہ نہیں ہے مرے درد کی صدا ہے  
مرے داغ دل لئے ہیں تیری بزم جب جی ہے  
✽ محمد شاہ..... راولپنڈی  
اسے چاہا، اسے پوجا، یہی توقیر ہے اپنی  
ہمیں گمراہ مت سمجھو، عبادت کب بدلتی ہے  
✽ زرین خان..... پشاور  
تم نے دو حرف تسلی کے کہے ہوتے تو  
ہجر کی شام سے ہم لوگ نمٹ کر آتے  
✽ نسیم احمد..... خانیوال  
کسی کے نام سے رشتہ ہمارا قائم ہے  
وہ ہے رقیب تو پھر بھی مجھے برا نہ لگے  
✽ محمد بھٹی..... اسلام آباد  
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی  
تو اگر میرا نہیں بننا، نہ بن اپنا تو بن  
✽ امتیاز احمد..... کراچی  
مجھ میں کیا ہے کہ مجھے یاد کرے گا کوئی  
اتجھے اچھوں کو یہاں لوگ بھلا دیتے ہیں  
✽ محمد کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی  
ذہن میں بت بھی تراشے تھے مگر آخر کار  
سب سے منہ موڑ کے یارب تیرے گھر آیا ہوں

✽ عدنان صدیقی..... اسلام آباد  
صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ  
گھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی  
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
مسافر تو پچھرتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے  
محبت زندہ رہتی ہے، محبت کب بدلتی ہے  
✽ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی  
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے  
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جانوں  
✽ فرحان احمد..... پاک کالونی، کراچی  
شب جہراں کی فرصت میں ستارے بول اٹھتے ہیں  
کسی سے دل لگانے کا عذاب اچھا کہ موت اچھی  
✽ محمد ادریس..... کراچی  
اپنی سزا طویل کیے جا رہے ہیں ہم  
اب تک مقاومت کا ارادہ نہیں کیا  
✽ جبران احمد ملک..... کراچی  
ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے  
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو  
✽ امیر بخش..... کوئٹہ  
داستان ان کی اداؤں کی ہے رنگین لیکن  
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا  
✽ دلشاد احمد..... بفرزون، کراچی  
ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لا دوا  
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو  
✽ محمد ظہیر..... بلیر، کراچی  
چھوڑا اسے تو اور بھی غم اس کا بڑھ گیا  
مقروض ہو گیا ہوں میں قرضہ اتار کر  
✽ محمد احسن..... سرگودھا  
آنکھوں کی طرح تھک گئے پھیلے ہوئے بازو  
وہ میرا پتا بھول گیا اب کے برس بھی

## محفل شعر و سخن

نام : \_\_\_\_\_  
پتا : \_\_\_\_\_

کوین  
برائے  
شمارہ  
جنوری  
2013



کی آمدنی سے تمام بل ادا کیا کرتا تھا۔

اس کے لیے وہ کسی دوسرے کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا بلکہ سارا قصور خود اس کا اپنا ہی تھا۔ اس نے شروع دن سے ہی رتھ کو گھر، بچوں اور خود پر کنٹرول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ فطرتاً معتدل مزاج اور نرم خو واقع ہوا تھا۔ لڑنا جھگڑنا، بحث کرنا یا اپنی بات منوانا اس کے خیر میں شامل نہیں تھا۔ اسی لیے رتھ اس پر حاوی ہوتی چلی گئی اور اپنی انہی خوبیوں یا خامیوں کی بدولت وائٹ بے اختیار ہوتا چلا گیا جبکہ رتھ اس کے بالکل برعکس تھی۔ مضبوط قوت ارادی کی مالک، بے رحم اور ہر ایک کو اپنے آگے جھکانے والی۔ اس سرد رویہ کی وجہ سے نہ صرف اس کے بچے دور ہو گئے بلکہ دوست بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے۔ وائٹ بھی بہت پہلے اس سے جان چھڑا لیتا اگر اس میں تھوڑی سی بھی ہمت ہوتی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ باسٹھ سال کا تھا اور اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اب اس کا پنشن اور سوشل سیکیورٹی سے ملنے والے چیک پر ہی گزارہ تھا۔ بچوں سے تو یہ توقع کرنا ہی بے کار تھا کہ وہ اسے جذباتی یا مالی طور پر سہارا دے سکیں۔ اس لیے وہ عمر کے آخری حصے میں رتھ کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

رتھ سے اس کی شادی کو تینتیس برس ہو چکے تھے اور اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اسے رتھ میں ایسی کیا کشش نظر آئی تھی کہ وہ اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کی شکل و صورت بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی مرد کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی۔ اس کا جسم شروع سے ہی بے ڈول تھا۔ اسے بے تحاشا کھانے کی عادت تھی جس کی وجہ سے اس کے وزن میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور اب وہ چلتا پھرتا گوشت کا پہاڑ نظر آتی تھی۔ ممکن ہے کہ وائٹ اس کی بے پناہ خود اعتمادی سے متاثر ہو گیا ہو۔

شادی کے بعد پہلا سال بہت اچھا گزرا کیونکہ اس دوران فریقین کا اصل روپ پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اگلے چار سال بھی وہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہے پھر پہلی بیٹی لورا کی پیدائش کے بعد سارا منظر نامہ بدل گیا اور زندگی اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئی۔ گزشتہ پچیس برسوں سے اس کی زندگی سے سکون و اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ کیٹی کی پیدائش ان کی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں تھی جس پر رتھ بے حد چراغ پا ہوئی اور اس نے علیحدہ سونا شروع کر دیا۔ وائٹ اگر آوارہ مزاج ہوتا تو اپنی جیسی بھوک مٹانے کے لیے کسی اور راستے کا انتخاب کر سکتا تھا مگر

یہاں بھی اس کی کم ہمتی آڑے آگئی اور وہ اپنی تقدیر پر ہنسنے لگا۔

اب باسٹھ سال کی عمر میں اس کی ایک ہی خواہش تھی اس کا اپنا ایک کمرہ جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ موسیقی سننے اور ٹیلی ویژن پر اپنی دلچسپی کے پروگرام دیکھ سکے۔ رتھ کو سوپ اوپیرا، مزاح پر وگراموں اور کرائم شوز سے دلچسپی تھی۔ جنہیں وہ اپنے چالیس اچے کے فلیٹ اسکرین ٹی وی پر دیکھا کرتی تھی۔ حسب عادت اس نے یہ ٹیلی ویژن سیٹ خریدتے وقت ہی وائٹ کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب بھی وہ ڈسکوری چینل یا پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلمیں دیکھنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً ہی چینل تبدیل کر دیتی۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر وہ شدت سے ایک کمرے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے ایک روز رتھ کے سامنے اپنا مطالبہ پھر دہرایا۔ ”میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ بلکہ انکار مت کرو۔“

”تمہیں الگ کمرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وائٹ سفاکی سے بولی۔

”میں اپنی ضرورت کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔“

”تا کہ تم اس کمرے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور میں تمہیں نہ دیکھ سکوں۔“

”نہیں۔“ اس نے زبان سے کہا لیکن دل میں سوچا کہ یہی سچ ہے۔ ”اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے۔ تم اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھنا چاہتی ہو جبکہ میں مختلف پروگرام دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ پرسکون ماحول میں اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کروں۔“

”کیا میں تمہیں پڑھنے سے روکتی ہوں؟“

”نہیں لیکن میں ٹی وی کی آواز سے ڈسٹرب ہوں۔“

”گویا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں پریشان کرنے کے لیے ٹی وی کی آواز اونچی رکھتی ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اب میری قوت سماعت پہلے سے کمزور ہو گئی ہے۔ تمہیں اتنا بے پروا تو نہیں ہونا چاہیے۔“

”تمہارے پاس تو لورا کا کمرہ بھی ہے جہاں تم بیٹھ کر سلائی کرتی ہو۔ اگر میں اپنے لیے ایک علیحدہ کمرہ مانگ رہا ہوں تو اس میں کیا قحاحت ہے؟“

”میں تمہیں کیٹی کے کمرے کو کسی مرد کے غار میں تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”کیا..... کیا کہا تم نے؟“ وہ اس نئی اصطلاح پر چونک گیا۔

”تم نے سنا نہیں۔ مرد کا غار، آج کل اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے۔“

”مجھے صرف ایک خلوت خانہ چاہیے جہاں مجھے ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ تم نہ جانے اسے کیا رنگ دے رہی ہو۔“

”دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ ایسا کمرہ جسے مرد اندر سے بند کر کے بیٹھ جائیں اور اپنے آپ کو بیویوں اور ذمہ داریوں سے دور کر لیں۔ اس کے علاوہ تمہاری یہ بھی خواہش ہوگی کہ بند کمرے میں بیٹھ کر کمپیوٹر پر عورتوں کی عریاں تصاویر دیکھ سکو۔“

”مجھے کمپیوٹر نہیں چاہیے اور نہ ہی میں اس طرح کی تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو صرف ایک آرام دہ کمرہ، ایک چھوٹی سی وی اور ایک سی ڈی پلیئر.....“

”ہم یہ فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”میں یہ سب چیزیں گھر کی فالتو اشیا فروخت کر کے رعایتی سیل سے خریدوں گا۔“

”ہمارے گھر میں ایسی کوئی فالتو چیز نہیں جسے بیچ کر تم رقم حاصل کر سکو۔“

”رتھ پلیئر، مان جاؤ۔“

”نہیں۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

اگلے روز رتھ نے کیٹی کے کمرے کی صفائی کی۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کے جہاں سے عقبی صاف نظر آتا تھا اس کے بعد اس نے مطمئن ہو کر کمرے کا جائزہ لیا پھر دروازے کو تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی اور دل خراش میں بولی۔ ”اب ٹھیک ہے۔“

یہ اس کی سوچ تھی جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ رتھ سوچ رہی تھی کہ اس نے کمرے کو تالا لگا کر اسے وائٹ کی دسترس سے دور کر دیا ہے جبکہ وائٹ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ اس نے آج تک رتھ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا لیکن اس بار وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر یہ

کمرہ حاصل کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ اگر وہ اس کی اجازت نہیں دیتی تو اس کے بغیر ہی وہ اس کمرے پر قبضہ کر لے گا چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو اور اگر ایک بار وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بعد میں رتھ کے شور شرابے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

اسے اپنا منصوبہ تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب اسے ایک ایسی مہم سر کرنا تھی جس میں خطرے کا امکان بہر حال موجود تھا۔

رتھ گھر کا سامان خود ہی الے کر آتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وائٹ خریداری میں بہت دیر لگاتا ہے اور عام طور پر غیر ضروری خوراک اور دوا بھی خرید لاتا ہے۔ اس بار جب وہ گھر کا سودا لینے گئی تو وائٹ نے کیٹی کو فون کر کے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ کیٹی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس نے وائٹ کی حوصلہ افزائی کی۔ کیٹی اپنی ماں سے بہت مختلف تھی اور اسے احساس تھا کہ اس کے باپ کو واقعی ایک الگ کمرے کی شدید ضرورت ہے۔ ویسے بھی اس کا گھر واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے باپ کو اپنا کمرہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

وائٹ کے لیے اگلا مرحلہ کیٹی کے کمرے کی چابی تلاش کرنے کا تھا جس میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ رتھ نے اس چابی کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اس کی سلائی مشین کی میز والی دراز میں رکھی ہوئی تھی۔ وائٹ نے فی الوقت اسے وہیں چھوڑ دیا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

رتھ ہر ہفتے کی صبح کو اپنی بیوہ بہن ایلن سے ملنے بے پورٹ جاتی اور اس کی واپسی عموماً شام پانچ بجے تک ہوتی۔ وائٹ نے پہلے سے ہی ایک قفل ساز سے بات کر رکھی تھی۔ اس نے چابی کی مدد سے کیٹی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور چابی کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد قفل ساز کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ بالکل ویسا ہی نیا قفل دروازے میں لگا دے۔ یہ کام مکمل ہو جانے کے بعد اس نے نئے تالے کی چابی اپنی کی چین میں لگالی۔ اس کمرے کی صفائی مہینے میں ایک بار ہوا کرتی تھی اور وائٹ کو یقین تھا کہ رتھ چار ہفتے بعد ہی اس کمرے کا رخ کرے گی۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران جب بھی رتھ گھر سے باہر گئی۔ وہ اس کمرے میں جا کر اپنا کام شروع کر دیتا۔ سب سے پہلے اس نے کیٹی کی چھوڑی ہوئی اشیا کو ڈبوں میں بند کر کے گیارہ میں ختم کیا۔ کیونکہ کمرے کی کھڑکی پر بھاری



پردہ پڑا ہوا تھا اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ رتھ روزگارڈن میں چہل قدمی کے دوران کمرے کے اندر کا منظر دیکھ پاتی۔

سات دن گزرنے کے بعد وائٹ نے اپنے ایک پرانے دوست چارلی کی خدمات حاصل کیں اور دونوں نے مل کر کمرے کا بقیہ سامان جس میں بستر، ٹائٹ اسٹینڈ، الماری اور لکھنے کی میز شامل تھی ایک خیراتی ادارے کو عطیہ کر دیا۔ اب وہ کمرہ مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد چارلی کے ساتھ مل کر گیراج میں رکھے ہوئے نصف درجن باکس کمرے میں منتقل کیے جن میں اس کی کتابیں اور میگزین وغیرہ رکھے تھے اور جنہیں رتھ نے کاٹھ کباڑ قرار دے کر گیراج میں رکھوا دیا تھا۔ چارلی کو بجلی کے کام سے بھی واقفیت تھی چنانچہ اس نے ٹی وی سیٹ کے لیے کیبل کا بھی بندوبست کر دیا۔

اگلے ہفتے وائٹ نے سستی اشیاء کے اسٹور سے ایک چھوٹا ٹی وی سیٹ اور سی ڈی پلیئر خریدا اور رتھ کے گھر واپس آنے سے پہلے یہ چیزیں کمرے میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا۔ اب تک اس کا منصوبہ بے حد کامیاب جا رہا تھا اور رتھ کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کی غیر موجودگی میں وائٹ کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ وائٹ کے پاس اپنی کارروائی کے لیے صرف ہفتہ کا دن ہی ہوتا تھا جب رتھ اپنی بیوہ بہن سے ملنے کے لیے جاتی تھی۔ چنانچہ اگلے دو ہفتوں میں اس نے چارلی کی مدد سے ایک کرسی، دو درمیانہ سائز کے کتابوں کے شیلف اور ایک چھوٹا سا قالین خریدا۔ یہ تینوں چیزیں دیکھنے میں قیمتی لگتی تھیں لیکن سستی چیزوں کے اسٹور پر بہت کم داموں میں مل گئیں۔

جب تمام چیزوں کا انتظام ہو گیا تو اس نے اطمینان سے بیٹھ کر اس کمرے کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر اسے کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ اس کی ضرورت کا سارا سامان موجود تھا اور اگر کوئی کمی رہ گئی تھی تو اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ یہ اس کا اپنا کمرہ تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب رتھ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اس کمرے کو جلد از جلد اپنے استعمال میں لانا چاہتا تھا اور رتھ کے علم میں لائے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسے دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے کتنی سادگی اور کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اس کمرے کو اپنے استعمال کے قابل بنایا ہے پھر شاید وہ زیادہ ہنگامہ نہ کرے لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔

جونہی رتھ نے اس کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور اس کا بھاری بھر کم جسم لمحہ بھر کے

لیے ساکت ہو گیا پھر وہ اپنی جگہ سے گھومی اور آنکھیں پیر پھاڑ کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر غراتے ہوئے بولی ”مکار، فریبی! تمہیں یہ سب کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

”رتھ، پلیز! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

”میں پریشان نہیں ہوں بلکہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔“ رتھ نے میری غیر موجودگی میں کیٹی کے کمرے کو مرد کے غار میں تبدیل کر دیا جبکہ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“

”میں تمہاری غیر موجودگی میں کبھی یہ کام نہ کرتا اگر تم سمجھ لیتیں کہ میرے لیے اپنے کمرے کی کیا اہمیت ہے کیا تم نہیں سمجھتیں کہ اب یہ کمرہ پہلے سے بہتر حالت میں نظر آ رہا ہے۔“

”مجھے تو بہت ہی برا لگ رہا ہے۔ یہ فضول سا قالین کہاں سے اٹھالائے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی اچھی خاصی قیمت ادا کی ہوگی۔“

”نہیں۔ یہ خاصا سستا مل گیا۔“

”اور تم نے کیٹی کی چیزوں کا کیا کیا؟“

”فرنیچر کے علاوہ تمام چیزیں گیراج میں رکھوا دی ہیں۔“

”اور شاید تم نے وہ فرنیچر کسی خیراتی ادارے کو دے دیا ہوگا۔“

”ہاں، وہ بہت پرانا اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ اسے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“

وہ ایک بار پھر غراتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وائٹ پوٹر، جب کیٹی کو معلوم ہوگا تو وہ بہت ناراض ہوگی۔“

”وہ پہلے سے سب کچھ جانتی ہے۔ میں نے اس بارے میں اسے فون کر کے بتا دیا تھا اور اسے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ بلکہ اس نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یہ سچ ہے۔“ وائٹ نے کہا۔ ”اسے اپنی چھوٹی ہوئی چیزوں کی کوئی پروا نہیں ہے اور نہ ہی اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ ہے۔ یہ بات ہم دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا معلوم ہے کہ تم نے مجھے شکست دینے اور میرے مقابلے پر آنے کی کوشش کی ہے۔“

فوری طور پر اپنا یہ کاٹھ کباڑ یہاں سے ہٹاؤ اور کیٹی کا جو بھی سامان باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہاں رکھوا دو۔“

www.PakSociety.com



عام طور پر ایسی صورت حال میں وائٹ کی جانب سے کوئی مزاحمت نہیں ہوتی تھی لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا، وہ اس کمرے کے معاملے میں حد درجہ جذباتی تھا اس لیے مخالفت پر اتر آیا اور اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ”نہیں۔“

”کیا، کیا کہا تم نے؟“ رتھ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

”میں نے کہا نہیں، یہ کمرہ میرا ہے اور اب یہ اسی حالت میں رہے گا۔“

رتھ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وائٹ کا یہ روپ پہلی بار اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔“

وائٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔

اگلے چند دنوں کے دوران رتھ نے اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر لیا۔ دھمکیاں دیں، آنسو بہائے، اس کے لیے کھانا پکانے اور کپڑے دھونے سے انکار کر دیا لیکن وائٹ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس دباؤ کا مقابلہ نہ کر پاتا لیکن کمرے کے معاملے میں اس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ جب رتھ کی طویل تقریر اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی تو وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتا اور کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اپنی پسندیدہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگتا۔ رتھ دروازہ جنتی اور چیختی چلاتی رہتی اور جب تک اسے یہ اندازہ نہ ہو جاتا کہ رتھ کا غصہ آسمان کی حدود کو چھونے والا ہے، وہ دروازہ نہ کھولتا۔

جب وہ کمرے میں نہ ہوتا تو اس کو تالا لگا کر رکھتا جس کی چابی اس کی چین میں تھی۔ رات کو سوتے وقت وہ اس چین کو اپنے نکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ اسے ڈرتھا کہ سوتے میں کہیں رتھ چابی تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے۔ رفتہ رفتہ رتھ نے اس معاملے پر خاموشی اختیار کر لی لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا اور جانتا تھا کہ یہ عارضی جنگ بندی ہے۔

اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنی خلوت گاہ میں گزارنا شروع کر دیا۔ وہ زیادہ تر موسیقی سنتا یا اپنے پسندیدہ مصنفوں کی کتابیں پڑھتا رہتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسے دل کا دورہ نہیں پڑ گیا۔ وہ صبح کے وقت اپنے ناشتے کے لیے انڈیا بنا رہا تھا کہ اسے سینے میں درد محسوس ہوا۔ پہلے تو رتھ یہی سمجھی کہ اسے گیس کی تکلیف ہے لیکن جب وائٹ کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تو وہ

اسے اسپتال لے گئی جہاں ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسے مزید ٹیسٹوں کے لیے تین دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے مکمل تشخیص کے بعد بتایا کہ یہ دورہ معمولی نوعیت کا تھا اور اسے اب اپنے معمولات زندگی میں تبدیلی لانا ہوگی۔

اسپتال میں قیام کے دوران رتھ اسے دیکھنے نہیں آئی۔ البتہ اس کا دوست چارلی باقاعدگی سے اس سے ملنے کے لیے آتا رہا۔ جس دن اسے اسپتال سے رخصت کیا جا رہا تھا۔ رتھ اسے ساتھ لے جانے کے لیے آگئی۔ وائٹ نے محسوس کیا کہ راستے بھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے وہ سمجھ نہ سکا لیکن گھر پہنچتے ہی اس مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ جونہی اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی خلوت گاہ اجڑ چکی تھی اور خالی کمرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ رتھ اس کے پیچھے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رتھ نے بھی اس کمرے کی چابی حاصل کرنے کے لیے وہی طریقہ اپنایا ہے جس پر وہ پہلے ہی عمل کر چکا تھا۔ یعنی اس کی غیر موجودگی میں چابی چرائی، کمرے کا تالا کھولا اور چابی دوبارہ چین میں ڈال دی۔

”میرا کمرہ۔“ وہ بہ آواز بلند بولا۔ ”تم نے میرا کمرہ چاہ لیا۔“

”احقانہ باتیں مت کرو۔ میں نے صرف کمرے کی صفائی کی ہے۔“

”اور میرا سامان، ٹی وی، کتابیں وہ سب کہاں ہیں؟“

”وہ سب ناکارہ چیزیں تھیں۔ میں نے انہیں باہر رکھا دیا۔“

”کہاں..... تم نے وہ سب چیزیں کہاں پھینک دیں؟“

”ظاہر ہے کہ گیراج میں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”ناکارہ اشیاء رکھنے کے لیے وہی ایک مناسب جگہ ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مڑی اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ وائٹ اس کے پیچھے پیچھے گیا اور چوہے کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے بحث کرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں

ریشہ طاری تھا اور رتھ نے اس سے پہلے بھی اس کو اتنے غصے

میں نہیں دیکھا تھا۔

”جہیں اس کا کوئی حق نہیں تھا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”پہلے تم نے کی تھی۔ اگر تم چوری چھپے کیٹی کے کمرے کو جہیز کے ہوتو مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے۔“

”یہ کیٹی کا نہیں، میرا کمرہ ہے۔“

”نہیں۔ اگر تم دوبارہ اسے اپنی خلوت گاہ بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو اسے بھول جاؤ۔ یہ کمرہ اب میرا ہے۔“

”کیا؟“

”تم نے سنا نہیں۔ یہ کمرہ اب میرا ہے۔ اب یہ پرانی حالت میں تو نہیں آسکتا لہذا میں نے اس میں اندرونی باغ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب کھڑکیوں کو کھول دیا جائے گا تو پودوں کو مناسب روشنی اور ہوا ملتی رہے گی۔“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“ وائٹ چلایا۔

”ہاں۔“ وہ بہ دستور مسکرا رہی تھی۔ ”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ پھر اس نے کسی کے زور سے گرنے کی آواز سنی۔ اب دھند چھٹ چکی تھی اور رتھ اس کے قدموں کے پاس فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اسٹیل کے کڑچھے کا وزن محسوس کیا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اس نے یہ کڑچھا اٹھایا اور رتھ کے سر پر دے مارا لیکن وہ یہ کام کر چکا تھا اور کڑچھے کی ضرب سے رتھ کے سر کا بایاں حصہ چل گیا تھا۔

اسے فوری طور پر صدمہ، ندامت اور دہشت کا احساس ہوا لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ نہ رہی اسے ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کڑچھا دوبارہ چوہے پر رکھا اور جھک کر رتھ کی نبض دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گیا اور خود کو اندر بند کر لیا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے پولیس، رتھ کی بہن یا چارلی کو فون کر دینا چاہیے یا خود پولیس اسٹیشن جا کر اسے جرم کا اعتراف کرے لیکن وہ کوشش کے باوجود اس خالی کمرے سے باہر نہیں آسکا۔ دو دن بعد جب ایلن وہاں آئی تب بھی وہ کمرے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

وائٹ نے رضا کارانہ طور پر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی جو وجہ بتائی اس پر براغ رساں یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن جب اس نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح رتھ نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خلوت گاہ کو اجاڑا جو اس کی دیرین زندگی میں بہت

اہمیت رکھتی تھی تو ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

اس پر فرد جرم عائد ہو چکی تھی۔ ٹام اور کیٹی اس سے جیل میں ملنے کے لیے آتے رہتے تھے جبکہ لورا بھی اس کی خیریت دریافت کرتی رہتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے یہ جرم کرنے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن وہ اس کی نیم دلی سے حمایت کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر بھی ناراض تھے کہ جب انہیں باپ کے سہارے کی ضرورت تھی تو وہ ان سے دور رہا اور انہیں مکمل طور پر رتھ جیسی ظالم ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

مقدمے کی کارروائی کے دوران ٹو جوان وکیل صفائی نے وائٹ کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی اور جیوری کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ٹام اور چارلی کو بہ طور گواہ پیش کیا تا کہ وہ وائٹ کے اچھے کردار کی گواہی دے سکیں لیکن وائٹ کے خلاف ناقابل تردید ثبوت موجود تھے لہذا جیوری نے اسے کوئی رعایت دیے بغیر مجرم قرار دے دیا۔ جج نے اسے تین سال قید کی سزا سنائی جو دوسرے لفظوں میں اس کے لیے عمر قید ہی تھی۔ البتہ اس کی عمر، صحت اور سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اسے ایسی جیل میں رکھنے کی سفارش کی گئی جہاں جیل کے اندر اس کی آزادانہ نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جیل میں خوش نہیں رہ سکے گا لیکن اس کے برعکس ہوا۔ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو وہاں کے ماحول میں ڈھال لیا اور چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کرنے لگا۔ شروع شروع میں اسے ایک دوسرے قیدی کے ساتھ رہنا پڑا لیکن اس کے عہدہ برتاؤ، چال چلن اور رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے جلد ہی ایک الگ کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا اور ٹیلی ویژن سیٹ اور سی ڈی پلیئر رکھنے کی اجازت بھی مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد اسے آرام کرسی اور کتابیں بھی مل گئیں۔ کچھ مزید کتابیں اس نے چارلی سے بھی منگوالیں۔ اس کوٹھری کا سائز کم و بیش اس کے کمرے جتنا ہی تھا۔ وہ کھانا کھانے، لائبریری جانے اور ورزش کرنے کے لیے کوٹھری سے باہر آتا جبکہ بقیہ وقت فلمیں دیکھنے، کتابیں پڑھنے اور موسیقی سننے میں صرف ہو جاتا۔ یہاں اس کی تنہائی میں قتل ہونے والا کوئی نہ تھا۔ شاید اسے اتنا سکون اور آرام اپنے گھر کے کمرے میں بھی نہ ملتا لیکن یہ کوٹھری ہر لحاظ سے اس کے لیے موزوں تھی۔ وائٹ پوٹر کو پہلی بار احساس ہوا کہ اسے وہ خلوت گاہ مل گئی ہے جس کی ہمیشہ اس نے تمنا کی تھی۔





## ناصر ملک مسافر

قسط نمبر: 10

### گل و گزار سے راہ پر خارتک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادا، پر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

### گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کھٹنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہر یار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانہ عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجوا اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خوشچمکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوٹی کبرئی رہتی تھی جنہوں نے ہمیں ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے مہمان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں



جان کر چیک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشر اور ایک مرد جو غالباً میرزا تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے۔ ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ پیا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجود کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزدی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اور ایک سابق فوجی ہماری خدمت پر مامور تھا۔ کھانا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جانکاد کی خاطر، بخت جان چھوٹی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں بیٹا نے میری تربیت کی اور مجھے فارم ہاؤس میں میڈم سے ملاقات کا حکم ملا لیکن یہ ملاقات ایک خونی مقابلے کی صورت میں جس میں، میں یہ مشکل تمام غالب رہا۔ میڈم کے امتحان لینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو غیب سے ہم پر ہتھیار تان لیے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان دونوں کو قابو کر لیا تعارف کرانے پر معلوم ہوا کہ وہ دونوں نامی گرامی ڈاکو تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھانا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم ٹھکانے پر مجھے اس کو اس کے خریدار حیدر خان کے سر پرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اس کو لے کر جب دلبر حسین کے گھر گئے تو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچا رہ گیا وہ چہرہ دیکھ کر میرے سارے زخم تازہ ہو گئے لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی راتوں کو مبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رگوقسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جا رہا تھا کہ اچانک مجھے غوا کر لیا گیا۔

### اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آج تم نے یہ حرکت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تم نہایت کینہ پرور اور ناقابل معافی شخص ہو۔“

اس کا بلند قبچہ گاڑی میں گونج اٹھا۔ اپنی ران پر زور دار ہاتھ مار کر بولا۔ ”یعنی ابھی عقل نہیں آئی تمہیں..... مجھے دھمکانے لگے ہو..... یعنی زور آور کو..... واہ سالے واہ! مگر خیر..... یہ تو ہوتا ہی ہے۔ موت سامنے آتی ہے تو بڑے بڑوں کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے اور اول فول بکنے لگتے ہیں۔ میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔“

خوف اور پریشانی کا ابتدائی مرحلہ بیت گیا تھا اور میں اس کی تحویل سے نکلنے کے لیے موقع کے انتظار میں ذہن دوڑانے لگا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں قطعاً خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ زور آور کے بازوؤں کا زور میں نے دیکھ رکھا تھا۔ اس کی منتقم مزاجی کو بھی آزمایا چکا تھا۔ اس نے موتی کے قتل کو ابھی تک بھلایا نہیں تھا۔ وہ خطرناک شخص تھا اور میرا جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بے خونی سے پوچھا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ تین مرتبہ دانتوں پر دانت مار کر ’ٹک ٹک‘ کی آواز پیدا کرنے کے بعد گنگنا یا۔ ”تم مجھے قتل کیا جائے، یا کہ معاف کیا جائے..... تو ہی بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے..... تم مجھے قتل کیا جائے.....“

اس کی تضحیک آمیز گنگناہٹ اور قافرانہ مسکراہٹ پر میرا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا کہ زوردار مکار مار کر اس کا دہیات منہ توڑ دوں مگر بے دقت تمام خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”میرے سوال کا

بہ آواز سن کر میرے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ ”کیوں؟ کیا اپنی بہن کے یار کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے سالے؟“ میرے کانوں میں اس کی زہریلی آواز پڑی۔ یوں لگا جیسے اس نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں اندیل دیا ہو۔

اسے پہچاننے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کھالے کے ہاتھوں حادثاتی طور پر قتل ہونے والے محبوب الحسن عرف موتی کا جگری یار اور دوست راست، زور آور تھا۔ پہلی مرتبہ وہ جھیل کے گیٹ پر مجھ سے ٹکرایا تھا جب میں اور کھالا، خانزاوی اسما سے ملنے کے لیے ملتان آئے تھے۔ میں نے اس کی خاصی ٹھکانی کی تھی۔ دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ابتدائی شب کے اندھیرے میں ڈیرا اڈا کی ایک مارکیٹ کے باہر ملا تھا۔ اس کے ساتھ ڈرائیور اور ایک جرسی والا شخص بھی تھا۔ دونوں مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے مگر میں انہیں زخمی کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تیسری مرتبہ اس سے میری ملاقات تھانیدار اظہر کی دفتری عدالت میں ہوئی تھی جہاں سے مجھے میڈم شکیلہ اور میرا شاہ نے رہائی دلائی تھی۔ اس نے میرا شاہ کی موجودگی میں بخنی فروش کے قریب گاڑی روک کر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے دیکھ لے گا اور آج اس نے اپنی دھمکی پر عمل کر لیا تھا۔

وہ کینہ تو زنگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی گالی نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ میں نے دانت پیسے اور سرد لہجے میں کہا۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو زور آور! میں نے سوچا تھا کہ تمہارے اور میرے بیچ معاملہ ختم ہو گیا ہے مگر

ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کرو یا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی دیکھ چلا تھا اور سواریاں لے کر قریبی موٹیک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ مرے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سنجھے ہوئے شخص مگر کچھ قوی انسان تھے لیکن بڑا اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن ور یام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلک رہتا تھا۔ ور یام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہر کارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا جس پر ور یام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک ختم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں ور یام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرفراز کی میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی زیناں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریزہ کی ہڈی میں چھبی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر کھن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیکس جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیکس کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلا یا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیر وٹا پ نو جوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نو جوان موتی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھا نے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب دلبر کھنے والے امیر شاہ عرف میر وٹا سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑ والے کی اور ہوا بھی نہیں، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑ والیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نو جوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر دوسرے بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ کھالا بھی لپٹا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پریشک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اٹھواتا ہوں۔ میرا شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی فرینک آن زمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے اکتشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر بغیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیاتی لڑکی سے ہوئی جس نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد بیلو کے کینک کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کر لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالا اس کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چائے پر مجبور کر دیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ بیانیاتی ایک تجربے کا شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد وار کے



جواب دو، خان صاحب بننے کی کوشش نہ کرو۔“

اس نے ٹھٹک کر مجھے دیکھا۔ میرا جملہ اُسے برا لگا تھا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور آنکھوں سے خشونت ٹپکنے لگی، بولا۔ ”بھتی کے! ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد پھر زہریلی مسکراہٹ کے جلو میں بولا۔ ”نہیں یار! ڈرتا نہیں، زیادہ فکر مند نہیں ہوتا..... میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ بھلا کوئی اپنے مہمانوں سے ایسا سلوک بھی کرتا ہے..... یار! بس تھوڑا سا مودعہ میلا کریں گے، گزرا زمانہ بچپن کا یاد کریں گے پھر تم جہاں کہو گے، وہاں پہنچاؤں گے..... بس!“

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کہیں محفوظ جگہ پر لے جا کر تشدد کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہ حکایت دیگر، وہ ان چوٹوں کا حساب لینا چاہتا تھا جو اُسے میرے ہاتھوں پہنچی تھیں۔ وہ اپنے یار کے قاتل تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا اور اپنی بے چینی کو دور کرنے کے لیے کھالے کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کن آنکھوں سے اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ پوری طرح چوکس تھا۔ ایسے ہی وقت میں میرے موبائل فون کا بزر بجا۔ زور آور چوٹ اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے فون سیٹ نکال لیا۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے ’پاورڈ آف‘ کر کے فرنٹ سیٹ کی طرف اُچھال دیا۔

اس نے بڑی مضبوطی سے پستول کو پکڑ کر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ میں اگر اُس سے پستول چھیننا چاہتا تو نہیں چھین سکتا تھا۔ اس کوشش میں میرے پہلو سے لگی ہوئی خوف ناک گن کی نال گولی اگل کر مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کر سکتی تھی۔ میں نے فی الحال مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اگلی سیٹوں کے درمیان سے فرنٹ اسکرین کے پار رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگا۔

آٹھ نمبر چنگی کے مین چوک پر پہنچ کر ڈرائیور نے دائیں ہاتھ نواب پور روڈ کی جانب ٹرن لیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد کھیرا آباد کی گنجان آبادی ختم ہو گئی اور قدرے کھلا علاقہ شروع ہو گیا۔ سڑک کے اطراف میں لکڑی کے ٹال، اینٹوں کے بھٹے اور آرے دکھائی دینے لگے۔ پھر کم گنجان آبادی بھی ختم ہو گئی۔ اکا دکا دکانوں اور مکانوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ مجھے شہر سے باہر، مضافات میں واقع اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہے تھے۔

گاڑی میں خاموشی طاری تھی۔ وہ تینوں میری مفاہمانہ خاموشی کو غیبت جان کر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی پانچ

سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے بائیں ہاتھ نکلنے والی لنک روڈ پکڑ لی۔ میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے یہ پکی سڑک بھی چھوڑ دی اور دو بھٹوں کے درمیان واقع کچے اور زگ زیک راستے پر کار ڈال دی۔ راستہ مٹی اور دھول سے آٹا ہوا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر ونڈا سکرین کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو اڑتی ہوئی دھول کے دبیز بادل کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے زور آور کو دیکھا جو بے فکری سے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اس وقت وہ چلیے اور چہرے کے تاثرات سے ایکشن فلموں کا ولن معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اپنی نوک پلک سنوارتا اور حلیہ درست رکھتا تو بینڈ سم قرار دیا جاسکتا تھا۔

میرا ذہن بڑی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور درپیش آنے والے نامساعد حالات سے نبرد آزمانی کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زور آور خطرناک ارادے رکھتا تھا۔ اگر اُسے معمولی پوچھ گچھ اور مار پیٹ کا شوق چراتا تو وہ مجھے شہر سے دور اس ویرانے میں نہ لاتا بلکہ وہیں دو چار ہاتھ رسید کر کے چھوڑ دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دومرتبہ شکست سے دو چار ہونے کے بعد بہت محتاط ہو گیا تھا اور مجھے سبق سکھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں میڈم شکیلہ کی کوشی اور اپنے گھر کے بیچ اس طرح اغوا کیا گیا تھا کہ نہ میڈم کو میرے بارے میں کچھ علم ہوا ہوگا اور نہ میرے گھر والوں کو میری خبر ہوگی۔ مجھ تک کسی امداد کا پہنچنا محض خام خیالی تھا۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں مستغرق تھا کہ کار ایک دیہاتی طرز کے تعمیر شدہ مکان کے بڑے سے دروازے پر رُک گئی۔ دھول کا گہرا بادل جو چلتی کار کے تعاقب میں دوڑا آ رہا تھا، چند لمحوں میں ہی کار کے گرد پھیل گیا۔ بہ صد کوشش بھی آس پاس کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ جب دھول ہوا میں تحلیل ہوئی، تب زور آور نے اپنے ساتھی کو نیچے اترنے کا حکم دیا اور کہا۔ ”صنی! اس الو کے پٹھے کا دھیان رکھنا۔ معمولی سی حرکت بھی کرے تو بے دریغ گولی مار دیتا۔“

مجھے گن پوائنٹ پر رکھنے والے کا نام غالباً حنفی تھا جسے مختصر کر کے یا بگاڑ کر ’صنی‘ کر دیا گیا تھا۔ زور آور کے اترنے کے بعد اُس نے مجھے اسی دروازے سے اترنے کا حکم دیا۔ زور آور چند قدموں کے فاصلے سے مجھ پر پستول تانے کھڑا تھا۔

میرے اترنے کے بعد صنی بھی کار سے نکل آیا اور گن کی نال میری ریڑھ کی ہڈی سے لگائے دھکیلا ہوا مکان کے

ایسی ساخت کے چوبی دروازے کی طرف بڑھا۔ زور آور میری داہنی جانب چند قدموں کے فاصلے پر محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ میں نے مکان پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ کبھی دیواریں پختہ اور بے رنگ تھیں۔ سینٹ کا سیاہی مائل رنگ دھول کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ مکان کے قرب وجوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس علاقے میں اینٹیں بنانے والے گھنوں کی بہتات تھی مگر اس مکان کے قریبی بھٹے کا فاصلہ بھی کم و بیش چار سو گز تھا۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ کر زکاتو صنی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”دروازہ کھلا ہے۔ اندر چلو۔“

میں نے کن آنکھوں سے زور آور کو دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دونوں کی بے حد محتاط روی نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ وسیع صحن کچا تھا۔ ایک چھوٹا اور دو بڑے کمرے، غسل خانے اور نکلے پر مشتمل اس مکان کی تعمیر کا انداز مقامی اور خالصتاً دیہاتی تھا۔

صنی نے حکم دیا۔ ”اُس کمرے میں چلو۔“

تینوں کمروں کے دروازے چو پٹ کھلے ہوئے تھے۔ درمیانی کمرے میں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہو رہا تھا جبکہ کسی مشین کے چلنے کی مدھم سی آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ مجھے جس کمرے کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، میرے اندازے کے مطابق وہ خالی تھا۔ غیر معمولی بھاری چو کھٹ والا دروازہ عبور کرتے ہی میرا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ کمرے میں نہ تو کوئی شخص موجود تھا اور نہ ساز و سامان۔ کمرے کے عین وسط میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک میری کپٹی پر زور دار دھماکا ہوا۔ آنکھوں کے آگے ایک لمحے کو سورج چمکا پھر دبیز اندھیرا چھا گیا۔ کم بخت صنی نے شاید پوری قوت سے گن میری کپٹی پر دے ماری تھی۔

میں نے بے اختیار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں سختی سے بھینچ لیا۔ بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے میں نے سر جھکنے کی پوری کوشش کی مگر یوں محسوس ہوا جیسے میرا سر منوں بھاری ہو گیا ہو اور آنکھوں کی بینائی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شاید بقیہ دن اور پوری رات گزر گئی تھی کیونکہ جب میری آنکھ کھلی، میرے سامنے کھلے ہوئے دروازے کے باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اسی کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بدن پر ایک میلی پٹیلی، مختلف رنگوں سے تھڑی اور بدبودار رضائی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رات کے گزرنے کا اندازہ اسی رضائی سے کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے کافی دیر

بعد تک میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی، میں نے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی اور داہنی کپٹی پر جا گرنے والی درد کی تیز لہر نے میری آنکھوں میں نمی اتار دی۔ میں نے کپٹی کی طرف ہاتھ بڑھا نا چاہا تو ہاتھ چلا کہ میرے دونوں ہاتھ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کوشش کے باوجود ہاتھ کو آزاد نہ کروایا تو میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا کہ میرے دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کو مسلسل ہلاتے ہوئے رضائی کو ایک طرف سرکایا۔ پیروں کو دیکھا۔ جوتے غائب تھے جبکہ گھٹنوں پر انگلی کے برابر موٹی سوتی رسی کے کئی ٹیل پڑے ہوئے تھے۔ رسی کی گانٹھ عقبی سمت میں تھی جو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر غیر معمولی بڑے ابھار کی بدولت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پیروں کو حرکت دیتے ہوئے رسی کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ کم بختوں نے بڑے ماہرانہ انداز سے مجھے رسی میں جکڑا تھا۔

میں نے گھٹنے اکٹھے کیے، پھر پیروں کے ٹیل اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سر میں دھمک پڑنے لگی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ تھک کر دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر، بے بسی سے آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ درد کی شدت سے عیاں تھا کہ کپٹی پر آنے والی چوٹ خاصی گہری اور خطرناک تھی۔

میں وقفے وقفے سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوئی نصف گھنٹے کی اس تکلیف دہ کسرت کے بعد پیروں کے ٹیل بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ سر کا درد بھی کچھ کم ہو کر قابل برداشت ہو گیا تھا۔

کھلے دروازے میں سے دکھائی دینے والے صحن کے حصے میں کوئی شخص اب تک آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی مشین کے چلنے کی مخصوص اور مسلسل آواز کے علاوہ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مکان میں میرے سوا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ پیروں کے ٹیل بیٹھنے میں کامیابی کے بعد میں نے گھٹنے کچے فرش پر ٹکائے اور پیچھے کی طرف جھک کر بندھے ہوئے ہاتھوں کو پیروں میں بندھی ہوئی رسی کی گانٹھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جونہی میری انگلیوں نے گانٹھ کو محسوس کیا، میری جان میں جان آئی۔ میں نے رسی کو ٹوٹل ٹوٹل کر گانٹھ کی نوعیت کو سمجھا اور کھولنے پر تمام قوت صرف کر دی۔ عمر بھر کی کاشتکارانہ ریاضت کام آئی اور میں تھوڑی دیر میں ہی اپنے پیروں کو



آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

پھر میں نے پیروں کو جھٹک کر رسی کے الجھاؤں سے نجات حاصل کی اور کھڑا ہو گیا۔ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سر بڑی طرح چکر رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے ایک قدم بڑھایا مگر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خود کو سنبھال کر آہستگی سے چند قدم چلا۔ تپور اگر گرنے لگا تھا مگر دیوار سے کندھا ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ مجھے اس تکلیف دہ کیفیت سے نکلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

پیاس کا جائگاہ احساس ہوا حلق میں کانٹے سے جھپٹے لگے تھے۔ ناگاہ نظر داہنے کندھے پر پڑی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرا کندھا، بازو اور قریب کا اگلا حصہ خون سے رنگا ہوا تھا۔ خون کافی مقدار میں بہا تھا جو زیادہ وقت گزرنے پر جم کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ورنہ کنپٹی پر اس شدت سے لگنے والی چوٹ کے نتیجے میں انسان کا زندہ رہنا محال ہوتا ہے۔ زور آور کے ساتھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی ساخت اس کے غیر معمولی وزنی ہونے کا پتا دیتی تھی۔ اس نے مجھے گن کا دستہ مارتے ہوئے شاید اپنی تمام تر توانائی صرف کر دی تھی۔

چند قدموں کی محتاط مسافت نے ہی مجھے نڈھال کر دیا اور میں دیوار کی جڑ میں بیٹھ کر بڑی طرح ہانپنے لگا۔ سانسیں معتدل ہوئیں تو میں پھر اٹھ کر چند قدم چلا اور تھک کر بیٹھ گیا۔ باری باری دونوں ہاتھوں کو رسی سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔ پھر چلنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ عمل نہ جانے کتنی مرتبہ کیا۔ جسم سے کافی مقدار میں خون بہہ گیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق میں کم و بیش چوبیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا جس کی وجہ سے جسم پر نقابہ طاری تھی۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ میں اس حالت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

جب میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلنے کے قابل ہو گیا، تب میں نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ صحن خالی تھا۔ حویلی کا چوبی دروازہ بند تھا مگر غیر مقفل تھا اور اندروالی چٹختی کھلی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ باہر سے بند تھا یا کھلا۔

میں نے ایک قدم باہر رکھا اور طائرانہ جائزہ لیا۔ اس حالت میں صحن عبور کر کے حویلی کے دروازے تک جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ کمرے میں موجود شخص کی نظروں میں آ کر میں کسی وقت پکڑا جاسکتا تھا۔ بعید نہ تھا کہ دیکھتے ہی گولی ماری جاتی۔ مجھے جسم پر طاری غیر معمولی

نقابہ نے خبردار کر دیا تھا کہ میں ایسی حالت میں زور آور کی صفی سے دو بدوڑائی میں غلبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ پر چھ سات فٹ اونچی پختہ چار دیواری تھی۔ میں اگر اس دیوار کو پھاند کر باہر نکلتا تو کمرے میں موجود لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ دیوار پر چڑھنا اور دوسری طرف کودنا میرے لیے مسئلہ نہیں تھا مگر بد قسمتی یہ تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی مدد کے بغیر دیوار پر چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔

ایک لخت ایک خیال سوچا۔ جلدی سے کمرے میں آیا اور دیوار میں بنی ہوئی کنکریٹ کی الماری کے ایک تیز دھار کونے پر کھائیوں میں بندھی ہوئی رسیوں کو گڑنے لگا۔ میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ گڑ کا یہ عمل ایک رسی کے ایک ہی مقام پر کیا جائے۔ سوئی رسی جلد ٹھس جاتی ہے۔ میری کوشش بار آور ثابت ہوئی اور سفید رنگ کی سوئی رسی ایک جگہ سے ٹھس کر ٹوٹ گئی۔ چند جھٹکوں کے بعد میرا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔ دوسرا ہاتھ چھڑانے میں محض چند سیکنڈ لگے۔ کمرے کی سرسری تلاشی لی۔ مجھے نہ تو اپنے جوتے ملے اور نہ ہی موبائل فون۔

میں نے دونوں ہاتھیں پھیلائیں، ہاتھوں کو جھٹک کر دوران خون بحال کیا اور بغیر کوئی وقت ضائع کیے دروازے سے نکل کر دبے پاؤں چلتا ہوا حویلی کی چار دیواری تک پہنچ گیا۔ سر میں بہ دستور درد ہو رہا تھا اور مسلسل باور کر رہا تھا کہ میں نازل نہیں ہوں۔ کسی بھی وقت گر سکتا ہوں۔ یہ میری قوت ارادی کا امتحان تھا اور زندگی کی خواہش قوت ارادی کے حلق میں طاقت بخش سیرپ پکار رہی تھی۔

زور آور مجھے بے ہوشی کی حالت میں باندھ کر کچھ زیادہ ہی بے پروا ہو گیا تھا، اس لیے اس نے نہ تو کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا تھا اور نہ کسی کو مجھ پر پہرے دار مقرر کیا تھا۔ اس کی حماقت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے مجھے فرار کی راہ مہیا کر دی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ دیوار کی منڈیر پر رکائے۔ ایسے ہی وقت میں سر میں تیز دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے میرا سر شیشے کا بنا ہوا اور ٹھوک سے پھٹ گیا ہو..... میں نے منڈیر چھوڑ دی اور سر تھام لیا۔ دائیں کان کے انچ بھر اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پٹی کے نیچے بڑا سا انبار محسوس ہو رہا تھا۔ شاید میرے خون کا تیز بہاؤ دیکھ کر زور آور اور صفی کو مجھ پر ترس آ گیا تھا یا وہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے بے ڈھنگے سے انداز میں پٹی کر دی تھی۔ یہی بہت تھا۔

چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہو گئے تو میں نے

مسافر

بھینچ کر منڈیر تھام لی۔ غیر معمولی نقابہ کی وجہ سے مجھے دیوار پر چڑھنے کے لیے اپنی باقی تمام تر توانائی بروئے کار لانا پڑی تھی۔ اس جدوجہد میں میری سانس پھول گئی تھی۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا تو مجھ بھر میں ایسی دیوار پر چڑھ سکتا تھا کیونکہ یہ میرا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

دیوار پر کسی چوپائے کی طرح ہاتھوں پیروں کے بل چڑھ کر میں نے دونوں اطراف کا جائزہ لیا۔ تین چار سو گز کے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے پر مزدور کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ دور سڑک پر اکاڈکا گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت چھوٹی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ جس راستے سے مجھے یہاں لایا گیا تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں پر بھی زور آور سے مدد بھیڑ ہو سکتی تھی۔ مجھے بھٹے کی طرف سے سڑک پر پہنچنا تھا۔ میری دانست میں یہ راستہ نسبتاً محفوظ اور مختصر تھا۔ میں نے خود کو سنبھال کر ناہموار زمین پر چھلانگ لگا دی۔ جونہی میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے، یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر پر بم پھٹ گیا ہو۔ درد کی کٹیلی لہر نے آن واحد میں میرا ذہن ماؤف کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنا سر تھامنے کی کوشش کی مگر میرے بازوؤں کی سکت جواب دے گئی اور میں تیزی سے نیم ڈھلوانی جگہ پر لڑھکتا گیا اور ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا۔ کوئی پانچ منٹ تک میں خالی الذہنی کی کیفیت میں چاروں شانے چت پڑا رہا۔

اس مایوس کن کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ سر درد میں کمی ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ میری خوش بختی عروج پر تھی ورنہ عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ انوار گرنے والے ایسی بے پروائی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس طرح کی احمقانہ بے پروائی کا مظاہرہ زور آور اور صفی نے کیا تھا۔ اس کی کار کی ڈکی کا کچھ حصہ بڑے دروازے کے پرے دیوار سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مکان کے اندر موجود تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انیس ڈرائیور شہر میں یا کسی اور جگہ پر چھوڑ کر واپس چلا آیا ہو۔

میں شکار پر نکلنے والی مٹی کی طرح آہٹ پیدا کیے بغیر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے پچھواڑے کی طرف آیا۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی اینٹوں کے لیے بنائے گئے بڑے چھوٹے گڑھوں کے بیچ بھٹے تک جانی ہوئی دکھائی دی۔ میں اس پر چل پڑا۔ ہر قدم پر سر میں دھمک پڑتی تھی اس لیے میری رفتار خاصی سست تھی۔ تقریباً سو فٹ دور جا کر میں نے مڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی

نہیں تھا۔ یعنی کسی کو بھی میرے نکل بھاگنے کا علم نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں میں اس مکان سے دور ہوتا جا رہا تھا، میرے سر کا درد کم ہوتا جا رہا تھا۔ شدید سردی میں زمین پر گزاری گئی رات نے میرے جسم کو اکڑا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دھوپ میں چلنے سے دوران خون بہتر ہو رہا تھا اور بدن کی نکور ہو رہی تھی۔ بھٹے کے برابر میں پہنچ کر میں بائیں ہاتھ مڑ گیا کیونکہ بھٹے کے قریب ایک قدرے بلند جگہ پر کئی پتھیرے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھے۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی مشکوک ہو جاتے اور شور مچا دیتے۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھے پکڑ کر بھٹے کی انتظامیہ کے پاس لے جاتے جو مجھے پولیس کی تحویل میں دے آتی۔ میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنسا نہیں چاہتا تھا، اس لیے میں نے ایک لمبا چکر کا نا اور ڈیڑھ دو سو فٹ لمبے اور پانچ فٹ کے لگ بھگ گہرے گڑھے میں سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھا۔ بھٹوں کی وجہ سے چار سو فٹ زمین میں چھ سات فٹ تک کی ناہمواری موجود تھی۔ کوئی خطہ چار فٹ گہرا تھا، کوئی چھ فٹ تو کوئی دو تین فٹ بلند..... پندرہ منٹ بعد میں رابطہ سڑک پر پہنچ گیا۔ اب مجھے کسی سے شہر کے لیے لفٹ لینا تھی۔ یہ گر مشکل نہیں تو آسان کام بھی نہیں تھا۔ لوگ تو بے ضرر دکھائی دینے والے اجنبیوں کو لفٹ دینے سے ڈرتے ہیں جبکہ میں اجنبی ہونے کے ساتھ ساتھ شدید زخمی بھی تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے شہر کی مخالف سمت میں جانے والے دو موٹر سائیکل سواروں کو روکنے کا اشارہ کیا۔ ارادہ تھا کہ ان سے شہر جانے والی سڑک پر پہنچانے کی درخواست کروں گا۔ وہ آہستہ ہوئے، قریب پہنچ کر مجھے دیکھا اور پھر ریس دبا کر آگے نکل گئے۔

شہر کی طرف جانے والے ایک اونٹ ریوڑے والے نے دور سے پوچھا اور ”خیر تاں ہے جوان..... کیوں رت نال رنگیا کھڑا ہیں؟“

(خیریت تو ہے جوان! کیوں خون سے رنگے کھڑے ہو؟) میں نے سرانگی میں اسے بتایا کہ مجھے اینٹوں پر گرنے سے سر میں سخت چوٹ آ گئی ہے اور شہر کے اسپتال جانا چاہتا ہوں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی۔

اسی اثنا میں اس نے میرے سامنے ریوڑا روک دیا۔ پھر ہمدردی سے بولا۔ ”آہیہ بھی سوہنا..... شہر آبی سڑک تاگیں میڈے کٹھے جل پیا، اُنھوں لاری تے بیہوش تھیں۔“ (سوہنا! آکر بیٹھ جاؤ۔ شہر والی سڑک تک میرے ساتھ چلو، وہاں سے بس میں سوار ہو جانا)



کرا سنگ کرنے والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہ میں نہ آسکوں۔ لیٹنے کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد ریڑھے بان نے کہا۔ ”اتر جاؤ جوان! شہر والی سڑک آگئی ہے۔ جا کر اس طرف کھڑے ہو جاؤ۔ لاری یا وین آئے تو اس پر چڑھ جانا۔“

ساتھ ہی اُس نے ریڑھ روک کر مجھے کمال محبت سے سہارا دے کر نیچے اُتارا اور اونٹ کو ہانک کر بلند آواز میں بولا۔ ”اللہ دی امان ہووی سوہنا! غریب داؤس! ایہو جتنا ہا.....“

(غریب کی استطاعت یہی تھی)

میں سڑک عبور کر کے دوسرے کنارے پر آن کھڑا ہوا۔ گزشتہ دن زور آور نے یہیں سے ٹرن لیا تھا۔ خیال آیا کہ مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ زور آور یا اس کا کوئی ساتھی کسی بھی وقت یہاں سے گزرتا تو میں نظروں میں آسکتا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں سڑک سے کوئی پانچ سات قدم دور ایستادہ ایک غیر معمولی پھیلاؤ والے پرانے کیکر کے تنے کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے شہر کی مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک دکھائی دیتی تھی مگر شہر سے آنے والا شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں اس وقت دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ زور آور کے آنے اور مجھے دیکھ کر رُکنے سے پہلے ہی کوئی بس آجائے جس میں بیٹھ کر میں شہر سدھار جاؤں۔ ہر انسان اپنے تحفظ اور فائدے کی دعا مانگتا ہے۔ کبھی دعا قبولیت کی سند حاصل کر لیتی ہے اور کبھی عرش سے ناکام لوٹ آتی ہے۔ دینے والا قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت رکھتا ہے۔ جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میری دعا کے قبول نہ ہونے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی مگر میں نہیں جانتا تھا۔ تب میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا جب ڈارک بلوکلر کی کار مکان کی طرف سے آئی، ٹرن لے کر شہر کی طرف جاتے جاتے رُک گئی اور اس میں سے زور آور نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میری جانب بڑھتا چلا آیا۔ میری ساری خوش گمانی مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئی کیونکہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا جو اُس نے کل پہن رکھا تھا۔

اسے دیکھ کر میں بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہشت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا کہ اُس نے مجھے کیسے دیکھ لیا تھا؟

اگر اس کے ہاتھ میں وہ منحوس گن نہ بھی ہوتی جو صفی نے میری کپٹی پر ماری تھی، میں تب بھی بھاگنے کی ہمت نہیں

اس نے چار ٹائروں والے ریڑھے پر کچی اینٹیں لاد رکھی تھیں جنہیں کسی بھٹے پر اتارنے جارہا تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر ریڑھے پر سوار کرایا اور اپنے ساتھ اینٹوں پر بٹھالیا۔ وہ پیدائشی مزدور تھا اور محض چالیس کی عمر میں پہنچ کر بوڑھا ہو گیا تھا۔ مزدوروں کی زندگیاں جلد تھک کر اپنی چادر جھریوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔

اس نے مجھ سے چوٹ آنے کا ماجرا دریافت کیا تو میں نے ایک من گھڑت کہانی سنا دی جسے سن کر وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ”مزدوری بھی اس دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ پسینے کے ساتھ خون بھی بہانا پڑتا ہے۔ مالک کو کام سے غرض ہوتی ہے۔ اسے ذرا ترس نہیں آتا۔ کیا تھا جو تمہیں کار میں بٹھا کر شہر لے جاتا اور پٹی کروا دیتا۔ سچا سائیں بھی ایسے بے رحم لوگوں کی جھولیاں بھرتا رہتا ہے۔“

میری کہانی نے اُس کا کوئی زخم کرید کر عیاں کر دیا تھا۔ وہ تاسف بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ ”میں صبح سے شام تک اینٹیں ڈھوتا ہوں تب کہیں جا کر دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ پر اللہ کا شکر ہے۔ وہ کھانے کو دے رہا ہے۔ یہی بڑی بات ہے۔ پتا نہیں ہماری اتنی نیکیاں بھی ہیں یا نہیں۔“ میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کا خلوص اور ہمدرد رویہ مجھے جواب دینے پر مجبور کر دیتا تھا اور ہاں، ہوں میں جواب دیتا رہا۔ بھٹوں کے بیچ والی کچی سڑک کو دیکھ کر مجھے زور آور یاد آ گیا جو مجھے باندھ کر، میری طویل بے ہوشی سے مطمئن ہو کر شہر چلا گیا تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا کہ اس سے راستے میں کہیں مڈ بھیڑ ہو سکتی تھی۔

اگر میرے فرار کے وقت وہ مکان کے اندر تھا تو اسے کسی نہ کسی وقت میرے تعاقب میں نکلنا تھا۔ یہ طے تھا کہ جو نمی اُسے میرے فرار کا علم ہوگا، وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے بھاگے گا اور نظر آنے پر مجھے دیوچ لے گا۔ میں اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے بھاگ نکلنے پر وہ بُری طرح مشتعل ہو چکا ہوگا اور مجھ پر بدترین تشدد کرے گا۔

زمین زیادہ ٹھنڈی نہیں تھی مگر میرے ننگے پیروں کو بخ بستہ محسوس ہو رہی تھی۔ محسوس ہوا کہ میرا جسم بخار پکڑ چکا تھا۔ پیاس اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر میں اس وقت سوائے انتظار کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ زور آور نے میرا موبائل فون چھین لیا تھا ورنہ میں میرا شاہ یا پیاجی کو فون کر کے بلوا سکتا تھا۔

بہ طور احتیاط میں اینٹوں پر اس انداز میں لیٹ گیا کہ



کر سکتا تھا اس لیے کیکر کے تنے کے ساتھ چٹ کر کھڑا رہا۔ وہ بے خوفی سے میرے بالکل قریب آ گیا اور خلاف توقع مسکرا کر بولا۔ ”شکر ہوا کہ تم مجھے اُس خلا میں سے نظر آ گئے ورنہ مجھے تمہاری تلاش میں سارا شہر کھنڈنا پڑتا۔“ اس نے سڑک کی جانب ایک ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مکان کی طرف سے آنے والی سڑک اور بڑی سڑک کے کنارے اُگی ہوئی بے ترتیب جھاڑیوں میں قدرتی طور پر ایک خلا بنا ہوا تھا جس کے سبب لنک روڈ پر آنے والے شخص کی نگاہ چند ثانیے کو کیکر کے تنے پر پڑتی تھی۔ اس نے مجھے وہیں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ بولا۔ ”چلو شاہاش! میری کار کی طرف..... میں تمہاری جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا پیارے.....“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”زور آؤ! تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جاؤ! مجھے چھوڑ دو۔ میرا شہر میں پہنچنا بہت ضروری ہے۔“

اس نے مخصوص انداز میں دانت بجائے اور زہریلے لہجے میں کہا۔ ”دشمنی نہیں ہے..... ہیں؟ پھر یہ مارا ماری کیوں ہو رہی ہے؟“ اس نے گن کی نال کا رخ میرے سینے کی طرف کیا اور اچانک دانت پیس کر درشت لہجے میں کہا۔ ”کتے کے بچے! اگر تم میرے ساتھ نہیں چلتے تو پھر اوپر جاؤ..... جنت میں یا جہنم میں.....“

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے گن کی لاک پن ہٹائی اور غرایا۔ ”چل رہے ہو یا.....؟“

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور ناچار چل پڑا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آیا اور میری کمر سے گن کی نال نکال کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چکنی مٹی میں دھنسی ہوئی ایک اینٹ کی ٹنگی ہوئی نوکیلی ٹکڑ سے زور آؤر کوٹھو کر لگی۔ وہ اوہ کی آواز نکال کر بڑی طرح لڑکھڑایا۔ مجھے اس کے گرنے کا فوراً اندازہ ہو گیا تھا اس لیے جھٹ سے پلٹ پڑا۔ دیکھا کہ وہ ہاتھوں کے بل زمین سے اٹھ رہا تھا۔ میرے لیے مزاحمت کا سنہرا موقع یہی تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پوری قوت سے اُس کے منہ پر لات دے ماری۔ میرے برہنہ پاؤں کا بالائی حصہ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ فٹ بھراونچا اچھلا اور پہلو کے بل ڈھلوان پر گر اور لڑھک گیا۔ چوٹ تو مجھے بھی آئی تھی اور یوں لگا تھا جیسے پورے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی ہو مگر قابل برداشت تھی۔ میں نے سرعت سے اٹھنے کی کوشش میں گن زور آؤر پر

چھلانگ لگا دی۔ میرے دونوں گھٹنے اُس کی کمر پر لگے۔ وہ کراہ کر پیٹ کے بل دوبارہ زمین پر گر گیا۔ کیکر کے کانٹوں کی ایک سوچی شاخ زمین پر پڑی تھی جس کے نوکیلے کانٹے اُس کے پیٹ اور چھاتی میں چبھ گئے۔ وہ دھاڑا اور پہلو کے بل کروٹ لے کر اپنی گن سنبھالنے لگا۔

وہ میرا نشانہ لینا چاہتا تھا مگر مجھ پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ہوا میں بلند کیں اور اُس کی ٹانگوں کے نیچے دونوں ایڑیاں دے ماریں۔ وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا اور کراہنے لگا۔ میں نے اس کی لمحائی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گن پر ہاتھ ڈال دیا۔

مجھے کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صفی کی طرف سے بھی خطرہ لاحق تھا جو ابھی تک میدان میں نہیں اُترا تھا مگر وہ کسی بھی وقت میرے عقب میں آ کر مجھے بے بس کر سکتا تھا۔

زور آؤر نے جھنکا دے کر گن چھڑا نا چاہی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا مکا اُس کی چھاتی پر مارا اور عین اُسی لمحے گن کو جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔ وہ غافل نہیں تھا اس لیے گن اُس کی گرفت سے نہ نکل پائی۔ میں نے جھنجھلا کر اُس پر دیوانہ وار چڑھائی کرتے ہوئے مکوں کی اندھا دھند یلغار کر دی۔ قریب تھا کہ میں اُس سے گن چھیننے میں کامیاب ہو جاتا مگر اُس کا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ اچانک میری کپٹی کے عین زخم پر آن لگا۔ یہ میری بد قسمتی تھی ورنہ میں اسے مدافعتی رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر چکا تھا۔ جونہی اُس کا ہاتھ میرے زخم پر پڑا، درد کی کٹیلی لہر میرے رگ و پے میں پھیل گئی۔ لمحہ بھر میں میرا وجود بے جان ہو گیا اور میں کوکھوں کے بل زمین پر گر گیا۔

زور آؤر کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی گن پر میری گرفت ختم ہو گئی اور میں بڑی طرح تڑپنے لگا۔ زور آؤر کو سنبھالنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ اس نے میری رانوں اور پسلیوں میں گن کے بٹ کی کئی خربیں لگا میں جن کی تکلیف سر کے زخم کی دھن میں دب کر رہ گئی۔ اشتعال کم ہوا تو اُس نے کپڑے جھاڑے اور مجھے گریبان سے پکڑ کر گاڑی کی طرف گھینٹنا شروع کر دیا۔ میں بلند آواز میں کراہ رہا تھا اور اُس سے اپنا گریبان چھڑانے کی بے جان کوشش کر رہا تھا۔ میری بد قسمتی تھی کہ اس دوران وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خام خیالی ہی تھی کہ ادھر آن نکلنے والا کوئی میری مدد کرے گا ورنہ لوگ پرانے پھندے میں ٹانگ نہیں اڑاتے بلکہ آنکھیں پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔

زور آؤر مجھے گھینٹنا ہوا سڑک تک لایا۔ اس دوران کار ریورس ہو کر موڑ کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ جونہی عقبی دروازہ کھول کر زور آؤر نے مجھے گاڑی میں ٹھونسا، صفی استہزائیہ قہقہہ اُچھال کر بولا۔ ”بڑے ڈھیٹ انسان ہو۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دس پندرہ دنوں تک حرکت کے قابل نہیں رہو گے مگر تم نے مکان سے بھاگ کر کمال کر دکھایا ہے۔ چلوں زور آؤر؟“

”چلو ڈیر! دیر ہو رہی ہے۔“ زور آؤر نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

میری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے دائرے بن رہے تھے اور سمٹ کر نقطے کی شکل اختیار کر کے غائب ہو رہے تھے۔ درد کم ہو گیا تو پسلیاں دکھنے لگیں۔ میں نے دانت بھینچ لیے۔ گاڑی چل پڑی۔ میں نے زور آؤر کی طرف دیکھا۔ وہ یہ ظاہر بے پروا دکھائی دے رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کی گن کی نال کا رخ میری جانب تھا اور اس کی انگلی ٹرانسکریپر دباؤ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر محنت کے بعد بھی اس کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دکھ ہوا کہ میری دوسری محنت بھی اکارت چلی گئی تھی۔ تبھی سیٹ پر سر نکالیا اور آنکھیں موند لیں۔ مجھ پر یک لخت نقاہت اور مایوسی نے شدید حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں میرے فرار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور میں سنی ان سنی کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے موبائل فون کا بزر بجا۔ صفی نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا، کال ریسیو کی اور بولا۔ ”ہاں استاد! بتایا تو تھا کہ کام ہو گیا ہے۔ پھر کیوں فکر مند ہو؟“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ آج آؤ، کل یا ہفتہ بعد..... اگر تم چاہو تو ابھی شہر سے نکل پڑو۔ مال تیار ہے۔ تمہیں یہاں رکنا نہیں پڑے گا۔“ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا پھر فون بند کر دیا گیا۔ صفی نے منہ بنا کر فون سیٹ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

زور آؤر نے پوچھا۔ ”استاد کا فون تھا؟“ ”ہاں! اسی کی زبان کھجلا رہی ہے۔ خود تو آج تک کچھ کر نہیں پایا مجھے سمجھا رہا تھا کہ یہ پڑا خطرناک شخص ہے..... باہ! وہ نہیں جانتا کہ جسے خطرناک شخص قرار دے رہا ہے وہ اس وقت زور آؤر کے قدموں میں بدل کتے کی طرح ڈم دبائے بیٹھا ہے۔“

زور آؤر نے تھک آ میز نظروں سے مجھے دیکھا اور

کہا۔ ”شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ موبی کے قاتل کے بارے میں..... ہیں؟ سنو! تمہارے پاس ایٹم بم بنانے کا نسخہ نہیں ہے جس کی مجھے ضرورت ہو۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”تو پھر مجھے اغوا کیوں کیا ہے تم نے؟“ وہ زہر خندانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”شہر یار! مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنے قیمتی شخص ہو۔ تمہارا ایک چاہنے والا بڑا بے تاب ہو رہا ہے تمہیں دیکھنے اور اپنا مہمان بنانے کے لیے۔ اس کا زور نہیں چلا تو اُس نے تمہیں مجھ سے خرید لیا۔ جانتے ہو کتنے میں؟“

مجھے ذہنی جھٹکا سا لگا۔ حیرت سے دریافت کیا۔ ”کتنے میں؟“ ”دس بیٹیوں میں..... میرا مطلب ہے کہ پورے دس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ”دس بیٹیاں ادھر، تم ادھر..... کہو! کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔“

”کون ہے وہ؟ میرا مطلب ہے میرا سودا کرنے والا کون ہے؟“

وہ بولا۔ ”جلد پتا چل جائے گا۔“ وہ فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میری استعجاب انگیز صورت سے حظ کشید کر رہا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”زور آؤر! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے اب میرے الفاظ کی تائید کر دی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کون اتنی بڑی رقم کے عوض مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر یہ واضح ہے کہ وہ میرا بھی خواہ نہیں ہے، میرا دوست نہیں ہے۔ وہ میرا دشمن ہے اور اچھا سلوک نہیں کرنا چاہتا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، دیکھا جائے گا مگر تم کان کھول کر سن لو۔ تم نے اپنے لیے بہت بڑی مصیبت خرید لی ہے۔ میں کون ہوں، میرے پیچھے کون لوگ ہیں، یہ تمہیں بخوبی علم ہے۔“

اس نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”ارے واہ بھی واہ! زور آؤر کو دھمکی دیتے ہو، اسے جسے دیکھ کر ہوا اپنا رخ بدل لیتی ہے۔ میری خواہش ہوگی کہ تم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے آؤ اور میں تمہاری سپاری پکڑوں..... رہی بات میرا شاہ کی، تو تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اس حرام زادی ٹھیکہ کی وجہ سے میں اُسے رعایت دیتا آیا ہوں۔ وہ مجھے..... ہائے..... بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک دن میری



ہاتھوں میں جھولے گی، اسی امید پر اس کتے کے پتلے پر ہاتھ نہیں ڈالتا ورنہ وہ کیا اور اُس کی اوقات کیا.....“

میں نے اُسے تاؤ دلایا۔ ”اگر یہی بات ہے تو پھر مجھے میرا یا اپنا موبائل فون دو، میں اُسے کال کرتا ہوں اور تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔“

وہ بہت مکار ذہن کا مالک تھا۔ دانتوں کو مخصوص انداز میں بجانے کے بعد گویا ہوا۔ ”تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا مگر وقت آنے پر..... ابھی نہیں۔“

کار نے اینٹوں کے بھٹوں کے درمیانی راستے پر ٹرن لیا۔ مجھے قسمت وہاں لے کر جا رہی تھی جہاں سے میں اپنی قوت ارادی کے بل پر نکل آیا تھا۔ زور آور کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور بے پروائی کے سبب مجھے نکلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ دوبارہ مجھے موقع دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانے اور دھمکانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی آنکھوں پر دس لاکھ روپے کی پٹی بندھی تھی۔

دھول اڑاتے راستے پر کار بچکولے لے رہی تھی اور میں اُس تا جرد فتن کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے زور آور کو میرے اغوا کے لیے دس لاکھ روپے کی خطرہ رقم دی تھی۔ ظاہر تھا کہ میاں دلبر حسین اور اس کے غنڈے رنگو قسائی کے علاوہ کون ہو سکتا تھا؟ میری وجہ سے انہیں نہ صرف دو کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ انہیں اپنے تین قیمتی بندوں اور نئی سرف یک آپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ جو شخص اپنی جنسی تسکین کی خاطر کروڑوں روپے لٹا سکتا تھا وہ اپنی آنا کی تسکین پر دس لاکھ خرچ کرتے ہوئے کیوں تذبذب کا شکار ہوگا۔

کار دھول سے اُٹے ہوئے مکان کے چوٹی دروازے پر رُک گئی۔ زور آور نے مجھے کار سے اُترنے کا اشارہ کیا اور گن پوائنٹ پر رکھ کر مکان کے اندر لے آیا۔ صحن میں کھڑا ہو کر زور سے چلایا۔ ”دو چار پائیاں نکال دو، اور صحن میں۔“

جس بکرے میں سے مشین کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس سے ایک چونتیس چالیس سالہ شخص برآمد ہوا۔ اس کا لباس نہ صرف میلا تھا بلکہ مختلف رنگوں سے لٹھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے سے پر تنگ مشین پر کام کرنے والا کار گیر لگتا تھا۔ اس نے نسبتاً چھوٹے کمرے سے باری باری دو چار پائیاں نکالیں، دیوار کے قریب متوازی بچھا لیں اور زور آور سے مودبانہ انداز میں مزید کسی خدمت کا حکم چاہا۔

زور آور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”اے پانی پلاؤ۔“

وہ نکلے سے میرے لیے سلور کے ایک رنگ زدہ گلاس میں پانی بھر لایا۔ مجھے زور کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے گلاس لیوں سے لگا یا اور چاہا کہ ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتار دوں مگر خشک حلق نے مزاحمت کر دی۔ زبردست اُچھو لگ گیا۔ کھانسی کا دورہ سا پڑا۔ کھانتے ہوئے سر میں شدید اور نہایت تکلیف دہ ٹیسس اُٹھیں۔ گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی زمین پر بہہ گیا۔

زور آور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”سکون سے نہیں لی سکتے تھے کیا؟ اوئے جاؤ! ایک گلاس اور بھر لاؤ اس جانور کے لیے۔“

وہ پھر گلاس بھر لایا۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرے۔ معدے میں عجیب سی اینٹھن ہوئی۔ غیر معمولی طویل دورانیہ بھوک اور پیاس کے عالم میں گزرا تھا جس کی وجہ سے شاید جسم کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔

زور آور طنز پر مسکراہٹ اُچھال کر بولا۔ ”تمہاری شکل بتاتی ہے کہ تم خاصی تکلیف میں ہو۔“

میں نے اُسے دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر بڑی ہوئی دوسری چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں صحنی اُس کے پیچھے سیکورٹی گارڈ کی طرح چوکس کھڑا تھا۔

”کیا سر کا زخم درد کر رہا ہے؟“

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں بخار ہو گیا ہے؟“

”ہاں! نمیر پچر بھی ہے۔“

اس نے گلاس تھامے کمرے کی طرف جاتے ہوئے شخص کو آواز دی۔ وہ قریب آ کر مودبانہ انداز میں کھڑا ہوا تو زور آور نے کہا۔ ”ہمارے لیے چائے بنا لاؤ۔ کیا تمہارے پاس بسکٹ ہیں؟“

وہ بولا۔ ”بسکٹ تو نہیں ہیں البتہ ہم نے ناشتے کے لیے پاپے رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں تو وہ لے آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، لے آؤ۔ کوئی گولی شولی بھی لیتے آنا، درد بخار کی۔“

وہ چلا گیا تو زور آور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اگر چاہو تو چار پائی پر لیٹ جاؤ۔“

اس کی آواز سے طنز کے ساتھ ساتھ رحم کا موبہم سا

جذبہ بھی جھانک رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشکش سے قائلہ نہیں اُٹھایا اور بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

وہ اور صحنی آپس میں محو گفتگو ہو گئے۔ مشین مین چائے تیار کر لایا۔ اس نے دیہاتی طرز کا پیالہ اور چند پائے میرے پہلو میں چار پائی کے بان پر رکھ دیے۔ دوسرے چکر میں پانی اور پیرا سینا سول کی گولیاں لے آیا۔ میں نے دو گولیاں حلق میں پانی کے ساتھ اُتار لیں۔ میرے جسم کو اس وقت ان کی شد ضرورت تھی۔ پھر میں نے ایک ”پاپا“ اُٹھایا، چائے میں ڈال دیا اور پچھلے تجربے کے پیش نظر تھوڑا سا منہ میں ڈالا۔ منہ کا ذائقہ عجیب تھا اس لیے پاپا بھی بد مزہ لگا۔ چائے کا گھونٹ بھرا، وہ بھی بے مزہ لگی۔ میں نے اوپر تلے تین چار پاپے پیٹ میں اُتار لیے اور چائے کا پیالہ خالی کر دیا۔

زور آور بڑے اٹھماک سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں صحنی کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے اسکرین کو دیکھا، پھر زور آور سے مخاطب ہوا۔ ”استاد کا فون ہے، کیا کہوں اُسے؟“

زور آور بولا۔ ”اُسے کہہ دو کہ مال تیار ہے۔ کسی بھی وقت آ کر وصول کر لے۔ اُسے سمجھا دو کہ بہتر یہی ہے کہ وہ ابھی آ جائے تاکہ ہم ابھی فارغ ہو جائیں۔“

صحنی نے کال ریسیو کی۔ کان میں بولنے والے کو سن کر بولا۔ ”استاد! کام ہو گیا ہے۔ زور آور جس کام کا تہیہ کرتا ہے، اسے مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ تم بال لینے کے لیے آ جاؤ۔ اور ہاں! یاد سے باقی کی آدھی رقم بھی ساتھ لے آنا۔ پوری پانچ پٹی مال.....“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر وہ کھل کر ہنسا اور اوباشانہ انداز میں بولا۔ ”ایسے طعنے نہ دیا کرو بڑے استاد! ہم سب لوگوں کا دین دھرم پیسا ہے۔“

ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی اور زور آور سے مخاطب ہوا۔ ”وہ سالاریوں خوش ہو رہا ہے جیسے خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔“

”کب آ رہا ہے؟“

”آدھے گھنٹے میں پہنچنے کا کہہ رہا ہے۔“

زور آور نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا حلیہ پہلے سے تبدیل ہو کر موبی جیسا ہو گیا تھا۔ لمبے سیاہ بال جنہیں گردن کے پیچھے پونی یا کلب میں باندھ رکھا تھا، لمبی قلمیں اور کلین شیو چہرہ..... کھلی شرٹ سے جھانکتا ہوا کسرتی بدن، گلے میں جھولتا ہوا سنہرا لاکٹ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ داہنی کلائی میں غیر معمولی موٹائی والا

کڑا..... دو تین مرتبہ اُس سے پنجہ آزمائی مرحلہ درپیش آیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ نام کا ہی زور آور نہیں تھا بلکہ اس کے فولادی اعصاب میں غضب کا زور چھپا ہوا تھا۔

پیٹ میں کچھ بڑے تو پر ماتما کی سوچتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جسم میں کچھ توانائی آئی تو ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ سر کا درد بہ دستور بے چین کر رہا تھا۔ میں نے زور آور اور صحنی کو باری باری دیکھا۔ دونوں نے مختلف انداز میں مجھے کور کر رکھا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دونوں کو ایک ہی وقت میں ڈانچ دے کر بچ نکلتا۔

زور آور نے شاید میری قلبی کیفیت بھانپ لی تھی، بھی زہریلی ہنسی ہنسا۔ ”شہر یار! شراب بڑی ظالم چیز ہے۔ تمہاری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد ہم نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ گہری نیند سو گئے تھے۔ تبھی تمہیں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ مگر اب ہم جاگ رہے ہیں۔ اگر تم بہادری دکھانے کا ارادہ رکھتے ہوئے تو شوق سے کر گزرو، جو کرنا چاہتے ہو۔ ایسی صورت میں، میں تمہیں زندگی کی ضمانت نہیں دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”شکریہ! میں اپنے خریدار کو زندہ آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تمہاری میڈم کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اختصار سے جواب دیا۔

”کیا تم نے اُس کا گروپ جان کر لیا ہے؟“

میں نے اُسے سرد نگاہوں سے گھورا، کہا۔ ”میں اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”ہوں.....“ اس نے ہنکارا بھرا، بولا۔ ”کسی دن وہ ایسے ہی شکل پر بے بسی سجائے میرے قدموں میں بیٹھی ہوگی جیسے تم بیٹھے ہو۔ وہ بھی زندگی کی بھیک مانگے گی۔ کیوں صحنی؟“

صحنی نے جھٹ سے کہا۔ ”وہ دن زیادہ دور نہیں ہے زور آور!“

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری ”خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”اگر تم اس وقت تک زندہ رہے تو ضرور دیکھ لو گے کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا اپنا پختہ ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ویسے بھی زور آور کے آگے اُس حرافہ کی.....“

میرا دماغ سلگ اُٹھا۔ میں نے تنہی انداز میں انگلی اُٹھائی اور کرخت لہجے میں کہا۔ ”اس کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی گندی زبان پر نہ لانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

اس نے خشک کر مجھے بے یقینی سے دیکھا پھر بلند ہتھکڑی لگا پائنتے بولے۔ ”ابے دیکھ صحنی! یہ..... ہا ہا..... یہ بھتیجی کا،



سالہ..... یہ مجھے کیا کہہ رہا ہے..... ہا ہا..... سنو! میں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ حرافہ نہیں ہے..... بڑی نیکیو کار اور پارسا خاتون ہے۔ فلاحی کام کرتی ہے وہ..... اس جیسے ان گنت یتیموں کو بھی پالتی ہے..... ہا ہا!“

میرے تن بدن میں آگ بھڑکی۔ جی چاہا کہ سودو زیاں کے شیار کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس کی ٹکا بوٹی کر دوں۔ یہ وقت خود پر قابو پاتے ہوئے درشت انداز میں کہا۔ ”دیکھو زور آور! وہ کیا کرتی ہے؟ وہ کیسی ہے؟ یہ فضول باتیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ میری باس ہے۔ یہ بھی جان لو کہ میں اس کے خلاف کوئی لفظ سننا گوارا نہیں کرتا۔“

وہ مزہ لے کر بولا۔ ”صرف باس؟ بھی وہ تو خوب صورت جوانی دیکھ کر لپکانے والی عورت ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے تمہیں بھی ایک آدھ بوسہ دے کر شباب کی لولی پاپ چوسنے پر لگا دیا ہو..... کیوں صفی! ایسا ہی کرتی ہے ناں وہ.....“

میدم کوئی پارسا عورت نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے گینگ کی چیف باس تھی۔ اس کے اشارے پر بیسیوں افراد جان ہٹھکی پر رکھ کر میدان میں نکل آتے تھے۔ اس کی مٹھی میں ان گنت ہوس کے پجاری سرکاری افسر دے ہوئے تھے جن کی ہوس کے جبروں میں وہ مختلف ذائقوں کا بخشی راتب ڈالتی تھی اور ہٹھکی پر سرسوں جمالتی تھی مگر زور آور کے منہ سے اس کا یوں تذکرہ میرے تن بدن میں آگ لگا چکا تھا۔

میں نے سر میں مسلسل دھڑکنے والے ہولناک درد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برقی مستعدی سے زور آور پر چھلانگ لگا دی۔ اسے میری طرف سے ایسی دلیرانہ حرکت کی توقع نہیں تھی جس کی گن سے گولی نہیں نکل سکی اور میں اس پر جا پڑا۔ میرا گھٹنا اس کی چھاتی پر لگا اور وہ چار پائی پر کمر کے بل گر گیا۔ اس کا سر چار پائی کی بانہ پر لگا۔ چوٹ خاصی شدید تھی جس کی وجہ سے اس کے حلق سے کراہ کے ساتھ مغلظات ابل پڑیں۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دے بغیر کموں اور گھٹنوں کی مسلسل ضربوں پر رکھ لیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نہ صرف چت ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی جسے میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا۔ صفی مجھ پر بہ آسانی فائر کر سکتا تھا مگر شاید اس نے اس ڈر سے گولی نہیں

چلائی تھی کہ زور آور کو نہ لگ جائے۔

زور آور کو بے بس دیکھ کر وہ پستول لہراتا ہوا چار پائی کے قریب آیا اور مجھے گالی دے کر غرایا۔ ”نیچے اتر دو ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میں اس دوران میں نہ صرف زور آور کی چھاتی پر بیٹھ چکا تھا بلکہ میں نے عجیب ساخت کی گن کی تالی اس کی پیشانی پر عین دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ دی تھی۔ میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ”پستول پھینک دو ورنہ.....“

صفی اور زور آور کے چہرے ایک دم متغیر ہو گئے۔ صفی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے پٹی ہوئی بسا کو دیکھنے لگا۔ میں غرایا۔ ”میں نے کہا ہے کہ پستول پھینک دو ورنہ زور آور اور کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“

زور آور نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”صفی! اس کی بات مان لو۔“

میری تمام تر توجہ زور آور پر مرکوز تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا اور مجھ پر نظریں ثبت کیے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ مجھے یہ خوش گمانی نہیں تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ موقع کے انتظار میں تھا جبکہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

جونہی صفی نے پستول اپنے پیروں میں زمین پر پھینکا، میں نے کہا۔ ”دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ایسے ہی وقت میں مکان کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ یہ سوچ کر کہ میرے خریدار پہنچ گئے ہیں، میرے جبرے پہنچ گئے۔ میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے زور آور کی چھاتی سے اترنا چاہا مگر عین اسی وقت صفی اپنے پستول کی طرف لپکا اور اس نے بے خوفی سے اٹھا لیا۔ اس کی یہ احمقانہ حرکت میری سمجھ میں تب آئی، جب میں نے اپنے آپ کو بری طرح پھنسا ہوا پایا۔ میں اگر اس پر فائر کرتا تو زور آور میری گرفت سے نہ صرف نکل جاتا بلکہ گن پر ہاتھ بھی ڈال دیتا۔ اگر اسی پوزیشن میں بیٹھا رہتا تو پھر باہر سے آنے والے میرے سر پر پہنچ جاتے۔

زور آور میری ذہنی کشش کو بھانپ کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”اب کیا ہو گا شہر یار! تم مجھے گولی مار کر بھی یہاں سے زندہ نہیں نکل سکتے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ گن پھینک دو۔“

مجھے فیصلہ کرنے میں محض ایک لمحہ لگا اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ کو حرکت دی اور صفی کا نشانہ لے کر فائر کر

مسافر

رہا۔ ساتھ ہی میں بائیں ہاتھ لڑھک گیا۔ یہ ایک وقت دو چھ فضا میں بلند ہوئیں اور میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر چار پائی سے اتر گیا۔ میری چلائی ہوئی گولی صفی کے پیٹ میں اتر گئی تھی اور وہ پستول پھینک کر دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے دہرا ہو گیا تھا۔ دوسری چیخ زور آور کے حلق سے نکلی تھی۔ صفی کی چلائی ہوئی گولی اس کی ران میں سوراخ کر گئی تھی اور وہ چار پائی پر گھٹنے سے دو تین انچ اوپر ران کو دونوں ہاتھوں میں کھینچ کر تڑپ رہا تھا۔

میں نے صفی کے جھکے ہوئے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے منہ سے دردناک کراہ خارج ہوئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے زور آور کی طرف گن کا رخ کیا۔ وہ اس دوران چار پائی پر میری جانب منہ کر کے دوڑا تو بیٹھ گیا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”نیچے اتر آؤ جان من! یہ نہ ہو کہ مجھے مجبوراً تمہارے سر میں بھی سوراخ کرنا پڑے۔“

اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور دانت بھینچے ہوئے تھے۔ وہ درد کی شدت کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آہستہ سے نیچے اتر آ کھڑا ہوا پھر بے ساختہ جھک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ران پر رکھا ہوا تھا۔

مجھے وقت کے زیاں کا احساس بے کل کر رہا تھا، تبھی غرا کر کہا۔ ”یہ ڈراما بازی بند کرو زور آور..... سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔“

وہ کھڑا ہوا۔ چند قدم وائیں ہاتھ چلا۔ پھر رک گیا۔ صفی کو چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ مجھے خاطر میں لائے بغیر آن واحد میں آخری سانسیں لیتے ہوئے صفی پر جھلکا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کی چالاکی کی تب سمجھ آئی، جب وہ اچانک پلٹا اور مجھ پر پستول تان کر بولا۔ ”بس بابا! ہاتھ سر سے بلند کر لو۔“ میں نے دانت پیس کر ٹرائیگر دباننا چاہا مگر انگلی کی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود ٹرائیگر نہ دبا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ زور آور کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ گن صرف دو گولیاں چلاتی ہے جو تم چلا چکے ہو۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول میں اس وقت پانچ گولیاں لگا جو تمہیں چھلنی کر سکتی ہیں۔ شاباش! ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“

اس دوران میں نے دو تین مرتبہ ٹرائیگر دبانے کی کامیابی کوشش کر ڈالی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ ایک تو مجھے اسی منجوس گن کے بارے میں معلومات

نہیں تھیں کہ اس میں کتنی گولیاں تھیں۔ دوسرا مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ صفی کے ہاتھ میں پستول تھا جو میری نادانی کے سبب زور آور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

مجھ پر ہونے والا مایوسی کا اچانک اور غیر معمولی شدید حملہ بڑا اعصاب شکن تھا۔ میں نے جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی وزنی گن اسے کھینچ ماری۔ اس نے میرا وار جھکائی دے کر خطا کیا اور صفی کے آخری جھٹکے لیتے ہوئے وجود کے پاس پہلو کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کو بھی مجھ پر سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ اس کے چہرے پر غم، برہمی اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات تھے جن کی بدولت اس کی شکل خاصی خوف ناک ہو گئی تھی۔

میں اگر پستول کی پروانہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا بھی دیتا تو فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ناچار مجھے اپنے ہاتھ سر سے بلند کرنا پڑے۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی صفی کی جیب میں پڑا ہوا موبائل بجنے لگا۔ زور آور نے چیخ کر کہا۔ ”دیوار پھاند کر اندر آ جاؤ استاد.....“ میں نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر دیوار کی منڈیر پر ایک چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے محن میں ہونے والے بھیا تک ڈرامے کو دیکھا، شاید کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پایا اور بولا۔ ”زور آور! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

زور آور نے بلند آواز میں کہا۔ ”استاد کو بتاؤ کہ سب ٹھیک ہے۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ اس لونڈے نے خرستی دکھائی تھی۔ مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اب یہ بینڈز آپ ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔“

دیوار پر سے جھانکنے والے نے معاملے کی نوعیت اور سنگینی کو بھانپا اور غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ پھر دیوار پر نظر آیا۔ اس مرتبہ اس نے دیوار پھاندی اور بھاگ کر دروازے کی چٹنی اُتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی تین آدمی اندر گھس آئے۔ تینوں نے ہاتھوں میں شارٹ گنیں تھام رکھی تھیں جن کا رخ ہماری جانب تھا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ چٹنی کھولنے والے سمیت مکان میں آنے والوں کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے کوئی بھی میرا واقف نہیں تھا۔ قیمتی سفید سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگ شخص سب سے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی میگنیزن والی رشین ساختہ اس کے گن تھی۔ اس کی ریشم کی تھم مگر نہایت خطرناک تھی۔ وہ نے ٹکے قدموں سے چلتا



ہوا میرے قریب آن رکھا۔ اس کی گن کی ٹال کا رخ زمین کی جانب تھا جبکہ اُس کے ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان رکھی تھیں۔ ایک منحنی وجود کے مالک شخص کے ہاتھ میں گن کے علاوہ سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔

زور آور بولا۔ ”استاد! میری حالت خراب ہے۔ میرا ساتھی اس مردود کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا اٹم وقت پر آگئے ہو۔ اسے اپنی تحویل میں لے لو، یہ بہت خطرناک ہے اور اس کی معصوم صورت پر بھروسہ نہ کرنا۔“

استاد بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تنہی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”زور آور! میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

اس کی بے حد سنجیدہ آواز سن کر مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے موت کی سی سنگینی رکھنے والی یہ آواز پہلے بھی کہیں سن رکھی تھی۔ کہاں اور کب؟ یہ یاد نہ آیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے گھیرے میں لے لیا جبکہ وہ نپے تلے انداز میں چلتا ہوا زور آور کی طرف گیا۔ اس کے قریب پیروں کے بل بیٹھ گیا اور صفی کی نبض چیک کرنے کے بعد مایوسی سے سر فٹی میں ہلا کر بولا۔ ”یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے زور آور! تم سناؤ، تم ایسے کیوں بیٹھے ہو؟“

”مجھے ٹانگ میں گولی لگی ہے استاد! اسی کم بخت نے ماری ہے۔“ وہ جبراً سمجھ کر درد کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس ایک لمحے کو اس پر سے توجہ ہٹی تھی اور اس نے اپنا کام دکھا دیا۔ چونکہ اسے زندہ سلامت تمہارے حوالے کرنا تھا اس لیے میرے ہاتھوں سے بچ گیا ورنہ صفی سے پہلے اس کی روح پرواز کرتی۔“

”کیا تم چل سکتے ہو؟“ استاد نے پوچھا۔

زور آور ہتھیلیوں کے بل زمین سے ٹھوڑا اوپر اٹھا اور بولا۔ ”میری گاڑی اور ڈرائیور یہاں موجود ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو اور مال کی قیمت چکا کر لے جاؤ۔ آہ! بڑا جگری یار تھا میرا! صفر! میرا صفی! پر زندگی بڑی بے وفا چیز ہے۔ بھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کبھی اچانک بجھ جاتی ہے۔ موم بتی کی طرح! پر استاد! جس وقت یہ لونڈا تیرے کام کا نہ رہے، اس وقت میرے کو بول دینا۔ میں اسے اپنے پاس لے آؤں گا۔ بہت حساب کتاب ہیں اس کی جانب میرے! لے جاؤ اسے!“

استاد نے گردن موڑ کر میرے دائیں ہاتھ کھڑے شخص کو مخاطب کیا۔ ”ملفغانی! اسے سہارا دے کر چار پائی پر بٹھاؤ اور پانچ لاکھ روپے اسے دے دو۔ ادھر مشین والے کمرے

میں اس کے آدمی ڈر کر دیکھے بیٹھے ہیں، انہیں جا کر کہہ دو کہ اسے فوراً شہر لے جائیں ورنہ گولی کا زخم خراب ہو جائے گا۔“ ”ملفغانی! کا لفظ سنتے ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ استاد کی آواز میں نے پہلے کہاں سن رکھی تھی اور وہ کون تھا؟ میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ وہ استاد ہی تھا۔ جب وہ فون پر میڈم شکیلہ کو دھمکیاں دے رہا تھا اور خانزادی کا مطالبہ کر رہا تھا، میں میڈم کے پاس موجود تھا۔ تب اُس کی آواز میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ کھالے نے مجھے اس کے دست راست ملفغانی کے بارے بتایا تھا جس کے توسط سے وہ استاد بھلو کے گروپ میں شامل ہوا تھا کہ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ کھالے، پیاجی اور میر و شاہ، تینوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ استاد بھلو بہت ظالم اور سخت اعصاب کا مالک شخص تھا۔ آج اُسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تینوں کی رائے غیر حقیقی نہیں تھی۔ اس کی شخصیت میں موت کا سا شہر اُڑ تھا جو بہت کم لوگوں کا وصف ہوتا ہے۔

اس کی شخصیت کسی بھی لحاظ سے اُس کے پیشے سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ سیاہ اور سفید بال جنہیں اُس نے بڑے سلیقے سے بغیر مانگ نکالے پیچھے کی جانب ڈال رکھا تھا، سفید و سیاہ موچیں اور شیو زده ابھرے ابھرے گال! وہ دیکھنے میں بڑا سیاست دان یا سرکاری آفیسر لگتا تھا۔ میں نے اگر اس کے کرتوتوں کے بارے میں سن نہ رکھا ہوتا تو مجھے پہلا گمان یہی گزرتا کہ وہ پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہے۔

ملفغانی نے سہارا دے کر زور آور کو کھڑا کیا اور بغلوں میں ہاتھ دے کر چلاتا ہوا اس چار پائی تک لے گیا جس پر کچھ دیر پہلے میرا اور اُس کا دلگل ہوا تھا۔ آرام سے بٹھانے کے بعد اپنے ساتھی کے پاس آیا، اس سے ہینڈ بیگ پکڑا اور پلٹ کر زور آور کے پاس گیا۔ ہینڈ بیگ اُس کی جھولی میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”پیارے! اس میں تمہاری مطلوبہ پانچ ہتھیلیاں موجود ہیں۔ پانچ پہلے آچکی ہیں۔ چاہو تو گن لو، چاہو تو مجھ پر اعتماد کر لو۔ تمہاری مرضی ہے۔“

زور آور نے اُس پر اعتماد نہیں کیا۔ جان جوکھوں میں ڈال دی جائے تو کسی پر بھروسہ کرنے کو دل نہیں مانتا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی۔ نوٹوں کی گڈیاں نکالیں، پرکھیں اور واپس بیگ میں رکھ کر زپ بند کر دی پھر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”ناراض نہ ہونا یار ملفغانی! اس دھندے میں پڑنے کے بعد اپنے باپ پر بھی اعتبار کرنے کو جی نہیں مانتا۔“

اس دوران استاد بھلو میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔ اس

کی سرد نگاہیں میرے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نظروں کی نظروں میں مجھے تول لینے کے بعد بولا۔ ”تمہارا نام شہر کیا ہے؟“

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ”ہاں! مگر تم لوگوں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو۔“ پھر اپنے ایک ساتھی سے حکیمانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ ”گاڑی سے کلپ نکال لاؤ۔ ہری آپ!.....“

زور آور مشین روم کی طرف منہ کر کے کسی کو بلارہا تھا۔ وہی مشین میں جس نے مجھے پانی اور چائے پلائی تھی، باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے صفی کی لاش کو دیکھتے ہوئے زور آور کے سامنے سبے سبے انداز میں کھڑا ہو کر ہدایات سننے لگا۔

استاد بھلو نے مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے سخت لہجے میں کہا۔ ”شہر یار! اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ رہو گے ورنہ میں زور عایت کا قائل نہیں ہوں۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے پہلے زور آور نے بھی مجھے یہی دھمکی دی تھی۔ اسی اثنا میں اس کا ماتحت دو عدد بڑے سائز کے آہنی کلپ لے آیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید شکل کے آہنی آلات تھے جنہیں میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پیچھے کھینچے اور کلپ میں ڈال کر کوئی پٹن دبا دیا۔ ”کلک! کی آواز کے ساتھ ہی میری آزادی سلب ہو گئی۔ میں نے ہاتھوں کو حرکت دے کر اس کلپ کی گرفت کی پتلی کا اندازہ کر لیا۔ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔ کلپ لگانے والے نے بڑے ماہرانہ انداز میں میرے لباس کی تلاشی لی۔ پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”استاد جی! مال ایک دم ادا ہے، پیک کر دیا ہے، اب کیا حکم ہے؟“

استاد کے بجائے ملفغانی بولا۔ ”اسے باہر لے چلو۔ پیچھے ڈال دو۔ ایک آدمی اس کے ساتھ بیٹھ جائے گا۔“

”پیروں میں کلپ ڈالنا ہے؟“

”ڈال دو!.....“ ملفغانی نے نخوت سے کہا۔ پھر وہ اور

استاد بھلو زور آور کے پاس جا کھڑے ہوئے جبکہ بقیہ دونوں افراد نے مجھے باہر کی سمت دھکیلنا شروع کر دیا۔ دروازے کے عین سامنے سفید رنگ کی بڑی مشینیں پھیر کھڑی تھیں۔ اس کے فرنٹ بمپر پر سبز رنگ کی تختی نصب تھی جس پر ”میرسوپائی اسمبلی“ کے سنہرے الفاظ چمک رہے تھے۔

ایک نے بیک ڈور کھولا۔ دوسرے نے مجھے دھکا دیا اور

مجھے چھاتی کے بل بمپر پر گرا دیا۔ میرے جسم کا بالائی حصہ گاڑی کے فرش پر جبکہ ٹانگیں زمین پر تھیں جب دونوں میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے کلپ میرے پیروں میں ڈال کر لاک کر دیا۔ پھرتی اور بڑی بے دردی سے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر فرش پر دھکیل دیا۔ شکر ہوا کہ پھیر و کے فرش پر دوپٹے کا لین موجود تھا ورنہ میری چھاتی اور منہ پھل جاتے۔

انہوں نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک چھوٹے سائز کی تریپال میرے وجود پر ڈال دی۔ یوں لگا جیسے میرا دنیا سے ٹکسرا بطل کٹ گیا ہو۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ عقبی حصے میں فرش پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرے نے دروازہ بند کر دیا۔

میری چھٹی حس نے سمجھا دیا کہ میں شدید خطرات سے دو چار ہو چکا تھا۔ استاد بھلو اور ملفغانی سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے تھے۔ اسی کے حکم پر مجھے زور آور کے ذریعے اغوا کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ دونوں بہت خطرناک تھے۔ جو گینگ میڈم شکیلہ پر اندھا دھند حملہ آور ہونے کی جرأت رکھتا ہو، اس کے دائرہ عمل کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی لاحق نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ وہ مجھے سردار حیدر خان کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس رات کے اندھیرے میں غنڈوں اور پولیس کے ہمراہ کھینچی جانے والی عورت سے لے کر سی ٹی وی میں اسما سے ہونے والی ملاقات اور مابعد میلے والی حویلی پر شب خون اور نور پور میں سردار حیدر خان کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی بربریت یاد آئی۔ وہ غنڈے جنہوں نے نہ صرف میرے چاچا اور چاچا کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا بلکہ میرے بے گھر کو آن واحد میں تیل چھڑک کر جلا دیا تھا، آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اسما کو میں اپنے ہاتھوں میاں دلبر حسین کے ڈیرے پر چھوڑ آیا تھا۔ سردار حیدر خان کے نزدیک اس عظیم جرم سمیت میرے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس کا مجھے اندازہ تھا اور کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ جی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر کلپ میں جکڑے ہوئے تھے۔ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ ایک مردود میرے سر پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈ گن تھی جس کی ٹال میری چھاتی پر موت کی آخری تحریر لکھنے کو بے تاب تھی اس لیے میں مزاحمت یا خود کو آزاد کرانے کی کوئی کوشش کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔

ہلتے چلتے ہوئے میں نے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے



کلب کی مضبوطی کا اندازہ کر لیا تھا۔ چونکہ مجھے اُس کے فنکشن کا علم نہیں تھا، اس لیے اسے کھولنے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ جانے چاہی سے کھلتا تھا یا کسی خفیہ مین سے، معلوم نہیں تھا۔ میں اس انداز سے لینا ہوا تھا کہ مجھے اپنے پیروں میں کلب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک طرح سے مایوس ہو کر میں نے طویل سانس لی اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا کہ میں سوائے سوچنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد استاد بھلو اور ریاض ملغانی مکان سے باہر آئے۔ دروازے کھلنے، پھر بند ہونے اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور مجھے بھیانک انجام کی طرف لے جانے والا سفر شروع ہو گیا۔

میں میڈم شکیلہ کی کونھی سے نکل کر عجیب حالات سے دوچار ہوا تھا۔ کسی کو مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت در قیامت کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ جب مجھے خود علم نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا اور میرے ساتھ کیا کیا جانے والا تھا تو کسی اور کو کیا علم ہو سکے گا، یہ صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ میں گھر میں بتا کر آیا تھا کہ مجھے دیر سویر ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ میڈم نے مجھے آرام کرنے کے لیے چھٹیوں سے نوازا تھا۔ وہ تب میرا پتا کرتی، جب مجھے کسی مشن پر بھیجنا مقصود ہوتا۔ تب تک حیدر خان نے میرے بدن کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔

مجھ پر ڈالی گئی ترپال خاصی موٹی تھی۔ جہاں اس نے میرے جسم کو بے حد گرمی دے کر حدت آمیز سکون بخشا تھا، وہیں اُس نے مجھے ہر نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ مجھے گاڑی کے پختہ سڑک پر چڑھنے، شہر کی طرف ٹرن لینے اور پھر بڑی سڑک پر چڑھنے کا احساس تو ہوا مگر بعد میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ استاد بھلو مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

مہنگی گاڑیوں کو کسی ناکے پر نہیں روکا جاتا۔ اس متوسلے ہجیر کے آگے تو ممبر صوبائی اسمبلی کی سبز نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جسے رکنے کا اشارہ کرنے کے جرم میں وردی پوشوں کی بیٹیاں اتار لی جاتی ہیں۔ مجھے چیکنگ کے نام پر تلاشی اور مدد کا سہارا بھی میسر آنے والا نہیں تھا۔

سفر میں گھٹنا گزر گیا یا شاید دو گھنٹے گزر گئے تھے، جب گاڑی نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور ناہموار کچے راستے پر چل پڑی۔ چونکہ وقت کا اندازہ نہیں تھا اس لیے میں سفر کی طوالت کا اندازہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ پھر اچانک گاڑی رُک گئی اور دروازے کھلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اپنے قاتلوں کی برات کے ساتھ منزل پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ہجیر وکابیک ڈور کھلا اور مجھے پیروں سے پکڑ کر ترپال سمیت نیچے گھسیٹ لیا گیا۔ پھر اسی حالت میں کھینٹے ہوئے کہیں لے جایا گیا۔ میری کمر میں کئی چھوٹے بڑے کنکر اور کانٹے جیسے مگر میری آہ و بکا شاید کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ بھی آخر کار عبور ہو گیا۔ جونہی میری ٹانگیں چھوڑی گئیں، دھڑام سے زمین پر گر گئیں۔

چند لمحوں بعد چوٹی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ میں کسی کمرے میں لا پھینکا گیا ہوں۔ ترپال میں لینا ہوا زمین پر پڑا تھا اور میرے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ترپال سے نکل جاتا یا اسے ایک طرف سرکا دیتا۔ میرے ہاتھ میرے اپنے وجود کے وزن سے ڈھک رہے تھے۔ کلب کی کوئی نوک کلائی میں چھ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلائی پر سے ماس اتر گیا تھا۔ اس جاں کنی کی کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ پھر دروازہ کھلا، قدموں کی آہٹ مجھ تک آئی اور چند لمحوں بعد میرے اوپر سے ترپال کھینچ لی گئی۔ میں نے کم روشنی کے باوجود استاد بھلو کو پہچان لیا۔ کھلے دروازے میں اس کے دو ماتحت گئیں اٹھائے چوکس کھڑے تھے۔

استاد بھلو چند لمحوں تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بھاری اور دل دہلانے والی سنجیدہ آواز میں بولا۔ ”شہر یار! تم موت کی ایسی کال کو ٹھہری میں پہنچ گئے ہو جہاں سے ضدی اور احمق بھی زندہ نہیں نکل سکتے۔ عقل مند موقع کی نزاکت کو دیکھ کر مفاہمت کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی بچا لیتے ہیں۔ مجھے چند سوالوں کے جواب چاہئیں۔ درست جواب دو گے تو زندہ چھوڑ دوں گا۔ جھوٹ بولو گے تو زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔ مجھے بتانا تھا، بتا دیا، آگے تمہاری مرضی کہ تم اپنے لیے کس راہ کا انتخاب کرتے ہو۔“

میرا دماغ تشویش اور خوف ناک اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی کمر تھا جہاں مجھے دوپٹے سمیت پروین کو یہاں پر رکھے جانے کے ثبوت ملے تھے۔ چوڑیوں کے چند ٹکڑے بھی ہاتھ لگے تھے۔ یعنی استاد بھلو جسے موت کی کوشٹری کا نام دے رہا تھا، یہ پہلے کے قلب میں واقع سردار حیدر خان کی وہی حویلی تھی جس پر میں ایک ناکام حملہ کر چکا تھا۔

میں دو چار پائیوں کے بیچ میں فرش پر اپنے اغوا کاروں کے رحم و کرم پر پڑا تھا۔ آنکھیں جھپکے بغیر استاد بھلو کو کئی ثانیوں تک دیکھا پھر اپنی آواز کو مستحکم بنانے کی اپنی ہی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔ ”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”دنیا مجھے استاد بھلو کے نام سے جانتی ہے، تمہاری میڈم بھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی مجھے جانتے ہو گے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! میں تمہیں جانتا ہوں مگر صرف نام کی حد تک۔ آج پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا ہے۔ حیران ہوں کہ ایسا کیا ہو چھتا ہے تمہیں مجھ سے جس کے لیے تم نے اتنا تردد کیا ہے۔“

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا، بولا۔ ”کیا تم میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو؟“ اس کی سنجیدہ آواز سماعت میں اتر کر دل تک گھسی جاتی تھی۔ یہ خوبی محدود ہے چند لوگوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ دوں۔“

وہ میرے قریب آیا اور چارپائی کی بانہ پر ٹک گیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”چھوٹی خانزادی کہاں ہے؟“

”چھوٹی خانزادی؟“ میں تعجب سے بولا۔ ”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟“

”سردار حیدر خان کی بیٹی..... جسے تمہاری میڈم نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“ اس کے چٹان جیسے بے تاثر چہرے کی درستی میں اضافہ ہو گیا، بولا۔ ”یہ پہلا سوال ہے۔ دوسرا سوال یہ ہوگا کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟ تیسرا سوال سائیکس دل جیت شاہ کو کس نے اور کیوں اغوا کر رکھا ہے جبکہ میرا تم سے چوتھا سوال یہ ہوگا کہ تم کہاں رہتے ہو؟“

اس نے تھوڑا سا توقف کیا، پھر بولا۔ ”اگر تم مجھے ان سوالوں کے ٹھیک جواب دے دو تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں ورنہ تم خان صاحب کے غصے کا شکار ہو جاؤ گے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے انہی سوالوں کی توقع تھی جو میرے کانوں میں پھلے ہوئے سیسے کی طرح انڈیل دیے گئے تھے۔ قدرے بے بسی سے کہا۔ ”مجھے کچھ وقت دے۔“

پھر جو کچھ جانتا ہوں، بتا دوں گا۔ سچ سمجھنا یا جھوٹ..... یہ تم لوگوں کی دانست پر موقوف ہو گا۔ اور ہاں استاد بھلو! مجھے زندگی کا لالچ نہ دو۔ میں سردار حیدر خان کو جانتا ہوں۔ اسے میری ایک سانس بھی ناگوار گزرے گی۔“

اس نے کندھے اُچکائے اور بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں شہر جا رہا ہوں۔ رات کو لوٹوں گا۔“

پھر چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور کسی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے آہستگی سے بولا۔ ”اے چارپائی پر ڈال کر لحاف میں لپیٹ دو۔ سردی سے کانپ رہا ہے۔ ہو سکے تو اسے چائے پانی بھی پلاؤ اور میرے آنے تک اس کا دھیان رکھو۔“

وہ چلا گیا۔ اس کے ماتحت ساتھیوں نے مجھے بے دردی سے اٹھایا اور چارپائی پر بیچ دیا۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی پر کوئی گدایا جادو نہیں بچھائی گئی تھی۔ یعنی اترنے والی رات کی تمام سختی مجھے اپنے بدن میں اتارنا تھی۔ پچھلی رات میں نے سر میں آنے والی چوٹ کی وجہ سے بے ہوشی میں گزاری تھی۔ یہی رگ و پے میں داخل ہونے والی سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ آج ہوش میں تھا۔ سردی کا جان لیوا احساس سردی اترنے سے پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا اس لیے متشکر ہو رہا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔ ایک نے گن تھام رکھی تھی جبکہ دوسرے نے اپنے ہاتھ میں چائے کا پیالہ اٹھا رکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے ہاتھ سے ملغانی نے ہینڈ بیگ لے کر زور آور کی جھولی میں رکھا تھا۔

اس نے پیالہ چارپائی کی بانہ پر لٹکایا اور میرے عقب میں آ کر کلب کھول دیا۔ ہاتھ آزاد ہونے کے بعد بھی کئی ثانیوں تک کوشش کے باوجود حرکت نہ کر پائے۔ جب شریانون میں دوران خون بحال ہوا تو میں نے چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔ گرم گرم دودھ پتی اور میلے چیلے مگر خاصے بھاری لحاف نے میرے بدن میں کچھ حرارت پیدا کی اور توانائی دی۔ مجھے واش روم جانے کی حاجت ہوئی۔ انہوں نے اجازت تو دے دی مگر پیروں کا کلب کھولنے سے انکار کر دیا۔ ناچار مجھے ان کا سہارا لے کر چڑے کی طرح پھدکنا پڑا۔ وہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر پھدکاتے ہوئے صحن کی بیرونی دیوار سے ملحقہ واش روم میں لے گئے۔

شام کے سائے رخت سفر لپیٹ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھاننے والا تھا۔ میں نے کمرے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی کیونکہ یہ وہی حویلی تھی۔ غیر اضطراری طور پر میری نگاہ برآمدے میں واقع کچن کم اسٹور کی طرف اٹھی جس میں مجھ سے پہلے یہاں پہنچنے والے کسی سفاک شخص نے جار جیتے جاگتے انسانوں کو رسیوں کے پھندے دے کر ہلاک کر دیا تھا اور سب کو اسٹور میں اوپر نیچے رکھ دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں کیے گئے جسموں کو یوں اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور اوپر نیچے ترتیب کے ساتھ رکھنا بڑا دل



گردے کا کام تھا جو اُس نے میرے اور پیاجی کے اندازے کے مطابق تنہا سہرا انجام دیا تھا۔ میں جس دنیا میں جی رہا تھا، وہاں کی سنگدل فضا میں بھی ایسا کرنا محال تھا۔

میں نے واش روم تک جاتے ہوئے حویلی کا جائزہ لے لیا تھا۔ کوئی بھی قابل ذکر تغیر دکھائی نہیں دیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُس رات میں نے اور کھالے نے چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ سکوت کو بھانپ کر لگائے گئے اندازے کے مطابق اس وقت حویلی میں سوائے استاد بھلو کے، وہی افراد یہاں موجود تھے جو مجھے زور آور سے وصول کر کے یہاں لائے تھے۔ اگر کوئی اور موجود تھا بھی تو وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔

حویلی کے باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں جو میرے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ بندھے ہوئے پیروں کی وجہ سے مجھے واش روم میں نہایت تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا مگر مجبوری تھی۔ میں نے اس دوران آہنی کلپ پر موجود کسی خفیہ بٹن کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ جیسے تیسے حاجت پوری کر کے نکلا تو دونوں کوروازے پر چوکس کھڑے پایا۔ دبلے پتلے شخص نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کمرے میں پہنچا کر اُس نے ہاتھوں کو پھر کلپ میں جکڑ دیا۔ رفتہ رفتہ میرے جسم کی توانائی بحال ہو رہی تھی۔

چونکہ زور آور نے مجھے ان کی تحویل میں دیتے ہوئے بہت خطرناک شخص قرار دیا تھا اس لیے دونوں پہرے دار بہت چوکے تھے۔ مونچھوں والا کمرے سے چلا گیا تھا جبکہ ضرورت سے کہیں زیادہ اسماٹ پہرے دار ایک چارپائی چھوڑ کر دوسری چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ باوجود اس کے کہ میں زخمی اور بندھا ہوا تھا، اس نے مجھے مسلسل گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔

شام کا دھندلکارات کے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔ چاند فلک پر جگمگا رہا تھا جس کی روشنی اندھیرے کو بھرپور تسلط جمانے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ میرے پہرے دار نے دیا سلائی جلائی اور الماری میں پڑی ہوئی میلے شیشے والی لائٹن روشن کر دی۔ لائٹن کی پہلی روشنی کمرے میں پھیل گئی اور ماحول بڑا عجیب، سوگوار اور پُر اضطراب بن گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکلنا تھا ورنہ بھیا تک تشدد اور بے بسی کی موت کا شکار ہونا تھا۔ پیاجی نے ٹریننگ دیتے ہوئے، فارم ہاؤس پر مجھے سمجھایا تھا کہ بھی تذبذب، پریشانی اور خوف کو اپنے اعصاب پر سوار

مت ہونے دینا ورنہ زندہ رہنے کے چانس گنوا کر موت سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ میں اپنے تئیں ذہن پر دہشت اور مایوسی کی یلغار کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

کافی دیر گزر چکی تھی جب حویلی کے باہر کوئی گاڑی آن ٹکی۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد سردار حیدر خان دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے اُس کے مخصوص حلیے کی وجہ سے پہچانا تھا ورنہ اندھیرے کی وجہ سے اُس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عمومی طور پر آف وائٹ بوسکی یا کرنڈی میں ملبوس رہتا تھا۔ گہرے کبجی یا کالے رنگ کی واسٹ اور ایرانی شال بھی اس کے روزمرہ کے لباس کا حصہ تھیں۔ اس وقت بھی وہ اسی لباس میں تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے دائیں پہلو میں آن کھڑا ہوا جبکہ استاد بھلو اور ملغانی چارپائی کی پائنتی کی جانب ٹھہر گئے۔

میری تمام تر بربادیوں کا ذمے دار یہی شخص تھا جو اس وقت سینہ تانے میرے سامنے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اُسے خون میں نہلانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ خواہش اپنے ہی خون میں نہا گئی اور میرے ہونٹ بے بسی سے بھنج گئے۔ میں جو اُسے جسم تصور میں زندگی کی بھیک مانگتا ہوا دیکھا کرتا تھا، اس وقت اسی کے رحم و کرم پر بے بس پڑا تھا۔ کھال سچ کہا کرتا تھا کہ یہ دنیا پیسے والوں کی ہے۔ یہاں وہی جیت جاتا ہے جو پانی کی طرح پیسا بہانے کا ہنر جانتا ہے۔ بڑا خان جیت گیا تھا اور میں..... اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہا تھا..... ناکر وہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا تھا.....

چونکہ لائٹن اور میرے درمیان سردار حیدر خان کا وجود حائل تھا، اس لیے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اُس کی آنکھیں اس وقت شعلے اگل رہی تھیں۔ جڑوں کے اعصاب بڑی تیزی سے تھرک رہے تھے۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے۔ اچانک اُس نے اپنی بھاری اور کڑک دار آواز میں غلیظ گالی دیتے ہوئے ٹھیسہ سہرائیکی میں کہا۔ ”بڑا لاث خان جتنا تھا..... ہوں..... اچھی نسل کا کتا بیروں میں دم ہلاتا رہتا ہے تبھی اچھا لگتا ہے۔ گندی نسل اپنے مالک پر بھونکنے سے باز نہیں آتی، تبھی مٹ جاتی ہے۔ ہمارے کتے ہماری طرف بوٹھی اٹھائیں تو انہیں قاتل مار دیا جاتا ہے یا پکلا ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ تم بھی گندی نسل کے کتے ہو۔“

## مسافر

میں نے یہ وقت تمام اپنے کھولتے ہوئے خون کو زہر سمجھتے ہوئے روکا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحوں کے توقف سے بولا۔ ”بتاؤ بھتیجی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟“

میں نے اپنے ذہن میں گزشتہ حالات کی تجزیاتی فلم چلا کر فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا بتانا تھا اور کیا چھپانا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اسما.....“ وہ ایک دم تڑپا اور غرایا۔ ”اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ ابھی زبان کاٹ دوں گا۔“

میرا دماغ گھوما مگر کچھ نہ کر پانے کی حالت میں پڑا ہونے کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، بولا۔ ”وہ میاں دلبر کے پاس ہے۔“

”کیہو! (کون) میاں دلبر؟“ اس نے سانپ کی طرح بل کھایا۔

”میاں دلبر حسین..... میں اس کے بارے میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ لاہور کے علاقے کا کوئی مشہور سیاست دان ہے۔“ میں نے اُس کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے لبوں پر قفل لگ گیا۔ یک ٹک مجھے پھر استاد بھلو کو دیکھنے لگا پھر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ ”بھلو! یہہ میں کیا سنداں پیاہاں؟“ (بھلو! یہہ میں کیا سن رہا ہوں؟)

بھلو کی سرد آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔ آپ کے بعد اس کے بیان کی پرکھ کرنا میرا کام ہے۔“

حیدر خان میری جانب مڑا اور دہاڑا۔ ”اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میاں صاحب کا خانزادی والے معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

میرے اندر آگ دھک رہی تھی مگر لہجے کو مودبانہ رنگ دیتے ہوئے بولا۔ ”اس نے خانزادی کو دو کروڑ روپے میں خریدا تھا۔“

”کیوں؟“ ”یہ تو میں نہیں جانتا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے ایما پر یہ سودا بازی کر رہا ہے۔“

حیدر خان کے منہ سے غفلت کا طوفان اٹھ آیا۔ اس نے میڈم، میاں دلبر حسین اور مجھے بے نقط سنائیں۔ اس دوران مجھے چار پانچ لائٹیں بھی رسید کیں جو لحاف کی وجہ سے زیادہ موثر ثابت نہ ہوئیں۔ استاد بھلو نے اپنے منہ سے

فرعون کا غصہ ٹھنڈا کیا اور سرد لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”شہر پار! اگر تمہاری کوئی بات بھی غلط ثابت ہوئی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ سوچ کر بولو۔ تمہاری کہی ہوئی بات کو میں پرکھوں گا اور اس کے بعد تمہاری زندگی کا فیصلہ کروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ جانتا ہوں، بتا رہا ہوں۔“

اسے میری بے خوفی نے مضطرب کیا مگر وہ فوری طور پر اپنے آپ پر قابو پا گیا۔ میرا شاہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو چہرے تک نہیں آنے دیتا۔ یہ اس کی بہت بڑی خوبی تھی جس کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا تھا۔

”خانزادی کو کون میاں دلبر کے پاس چھوڑنے گیا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”میں.....“

”بورے والا میں۔“ مجھے سخی محمد کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات یاد تھیں اور میں نے اپنی کہانی میں صداقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہی معلومات کا سہارا لیا۔

”بورے والا شہر میں؟“ اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ وقت تمام اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔

”نہیں..... کسی مضائقہ کی گاؤں میں۔“ ”بدنسل کتے! اس گاؤں کا کچھ نام بھی تو ہوگا ناں..... کیا بورے والا شہر کے قریب واقع ہے؟“ خان نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

”نہیں..... بورے والا سے دور، دریائے ستلج کے کنارے پر واقع تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے گاؤں کے نام کا علم نہیں ہے۔“

”میاں صاحب نے خانزادی کو خود وصول کیا تھا؟“ ”نہیں، میں نے میاں دلبر حسین کے حکم پر وہاں کسی ڈیرے پر اس کے کارندے تک خانزادی کو پہنچایا تھا۔“

”اُس کتے کا نام جانتے ہو؟“ ”نہیں!“ ”پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ خانزادی کو اُسی کے حوالے کرنا ہے؟“

”ہمارے درمیان کوڑوڑوڑے کے گئے تھے۔“ میں نے پوری کوشش کی کہ میرا چہرہ میرے جھوٹ کی چٹلی نہ کرے۔

”اس ڈیرے کا کل وقوع بتاؤ۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میں پہلی مرتبہ وہاں گیا تھا۔ ڈیرا بیور کو راستے کا علم تھا۔“



”کیا تمہیں راستہ یاد ہے؟“ وہ مجھ پر تھوڑا جھکا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بو آرہی تھی۔

”ہاں..... میں وہاں جا تو سکتا ہوں مگر لوکیشن کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا۔“ میرا جھوٹا اپنا اثر دکھا رہا تھا اور میرے سر پر مسلط فوری موت کو ٹالنے لگا تھا۔ میری دانست میں اب وہ اساتذہ رہنمائی اور اس کی بازیابی تک مجھے قتل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

”خانزادی کو تمہاری کنجری مالکن نے اغوا کیوں کیا تھا؟“ حیدر خان پھنکارا۔

میں نے کہا۔ ”اس بات کا آپ کو علم ہے خان صاحب.....“

اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ ”کھوتی داپتر! میگوں ہر گالہ داپتا ہے پر میں جیڈے موٹوں سن سگداں۔“ (گدھی کے بچے! مجھے ہر بات کا علم ہے مگر میں تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں)

تھپڑ زوردار تھا مگر میرے منہ سے نکلنے والی تیز چیخ کی اصل محرک وہ تکلیف تھی جو زخم دکنے سے پہنچی تھی۔ میرا بدن جھٹکے لینے لگا اور منہ سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔ اس نے اسے میری اداکاری سمجھا اور دانت چس کر غرایا۔ ”ہک چاٹ نال ای ترفن پے گیا ہے نامرادا..... اوئے ایندی موت سداؤ بندی پی ہے بلو..... ایں کو سمجھا گھن نی تاں کل دامر دا آج مر پوی.....“

(نامرادا ایک تھپڑ لگنے سے ہی تڑپنے لگا ہے۔ اس کی موت آوازیں دے رہی ہے بلو! اسے سمجھا دو ورنہ کل کا مرنا آج ہی مر جائے گا)

اس نے فوراً بڑھ کر میری اُتری ہوئی پٹی کھینچ کر اپنی جگہ پر دوبارہ ایڈجسٹ کی اور مجھے دھمکانے کے بجائے برا بھونچا حیدر خان سے مخاطب ہوا۔ ”خان صاحب! اس کے سر میں گہرا زخم ہے۔ وہ دکھ گیا ہوگا۔ آپ ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مردود گزر جائے اور ہماری محنت ضائع ہو جائے۔“

”اوئے! اب چپ کرو..... بتاؤ! تم نے اپنی بہن کو کہاں چھپا کر رکھا ہے؟“ اس نے میرے کانوں میں پچھلا ہوا سسہ انڈیلا۔ ایسا زخم کریدا جس پر میں ابھی تک کوئی مرہم نہیں رکھ پایا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر میری جسمانی سکت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے ایک

سورج چمکا اور میں ہوش و خرد کی سرحدیں عبور کر گیا۔ میری بے ہوشی نے وقتی طور پر اس پھرے ہوسے فرعون سے میری جان چھڑا دی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں دھواں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے کھن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ساتھ والی چار پائی پر گزشتہ دن والے پہرے سے دار ایک پھول دار رضائی میں لپٹے بیٹھے تھے۔ کمرے کی ایک کٹڑ سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شاید پہرے داروں نے سردی سے بچاؤ کے لیے کٹڑیوں کی آگ جلا رکھی تھی۔

میرے بدن پر لحاف موجود تھا۔ اس کے باوجود میں سردی سے کپکپا رہا تھا۔ مجھے اپنے سر کے بال گیلے محسوس ہوئے۔ میرا گریبان اور کالر بھی بھیجا ہوا تھا جس کی وجہ سے سردی کا احساس فزوں تر تھا۔ شاید وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے پانی چھڑکتے رہے تھے پھر ناکام ہو کر آج کا کام کل پر نال کر چلے گئے تھے۔

میرے جسم میں پیدا ہونے والی حرکت نے دونوں اوگھٹے ہوئے پہرے داروں کو چوکنا کر دیا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے واش روم جانا ہے۔“ بڑی موچھوں والے نے برہمی سے کہا۔ ”اس وقت؟ آرام سے پڑا رہ۔ باہر بڑی سردی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھی سردی لگتی ہے مگر واش روم میں جانا ضروری ہے ورنہ.....“

میری آواز میرے بدن کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے میری ادھوری بات کو دھمکی سمجھا، بھی غرا کر بولا۔ ”کیا ورنہ..... کیا کرے گا تو؟“

میں نے بے بسی سے کہا۔ ”میں تو کچھ نہیں کروں گا مگر وہ کچھ ہو جائے گا کہ تم لوگوں کا یہاں بیٹھنا محال ہو جائے گا۔“ وہ میری بات میں مضمر دھمکی کو سمجھ گیا بھی بڑا سامنے بنا کر اپنے سامنے سے مخاطب ہوا۔ ”چل اوئے جیدا! اس کھوتے کے بچے نے تو مرنا ہی ہے، ہمیں بھی سردی میں مار کر دم لے گا۔“

جیدا مجھے گالی دیتے ہوئے رضائی سے نکل کر چار پائی سے اُترا اور سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے بیڑاری سے بولا۔ ”تمہیں بھی اس وقت ہی جا گنا تھا۔“

مارے سردی کے میرے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”یار! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ مجھے بھی اتنی سردی میں باہر نکلنے کا کوئی شوق نہیں ہے، وہ بھی جڑے کی طرح بے ہودہ انداز میں بھدکتے ہوئے.....“

اس نے کلپ کھولا۔ پھر دونوں نے مجھے پکڑ کر کمرے سے نکالا۔ باہر واقعی سردی حد سے زیادہ تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھیرا بدن کو چیر گیا۔ میرے دانت بچنے لگے۔ وہ دونوں واش روم کے باہر رک گئے جبکہ میں اندر چلا گیا۔ باہر پانی بجلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرے کا راج تھا۔ ایک بار پھر وہ تکلیف دہ مرحلہ درپیش تھا جس سے میں ایک مرتبہ پہلے مر رہا تھا۔ مستحکم خیز انداز میں بیٹھ کر بھی میں نے کلپ کو سونے کا عمل جاری رکھا۔ کم بجت عجیب ساخت کا تھا۔ اس کا میکانزم سمجھ میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ واش روم سے نکلا تو اپنی کپکپاہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ مختصر الوجود جیدے نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف کھینچا۔ ایک امید کوندے کی طرح میرے ذہن میں لگی اور میں نے بڑی سرعت سے اسے جھٹکا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مڑنے لگا تھا، بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر مجھ سے آن ٹکرایا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی گردن کے گرد بازو حائل کیا، اُسے کھینچ کر پہلو سے لگایا اور پلک جھپکنے کی سی دیر میں اپنا دایاں ہاتھ اُس کی گن پر ڈال دیا۔ وہ جب تک سنبھلا، تب تک نہ صرف وہ میرے زورادی شلٹے میں جکڑا جا چکا تھا بلکہ اس کی گن بھی میری دسترس میں آ چکی تھی۔

میرے غیر متوقع ردِ عمل کو بھانپنے اور خود کو سنبھالنے میں اس کے سامنے کو کچھ وقت لگا۔ اس دوران بساط پٹی جا چکی تھی، میں غرایا۔ ”گن نیچے پھینک دو ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔“ میری گرفت میں مچلنے والا جیدا جسمانی طور پر مجھ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود خود کو چھڑانے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی کہنیاں میرے پیٹ اور کمر پر یاریں۔ تھک کر تھم گیا۔ اب اسے ساکس لینے میں بھی دقت پیش آنے لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے کھانسنے لگا تھا۔ اس کا سامنے مزاحمت کا فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ رہا تھا۔ میں نے اُسے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں گن پھینکنے کا حکم دیا۔ اس نے بے بسی سے جیدے کو دیکھا اور کندھے اُچکا کر گن اپنے قدموں میں زمین پر رکھ دی۔ میں نے اپنے بازو کو زوردار جھٹکا دیا اور کہا۔ ”یہاں کتنے لوگ موجود ہیں؟“

اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ لمبی موچھوں والے نے کہا۔ ”ہم دو آدمی ہیں۔“ مجھے ایک ذرا تعجب ہوا کیونکہ میرے انداز سے اس کے

مطابق دونوں کو یہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ان کے علاوہ حویلی میں پہلے سے رہائش پذیر لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ضروری تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”بلو اور ملغانی کہاں ہیں؟“ وہ بولا۔ ”دونوں بلوچ نگر گئے ہیں۔ بڑے خان کے ساتھ۔“

بلوچ نگر میں سردار حیدر خان کا محل واقع تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ محل کے پر آسائش ماحول میں شبِ ببری کی غرض سے چلے گئے تھے۔

مجھے ان کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر کوئی اور حویلی میں موجود ہوتا یا گہری نیند سو رہا ہوتا تو میری آواز سن کر اب تک کھچارے نکل کر سامنے آ چکا ہوتا۔ میں چاہتا تو دونوں کو شوٹ کر سکتا تھا مگر اس احتیاط کے پیش نظر کہ فائر کی آواز مجھے کسی پریشانی سے دوچار نہ کر دے، میں نے گن پھینکنے والے کو چند قدم پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ نہ سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ میں نے جیدے کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا اور چاہا کہ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دوں مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی ہڈی تو بچ گئی مگر میرا کام ہو گیا۔ اس کے حلق سے نہایت ڈراؤنی خرخراہٹ نکلی اور بدن اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ جونہی میں نے اس کی گردن چھوڑی، وہ زمین پر بے جان انداز میں ڈھیر ہو گیا۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ وہ بے ہوشی کی اداکاری نہ کر رہا ہو، میں نے گن کی نال کا کندہ پوری قوت سے اس کی کٹھنی پر دے مارا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا یا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ میں نے اطمینان محسوس کیا اور گن کا زرخ چند قدم دور کھڑے ہوئے مونچھ بردار شخص کی طرف کر دیا جو حیرت پاش نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا زرخ اپنی جانب ہوتے دیکھا تو خوف کے مارے ہاتھ سر سے بلند کر لیے اور گھٹکیاں لگا۔

میں نے کہا۔ ”یہ کلپ کیسے کھلتا ہے؟“ ”پتا نہیں..... جیدا ہی کھولتا تھا۔“ وہ منتنایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر جھوٹ بولنا بھی بڑا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے مردوں کو بلانے کا ہنر آتا ہے۔ تم اپنا زرخ دوسری جانب کرلو۔“

وہ بیروں پر گھوم گیا۔ میں پھدکتا ہوا اس کے عقب میں پہنچا اور گن کو نال سے پکڑ کر پوری قوت سے اُس کے سر پر



دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ وہ پلٹنا چاہتا تھا مگر دوسری ضرب نے اُسے موقع نہیں دیا۔ سر پھٹنے سے خون کا فوارا چھوٹ پڑا اور وہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

میں زمین پر بیٹھ گیا اور کلپ کو ٹول کر اس کا چورسوج تلاش کرنے لگا۔ یہ صدکوشش بھی کہیں نہ ملا تو میں پریشان ہو گیا۔ دھیان کیا تو پتا چلا کہ اس منحوس کلپ کی ساخت ایسی تھی کہ میں اسے گولی مار کر توڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ گولی میرے کسی ٹخنے پر لگ سکتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنا بھی ضروری تھا ورنہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور انگلیوں کو ایک ننھا سا ابھار محسوس ہو گیا۔ اُسے دبایا، دائیں بائیں کھسکایا، مگر کلپ نے نہ کھلنا تھا، نہ کھلا۔ پھر میں نے کن اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر زمین پر کھڑی کی اور جلدی جلدی اٹنے سیدھے ہاتھ مارنے لگا۔ ایسے میں اچانک کوئی ہٹن قُب گیا اور 'کلک' کی آواز کے ساتھ ہی کلپ کھل گیا۔ میرے رگ دے میں بجلی بھر گئی۔ گن اٹھا کر اچھلا اور حویلی کے دروازے کی طرف دوڑا۔

زندگی کی قوی امید نے میرے تن بدن میں نئی روح پھونک دی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ اپنے پاس بلاتی ہے تو مردہ قدموں میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ میں پھانک نما بڑے چوہی دروازے پر پہنچ کر ایک ذرا ٹھہرا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ کتوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ دو یا تین..... مجھے کتوں سے نمٹنا آتا تھا مگر اس وقت میرے جسم پر جما ہوا خون چپکا ہوا تھا۔ سر کا زخم بھی موجود تھا۔ کتوں کو خون کی بونے دیوانہ کر دینا تھا۔ ایسی حالت میں کتوں پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ میں پلٹا اور برآمدے میں موجود سالخورہ میڑھی کی طرف بڑھا۔

ایسے میں مجھے بے ہوش پہرے داروں کا خیال آیا۔ وہ ہوش میں آ کر میرا تعاقب کر سکتے تھے یہ بھی بعید نہ تھا کہ مڈبھیڑ ہونے پر وہ مجھے گولی مار دیتے۔ میں پلٹا اور تیزی سے جیدے کے قریب پہنچا۔ اس کی بغض چپک کی۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ بڑی مونچھوں والا زندہ تھا۔ میں نے اُسے اوندھا کیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا، گن ایک طرف رکھی اور دونوں ہاتھوں کی سنگھسی اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ 'سٹناک' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی میرے حلق سے بھی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ پوری قوت سے جھٹکا دینے کی وجہ سے

میرے سر کا زخم پھر دکھ گیا تھا۔

میں نے یہ وقت تمام خود کو منہ کے بل گرنے سے بچایا۔ اپنی برہنہ پائی کا خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔ میں نے اس کی بھاری بھر کم نوروزی کھڑی اُٹھا کر پہن لی۔ میری جیبیں خالی تھیں۔ اس امید پر کہ اس کے پاس رقم ہوگی، میں نے اس کی جیبیں کھٹکائیں۔ چند نوٹ ہاتھ لگ گئے۔ یہی بہت تھے۔ انہیں گنے بغیر جیب میں ڈالا۔ خون آلود کپڑوں پر نگاہ پڑی۔ خیال آیا کہ کمروں کی سرسری تلاشی لوں۔ کوئی سوٹ مل جائے تو پہن لوں پھر ذہن میں تشویش دوڑ گئی۔ میں فضولیات کے چکر میں پڑ کر اپنے لیے خطرات مول لے رہا تھا۔

میں شارٹ گن اٹھا کر میڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور کھالا پہلی مرتبہ انہی میڑھیوں کے ذریعے چھت سے اتر کر محن میں آئے تھے۔ بے خونی سے جانی پہچانی میڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ یقین ہو گیا تھا کہ دوسرے پہرے داروں والی خونیں حویلی خالی تھی اور مجھے روکنے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ چاروں جانب پھیلی ہوئی چاندنی میں دیکھا بھلا منظر جگمگا رہا تھا۔ چونکہ میں نے بیلے والا راستہ دیکھ رکھا تھا اس لیے میں نے ادھر کا رخ کرنا مناسب سمجھا۔ بلوچ نگر والے راستے پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میں نے گن اپنی فیس کے پلو سے باندھی اور نیچے اتر آیا۔ مجھے کتوں کے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا۔ ان کے بھونکنے کی آوازیں حویلی کے اگلے حصے کی طرف سے بلند ہو رہی تھیں مگر میں متفکر تھا کیونکہ کتوں کے سونگھنے کی حس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ناہوار زمین پر درختوں کے بیچ سے گزرتا ہوا میں کھیت میں آ گیا۔ سامنے جھنگلی تھی جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ چڑھے چاند کی دودھیاروشنی میں چلنا مشکل نہیں تھا مگر میرے بخار زدہ جسم پر نقاب تاروی تھی جبکہ مجھے سڑک تک پیدل چلنا تھا۔ سفر زیادہ اور پُر خطر تھا۔ بھیڑیوں اور آوارہ کتوں کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔

میں احتیاط سے چلتا ہوا جھنگلی تک پہنچ گیا۔ کتوں کا خطرہ ٹل گیا اور میری رفتار قدرے تیز ہو گئی۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے غلطی کا احساس دلایا۔ میں نے مردہ پہرے دار کے جوتے اُٹار کر پہنے تھے مگر اُس کا کوٹ اُتارنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں سرکنڈوں اور جنگلی گھاس میں چپے ہوئے پر بیچ راستے پر جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ڈیڑھ سے کچھ اوپر کا مل تھا۔ رات

سرد تھی۔ دریا کے قرب کی وجہ سے فضا نرم اور مرطوب تھی۔ سردی کے مارے میرے ہاتھ پیرن ہو رہے تھے مگر میں رکنا نہیں چاہتا تھا تبھی منکسل چل رہا تھا۔ خان کی حویلی سے دور آ گیا تھا مگر پوری طرح چوکس تھا۔

اندازے کے مطابق میں نے نصف راستہ طے کر لیا تھا جب مجھ پر نقاب تاروی تاری ہونے لگی تھی۔ یلغار کی شدت غیر معمولی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بعد اب میرا دماغ بھی شل ہونے لگا تھا اور عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا انتہائی سردراتوں میں فصلوں کی آبیاری کی تھی۔ نہر کے پانی کو کھال کھال چلا کر فصلوں تک پہنچایا تھا۔ تب بھی ایسی کیفیت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ میں پکی سڑک تک پہنچنے میں شاید کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ یہ بے سرو سامان سفر میری قوت ارادی اور جسمانی استعداد سے زیادہ تھا۔ میں نے ایک موہوم سی امید کا سہارا لیا اور شیشم کے ایک قدرے بلند قامت درخت پر چڑھ کر ارد گرد دیکھا۔ کسی گھر یا ڈیرے کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ مغربی جانب کوئی دو میل دور دریا دکھائی دے رہا تھا۔ دریا کے کنارے کوئی بستی آباد نہیں تھی۔ میرے چاروں طرف کوندراور جنگلی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ میں درخت پر ایک کرسی نما جگہ پر تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ کر ہاتھ مسلنے لگا۔ کاش! میرے پاس ماچس ہوتی تو میں گھاس پھوس کو آگ لگا کر اپنے منجمد ہوتے ہوئے جسم کو حرارت دے لیتا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ حویلی سے نکلے ہوئے میں گھیس یا کھیل اور دیاسلائی اپنے پاس رکھ سکتا تھا جس کا مجھے اس وقت ہرگز خیال نہیں سوچا تھا۔ اس وقت تو مجھ پر محض حویلی سے جلد از جلد بھاگ نکلنے کی دھن سوار تھی۔

میں نے درخت پر بیٹھ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جلد ہی مجھے اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا۔ گھنے سرکنڈوں اور کوندراور گھرے ہوئے راستے میں ہوا نہیں لگتی تھی۔ درخت پر بیٹھا تو بخ بستہ ہوا بدن سے پار ہونے لگی۔ میں آواز دیر تک یہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی مایوسی کی دبیز دھند کو نوچ پھینکنے کی کوشش کی اور زندگی کے آخری لمحے تک بقا کی جنگ لڑنے کا فی الفور فیصلہ کر لیا۔ گھیس کا عقبی پلو پھاڑا اور سر پر باندھ لیا۔ کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں درخت سے اتر آیا۔ ایک مرتبہ پھر اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے چل پڑا۔

میں بیٹ والے موڑ پر آ کر ایک ڈرائز کا سامنے وہ راستہ تھا جو ڈرائز پر جا چڑھتا تھا۔ بائیں ہاتھ پر وہ تنگ اور دشوار گزار راستہ تھا جو نہر کی پٹری سے جاملتا تھا۔ یہ نہر چوک قریشی سے قصبہ گجرات اور محمود کوٹ جانے والی سڑک کو کراس کرتی ہوئی اس طرف آتی تھی اور مل کھا کر ڈرائز کو بیٹ کے مقام پر عبور کرتی تھی۔ یہ معلومات مجھے کھالے نے بہم پہنچائی تھیں۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر میں اس وقت بیلے سے نکل کر بڑی سڑک کے ویران مقام پر جا کھڑا ہوا تو کوئی ڈرائزور مجھے دیکھ کر گاڑی روکنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بیلے کا خطرناک بیابانی مقام، میرا ناگفتہ بہ اور مشکوک حلیہ، ہاتھ میں پکڑی ہوئی شارٹ گن اور سر پر باندھی ہوئی خون آلود پٹی..... رات کے اس پہر میں کوئی فائر اتھقل شخص ہی اتنا بڑا خطرہ مول لینے کا روادار ہو سکتا تھا۔ اگر میں بیٹ والی بستی کی طرف جا نکلتا تو کسی نہ کسی گھر سے مدد ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس میں خطرہ یہ تھا کہ مدد دینے والا پولیس کو مطلع کر سکتا تھا اور مجھے بے خبری میں سرکاری بنجرے میں پھنسا سکتا تھا۔

دونوں اطراف خطرہ موجود تھا۔ اگر میری حالت درست ہوتی اور حلیہ مشکوک نہ ہوتا تو میں یقیناً بستی کا رخ نہ کرتا۔ اپنے دم بہ دم ناتواں ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالا دینے کی خاطر میں نے نہ چاہتے ہوئے نہر کی پٹری کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ بستی کے کسی دروازے پر دستک دے بغیر میں آگ جلا کر سینک سکتا تھا۔ لائن کے ہول پر جا کر کھانا کھا سکتا تھا، چائے پی سکتا تھا اور کسی ٹرک ڈرائیور کی منت سماجت کر کے ملتان کی طرف عازم سفر ہو سکتا تھا۔ یہ راستہ بہت دشوار گزار اور ناہوار تھا۔ اگر آسمان پر چاند جلوہ گر نہ ہوتا تو شاید میں نہر کی پٹری تک پہنچ ہی نہ پاتا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے کے بعد اٹھنے کا یار نہ نہیں تھا۔

جب میں بیٹ والی خوابیدہ بستی میں پہنچا تو میرے قدم بُری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ وزنی نوروزی کھڑی میرے پیروں کو بُری طرح کاٹ رہی تھی مگر میں اُسے اتار پھینکنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کوئی گھٹنا بھر پیدل چلا تھا۔ عام حالات میں میرے نزدیک یہ کوئی بڑی مسافت نہیں تھی مگر رات کے اس پہر کی جان ہوا سردی میں چند قدم چلنا دو بھر تھا جبکہ میں نے کم وبیش آٹھ دس کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا۔ توقع کے برعکس بستی کے کتوں نے میرا استقبال نہیں کیا تھا اور میں خاموشی سے گلیوں میں سے گزرتا ہوا پکی سڑک پر آ گیا۔ اندازہ تو تھا کہ اس وقت سڑک پر ٹریفک



بہت کم ہوگی مگر ٹریفک بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ چھوٹا سا عام نوعیت کا اڈا تھا۔ یہ مشکل بیس تیس دکانیں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ پھلوں کی ریہڑیاں اور سبز یوں کے پچھے ترپالوں میں لپٹے ہوئے تھے جبکہ اڈے کے اگلوے چھپر ہوٹل کے باہر بھی سرکنڈوں کی بنی ہوئی چن دکھائی دے رہی تھی۔ آگ سینکنے کی خواہش آمیز توقع دم توڑ گئی۔ میں چند لمحوں تک نہر کے پل پر بنی ہوئی چھوٹی سی کنکریٹ کی دیوار پر بیٹھا رہا پھر پھلوں کی ایک ملفوف ریہڑی کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی سی تنگ دود کے بعد میں دو تین کیلے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہیں ندیدوں کی طرح حلق سے اُتارا۔ نلکے کی نوٹی سے منہ لگا کر پانی پیا، شارٹ گن کی نال کو چوما اور پل کے قریب پڑے ہوئے بند چوٹی کھوکھے کے نیچے پھینک دیا۔ ایک ہتھ ریہڑی پر سے قدرے بہتر حالت کی ترپال اُتار کر چادر کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ اب میں پہلی نظر میں مشکوک دکھائی نہیں دیتا تھا اور سرد ہوا سے بھی محفوظ ہو گیا تھا۔ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے سڑک کے کنارے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ گزرنے والے دو تین ٹرکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ایک لانگ روٹ کی بس بھی ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ مجھے ڈر لاحق ہوا کہ کوئی پولیس کی گاڑی ادھر نہ آئے۔

رنگ برنگ بیٹوں کے جلو میں آتی ہوئی ایک بس دکھائی دی تو میں نے دونوں ہاتھیں لہرا کر ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں رکی مگر اُس کے عین پیچھے آنے والی کالٹس کار رُک گئی۔ ایک شوخ آواز سنائی دی۔ ”اوائے جہاز۔۔۔۔۔“

(اوائے جہاز! کہاں جاؤ گے؟)

میں جلدی سے قریب ہوا۔ کار کی اندرونی لائٹ آن تھی۔ دھمک دار آواز میں ٹیپ پلیئر پر تانٹیکسٹر کا کوئی گیت چل رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نہایت وجیہ اور خوش لباس جوان بیٹھا ہوا تھا جو پہلی نظر میں کھلنڈری طبیعت کا مالک معلوم ہوا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے مظفر گڑھ جانا ہے۔“

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ”تو جاؤ“ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔“

میں نے دروازے پر جھک کر ملتیجانہ انداز میں کہا۔ ”کوئی سواری نہیں مل رہی ہے اس لیے براہ کرم مجھے لفٹ دے دیں۔“

وہ حیرت اور دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”طیلے سے جہاز لگتے ہو۔ لہجے سے پائلٹ افسر کی شکل سے زخمی مزدور۔۔۔۔۔ کمال کے آدمی ہو یا رتم۔۔۔۔۔ چلو! بیٹھ جاؤ۔ کیا یاد کرو گے۔“

میں نے عقبی دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”میں یار۔۔۔۔۔ اگلی سیٹ پر آؤ۔“

میں اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے شیشہ چڑھا دیا اور لگاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے سر پر جلی دور کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ ایک پٹی جھانک رہی ہے جس پر خون لگا ہوا ہے۔ کیا ہوا؟ کہیں یہ جہاز غلطی سے بجلی کے کھمبے پر لینڈ تو نہیں کر گیا؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں نشی نہیں ہوں۔“ اس نے مصنوعی تعجب سے کہا۔ ”اچھا! تم نشی نہیں ہو۔۔۔۔۔ تو پھر یقیناً میں نشی ہوں۔ نشہ کرتا ہوں۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”کہہ بھی لو تو کیا فرق پڑ جائے گا۔“ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اسٹیرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے گنگناہٹ لگا۔ ”یارو! مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں۔۔۔۔۔ یارو!“

وہ دیکھنے میں نہ صرف بہت پینڈسم، پڑھا لکھا اور نفیس مزاج تھا بلکہ خاصا خوش ذوق اور خوش گفتار بھی واقع ہوا تھا۔ گاڑی آپ ماڈل کی تھی۔ اس نے بڑا شاندار سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال نسبتاً چھوٹے اور فوجیوں کے انداز میں تراشیدہ تھے۔ چونکہ گاڑی کا میٹر چل رہا تھا اس لیے اس کی سیٹ پر کوٹ لٹک رہا تھا۔

اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے، بولا۔ ”یار! تم نے میرا ایکسری کر لیا ہے۔ اپنی الٹرا سائونڈ رپورٹ بھی دکھا دو۔ میرا مطلب ہے کہ تم کچھ اپنے بارے میں کہو، خاموشی مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

میں نے کہا۔ ”میں مصیبت کا مارا ہوا شخص ہوں، اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے دوست۔“ خود پر قابو پانے کے باوجود میرے لہجے میں تلخی گھل گئی، وہ بولا۔ ”ہوں۔۔۔۔۔ یہ دنیا، دنیا نہیں، مصیبت کا ہے۔۔۔۔۔ تارچر سہل۔ یہاں ہر کوئی مصیبت میں ہے۔ کوئی نئی بات کرو، بتاؤ۔۔۔۔۔ اپنی اس امپورٹڈ شال پر روشنی ڈالو۔ ایسی خوبصورت شالیں بے قدرے لوگ اپنی گاڑیوں پر ڈال دیتے ہیں، ہے نا؟“

اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ میں نے شرمسار ہو کر کہا۔ ”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔“

”اور ایجاد کی ماں کے ہوتے ہوئے بھی تم سردی سے“

کانپ رہے ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”زخم کا خون جما ہوا ہے۔ لگتا ہے کانی پرانا ہے۔ یقیناً تمہیں پٹی بدلوانے کا وقت نہیں ملا۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”اسلم علی۔“ میں نے جھوٹ بولا اور سر جھکا لیا۔ میں اس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا تھا۔ وہ مجھے نشی سمجھ رہا تھا اور میں اپنے دفاع میں خود پر ڈھائی جانے والی قیامت کو اس پر آشکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”کہاں سے آرہے ہو؟ اب یہ نہ کہنا کہ میں وہاں سے آیا ہوں، جہاں سے ہر آدمی آتا ہے۔“

”میں پیلے سے آرہا ہوں۔“

”کیا مظفر گڑھ میں رہتے ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان میں رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر کیا کرنے آئے تھے؟“ وہ بولا۔ ”صبح کی سیر کا“

نے نام بتانے کے بجائے انگریزی میں لکھے ہوئے نام کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا۔

”کہا تو ہے کہ مزدوری کرتا ہوں۔“

”ریس کورس گراؤنڈ میں گھوڑوں کو نہلاتے ہو؟“ اس نے کمال سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔!“ میں چونکا۔ ”میں زمیندارہ کرتا ہوں۔“

”ملتان شہر میں؟“ وہ ہنسا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ملتان کے قریب، گاؤں میں۔“

”جھوٹ۔۔۔۔۔ تمہاری آواز بتا رہی ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے تمہارا اثرو یو بند کر دینا چاہیے۔“ اس نے کہا اور آٹو رپورس ٹیپ پلیئر کا بٹن پیش کر کے کیسٹ کی سائڈ بدل دی۔

”ہم آواز گنگناہٹ لگا۔“ ہم نے صنم کو خط لکھا، خط میں لکھا۔۔۔۔۔ اے دل ربا، دل کی گلی۔۔۔۔۔“

اس کی گنگناہٹ اچانک تھم گئی۔ مجھے دیکھے بغیر سنجیدہ لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔ ”مسٹر! اگر تم خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہو اور تمہیں کسی دشمن کا خوف ہے تو گلو کو کپار ٹمنٹ میں سے میرا پستول نکال لو۔ فلی لوڈ ڈے، کام آئے گا۔“

میں نے ٹھنک کر اُسے دیکھا کہ وہ مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔ اُسے سنجیدہ پا کر میں نے کہا۔ ”شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔“

وہ قدرے حکیمانہ لہجے میں بولا۔ ”کھولو تو سہی۔“

میں نے بے دلی سے گلو کھولا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ایک چھوٹے سائز کا سلور کلر کا پستول پڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول کو چھوئے بغیر شاہد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا۔ ”چیک کرو، ایک دم جینون اور ولایتی مال ہے۔“

میں نے پستول اٹھایا۔ اس کا سرسری جائزہ لیا اور واپس رکھ دیا۔ وہ بولا۔ ”چاہیے تو رکھ لو۔۔۔۔۔ میں اور لے لوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور گلو بند کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”میرا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ سوچا تھا کہ تم کوئی ڈاکو ہو۔“

رات گئے شکار کی تلاش میں جھنک رہے ہو مگر اسلحے سے عاری ہو، تبھی یہ سہولت دے دی مگر جب تم نے پستول مجھ پر تان کر نہیں کہا کہ نکال دو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے تو مجھے مایوسی ہوئی۔“

”مگر تم کیوں لٹنا چاہتے تھے؟“ مجھے اس کی شخصیت دم بہ دم حیرت کے سمندر میں غرقاب کیے دے رہی تھی۔

”تا کہ تم اپنا کام کر کے چلتے بنو اور میرا وقت ضائع نہ“

”ہوں۔۔۔۔۔ یار تم تو پڑھ لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟“ میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس

”ہوں۔۔۔۔۔ یار تم تو پڑھ لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟“ میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس

”ہوں۔۔۔۔۔ یار تم تو پڑھ لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟“ میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس

”ہوں۔۔۔۔۔ یار تم تو پڑھ لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟“ میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس



کرو۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔ ”چھوڑو اس تذکرے کو، اگر مناسب سمجھو تو اپنی مصیبت پر روشنی ڈال ہی دو۔ دیکھتے ہیں کہ اس پٹاری سے کون سا سانپ نکلتا ہے۔ بالی داوے! میں تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ چاہو تو فائدہ اٹھا لو۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہاری یہی مدد میرے لیے بہت ہے کہ تم نے اجنبی ہونے کے باوجود مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے دی ورنہ اب تک میں وہاں سردی میں ٹھہر کر مر گیا ہوتا۔“

وہ مسکرایا۔ ”تم آسانی سے مرنے والے لگتے تو نہیں ہو۔“ اس کی توجہ کا مرکز میری ذات تھی۔ میں نے اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا۔ ”تم اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہو؟“

”یعنی مجھے اس وقت ڈرائیونگ نہیں کرنی چاہیے؟“ اس نے رُسان سے کہا۔

”ہاں! نقصان کا اندیشہ ہے۔“

”کیسا نقصان؟“ وہ عام سے انداز میں مستفسر ہوا۔

”جانی یا مالی؟“

”کوئی سا بھی.....“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا نقصان ہو چکا ہے۔ میری زندگی کی سب سے قیمتی شے چھین لی گئی ہے۔ اب کسی بھی واردات کا خطرہ نہیں رہا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”تم سمجھو گے بھی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ دنیا خوب صورت عذاب کدہ ہے۔ تم سردی میں ٹھہر کر مرنے جا رہے تھے جبکہ میں جلتی ہوئی آگ میں کھڑا ہوں اور موت کو آوازیں دے رہا ہوں۔ ہے ناں عجیب بات کہ تم بھی ناخوش، میں بھی دکھی۔“

میں نے کہا۔ ”تم شکل سے تو دکھی نہیں لگتے ہو۔“

”ہاں! خون نچر جائے تو بھی چہرہ سفید ہو جاتا ہے۔“

وہ بہت باتوں کی اور چالاک تھا۔ بات سے بات نکالتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم ڈیرا غازی خان سے آرہے ہو؟“

”نہیں..... میں پل غازی گھاٹ تک گیا تھا۔“

”اس وقت؟“

”لوگ وقت کے محتاج ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو وہ گھر سے نکلتے ہیں۔ سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شام کو گھر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں سورج کی پروا کیے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اُسے جب نکلنا ہو، نکل آئے، مجھے کوئی اعتراض

نہیں۔“

نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔ ”وہاں بہت ضروری کام تھا۔“

”ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... شاید کبھی ہوگا بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں

غیر متوقع طور پر مایوسی کھل گئی، بولا۔ ”پل پر سے دریا میں کودنے کا ارادہ تھا۔ یعنی خودکشی کا..... پھر دل نے ساتھ نہیں

دیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ مرنے سے پہلے میں سردی کی

اذیت برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس اہم ترین

کام کو کسی مناسب وقت پر ٹال کر واپس آ گیا ہوں۔“

”خودکشی؟ مگر کیوں؟“ مجھے اس کی بات پر یقین نہ

آیا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ خودکشی کا مرحلہ بہت گہرے

دکھ کے بعد درپیش ہوتا ہے جبکہ اس کا چہرہ طمانیت اور آسودگی

کو ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”شاید تم مذاق کر رہے ہو۔“

”شاید.....“ اس نے کندھے اُچکائے اور سیٹی بجانے لگا۔

مجھے اچنبھا سا ہوا۔ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں

تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو بہ غور دیکھا۔ بہر و پیا

معلوم ہوا۔ کبھی ہنسنے والا، کبھی رونے والا اور کبھی ایک دم

سنجیدہ مزاج..... میں نے چوٹ کی۔ ”اگر تم چاہو تو اپنی

اسٹوری کا اسکرپٹ سنا دو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پھر اچانک خاموش ہو

گیا اور بولا۔ ”ہاں! انسان، انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ شاید

اسی لیے خدا نے ایک سے زیادہ انسان پیدا کیے ہیں۔ تم

میرا دکھ سن لو، یہی بہت بڑی مدد ہوگی تمہاری۔“

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اُسے اپنے

انٹرویو سے ہٹا کر جواب دہ کر لیا۔ اس نے ایک طویل سانس

لی اور کہا۔ ”میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو

نہیں ہوگا؟ اوہ نو..... تم تو خودکشی ہو..... پتا نہیں جس پتے

ہو، ہیر و کن پھینچڑوں میں اُتارتے ہو یا رگوں میں ٹپکے

لگواتے ہو..... پُر مجھے کیا؟ میں تو اپنا دکھ بیان کر کے دل کا

بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا سننے کے لیے تیار ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! میں ہمدن گوش ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ افوہ! میں

بھی کتنا پاگل ہوں۔ کرتا تھا..... کیا مطلب؟..... کرتا

ہوں..... ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت

کرتی ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے، جانتے ہو؟ کبھی تم نے کسی

سے محبت کی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”محبت کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ

سکتا۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔“

”یہ بھی بکواس ہے میرے دوست..... کیا نام بتایا تھا



تم نے..... ہاں! اسلم علی..... یہ جتنے سرمایہ دار لوگ ہیں، مل اور زر اور سیاست دان ہیں..... ان پر محبت کا دورہ نہیں پڑتا۔ ان پر دولت کی ہوس کا دورہ پڑتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اور وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، چوری چوری ملاقاتیں کیں..... پھر پھنسا ہو گیا۔ یہ ہیرا رنجھا اور سوہنی مہینوال کی اسٹوری میں ولن موجود ہے۔ ہے ناں؟ بس سمجھو ویسا ہی ایک ولن ہماری محبت کہانی میں آن وارو ہوا اور لو کر ایسٹ شروع ہو گیا۔“

ہم اس دوران مظفر گڑھ شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”شہر آ گیا ہے۔ ابھی تم کہو گے کہ میں تمہیں اُتار دوں۔ اس طرح میری محبت کی طرح میری کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ اگر برا نہ مانو تو میں گاڑی ایک طرف روک دوں اور اپنی بات پوری کر لوں؟“ اس کے لہجے کی معصومیت نے مجھے مضطرب کر دیا۔ وہ جتنا کھلندرا اور شوخ طبع دکھائی دیا تھا، اس سے کہیں زیادہ پریشان اور ملول نظر آنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ”شاید! میرا حلیہ ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس دیکھ کر دھر لے گی اور میں ایک نئی مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔“

اس نے گاڑی روڈ سائڈ پر روک دی اور بولا۔ ”پولیس کی فکر نہ کرو۔ میرا دکھ سن لو۔ میں کسی سے بھی شہر نہیں کر سکتا۔ اگر یہی حالت رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا یا کوئی دماغی رگ پھٹ جائے گی۔“

اس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، جو ہو گا دیکھا جائے گا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کارلائٹر سے سلگائی اور بولا۔ ”ہینکس گاڈ!“ پھر شیشہ اُتار کر دھواں باہر اُچھالتے ہوئے بولا۔ ”یار! وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اتنی کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے لگتی تھی۔ وہ بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کا تہیہ کر رکھا تھا مگر اس کا باپ ولن کے روپ میں ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اُسے اپنے کسی بھانجے جیسے سے بیاہنا چاہتا تھا۔ پھر جانتے ہو، کیا ہوا؟“

میں نے لقمہ دیا۔ ”اس کی وہاں شادی ہو گئی جہاں اس کا باپ چاہتا تھا اور تمہارا کھیل ختم.....“

یار کے ساتھ کہیں منہ کالا کر گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ بہت خوب صورت تھی اس لیے اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ پہلی بات غلط تھی۔ اس کے چہرے پر تقدس کا اتنا طاقتور نور ثبت تھا کہ دنیا بھر کی سیاہیاں اسے کالا نہیں کر سکتی تھیں۔ یعنی اُسے اغوا کیا گیا تھا۔ ہائے! محبت انسان کو طاقت دیتی ہے مگر اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ میں جو اس کے لیے آسان سے تارے توڑ لانے کا دعویٰ رکھتا تھا، اُسے بازیاں نہیں کراسکا۔ تف ہے میری مردانگی پر..... میرے اختیارات پر.....“

اس نے سگریٹ کا لمبا کش پیچھڑوں میں اُتارا اور شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ نہیں ملی مگر میں زندہ ہوں جبکہ میں نے کئی مرتبہ اس کی گہری آنکھوں کو چوم کر وعدہ کیا تھا کہ اُس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہوں گا، مر جاؤں گا۔ جس دن میں نے یہ کہا تھا، اس دن نہ تو میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کا چہرہ ابھرا تھا، نہ اگلوٹی بہن کا، نہ باپ کا..... آج جب اس عہد کو نبھانے کا وقت آیا ہے تو کبھی چہروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میں نے یہ سانس بھی پڑھ لی ہے کہ ایک کی محبت میں زندگی گنوا کر مجھے تین سچی محبتوں کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے۔ ہے ناں سانس..... امریکا اس سانس کا بیروکار ہے۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کی محبت میں اتنا آگے نہیں جانا چاہتا کہ بھارت کی تجارتی منڈی میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ سچ کہتا ہوں کہ یہ دنیا مصیبت گاہ ہے ڈیر!“

بات کرتے کرتے اس کا گلا زندہ گیا تھا اور چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ میرے استعجاب سے لائق تھا، بولا۔ ”آج میں گھر سے چور کی طرح چپکے سے نکلا تھا۔ ارادہ تھا کہ غازی گھاٹ کے پل پر کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کو پکاروں گا۔ خدا سے پوچھوں گا کہ اگر اس نے مجھے مہینوال کی قسمت میں سوہنی کا ملاپ کرانا لکھا ہی نہیں تھا تو پھر ہمیں ملانے کی کیا ضرورت تھی؟..... کروڑوں اربوں کی دنیا میں میرے سوا اُس نے کسی اور دل میں سوہنی کی محبت کیوں پیدا نہیں کی تھی؟..... ہے ناں پرالم؟..... اگر میں اسے من مندر کی رانی بنانے کے قابل نہیں تھا تو پھر اُس وقت پھٹ کیوں نہیں گیا جب میں نے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کا پہلا بوسہ لیا تھا؟..... مجھے آگ کیوں نہیں لگی تھی اُس وقت، جب میں نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر خدا کو ہی اپنی محبت کا ضامن بنایا تھا؟..... ہائے دوست! میں خدا سے یہی پوچھنے کے لیے گیا تھا کہ اگر اس کی اتنی بڑی دنیا میں ہم دو محبت کرنے والے شادی کر لیتے تو اس کے قول پر حرف

سہم میں کیا گڑبڑ رونما ہو جاتی؟“

اس کی آواز پھٹنے لگی۔ میرا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ میں نے اُس کا شانہ چھپھپایا اور ورطہ حیرت میں ڈوب کر حصار کیا۔ ”پھر؟“

”پھر کیا؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دہ ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کئی مرتبہ بلند آواز میں پکارا۔ وہ نہیں بولا۔ مگر پکٹ پر ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں نے سن لیا اور کھڑے ہوئے میرے سر پر پہنچ گئے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اگر میری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو اُسے پکڑ کر اندر کر دیتے اور کہتے کہ تم قانون کی اجازت کے بغیر مرنے کا بھی اختیار نہیں رکھتے..... میں نے انہیں گالیاں دے کر بھگا دیا اور خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ میں احتجاجاً تمہاری دی ہوئی زندگی تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔ یہ بہت بڑا اور پاپا ہے، اسے بندے لگنا آتا ہے، میں جانتا ہوں۔ مجھے تیرا نہیں آتا، یہ بات ور یا جانتا ہے۔“

وہ ایک پل کوڑکا پھر بولا۔ ”ایسے میں ماں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کیا ایک لڑکی اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ مجھ سے میری ماما چھین کر دریا کے پر در کرنے چل پڑا ہے؟ چشم تصور میں کالج جاتی ہوئی بہن نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ بھائی! انتظار کرو، میں بھی تمہارے پیچھے آ رہی ہوں کیونکہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ باپ کے چہرے کی جھریاں گہری ہونے لگیں۔ وہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا..... یار! وہاں سردی بھی بہت تھی۔ دریا بنی ہوا نے میرے ارادے کی دیوار میں ان گنت سوراخ کر دیے..... میری روح کے کبھی جذبوں کو نمجند کر دیا اور پھر سانس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے کھجایا کہ تمہارے مرنے سے اغوا ہونے والی کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تمہاری بہن کو اغوا ہونے سے کون بچائے گا؟ تمہارے باپ کا سہارا کون بنے گا؟ ہے ناں بزدلی کی بات؟..... اور ڈیر! میں نے اس ڈاکٹر اُن کے آگے سر جھکا دیا کیونکہ در پردہ میں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا..... زندگی ایک بار ملتی ہے۔ لڑکیاں بار بار ملتی ہیں، ہے ناں؟ پُر میں پاگل ہوں۔ یہ جانتا ہوں، پھر بھی اسی لڑکی کو ہی سوچتا رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہے تو جہاں ہے، وہ مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا..... یقیناً!“

میں نے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر اُن منطقی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس سے انکار کرنے والا جاہل اور بزدل قرار پاتا ہے، اس

پر عمل کرنے والا دانش مند ہوتا ہے۔ تم نے دریا میں نہ کوڈر غفل مندی کا ثبوت دیا ہے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایسے ہی وقت میں مجھے سامنے سے آتی ہوئی گھومتی ہوئی نیلی بنی والی پولیس موبائل وین دکھائی دی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے گھبرا کر وین کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ..... وہ پولیس کی گاڑی آ رہی ہے..... پلیز! یہاں سے نکل چلو ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔“ وہ اپنی پیدا کردہ سوگوار ٹرانس سے نکل آیا اور بولا۔ ”کہاناں کہ فکر نہ کرو۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ میں کن ناکرہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ پولیس والے مجھے دیکھتے ہی پکڑ لیں گے۔“

”کیوں؟ کیا تم نے پولیس والوں کے پیسے دینے ہیں یا کوئی خطرناک اشتہاری مجرم ہو؟“ اس نے طویل سانس حلق سے خارج کی۔ ”اگر ہو بھی تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم کچھ کھاؤ گے؟“

”نہیں نہیں!“ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایسے میں موبائل وین قریب آ گئی تھی۔ شاید نے گاڑی کی لائٹس سے رکنے کا مخصوص اشارہ کر کے موبائل وین کو روکا۔ نیلے رنگ کی موبائل وین، جس کے ہونٹ پر سفید رنگ سے بڑے حروف میں پولیس لکھا ہوا تھا، سوزوکی کے عین سامنے، چند قدموں کے فاصلے پر آن رکی۔ میں نے شاکی نظروں سے شاہد کو دیکھا جو بے پروا بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں بڑی طرح چھنس گیا تھا۔ بیٹھا رہتا تو حراست میں لے لیا جاتا اور بھاگنے کی کوشش کرتا تو میری کمر چھلنی ہو جاتی۔ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں خوف زدہ نظروں سے وین سے ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے پولیس اہلکار کو دیکھنے لگا جو دروازہ کھول کر شاہد کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے شاہد کو سلام کیا اور قدرے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”خیر تو ہے فوجی صاحب! آج ہماری جگہ ڈیوٹی دینے لگے ہیں۔“

شاہد نے ہنس کر کہا۔ ”اوائے بکے تھانیدار! یہ ڈیوٹیاں شیوٹیاں تمہیں مبارک ہوں، میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ اپنے بڑے صاحب کو چکر دیتے ہو یا واقعی رات کو گشت پر نکلتے ہو۔“

”کوٹھی پر جا کر انہیں بتا دیجیے گا کہ ان کے ماتحت کس جانفشانی سے سرکاری فرائض سرانجام دیتے ہیں۔“ اس نے جواباً دانت نکالے۔ ”یہ کون صاحب ہیں آپ کے ساتھ؟“



کا راستہ اولاد ہے جبکہ مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے نکلتا ہے۔ چکن پیس ہاتھ میں آتے ہی تمہاری دلچسپی میری کہانی میں زیادہ ہوتی ہے۔“

مجھے ایک ذرا شرمندگی ہوئی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”چینی بھی لونٹا..... شرمندہ کیوں ہوتے ہو بھی! زندگی کھانے پینے کے علاوہ ہے ہی کیا؟..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ننھے مغوی نے واپسی پر ان دوا شفا کے نام بھی بتائے تھے جو اُسے کسی جنگل سے نیم مردہ حالت میں اٹھا کر اپنے ساتھ ملتان لے گئے تھے۔ ایک کا نام شہر یار جبکہ دوسرے کا نام خالد عرف کھالا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ شہر یار کا گھر نور پور میں واقع سائیں جگ جیت کے مزار کے قریب ہے۔ ہمیں وہاں جا کر پتا چلا کہ کھالے کا گھر بھی اسی گاؤں میں واقع تھا۔ دونوں آپس میں بڑے جگری یار تھے اور دونوں ہی گاؤں سے غائب تھے..... نہ سائیں ملا، نہ وہ دونوں ہاتھ لگے..... تفتیش جہاں سے شروع ہوئی تھی، بد قسمتی سے وہیں پر ختم ہو گئی!“

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اسپینڈو میٹر کی تھمی ہوئی سوئی پر نظریں مرکز کر کے خاموشی سے پیس کھانے لگا۔ یوں لگا جیسے میری موجودگی اچانک ہی اُس کے نزدیک بے معانی ہو گئی تھی۔

میرے پیٹ کی بھڑکی ہوئی آگ بجھ گئی تھی۔ منزل واٹر کی آدھی بوتل حلق سے اتاری اور بکس میں پڑے ہوئے نشو پینہ پھینچ کر ہاتھ منہ صاف کیا، کہا۔ ”یار! تم تو واقعی بہت دکھی انسان ہو۔“

وہ زہر خندانہ انداز میں مسکرایا، پھر چیخ بھری نظروں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔ ”تم میری مدد کر سکتے ہو، اگر چاہو تو.....“

”وہ کیسے؟“ میں چونکے بنانہ رہ پایا۔

”تم ملتان میں رہتے ہو۔ شکل سے اعلیٰ درجے کے آوارہ لگتے ہو۔ کوشش کرو تو ان دونوں کا کھوج لگا سکتے ہو جنہوں نے ننھے وحید کی جان بچائی تھی؟“

میرا ماتھا ٹھنکا، پوچھا۔ ”تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”یار! وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے وحید کو کہاں سے اٹھایا تھا۔“

”اگر انہوں نے تمہیں کچھ نہ بتایا تو؟“

وہ بڑے یقین سے بولا۔ ”وہ دنیا کے سب سے بڑے

کینے انسان ہوں گے جو میری دکھ بھری داستان سن کر بھی تعاون پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اگر انہیں کوئی مجبوری لاحق ہوئی تو میں کپروما ننگ تصویر پر عمل کروں گا۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو..... انہیں سلیوٹ کروں گا اور اپنی قسمت کو روتا

ہم کے ساتھ اس لیے چپکا رکھا ہے کہ میں کبھی اُسے فراموش نہ کر سکوں۔ مگر تم کیسے جانتے ہو؟“

مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ معاملے کو سنبھالنے کے لیے میں نے بات بنائی۔ ”میں نے تمہارا نام سن رکھا تھا۔ سب انسپٹر کا مود بانہ رویہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تم پرنسٹن پولیس کے بیٹے شاہد سلیم ہو۔ میرا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”چکن پیس آرہے ہیں۔ وہ کھالیں، پھر بات کریں گے۔“

پولیس کی موبائل وین دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد سب انسپٹر نے موبائل وین سے اتر کر شاہد کو فوڈ پیک، منزل واٹر کی دو چوٹی بوتلیں اور بقایا رقم تھمائی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ شاہد نے فوڈ پیک کھول کر درمیان میں رکھ دیا۔ گاڑی میں اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ وہ ایک نمٹاؤ کچ آپ کے سائے کو ناخنوں کی مدد سے کھولتے ہوئے بولا۔ ”موجاں شو جاں اڑاؤ ڈیر! اسے میری کہانی کو اچھے سامع کی طرح سننے کا انعام سمجھو۔“

میں نے ایک چکن پیس اٹھا لیا، پوچھا۔ ”تمہاری محبوبہ کے بھائی نے واپس آ کر کیا بتایا؟“

”تنہا بڑا آپ سیٹ تھا۔ نارل نہیں تھا۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی اور پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں سے بچا کر معلومات حاصل کیں۔“

”پھر؟ کیا بتایا اُس نے؟“ میں نے دلچسپی لی۔

”ہا! جو بتایا، وہ بھی کارآمد نہ ہوا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اور اس کی بڑی بہن سائیں دل جیت سے ملنے کے لیے نور پور نامی گاؤں میں گئے تھے۔ انہیں سائیں نے ثریت پلا کرے ہوش کیا اور کسی نامعلوم مکان میں شفٹ کر دیا۔ میں نے پولیس کو لے کر سائیں دل جیت پر ریڈ کیا تو پتا چلا کہ وہ اُسی دورانیے میں نور پور سے فرار ہو گیا تھا۔ کسی کو بھی اُس کے بارے میں علم نہیں تھا۔“

”وہ کیسے رہا ہوا؟ یہ اُس نے نہیں بتایا؟“ میں نے گہرا

اس نے ایک قہقہہ لگایا، پھر تادیر ہنستا رہا۔ میں نے قہقہہ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کیا اُس نے تمہیں کوئی لطیفہ بتایا تھا؟“

اس نے عجیب سے انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور ننھے بے غور دیکھا، بولا۔ ”دیکھا! ہمارے باپ دادا کتنے ہلکے لوگ تھے۔ انہوں نے لکھ رکھا ہے کہ عورت کے دل

رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ؟“

”فوج میں ہوں..... ورزش کرنے کے پیسے سرکار سے اینٹھتا ہوں۔ اچھا کھاتا ہوں۔ ٹھنڈا گرم، سب بچا ہوں۔ مگر جب سے میری معشوقہ اغوا ہوئی ہے، میں ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ اُدھر، فوج میں، اپنا ایک یار بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی میری حاضری لگا دیتا ہے، بھی چھٹی..... اور محسوس نہ کرنا پولیس والے سے مذاق کیا ہے میں نے..... تم میرے رقیب نہیں ہو۔ ویسے تو اس وقت پوری دنیا میری رقیب ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر چیز کو آگ لگا دوں۔“

وہ بڑی روانی سے گفتگو کرتا تھا۔ خوب روئی کے بعد یہ اُس کی دوسری بڑی خوبی تھی۔ تھوڑے وقفے کے بعد گویا ہوا۔ ”ہم کیا بات کر رہے تھے؟“

”تم اپنی ناکام محبت کی کہانی سن رہے تھے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں یار..... بہت غلط ہوا۔ میری محبوبہ غائب ہو گئی۔ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اُس کا ننھا منسا بھائی بھی اغوا ہوا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے بعد اچانک گھر پہنچ گیا۔ تب تک میں، میرا باپ اور لڑکی کے ماں باپ ان دونوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ جب بچے نے بتایا کہ اس کی بہن بھی زندہ ہے، تب کار جتھو کے لیے ہمارے جسموں میں نئی جان پڑ گئی مگر بازیاب ہونے والا بچہ ایسا کوئی کلیونہ دے سکا جس پر چلتے ہوئے میں، اس کے والدین یا پولیس مغویہ تک پہنچ جاتے۔ میں نے اُسے بہت کریدار مگر اس نے عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی کہانی سنا کر میرے ذہن کو مزید الجھا دیا۔“

میں ہونٹوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور آگئی کا نیا جہان مجھ پر کھلتا چلا گیا۔ میری نظروں کے سامنے ایک پل کو وحید کا چہرہ جھلایا۔ وہ اپنی بہن عاشری کے ساتھ اغوا ہوا تھا اور مجھے پیلے میں جاں بہ لب ملا تھا۔ پھر اُسے ملتان سے گاڑی پر بٹھا کر گھر آکے روانہ کر دیا گیا تھا۔ عاشری کا غم زدہ دیوانہ جس سے ملنے کے لیے وہ مظفر گڑھ آیا کرتی تھی، یقیناً یہی تھا، شاہد سلیم.....! میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”ڈیش بورڈ پر تمہارا نام شاہد لکھا ہے۔ تمہارا پورا نام شاہد سلیم ہے؟“

وہ چونکا۔ ”ہاں..... میرا نام شاہد سلیم ہے۔ مجھے حلقی کرنے والے سلیم شہر والے ہیں اسی لیے اپنا نام

”یہ میرا رقیب ہے..... ہا!..... رقیب! پرتم کیا جانو، یہ رقیب کس بلا کا نام ہے۔“ شاہد پر سوار غم و اندوہ کا تاثر چند لمحوں میں ہی زائل ہو گیا تھا، بولا۔ ”اوائے نکلے تھانیدار! بچ بول، تیرے قانون کے پاس کوئی ایسی دفعہ ہے، جس کے لگانے سے میرا رقیب ساری عمر حوالات میں پڑا رہے اور میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ موجاں شو جاں کرتا رہوں؟“

”فوجی صاحب! ہمارے قانون میں ہر دفعہ موجود ہے۔ آپ حکم کر کے دیکھیں۔ گنگنے کی طرح قانون کی انگلی میں ایسے جڑوں گا کہ قیامت تک نکل نہ پائے گا.....“ نکل تھانیدار چھاتی پھلا کر بولا۔ ”ایک بس بابا جی کو سنبھالنا آپ کے ذمے رہا۔ اسے ساری عمر چکروں میں ڈالے رکھنا میرا کام.....“

میری سانس حلق میں اُٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شاہد کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں تھا بلکہ کسی بڑے آفیسر یا سیاست دان کا من چلا بیٹا تھا اور اس سب انسپٹر عرف نکلے تھانیدار سے خاصا بے تکلف بھی تھا۔

سب انسپٹر سوزو کی کالس کی چھت پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور اجازت طلب انداز میں بولا۔ ”کوئی خدمت ہمارے لائق؟“

”یار! اُدھر جھنگ موڑ سے دو چار تمکین کلر پکڑ لاؤ..... زور کی بھوک لگی ہے۔ یہ کم بجت گاڑی چلتی کم اور اچھلتی زیادہ ہے۔ کھایا پیسا سب ہضم کر ا دیتی ہے؛ منتوں میں..... یہ پکڑو پیسے اور اس کے سر پر کھڑے ہو کر روسٹ کرانا..... زیادہ نہیں، بس دو چکن بریسٹ پیس!“

اس نے جیب میں سے ایک بڑا نوٹ کھینچا اور سب انسپٹر کو تھما دیا۔ اس نے مروتا دو تین مرتبہ نوٹ لوٹا نا چاہا مگر شاہد نے سختی سے روک دیا اور کہا۔ ”تم مجھے دو پیس کھلا کر عوام سے بیس اصل کلر اینٹھ لو گے۔ ناں یار! مجھے بد دعاؤں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ تم لوگوں کو تو خیر توپ سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اوائے ہاں! پانی کی بوتلیں بھی پکڑ لانا۔“

وہ ہنستا ہوا پلٹ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس جھنگ موڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے دم میں دم آیا۔

شاہد شگفتہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے مجھ پر ڈاکا نہیں مارا، بھلے دنیا کو کتنی کا ناچ نچاؤ، انگلیوں پر تھر کاؤ، مجھے کیا۔ ویسے دنیا میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

میں نے مرعوب ہو کر پوچھا۔ ”تم کیا کام کرتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”بتایا تو ہے کہ زندگی میں ایک ہی کام چھیڑ رکھا تھا۔ وہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ میں اپنے عشق کی بات کر



کونٹھی کی عمارت گیٹ سے کوئی تین سو فٹ کے فاصلے پر اپنے کرد فرسیت موجود تھی۔ پارکنگ میں نیلے لکڑی نیلی عتی والی ایک لینڈ کروڑ اور ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کروڑ لکڑی تھی۔ شاہد نے پارکنگ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی گیٹ سے پر کھڑی کر دی اور مجھے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ میں نے اُس کی تھلید کی۔ باہر قدم رکھتے ہی سرد ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکرایا اور مجھے یاد آیا کہ میں زندگی جیسی طویل اور موت جیسی سردرات کا مسافر تھا۔ کونٹھی کے اگلے حصے میں دو سنتری گیس ہیٹر آن کیے اسٹولوں پر بیٹھ کر ہاتھ سینک رہے تھے۔ انہوں نے اٹھ کر شاہد کو سیلوٹ کیا۔

شاہد نے تھکسا نہ لہجے میں کہا۔ ”انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔ گیزر آن کر دو تا کہ ہم منہ ہاتھ دھولیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ کونٹھی کے اندر چلا گیا جبکہ ایک سنتری نے مجھے گیٹ ہاؤس میں پہنچا دیا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو اس نے گیس ہیٹر آن کر دیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے تشکیک آمیز لہجے میں بولا۔ ”صاحب! میں گیزر چلانے جا رہا ہوں۔“ وہ چلا گیا تو میں نے سرسری نظروں سے گیٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ کافی پُر آسائش جگہ تھی۔ آرائش کا انداز بھی سادگی مگر جاذبیت لیے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاہد کی آواز سنائی دی۔ وہ سنتریوں سے باتیں کرتا ہوا گیٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ سیدھا میری طرف آیا اور کھڑے کھڑے بولا۔ ”کچھ دیر میں پانی گرم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم نہالو اور فریش ہو جاؤ۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”اس وقت؟“ ”پانی گرم ہو تو پھر دن کیا اور رات کیا؟“ وہ آنکھیں نچا کر بولا۔ ”تمہاری حالت خاصی رَف ہے۔ پہلی نظر میں اجڑا اور پیشہ ور چور ڈاکو معلوم ہوتے ہو۔“ میں نے بدن پر لپٹی ہوئی ترپال، کچڑ اور دھول میں آٹی ہوئی نوروزی چپل اور میلے چیکٹ لباس پر نظر ڈالی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس نے قدرے حکم آمیز آواز میں کہا۔ ”تمہیں یقیناً میرا لباس فٹ آئے گا۔ لیکن اگر اس خرچے سے نجات حاصل کر لو۔“

میں نے اپنی کپٹی پر ہاتھ رکھا۔ ”مگر میرے سر میں زخم ہے۔ گیلیا ہو کر خراب ہو جائے گا۔“ ”اس کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ ویٹ فار اے موٹ ڈیر!“

اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم گھر چل رہے ہیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں شاہد! جو پوچھتا ہے، میں پوچھ لو پھر جھنگ موڑ اُتار کر گھر چلے جانا۔ وہاں سے مجھے ملان کے لیے بس یا ویکن آسانی سے مل جائے گی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور حتی انداز میں بولا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہاری حالت درست نہیں ہے۔ جو بھی دیکھے گا شکوک ہو جائے گا۔ صبح ہونے والی ہے۔ نہا کر چیخ کر لینا اور ناشتا پُرپ کر کے ملان چلے جانا۔ مجھ پر شک نہ کرنا۔ میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور بھی نہیں چاہوں گا کہ میرے خلوص پر حرف آئے، کہاناں!“

”تمہارا باپ.....“ ”تم نے اگر پچاس قتل کر رکھے ہیں اور کروڑوں روپے تمہارے زندہ یا مردہ سر کی قیمت مقرر ہے، تب بھی میں تم پر کوئی آج نہیں آنے دوں گا۔ میں نے وعدہ کیا ہے یار!“ میں نے اس کے پختہ ارادے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور سر جھکا لیا۔ لذیذ چکن پیس نے جسم کو توانائی دی تھی، کار کے چلتے ہوئے اتر ہیٹر نے رگوں میں اتری ہوئی سردی کو نوچ پھینکا تھا مگر میں مکمل طور پر فٹ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر کے زخم کی نوعیت کیا تھی مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ زخم علاج طلب تھا۔ آرام کی بھی ضرورت تھی۔ سخی محمد کے ساتھ دو آجے کی طرف جانے کے لیے میڈم کی کونٹھی پر پہنچنے کے بعد سے اب تک ایک لمحے کو بھی چین نہیں آیا تھا۔ شاہد دیکھنے میں بے ضرر اور یار باش انسان تھا، اس پر یقین کیا جا سکتا تھا، بھی میں نے خود کو اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

جھنگ موڑ پر پولیس وین کھڑی تھی۔ چکن پیس لا کر دینے والا سب انسپکٹر پانچ چھ سپاہیوں کے نرغے میں ہونٹ کے باہر کھڑا تھا۔ سبھی نے ہاتھوں میں ربڑی دودھ کے پیالے تھام رکھے تھے۔ شاہد نے ان کے قریب جا کر گاڑی آہستہ کی، شیشہ اُتار اور نعرہ لگایا۔ ”شادابھی سرکاری جوانو.....“

سبھی نے بہ یک آواز جواب دیا۔ ”شاہد صاحب زندہ ہوا!“

وہ پیچھے رہ گئے۔ شاہد نے ہونٹ سیڑ کر سیٹی بجائی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد اس نے مین روڈ پر واقع سرکاری رہائش گاہ کے نیلے اور سرخ رنگ والے بڑے آہنی گیٹ پر بریک لگائے۔ ہارن کی آواز سن کر گیٹ کے ماتھے سیکورٹی روم میں سے ایک سپاہی برآمد ہوا۔ اس نے شاہد کو سلام کرنے کے بعد گیٹ کھول دیا۔ سرکاری

نے کوئی جرم کر رکھا ہے؟..... اگر ایسا ہے، تو بھی سچ کیا..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر آج نہیں آنے دوں گا۔ تم بس کسی طرح ان دونوں کو تلاش کر دکھاؤ..... میں احسان فراموش شخص نہیں ہوں۔ میں تو محبت کرنے والا انسان ہوں۔ اور..... اور..... میں کسی کو گزند پہنچانے کا خواہش مند ذہن نہیں رکھتا۔ صرف اُسے الٹا لٹکاؤں گا جس نے میری جان من کو میری نظروں سے دور کر رکھا ہے۔“

اس کے رویے نے اُس کے اخلاص کو مجھ پر عیاں کر دیا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ”تو پھر وعدہ کرو اپنی محبوبہ کی قسم کھاؤ کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھو گے۔“ اس نے بڑے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا، کچھ سوچا اور کہا۔ ”میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“ میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”شاہد! میں نے تمہیں اپنا نام اسلم بتایا تھا۔ میں اسلم نہیں ہوں بلکہ شہر یار ہوں۔ وہی، جس نے وحید کی زندگی بچائی تھی۔ میں تمہاری اور عاشی کی محبت سے بھی واقف ہوں۔ لو! میں نے تمہاری بہت بڑی الجھن دور کر دی ہے، تم اپنا وعدہ نبھانے کی فکر کرو۔“

میری آواز سے چیخ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ کھلنڈراپن عطا ہو گیا اور وہ مجھے یک ٹک دیکھنے لگا۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا حالانکہ میں نے اُسے یقین دلانے کے لیے عاشی کا حوالہ دیا تھا جبکہ اس نے مجھے اپنی محبوبہ کا نام نہیں بتایا تھا۔

وہ بولا۔ ”تم شہر یار ہو وہی جس نے وحید کو بچا ہوا تھا اور تم نے میری محبوب ترین ہستی کا نام بھی لیا ہے..... عاشی..... کیا تم نے یہی کہا ہے؟“

میں نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔ اب تم جو چاہو، دریافت کر لو۔ میں بتانے کو تیار ہوں۔“

اس کی لمبی زبان شاید دانتوں تلے دب گئی تھی۔ کافی دیر بعد اس کی جھکی جھکی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”مگر تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“

”کہا تو ہے کہ مصیبت میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کس مصیبت میں؟“

”یہ لمبی اور غیر متعلقہ کہانی ہے۔ تم اپنی بات کرو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

اس نے ایک ڈرا مجھے دیکھا اور ہنسنا۔ پھر گاڑی

دھوتا لوٹ آؤں گا کیونکہ انہوں نے ایک انسان کی جان بچانے کا اعزاز حاصل کر رکھا ہے۔“

اس کا لہجہ بڑا پختہ مگر کرب سے لبریز تھا۔ اس کی نیم بھرائی ہوئی، جذبات سے مغلوب آواز نے مجھ پر اداسی اور شکست خوردگی طاری کر دی۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”ممکن ہے وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے منظر عام پر نہ آنا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں تم کیا کرو گے؟“

”میں انہیں کسی کے سامنے لے کر جانا بھی کیوں چاہوں گا۔ مجھے وہ نہیں، اپنے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔“ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟“

میں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دل اُس کی مدد کا ارادہ رکھتا تھا مگر ذہن الجھن زدہ تھا۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا تھا، اس لیے مجھے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ وہ میری خاموشی کو انکار سمجھ کر بولا۔ ”یار! تم کوشش تو کر سکتے ہو۔ دیکھو! اگر تمہیں پیسوں کی پراہم ہے تو سمجھو! اٹ! زونو پر اہم..... جتنے مانگو گے، اتنے دوں گا..... ہوں؟ اگر تم انہیں ڈھونڈ نکالو گے تو ٹکڑا انعام بھی دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”شاہد! تم بہت اچھے انسان ہو۔ ایک لڑکی کے لیے اتنی سنجیدگی سے سوچتے ہو، یہ تمہاری عظمت کی دلیل ہے مگر.....“

”کہانا! میری مدد کرو۔ میں تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دوں گا۔“ وہ اسٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

میں اس دوران دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اس پر اپنا آپ آشکار کر دینا چاہیے۔ میں نے ایک طویل سانس پھینچ پڑوں میں اُتاری اور کہا۔ ”اوکے مسٹر شاہد سلیم! میں تمہاری الجھنیں دور کر دیتا ہوں۔ مگر بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟“

وہ ایک دم میری جانب پلٹا اور میرا بازو تھام کر سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے تمہاری ہر ڈیمانڈ منظور ہے، بولو..... کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں تمہاری مدد کرتا ہوں، تم میری مدد کرو..... بس! مجھے میسے نہیں، یہ وعدہ چاہیے کہ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرو گے اور نہ ہی منظر عام پر لاؤ گے۔“

اس کے چہرے پر غیر معمولی استعجاب رقم ہو گیا۔ ”کیا مطلب؟ میں تمہیں کیوں پولیس کے حوالے کروں گا؟ کیا تم



”اشتبہاری ہو؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“

”تمہیں اتنی سی بات کی سمجھ بھی نہیں آتی کہ سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر سے تمہیں کون گرفتار کرنے کی جرات کر سکتا ہے؟“

”سپرنٹنڈنٹ آف پولیس.....“ میں نے برجستہ کہا۔

”سپرنٹنڈنٹ صاحب کا آفیسر بھی میری منجھی میں ہے۔ تم جانتے ہو، وہ کون ہے؟“ وہ مسکرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”میری ماما اُن کی آفیسر ہیں۔“

میں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ٹھیک گیا۔ کان لگا کر کچھ سن رہا پھر بولا۔ ”لگتا ہے، پایا آگئے۔“

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ چند لمحوں بعد ایس ایس پی سلیم شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید لباس کا کلف شدہ لباس پہن رکھا تھا۔ شاید وجاہت اور نین و نقوش میں اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جب وہ صوفے پر بیٹھ گیا، میں بھی مودبانہ انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گہری نظروں سے میرا سر تا پا جائزہ لیا اور بڑے شائستہ لہجے میں خیریت دریافت کی، پھر شاہد کو مخاطب کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنے موضوع پر گفتگو کرنی چاہیے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔“

شاہد نے اپنے مخصوص کھنڈرے انداز میں عاشی اور وحید کے اغوا کی کہانی اور اب تک اپنی اور محکمہ پولیس کی کارگزاری بیان کی۔ کم و بیش یہی باتیں اُس کے منہ سے

میں نے پہلے ہی سن لی تھیں۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے ہونے والی اتفاقی ملاقات کا ماجرا سنایا اور بولا۔

”پاپا! شہزیار اور اس کے ساتھی خالد نے وحید کو نیم مردہ حالت میں اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جب وہ ٹھیک ہوا تو انہوں نے اُسے بس میں بٹھا کر گھر روانہ کر دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی انکوائری..... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے عشرت تک پہنچنا ہے۔“

سلیم شہزاد نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور پیار سے کہا۔

”اگر میں نے محبت نہ کی ہوتی تو شاید تمہیں نصیحت کرتا کہ اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اب یہ کہتا ہوں کہ فکر نہ کرو، تمہارا خلوص تمہیں اُس تک پہنچا دے گا۔“ پھر میری طرف

مڑے۔ ”ہاں تو بیٹا! مجھے یہ بتاؤ، کیا تم وحید کو پہلے سے جانتے تھے؟“

”جی سر!“ میں نے کہا۔

مگر تہی موٹے اور ملائم کپیل نے مجھے آغوش میں لے کر مہری نیند سلا دیا۔ ذہن کی غلام گردشوں میں چکرانے والا آخری رقص خیال یہی تھا کہ میں موت کا لباس سفر طے کر کے زندگی کی بے حدت آغوش میں سر رکھ چکا تھا اور قسمت نے مجھے اُس شخص سے اتفاقاً ملا دیا تھا جس سے ملنے کی خواہش میرے دل میں چپکے چپکے پلٹی رہی تھی۔

نصف دن گزر گیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ پرسکون اور بھرپور نیند لینے کے وجہ سے میری حالت بہتر ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

کمرے کی صفائی کی جا چکی تھی اور میرا ناقول اور میلا کپڑا لباس غائب تھا۔ کیس میٹراب بھی چل رہا تھا جس کی وجہ سے سردی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ میں نے اپنی کپڑی کوٹولا۔

معمولی نوعیت کا درمخوس ہوا۔ ایک آدھ دن میں زخم ٹھیک ہونے والا تھا۔ جب ایک وردی پوش نے جھانکا، میں دیوار گیر چینیٹنگ دیکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے بیدار دیکھ کر اُس نے دریافت کیا۔ ”سر! کھانا تیار ہے، لے آؤں؟“

”شاید کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ خیال آنے پر فوراً ہی صبح کی۔ ”میرا مطلب ہے شاہد صاحب دکھائی دیں تو انہیں بتا دینا کہ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”بس سر! میں نے کھانے کے بارے پوچھا ہے۔“ اس کا لہجہ مودبانہ تھا۔

”بس.....“

پانچ منٹ بعد اس نے ڈائنگ ٹیبل پر پرکلف کھانا جن دیا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ میں نے کھانے سے انصاف کیا، ڈرنک لیا اور شاہد کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نصف گھنٹے بعد آیا۔ ٹراؤزر اور شرٹ پہنے ہوئے تھا اور کالج بوائے لگ رہا تھا۔ مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا اور بولا۔

”کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں، شکر ہے!“

”میں نے پایا سے بات کی تھی۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ ابھی تو آفس میں ہیں۔ جلد آنے کا کہہ گئے تھے۔“

”یار مروانہ دینا۔“ میرے ذہن میں تشویش کا کیزا رنگ گیا۔ ”میں عام آدمی نہیں ہوں.....“

”یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ تم عام نہیں، خاص آدمی ہو۔“ وہ میری بات کاٹ کر شوخی سے بولا۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں جس کیسے بتاؤں کہ میں پولیس کا سامنا نہیں کر سکتا۔“

گیا۔ وہ کاشن سویپ کی مدد سے جیل صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”نہایت بدتمیز انسان ہو یا رتم تو.....“ کہا بھی تھا کہ احتیاط سے کام لینا۔ تین سو روپے کی امپورٹڈ جیل لگائی تھی تاکہ زخم گیلانہ ہو۔ تم نے پھر بھی زخم گیلانہ کر دیا۔ افوہ! جاہل شخص کی یاری بھی کسی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ پر ایک بات ہے مسٹر پیٹنڈو! تمہارے بال بڑے ملائم اور شائنی ہیں، ایک دم کسی رنگ فریج گرل کی طرح..... واؤ!“

نیوٹریپ کی مدد سے اس نے اسارٹ بینڈیج کی، اشنی باؤنک اور پین کمر گولیاں کھلائیں اور اٹھ کر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے فارغ کر دیا۔

میں نے اُسے بے حد ممنون نگاہوں سے دیکھا تو وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔ ”میں جوتے لینے جا رہا ہوں۔ ڈرو مت، ماروں گا نہیں..... پہناؤں گا۔“

پھر قالین پر میرے اُتارے ہوئے لباس اور تریپال پر پڑی ہوئی نوروزی کھینڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دل کھول کر ہنسا۔ ”یہ لکڑی مار کہ کھڑاؤں تو میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں، بیروں میں ڈال کر ان کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے۔ اسے دیکھو! کیسی عجیب ٹوپی ہے۔ شاید ظہیر الدین بابر کے کسی شیر وزیر کی ہے۔ اور ہاں! چائے کا موڈ ہے؟“

میں نے شرمسار ہو کر کہا۔ ”شاہد! میں اتنا اہم نہیں ہوں۔“

”مجھے مطلب بھی تو ہے تم سے۔“ وہ ہنس کر بولا اور گیٹ ہاؤس سے نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد جوتوں کا ڈبا جس پر ایک مہنگی کمپنی کا نام چھپا ہوا تھا، اٹھائے لوٹا اور میرے پیروں کے قریب فرش پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں جراثیم بھی ہیں..... پہن لینا۔ تھوڑی دیر میں سنتری بادشاہ چائے لے آئے گا۔ پینا اور ادھر جا کر سو جانا۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں، جا کر آرام کروں گا۔ صبح بات ہوگی۔ ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے دیوار گیر کھینڑی کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی۔ ”صبح تو ہونے والی ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے کہا تھا ناں کہ میں سورج کی حکمرانی کو قبول نہیں کرتا ہوں۔ جب جاگوں گا، تب میری صبح ہوگی۔“

اوکے ڈیر! ٹیک کیئر..... اینڈی یو! ان کنگ مارنگ۔“

اس نے ہاتھ لہرایا، دل آویز خوب صورت مسکراہٹ میری جانب اُچھالی اور پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد سنتری نے چائے کا کپ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ چائے پینے کے بعد میں جوتے اور جراثیم اٹھائے ملحقہ بیدروم میں گس گیا۔ نہایت آرام دہ بیٹھ

وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بنگر میں لٹکتا ہوا سوٹ اور میڈیکل کٹ اٹھا لایا۔ اس نے مجھے ٹوب لائٹ کے نیچے قالین پر بٹھایا اور پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لینے لگا، بولا۔ ”زخم تو خاصا گہرا ہے۔ شاید خراب بھی ہو گیا ہے..... نہیں..... ابھی سپ نہیں پڑی۔ اس کی صفائی کر کے واٹر پروف جیل لگا دیتا ہوں۔ نہاتے ہوئے احتیاط سے کام لینا۔ پٹی بعد میں کر دوں گا۔“

جدید طرز کی میڈیکل کٹ میں حادثاتی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ضروری سامان موجود تھا۔ اس نے زخم کی اطرائی جلد صاف کی، بال کاٹے اور اسپرٹ اور ہائیڈروجن پراکسائیڈ کی مدد سے صفائی کرنے لگا۔ محسوس ہوا کہ تکلیف میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ٹانگے لگانا پڑیں گے؟“

”نہیں۔ زخم گہرا ہے، بڑا نہیں ہے۔ جس گدھے ڈاکٹر نے پٹی کی تھی، اگر وہ سویپ صبح جگہ پر رکھتا تو اب تک زخم ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ خیر..... فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے دلا سا دیا۔ ”منظر گڑبڑ آنے سے پہلے پایا کی اپائنٹ منٹ ڈسٹرکٹ وہاڑی میں تھی۔ وہاں پایا کا ایک دوست ہوا کرتا تھا..... ڈاکٹر اکمل مجید..... میں اُسے انکل بالکل جدید کہا کرتا تھا..... وہ نہ صرف پایا کا بلکہ میرا بھی اچھا دوست تھا۔ وہ مجھے میتھ کی ٹیوشن بھی دیا کرتا تھا اور میں نے اس سے میتھ پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سیکھ لیا۔ ہے ناں مزے کی بات؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ غصے سے بولا۔

”زبان ہلاؤ، سر کو حرکت نہ دو پیٹنڈو! پشٹ!“

اس کے ہاتھوں کی حرکت ماہرانہ تھی۔ زخم پر جیل کا لپ کرنے کے بعد اس نے مجھے سوٹ تھمایا اور ہاتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔ ”شیونگ کا سامان الماری میں پڑا ہے۔ یہ جھاڑ جھنکار بھی کاٹ پھینکا۔ بہت برا لگ رہا ہے۔“

اس نے درست کہا تھا۔ مجھے فریش ہونے کے لیے ہاتھ لینا چاہیے تھا۔ گرم پانی نے نہ صرف میری ٹھکن اُتار دی بلکہ میں خود کو نہایت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے مجھے نئی زندگی میسر آ گئی ہو۔ چیخ کر لینے کے بعد قد آدم آئینے نے تائید کی کہ میں واقعی چھج ہو گیا تھا۔ بالوں کو احتیاط سے سنوارتے ہوئے ہاتھ روم سے باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو کر بولا۔ ”اب ہوئی ناں بات..... تم تو اچھے خاصے انسان لگتے ہو ڈیر!“

میں کھیا کر، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر قالین پر بیٹھ



چاہتا ہے کہ ابھی اڑ کر حیدر خان کے سر پر پہنچ جاؤں اور اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دوں۔ پاپا ثبوت مانگتے ہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ یہ شیطان جاگیر دار اپنے جرائم کے ثبوت نہیں چھوڑا کرتے۔

”تو؟“ میں نے پوچھا۔  
”تم ہی کچھ کر سکتے ہو شہر یار! الدین کا چراغ رگڑو، کوئی جام جشید ڈھونڈ لاؤ۔۔۔۔۔ کچھ بھی کرو۔۔۔۔۔ مجھے میری عشرت لاؤ۔ فارگا ڈسک ڈیز!“

وہ اٹھا اور پلک جھپکتے میں میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”انکار نہ کرنا یار! تم مسیحا بن کر میری زندگی میں آئے ہو۔ مسیحا کون ہوتا ہے، جانتے ہو؟ وہ جو خدا کی تخلیق کی ہوئی زندگی کو بچاتا ہے۔ تم نے وحید کی زندگی بچائی۔ میری بھی بچا لو۔ زندگی میں بھی تمہارے کام آ جاؤں گا۔“

میں نے اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنے ساتھ اُسے بھی کھڑا کر دیا، پھر سینے سے لگا کر بچھنے لیا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ایک ہی مسافت سے برسرِ پیکار بے سرو ساماں، خانماں خراب مسافر تھے۔ سبھی قدرت کی طرف سے مجھے اُس کی اور اُسے میری محبت کا قیمتی جذبہ سونپ دیا گیا تھا۔

وہ چائے نہیں پیتا تھا مگر مجھے الوداعی چائے پلانا چاہتا تھا۔ چائے پینے کے دوران اس نے عاشی کی بہت سی یادیں میرے ساتھ سیر کیں۔ اس نے بتایا کہ وحید بات بات پر میرا تذکرہ کرتا ہے اور تعریفیں کرتے نہیں ٹھکتا۔ وہ میرے بارے میں جتنا جانتا تھا، اُس نے سنے درے شاہد کو بتا دیا تھا۔ میری دلچسپی پر شاہد نے مجھے عاشی کے گھریلو حالات سے آگاہ کیا۔ عاشی کی ماں وحید کے آنے سے قبل اپنے چو اس میں نہیں تھی۔ یا گلوں کی طرح دیواروں سے سرنگراتی تھی اور تمام دن روتی اور چیختی تھی۔ اس کا باپ سجاد بھی ایب نارل ہو گیا تھا۔ دکان مسلسل بند رہتی تھی اور وہ تھانے کی چہار دیواری سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ پہلے تو عشرت کی ماں نے شاہد سلیم کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا مگر جب اُس نے یہ مشکل یقین دلا کر اپنی پوزیشن واضح کر دی تو وہ بالکل مایوس ہو گئی۔ اس کی دنیا لٹ گئی تھی۔ بیٹے اور بیٹی کے علاوہ دیکھنے کو بھری دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

مستزاد یہ ہوا کہ ہر کسی نے، یہ شمول سجاد اور اس کے خاندان کے، اُس پر انگلیاں اٹھائیں اور لعن طعن کیا۔ بیٹی کے اغوا میں اُسے ملوث قرار دیا۔ یہ تک کہا گیا کہ وہ خود بھی

اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے مدد طلب نظروں سے شاہد کو دیکھا۔ وہ جھٹ سے بولا۔ ”پاپا! فاول نہ کھیلیں پلیز!“  
سلیم شہزاد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر بولا۔ ”تمہارے جیسے ریفری کی موجودگی میں بھلا میں کیا فاول کھیلوں گا۔ اوکے۔۔۔۔۔ اب میں چلتا ہوں، تم اپنے نئے دوست کو پہنچی دو۔ یہ تمہانے چوک قریشی کو مطلوب ہے۔ تھوڑا دھیان رکھنا۔ اگر ممکن ہو تو اسے کسی محفوظ ذریعے سے ملان پھینچا دینا۔ فون نمبروں کا تبادلہ کر لینا۔ رابطہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔“

وہ اٹھا، شاہد کے گال پر چپت لگانے کے بعد مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا! ڈرو مت۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ شاہد کے کلاس فیلو ظفر یاب کا باپ، سردار بخت خان، بڑا معتول آدمی ہے۔ میرا دوست بھی ہے۔ اس نے مجھے تمام رام کہانی سنا کر تمہاری مدد کی درخواست کی تھی۔ اگر کبھی میری ذات پر بھروسہ کرنے کی جرأت اپنے اندر پاتا تو مجھے راز دار بنالیتا۔ مگر اب بھی نہیں۔۔۔۔۔ پھر کبھی سہی۔۔۔۔۔ گڈ بائی!“

وہ چلا گیا تو شاہد میرے قریب کھسک آیا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ”دوست۔۔۔۔۔ مجھے تم نے دوست کہا ہے ناں۔۔۔۔۔ اور مجھ پر اعتماد کیا ہے ناں تم نے؟۔۔۔۔۔ دیکھو! سچ کہتا ہوں کہ میں اپنی عشرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے پاپا نے بتایا ہے کہ تم بڑے دل گردے والے انسان ہو۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“  
میں نے اُس کے غیر معمولی سرخ چہرے کو، آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی کو دیکھا اور تہ دل سے ڈھارس دی۔ ”میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں، خدا نے چاہا تو عاشی جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔“

”شہر یار! تم غیرت کی جنگ لڑ رہے ہو جبکہ میں عشق کی بازی ہار رہا ہوں۔ تمہاری اور میری قلبی کیفیات میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہے۔ میرے اندر ناکامی کی برف جم رہی ہے۔ تمہارے اندر الاؤ روشن ہے، وہ شعلے بھڑک رہے ہیں جو پوری دنیا کو جلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تم انکس سے میری عشرت کو ڈھونڈ لاؤ ورنہ میں مر جاؤں گا۔۔۔۔۔ رات کو دریا پر سے لوٹ آیا تھا۔ دوبارہ جاؤں گا تو تباہ لوٹنے کا یار نہ بھی نہ رہے۔“

”تمہارے پاپا۔۔۔۔۔“  
”نہیں یار!“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”وہ ہر جگہ کو قانونی ہتھیاروں سے لڑنے کے عادی ہیں۔ میرا جی

سے ملک کے تمام پولیس مقابلوں کی صداقت میری نظروں میں مشکوک ہو گئی ہے۔“  
اس نے تقیبی انداز میں سر ہلایا پھر قدرے توقف سے پوچھا۔ ”سائیں دل جیت شاہ کا سردار حیدر خان سے کیا تعلق ہے؟۔۔۔۔۔ اس نے عشرت اور وحید کو اغوا کر کے اُس حویلی میں کیوں پہنچایا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”دونوں کے مفادات سانچے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سائیں دل جیت، حیدر خان کا کارندہ ہے۔ اسی کی پشت پناہی پر جرائم کے آسمان پر پروازیں کرتا ہے۔“  
”تمہارے خیال میں اس وقت عشرت کہاں ہوگی؟“  
”میں اُسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر تعجب سے پوچھا۔  
”تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟“  
”میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جہاں وہ ہوگی، وہیں میری بہن بھی ہوگی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ اس کے لب سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ ”کیا دونوں لڑکیاں محفوظ ہوں گی اب تک؟“  
میرا دل مٹھی میں آ گیا۔ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں ہوں، خیری سلامتی ہوں۔“  
”تمہارے خیال کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟۔۔۔۔۔“

ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے۔۔۔۔۔؟“  
”میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل؟“ میں نے چونک کر کہا۔  
”اگر ممکن ہے تو آپ سردار حیدر خان کو آریٹ کر لیں۔ اُس پر مقدمہ بنائیں اور اسے اغوا کے جرم میں سزا دلوائیں۔“  
اس کی ہنسی بڑی زہر خند تھی۔ ”وہ ثبوت کہاں سے لاؤں جنہیں دیکھ کر عدالت اس الزام کو مان جائے؟“

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا، اس لیے خاموش رہا۔ شاہد نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ”ہم وحید کو اُس کمرے میں لے جاسکتے ہیں پاپا جہاں اُسے اغوا کے بعد رکھا گیا تھا۔ اس کی نشاندہی ثبوت کا درجہ نہیں رکھتی کیا؟“  
”رکھتی تو ہے مگر اس کی حیثیت کمزور ہے۔“ ایس ایس بی سلیم شہزاد نے کہا پھر مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔ ”تم آج کل کیا کرتے ہو؟“

”بتایا تو ہے آپ کو۔۔۔۔۔ میں اپنی بہن کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ جب وہ ملے گی، تب کوئی کام دھندا چھیڑوں گا۔“  
”نور پور میں تمہارے گھر پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ دو آدمیوں کو گھر کے ساتھ زندہ جلا دیا تھا۔ تم نے ان لوگوں کو قتل کر دیا اور موقع سے فراوان ہو گئے۔ وہ کیا کہانی تھی؟“

”سرنہیں۔۔۔۔۔ انکل کہو یار! یہ میرے پاپا ہیں، پولیس آفیسر نہیں ہیں۔ جب کبھی ان سے دفتر میں ملنے کا اتفاق ہو، تب شوق سے ’سر‘ کہنا۔“ شاہد نے بے تکلفی سے کہا۔  
”جی انکل!“ میں نے فوراً صحیح کر لی۔

سلیم شہزاد مسکرایا اور مصنوعی غصہ بھری آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”وحید تمہیں کہاں ملا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے اُسے نیم مردہ حالت میں کہاں سے اٹھایا تھا؟“

میں نے حیدر خان کی حویلی، پیلے، بھیڑیے اور وحید کے بارے تفصیل سے بتا دیا۔  
وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر نرمی سے مستفسر ہوا۔ ”تم اُس حویلی میں کیا لینے گئے تھے؟“  
میں نے اُسے پروین کے اغوا کا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ سننے کے ساتھ ساتھ گہری نظروں سے میرے بیان کی صداقت میری آنکھوں سے کھوجتا جاتا تھا، بولا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ تمہاری بہن کو سردار حیدر خان نے اغوا کر کے اپنی اُس خفیہ حویلی میں رکھا ہوا ہے؟“

میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”نہیں انکل! ان باتوں کا تعلق عشرت کے اغوا سے نہیں ہے، اس لیے مجھے جواب دینے پر مجبور نہ کیجیے۔“  
”اوکے۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بہن کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی تھی؟“  
”نہیں۔۔۔۔۔ اگر تھانے جا کر ایف آئی آر درج کرانے کی درخواست دیتا تو نئی مصیبت میں پڑ جاتا۔ پولیس والے بڑے خان کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ ہوتے۔ داد ری کیا کرتے، الٹا مجھے حوالات میں ڈال دیتے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ عشرت کو اُسی حویلی میں رکھا گیا تھا اور تمہارے جانے سے پہلے کسی اور نے اُسے وہاں سے نکال لیا؟“  
”جی انکل!“

”تمہارے بتائی ہوئی کہانی سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں تو غلط نہیں ہوگا کہ سردار حیدر خان، چوک قریشی کے تھانے دار اور ڈی ایس پی نے مل کر پیلے میں پولیس مقابلے کا جو کھیل کھیلا تھا، وہ اسی بساط پر سجایا گیا تھا جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو۔ کیا تم میرے خیال سے متفق ہو؟“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ”جی انکل! اسی واقعے



مجھے شرمندگی ہوئی۔ جلدی سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کالج میں داخلہ لے لو۔“  
وہ بولی۔ ”انکل کہتے ہیں کہ داخلہ کے لیے بورڈ کی سند ضروری ہے۔ سند ہو تب بھی میٹرک کا نیا رزلٹ آنے کے بعد کالجوں کے ایڈمشن کھلیں گے۔“  
”پرائیویٹ کالجز میں سارا سال داخلہ ہوتا رہتا ہے۔ میں پتا کروں گا۔ ادھر قریب ہی بورڈ کا دفتر واقع ہے۔ کسی وقت چلی جانا اور ڈپٹی کیٹ سرٹیفکیٹ نکلوانے کا پراسس معلوم کرنا۔ اوکے؟“

وہ بولی۔ ”میں نے موجودہ کے ساتھ جا کر بورڈ کی عمارت دیکھ لی ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی بھائی!“  
وہ بڑی ادا سے مجھے بھائی کہا کرتی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی بے تکلفی سے اپنے مخصوص انداز میں بے ربط باتیں کر رہی تھی۔ وہ بچپن ہی سے شرارتی طبع واقع ہوئی تھی اور لاڈ پیار نے اُسے منہ پھٹ بھی بنا دیا تھا۔ جو بات فرزانہ اور پروین نہیں کہہ پاتی تھیں، وہ بلا دھڑک کہہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! کیا تمہیں غزالہ کی یاد نہیں آتی؟“

میں نے اُسے دیکھا۔ دونوں گال تہمتارے تھے۔ آنکھوں سے شرارت اڑ رہی تھی، میں بولا۔ ”نہیں شانوا! مجھے سوائے پروین کے، کوئی یاد نہیں آتا۔“

اس کی آنکھوں کی مشعلیں اچانک ہی بجھ گئیں۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب وہ ہمارے درمیان موجود ہوگی، تب ہم مل کر غزالہ کو یہاں لانے کا منصوبہ بنائیں گے۔“

اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئی۔ دروازے میں رُک کر پلٹے بغیر بولی۔ ”چائے پیو گے؟“

میں نے کہا۔ ”اپنے ہاتھ سے تیار کرو تو ضرور پیوں گا۔“  
میں چاہتا تھا کہ میں نے بے دھیانی میں اُسے جس اندوہ بھری کیفیت میں دھکیل دیا تھا، وہ مصروف ہو کر اُس سے نکل آئے ورنہ مجھے چائے کی طلب نہیں تھی۔ اُس کا بھجا بھجا چہرہ مجھے دکھ دیتا تھا۔ اُس سمیت میں کبھی کو خوش اور ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ جذبہ میرے اندر تب پیدا ہوا جب ان کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ شاید اسی جذبے کو ماتا کا نام دیا جاتا ہے یا دنیا کے اس قیمتی ترین جذبے کا ابتدائی مرحلہ..... احساسِ سرپرستی.....

جی کڑا کر کے اُسے تسلی دی۔ ”کم آن ڈیئر! یوں مایوس نہیں ہوتے۔ خدا پر اپنے یقین کو کامل اور ایمان کو پختہ رکھو۔ اس نے وحید کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچنے کا زندگی بھر میں نے ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ ایسی ہی کوئی اچھی صورت عاشی اور پروین کے لیے بھی قسمت تشکیل دیدے گی۔ مجھے یقین ہے، تم بھی خود کو مضبوط رکھو ورنہ ہم ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں ڈرائیور نے فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روکی اور ہارن بجایا۔ میں نے شاہد سے ہاتھ ملایا اور ٹیک کیئر کہہ کر گاڑی کا رخ کیا۔ جب میں سیٹ پر بیٹھ گیا، تب شاہد نے چٹخ کر کہا۔ ”اوئے شہریار! تم نے کبھی عشق نہیں کیا..... تمہیں کسی نے محبت نہیں کی..... اس لیے فلسفہ بکھارتے ہو۔ کبھی جان شانے میں آگئی تو پوچھوں گا..... پھر یہی نصیحت کروں گا، بڑے دانشوروں کی طرح..... ناؤ گڈ بائے ڈیئر!“

اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ..... میرے لبوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ چمک گئی۔ ٹیکسی کی رفتار تیز ہو گئی۔ خوب صورت میزبان میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ملاقات کا آخری منظر..... اُس کا طعنہ بار، ہنستا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں کافی دیر کے لیے ثبت ہو کر رہ گیا۔

میں چار بجے کے لگ بھگ اپنے گھر پہنچ گیا۔ شانو نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ میری طویل غیر حاضری پر برہم تھی۔ فرزانہ اور موجودہ نے میری حمایت کرتے ہوئے اس ہڈیل سے میری جان چھڑائی۔ میرے سر پر بندھی ہوئی امارٹ بینڈج دیکھ کر کبھی متفکر ہوئے۔ میں نے معمولی چوٹ ہے کہہ کر انہیں مطمئن کیا۔ فوجی اختر نے مجھے بتایا کہ بھائی نے اسکول کے کاغذات نہ صرف مکمل کروا دیے ہیں بلکہ موجودہ کا قریبی انگلش میڈیم اسکول میں ایڈمشن بھی کروا دیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔

اپنے کمرے میں آیا، بیڈ پر نیم دراز ہو کر ساتھ ہنسی ہوئی شانو سے مخاطب ہوا۔ ”تم بھی اسکول میں داخلہ لے لو۔“

وہ جھٹ سے بولی۔ ”بھائی! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم بہت بدل گئے ہو۔ تم پہلے والے شہرے نہیں رہے ہو۔“

”کیا ہوا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”تمہیں یاد ہی نہیں کہ میں میٹرک کر چکی ہوں۔“

الجھنوں کو سلجھانے میں بھرپور مدد کروں گا۔“  
میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلیں! دیکھیں گے کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔“

اس نے ایک لمبا کش چھاتی میں اُتارا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے پایا ہے کہا تھا کہ تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بہن اور عاشی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں۔ تمہیں اس بات پر یقین محض اس لیے ہے کہ ان کے ساتھ تمہارا دوست موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی حیثیت بھی محض مغوی کی ہے۔ تمہیں یہ توقع ہے کہ اُس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں کو اس خوف ناک حویلی سے نکالا ہو۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

میں نے اس کا مدعا نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ”جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک پھندے سے نکال کر دوسرے میں پھنسا دیا گیا ہے۔ پنجرے کا مالک بدلا ہے، پنجرہ نہیں۔“

اس کے خوب صورت چہرے پر فکر و تردید کی پرچھائیں لرزاں تھیں۔ میں بولا۔ ”میں تمہاری طرح منفی نہیں، مثبت انداز میں سوچنے کا عادی ہوں۔“

”حالات مایوس کن ہیں۔ اُمید کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔“ اس کی آنکھیں ایک دم بھیجی بھیجی سی لگنے لگیں۔ ”دیکھو شہریار! اگر تمہاری بہن حیدر خان کی قید سے نکل کر کسی اور قید میں نہیں گئی تو پھر اُس نے اب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بڑی پتے کی بات کی تھی۔ ایسے ہی وقت مجھے خیال آیا کہ پروین کو میرے موجودہ پتے ٹھکانے کا علم ہی نہیں تھا، رابطہ کیسے کرتی؟..... بعد نہیں تھا کہ وہ میری تلاش میں سرگرداں ہو۔

میں نے یہی بات شاہد سے کہی تو وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ ”تمہاری بہن کی حد تک تو اس خوش گمانی میں رہا جاسکتا ہے مگر میرا گھر اور فون نمبر تو وہی ہے جسے عاشی مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ اس نے کیوں مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟ تم نے امیر نواز کا تذکرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بھی دونوں کے ساتھ ہے۔ اس کا گھر تو جمل نہیں گیا اور نہ اس کے ماں باپ نے ٹھکانا تبدیل کیا۔ اس نے اپنے گھر زندہ اور باخیریت ہونے کی خبر کیوں نہیں دی؟..... شہریار! میرا دل کہتا ہے کہ میری عاشی شاید مجھے بھی نہ مل سکے گی۔“

اس کی شکست کے بوجھ تلے دبی ہوئی نیم مردہ آواز اور پختہ دلیل نے مجھے لمحہ بھر میں مضطرب کر دیا۔ میں نے

گندی تھی، اس کی بیٹی بھی گندی نکلی۔ جو لوگ عاشی کا ہاتھ مانگنے کے لیے اُس کے پیروں کو چھوتے تھے، وہ تھوکتھو کرنے لگے۔ ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ اس پر زوال کی گھڑی آگئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر بیٹی کی زندگی کی دعا مانگنے کے ساتھ ساتھ دیواروں کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ اُس نے کوئی جرم نہیں کیا..... اس کی بیٹی نے کوئی جرم نہیں کیا..... دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر آنکھیں اور زبان نہیں ہوتی اس لیے مان جاتی ہیں مگر انسان نہیں مانتا۔

وحید اچانک گھر پہنچا تو ماں باپ کو جینے کا سہارا مل گیا۔ اکلوتے بیٹے کو زندہ و سلامت دیکھ کر دل کی دھڑکن چل پڑی۔ بیٹی کے مل جانے کی آس لگ گئی۔ پولیس نے بہت چاہا کہ عاشی کے اغوا میں نامزد مظرم کے طور پر میرا نام ایف آئی آر میں درج کیا جائے مگر عاشی کی ماں میری حمایت میں سینہ سپر ہو گئی۔ اسے وحید نے میرے بارے میں بتایا تھا اس لیے کس طرح بیٹے کی زندگی بچانے والے پر مقدمہ کرتی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دعویٰ کرتی تھی کہ اس کی ماتائی آنکھوں نے مجھے دیکھنے کے بعد مجھے اچھا انسان سمجھا تھا۔ چونکہ تفتیشی آفیسر کے پاس میری ذات پر شک کا نہ جھٹلایا جانے والا جواز نہیں تھا اس لیے وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ اگر آپ نہیں مانتیں تو نہ سہی.....

چار بجے کے قریب وہ اپنی سوزوکی میں بٹھا کر مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر لے آیا۔ ایک نئے ماڈل کی کار کے قریب تاش کھیلے ہوئے ڈرائیور کو بلا کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”دن میں میں مرتبہ حکم کا یکہ تمہارے ہاتھ لگتا ہے مگر جیب خالی رہتی ہے۔ پھر بھی پتوں پر تکیے کے رکھتے ہو بے وقوف آدمی! روزی روٹی کیا کرو، یہ احقانہ گیم نہ کھیلا کرو۔ یہ میرا مہمان ہے۔ اسے ملتان چھوڑ آؤ۔ بولو! کتنے پیسے لو گے؟“  
اس نے رسماً کہا کہ صاحب! جتنے مرضی دے دو پھر شاہد کے اصرار پر اس نے کراہیہ بتایا۔ شاہد نے جیب سے پیسے نکالے اور گن کر اُس کی پھٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ، ڈیزل ڈلو آؤ.....“

اس نے گاڑی نکالنے میں دیر نہیں کی۔ شاہد نے سگریٹ سلگائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شہریار! تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو مگر دوستی میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس لیے میرے رویے پر خفا نہ ہونا۔ تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چونکہ میں نے وعدہ کیا تھا، اس لیے مصروف نہیں ہوا لیکن یہ تم پر قرض رہا۔ آئندہ ملاقات پر تفصیل سے سننا چاہوں گا کہ تم پر کیا مٹی ہے۔ تمہاری قانونی



# پیش عقل

سریم کے حنان

دکھ اور تکلیف میں قدرت نے ایسا گداز رکھا ہے جو انسان کو عاجزی کی طرف مائل کرتا ہے۔ جیسے ایک اور ایک گیارہ ہوسکتے ہیں ویسے ہی کئی کمزور مل کر ایک طاقت بن جاتے ہیں۔ وہ منظر کچھ ایسا ہی رقت انگیز تھا جس نے کئی سنگ دلوں کو بھی رلا دیا۔۔۔ جب کسی نے اپنی جیت کو کسی کی ہارسے بدل ڈالا تو۔۔۔ اتجانے میں کتنے باشعور آپ ہی شرمندہ ہو کر رہ گئے۔



ایک ایسے مقابلے کی روداد جس سے کتنے ضمیر جھنجھٹا گئے

رہی تھی۔ اسٹیڈ میں خاصے لوگ تھے اور زیادہ تر فیملی تھیں۔ اکا دکا لوگ اکیلے بھی آئے تھے لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس تقریب سے متعلق تھے۔ مارچ کا آغاز تھا اس لیے سردی کی شدت کم تھی اور دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ میں اپنے

اس چھوٹے سے خوب صورت اسٹیڈیم میں خاصی گہما گہمی تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی اس چار دیواری میں ایک طرف اسٹیڈ بنا تھا اور اس کے سامنے سرسبز میدان تھا۔ دور سبز پہاڑیوں کے پس منظر کے ساتھ یہ جگہ اور بھی خوب صورت لگ

فروخت کی تھی۔ اس پر چار سال قبل کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔ میں نے تینوں اسٹامپ پیپر ز الٹ پلٹ کر دیکھے۔ چاچا چراغ کے انگوٹھے لگے ہوئے تھے۔ شناختی کارڈ کا نمبر بھی درج تھا۔ زمین کو بیچنے کے اس معاہدے پر گواہان کے نام اور دستخط بھی موجود تھے۔ میں نے دونوں نام پڑھے۔ وہ میرے نزدیک اجنبی تھے۔

بیچ نامہ مکمل تھا۔ اس پر کسے گئے دستخط، مثبت شدہ انگوٹھوں کے نشان اور شہادتیں اصلی تھیں۔ ریونیو آفیسر کی تصدیق اور مہر بھی ثبت تھی۔ اس دستاویز کو ریونیو ریکارڈ میں شامل کرنے کے لیے صرف پیواری کی جانب سے انتقال کا پیشہ دارانہ عمل باقی تھا۔

میرے ہونٹ جھنج گئے۔ سمجھ میں آ گیا کہ میرے گھر پر حملہ آور ہونے والے اس دستاویز پر چاچے کے انگوٹھے ثبت کرانے آئے تھے۔ انہوں نے چاچے کی موت سے پہلے یا بعد میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا مگر ان کی موت ان کا پیچھا کرتی ہوئی عین موقع پر پہنچ گئی۔ اگر یہ رجسٹری ریونیو آفس تک پہنچ جاتی تو میرے چاچے کی تمام تر زرعی ورہائش جائیداد کسی اور کے نام منتقل ہو جاتی۔

شانو میرے چہرے کے دم بہ دم بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہی تھی، پریشان ہو کر مستفسر ہوئی۔ ”بھائی! اس میں کیا لکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم جاؤ اور مجھے توجہ سے پڑھنے دو۔“

وہ بولی۔ ”چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ کیا گرم کر دوں؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کاغذات میں کھو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میرے ذہن میں ایک کوندا سالپکا۔ میں نے کریدتی ہوئی نظروں سے جائیداد خریدنے والے کا نام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وثیقہ نویس بڑے میڑھے اور الجھے ہوئے طرز تحریر میں لکھتے ہیں، الفاظ اور جملے بھی خالصتاً اصطلاحی ہوتے ہیں اس لیے مجھے تھوڑی دقت ہوئی مگر میں پڑھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی اپنے مطلوبہ نام پر نظر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا اور یوں اگا جیسے مجھے کسی نے انگاروں سے دہکتے ہوئے کنویں میں دھکا دے دیا ہو۔ یہ نام تو میرے دل پر کندہ تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کسی گردش نیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے بڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

چند منٹوں بعد وہ چائے کا بڑا سا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پیالے کو دیکھا تو وہ کھکھلا کر ہنسی۔ ”یہ دودھ پتی ہے، چائے تھوڑی ہے۔“ ”کیا ساری رات بیٹھا پیتا رہوں گا؟“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اور یہ کیا ہے؟“

اس نے ہاتھ میں ایک پیپر رول پکڑ رکھا تھا۔ وہ بولی۔ ”دکھانے کے لیے لائی ہوں کہ یہ کاغذات تمہارے کام کے تو نہیں۔۔۔۔۔ الماری کی صفائی کرنے پر ملے ہیں۔“

”اوہ لیس۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ پیپر رول مجھے کہاں سے ملا تھا۔ یہ مجھے اُس لینڈ کروڈر کی سیٹ پر سے ملا تھا جس میں میرے گھر پر حملہ کرنے والے نور پور آئے تھے اور انہوں نے اسے سائیکل جگ جیت کے مزار کے احاطے میں پارک کیا تھا۔ پھر جب میں نے شانو، فرزانہ اور کھالے کو اپنی اسوز وٹرو پر میں منتقل کیا تھا، تب اس رول کو بھی اٹھا لیا تھا۔ سوچا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر ان کا مطالعہ کروں گا۔ مجھے یہ توقع رہی تھی کہ ان کاغذات میں کوئی کارآمد اور مجھ سے متعلقہ تحریر ہی ہوگی۔ بعد میں اسے بھول گیا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے پیپر رول لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شانو نے کہا۔ ”تم چائے پیو، میں اسے کھولتی ہوں۔“

اس نے میرے ہاتھ سے رول اچک لیا اور ربر بزنڈ کھینچ کر اُتار دیا۔ سفید رنگ کے نوٹو اسٹیٹ پیپر میں اسٹامپ پیپر ز لپٹے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سیدھا کر کے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”بھائی! ان پر تو بابا کا نام لکھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ یہ دیکھو!“

میں نے پیپر تھامے اور ہیڈ پر پھیلایا۔ وہ چونکہ کافی دیر تک مڑے رہے تھے اس لیے اسپرنگ کی طرح فوراً رول ہو گئے۔ میں نے چائے کا پیالہ رکھا اور انہیں کھول کر بغور پڑھنے لگا۔

وہ تین مختلف مالیت کے اسٹامپ پیپر ز پر مخصوص انداز تحریر میں رقم کیا گیا رجسٹرڈ بیچ نامہ تھا جو عمومی طور پر زمینوں کی خرید و فروخت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلے پرت پر زمین کا تہہ اور کیفیت نامہ درج تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اپنے چاچے چراغ دین کا نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ دیکھ کر تیز ہونے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس دستاویز کی رو سے چاچے نے اپنی ورثاتی جائیداد



ساتھی کیمرا میں فیصل کے ساتھ اسٹیڈیم میں داخل ہوئی تو ریس کے آغاز میں کچھ وقت تھا۔ میں جس چینل کے لیے کام کرتی ہوں وہاں مجھے عام طور سے ایسے واقعات کی کوریج کے لیے بھیجا جاتا ہے جنہیں دیکھ کر ناظرین کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ آپ صرف سوچ سکتے ہیں کہ ان واقعات کی کوریج کرتے ہوئے میرا کیا حال ہوتا ہوگا لیکن میڈیا اب ایک دوڑ بن گیا ہے، سب سے پہلے خبر کے جنون نے چینل ملازمین کی نیند حرام کر دی ہے، خاص طور سے جو خبر سے متعلق ہوں۔

مگر آج میرے ڈائریکٹر نے غیر متوقع طور پر مجھے اس اسپورٹس ایونٹ کی کوریج کے لیے بھیج دیا۔ یہ کوئی خاص ایونٹ نہیں تھا۔ خبروں میں اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اس بات کا تو بے فیصد امکان تھا کہ جب اس اسپورٹس ایونٹ کی خبر چینل سے نشر ہوگی تو لوگ چینل بدل کر کوئی دوسرا چینل لگا لیں گے جہاں سے کوئی گرم مباحثہ یا انٹر ٹینمنٹ کا پروگرام نشر ہو رہا ہوگا۔ ظاہر ہے کسی بھی رپورٹر کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ شکن بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی رپورٹ کو ناظرین یا پڑھنے والے ہی نہ میسر آئیں۔ مگر باس کا حکم تھا اس لیے آنا پڑا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ اس کی بھی مجبوری ہے، ایونٹ میں شامل ایک لڑکی اس کی مسز کی بھیجی ہے اس لیے کوریج لازمی ہوگی۔

ظاہر ہے، ہر چینل پر ایسی سوریس دستیاب نہیں تھی اس لیے جب میں اسٹیڈیم میں داخل ہوئی تو وہاں صرف سرکاری ٹی وی کی ٹیم موجود تھی۔ ایونٹ میں صرف ریس شامل تھی۔ اس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ جو اٹھارہ سال سے اوپر تھے ان کی الگ الگ ریس تھی پھر بارہ سے اٹھارہ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ریس تھی اور تیسری کیلگری بارہ سال سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ گویا کل چھ ریس تھیں اور ہر ریس کا فاصلہ کوئی دو سو گز تھا۔ بیس بیس منٹ کے وقفے سے یہ تمام ریس دو گھنٹے میں تمام ہو جاتیں۔ اسٹیڈیم میں اوپر ایک باکس میں کنٹریٹر بیٹھے تھے اور ریس کی تیاری کی کنٹری کر رہے تھے۔ میں نے فیصل کے ساتھ ایک مناسب جگہ تلاش کی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہاں کھانے پینے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

”ہر جگہ کھانے کے چکر میں مت رہا کرو۔“ میں نے کہا۔ ”برائے مہربانی کیمرا اسٹیڈیم میں موجود خواتین کے بجائے ریس میں حصہ لینے والے بچوں پر رکھنا۔“

”یہ بچے تو نہیں ہیں۔“ فیصل نے ایک طرف موجود لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ لڑکیوں نے ریس کا لباس پہن رکھا تھا،

جو ڈھیلے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ ان میں سے اکثر لڑکیوں کی صحت بہت اچھی تھی جیسا کہ اسپورٹس میں حصہ لینے والی لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ تھیں اور اسپورٹس ایونٹ میں حصہ لینے کے خیال سے خوش اور پر جوش تھیں۔ انہیں شاید احساس بھی نہیں تھا کہ اس لباس میں فیصل جیسی ذہنیت رکھنے والے لوگ انہیں کس طرح دیکھ رہے ہیں۔ میں نے پرملاست نظروں سے فیصل کو گھورا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

زیادہ تر فیملیز وہی تھیں جن کا کوئی بچہ اسپورٹس ایونٹ میں حصہ لے رہا تھا۔ ان کے تعداد بھی اچھی خاصی تھی اس لیے اسٹیڈیم میں گہما گہمی کا منظر تھا۔ ریس کا آغاز ہونے والا تھا۔ سب سے پہلے بارہ سال سے کم عمر بچیوں کی ریس ہوئی۔ بچیاں اسٹارٹنگ لائن پر آئیں۔ ان کے ماں باپ اور دوسرے گھر والے اسٹیڈ کے نچلے حصے میں آگئے اور ابھی سے آوازیں لگا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ فیصل نے کیمرا سنبھال لیا اور میں تبصرہ ریکارڈ کرانے لگی۔ ریس کا آغاز پستول کے فائر سے ہوا، بچیاں دوڑ پڑیں۔ وہ چھوٹی تھیں اور ان کو ذرا دشواری بھی ہو رہی تھی لیکن وہ دوڑتی رہیں اور تقریباً سب نے آس پاس فٹنگ لائن عبور کی۔ دوڑنے سے اور فٹنگ لائن کراس کرنے کی خوشی میں ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ ریس ختم ہوتے ہی ان کے ماں باپ اور گھر والے اسٹیڈ سے نکل کر ان کے پاس آگئے اور انہیں مبارک باد دینے لگے۔ انعامات سب سے آخر میں دیے جاتے۔

دوسری ریس لڑکوں کی تھی۔ یہ بھی اسی طرح ختم ہوئی۔ تقریباً تمام لڑکوں نے آس پاس فٹنگ لائن عبور کی اور اس ریس میں بھی فارغ یا دوسرے تیسرے نمبر پر آنے والے کا اعلان نہیں کیا گیا، کیونکہ اسپورٹس ایونٹ کا مقصد ان بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا، ان میں مقابلہ کرانا نہیں تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی ان بچوں سے وابستگی اور ان کی طرف سے حوصلہ افزائی دیکھ کر میں بھی جذباتی ہو گئی تھی اور مجھے یہاں آنے سے جو ذرا کوفت ہوئی تھی، وہ خوشی میں بدل گئی۔ حد یہ کہ فیصل جیسا آدمی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ فطری طور پر وہ کیسا سہی لیکن اس میں شک نہیں کہ میں نے اس سے اچھے کیمرا مین بہت کم دیکھے تھے۔

تیسری ریس کے بعد کھانے اور آرام کا وقفہ ہوا تھا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ اسٹیڈ کے پیچھے شامیانہ لگا کر وہاں آنے والوں کے لیے ریفریٹیشن کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ باقاعدہ کھانا نہیں تھا لیکن بہت سارے بکری آٹے موجود تھے جن

کے ساتھ کولڈ ڈرنک، چائے اور کافی بھی تھی۔ کھلاڑیوں کے لیے الگ جگہ تھی جبکہ عام لوگوں کے لیے الگ جگہ کا انتظام تھا۔ خلاف توقع وہاں سب نے ہی بہت تیز اور تہذیب سے کھایا تھا، نہ تو ہڑبونگ مچتی تھی نہ چیزیں گرانی گئی تھیں اور نہ ہی کھانا ضائع کیا گیا تھا۔ لوگ بہت آرام سے، سکون سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں لے کر کھا رہے تھے۔ فیصل نے ایک کیک چمٹری کھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں اس طرح سکون اور تہیز سے بھی کھایا جاسکتا ہے۔“

”واقعی۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”ورنہ میں نے فائبر اور سکس اسٹارٹنگ لائن میں بھی ان لوگوں کو اس طرح کھاتے اور ضائع کرتے دیکھا ہے جو اب کھرب پتی ہوتے ہیں۔“

مجھے ریس کا دوسرا مرحلہ شروع ہونے سے پہلے بچوں اور ان کے گھر والوں کے تاثرات بھی ریکارڈ کرنا تھے اس لیے کھانے کا مرحلہ جلدی جلدی ختم کیا گیا۔ فیصل نے کیمرا اور میں نے مائیک سنبھالا اور ہم کھلاڑیوں اور ان کے گھر والوں کے تاثرات ریکارڈ کرنے لگے۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ ان کے لیے اسپورٹس ایونٹ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ایک چھ سال کی بچی بہت خوش تھی اس نے اپنی توتلی زبان میں جو بتایا اس کا ترجمہ اس کی ماں نے کیا۔ بچی کا کہنا تھا کہ وہ فٹنگ لائن کراس کرنے پر بہت خوش ہے کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکے گی۔ ایک دس سالہ لڑکے نے شکایت کی کہ اس کا جوتا ٹھیک نہیں تھا ورنہ وہ سب سے آگے نکل جاتا۔

کھانے اور آرام کا وقفہ ختم ہوا اور ریس کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ اس بار بارہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کی ریس تھی۔ آخری دور ریس اٹھارہ سال سے اوپر کی لڑکیوں اور لڑکوں کی تھی۔ مگر یہ سب بھی بچے تھے۔ مجھے یقین تھا ان میں سے کسی کی عمر بھی بیس سال نہیں ہوگی۔ اب لڑکیوں کی ریس تھی۔ یہ کل آٹھ لڑکیاں تھیں۔ سوائے ایک کے سب گوری جٹی، خوب صورت نقوش والی اور صحت مند تھیں۔ ایک ان میں سے کسی قدر سانولی تھی اور اس کی صحت بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ لڑکیوں کو دیکھ کر فیصل کی آنکھوں میں پھر چمک سی آگئی تھی۔ وہ کچھ ٹھکرکی واقع ہوا تھا اور آدمی اپنی فطرت نہیں بدل سکتا ہاں، اسے دبا ضرور سکتا ہے۔

”میرے خدا۔“ اس نے زیر لب کہا۔ ”انہیں کون لڑکیاں کہہ سکتا ہے یہ تو دو بچوں کی مائیں لگ رہی ہیں۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”کسی ملے تمہاری بات سن لی تو چینل پر تمہارے بارے میں خبر

آ رہی ہوگی۔ ان کے چہرے دیکھو اتنی معصومیت تو آج کل چار پانچ سال کی بچیوں کے چہرے پر بھی نہیں ہوتی ہے لیکن تم چہرہ دیکھتے ہی کہاں ہو...؟“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

فیصل کھینچا گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے، اب اپنا کام کرو اور کیمرے کا لینس قابو میں رکھنا۔ میں بعد میں پوری ویڈیو دیکھوں گی۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔

”اوکے باس۔“ فیصل نے بد مزگی سے کہا اور کیمرے پر جھک گیا۔

لڑکیاں اسٹارٹنگ لائن پر آگئی تھیں اور ذرا ترچھا ہو کر بھاگنے کا پوز بنالیا تھا۔ ان کے ماں باپ اور گھر والے ابھی سے تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ جیسے ہی فائر ہوا وہ سب دوڑ پڑیں۔ زیادہ تر لڑکیاں تو فوراً ہی آگے نکل گئی تھیں حالانکہ ان میں سے بعض کو دوڑنے میں دشواری

## دنیا بھر میں

# جاسوسی ڈائجسٹ

سپنس ڈائجسٹ جاسوسی ڈائجسٹ پاکستان ڈائجسٹ

منگوانے کیلئے ہمارے مقرر کردہ ایکسپورٹرز

## ویلکم ٹریڈرز

سے رابطہ کریں

## WELCOME TRADERS

189-E, Block-2, P.E.C.H.S, Karachi, Pakistan

Tel: (92-21) 34545513, 34520214.

Fax (92-21) 3454885.

Cell # 0333-4315950

Email: zaidi@welcome.com.pk

Website: www.welcome.com.pk



## سیرمد شہید

اللہ اپنے لیے جب خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے تو ان کے عادات و اطوار اور کردار بھی بہت خاص بنا دیتا ہے۔ ایران کی سرزمین پر پیدا ہونے والے اس ولی کا مزاج بھی بچپن سے بہت منفرد رہا، اس کے نزدیک حرص و ہوس اور دولت کی تجارت ہمیشہ بے معنی رہی۔ شاہ جہان کے دور میں اس ولی کا بہت شہرہ تھا جس کا داراشکوہ بھی گرویدہ رہا۔۔۔ بالآخر حالات کی ستم ظریفی نے اورنگ زیب کے حکم پر ان کا سرتن سے جدا کرادیا۔

دنیاوی تجارت کی نشی کرنے والے ایک ولی کی سچی اور کھری باتیں



سترہویں صدی کے ایران میں جو قومیں آباد تھیں ان میں یہودی بھی شامل تھے۔ ان کی اکثریت کاشان میں آباد تھی اور یہ بیشتر تاجر تھے۔ جو مسلمانوں میں گھلے گھلے رہنے کے باوجود اپنی قومیت اور سماجی روایات کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے گرد و پیش اسلام کا چہ چار ہوتا مگر یہ اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے مگر تباہ کے۔ آخر اسلام نے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں سے بعض کو محاذ کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسلامی علوم و فنون کو محض ان کی افادیت کے پیش نظر اختیار کرتے لیکن پھر وہ اس کی محبت اور

منظر دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

ان تمام آنکھ لڑکیوں نے ایک ساتھ فٹنگ لائن عبور کی اور پھر ان لڑکیوں کے ماں باپ، جو خود بھی انگلہ بارتھے، ان لڑکیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ میرا اندازہ درست نکلا، بیتاب ہو کر ٹریک پر آنے والی سانولی لڑکی کی ماں تھی۔ اس نے جاتے ہی اسے سینے سے بھونپی پڑ رہی تھی۔ اگرچہ اس کی آنکھوں اس کے چہرے سے بھونپی پڑ رہی تھی۔ صرف اسی لڑکی کی نہیں بلکہ تمام لڑکیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان کے ماں باپ اور گھر والے بھی رو رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی اپنی آنکھیں صاف کر رہے تھے۔ جب میں نے فیصل کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میں بھی رو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں صاف کیں تو مجھے فیصل بھی آنکھیں ملتا نظر آیا اور پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کھسپانے انداز میں کہا۔

”آج مٹی اڑاتی ہوا چل رہی ہے۔“

”ہاں شاید۔“ میں نے اس کی بات کی تردید نہیں کی۔

”یہ سارا منظر ریکارڈ ہوا ہے نا؟“

”بہت اچھی طرح۔“ اس نے اپنا کیمرہ اٹھتے چھپایا۔ ”تم جانتی ہو میں سین ماس کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

میں نے آنکھیں صاف کرنا چاہیں تو فیصل نے روک دیا۔ ”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے اس طرح ریکل ٹچ آئے گا۔“

فیصل نے کیمرہ میری طرف کیا اور میں نے مانگ سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ”آپ نے ابھی اپنی ٹی وی اسکرین پر جو منظر دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر ان لڑکیوں کی جگہ آپ اور ہم ہوتے تو شاید اس لڑکی کے گرنے پر مڑ کر بھی نہ دیکھتے، ہمیں صرف آگے اور سب سے آگے نکل جانے کی دھن ہوتی کیونکہ ہم با شعور ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جنہیں ہم ایب نارمل کہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دماغ ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہے۔ ان معصوم لڑکیوں نے آج ہمیں سبق دیا ہے۔۔۔ زندگی دوڑ کا نام نہیں ہے یا دوسرے سے آگے نکل جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ گرتوں کو سہارا دینے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ یہ بچے سیکھنے کے لیے ہمارے محتاج ہیں لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ہم بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس عقل نہیں تو کیا ہوا ان کے پاس انسانیت تو ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے۔ کیمرہ مین فیصل شفیق کے ساتھ حمیرا احمد۔“

پیش آرہی تھی۔ البتہ سانولی لڑکی پیچھے رہ گئی۔ اس سے درست انداز میں بھاگنا نہیں جا رہا تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں سے دس بارہ قدم پیچھے تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ فٹنگ لائن تک دوسروں کے بہت دیر بعد پہنچے گی۔ دوسری لڑکیاں نصف فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ جوش اور بھاگنے کی محنت سے ان کے چہرے سرخ ہو کر چمک رہے تھے۔ وہ فٹنگ لائن تک جلد از جلد پہنچنے کے لیے جسم و جان کی ساری توانائی استعمال کر رہی تھیں۔

سانولی لڑکی اب بری طرح لڑکھڑا رہی تھی اور سب کی توجہ آگے جانے والی لڑکیوں کے بجائے اس پر تھی۔ پھر وہی ہوا جو میرے ذہن میں اور سب کے ذہن میں آیا تھا، لڑکی گری اور بہت زور سے گری، اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی اور وہ بے ساختہ چلا اٹھی۔ اس کے بعد وہ بری طرح رو دی۔ لیکن یہ رونا تکلیف کی وجہ سے نہیں تھا، یہ رونا دوسری لڑکیوں سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے تھا جو اس سے خاصی آگے جا چکی تھیں۔ لڑکی کو گرتے دیکھ کر اسٹینڈ میں بیٹھے لوگ بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک عورت نے بے ساختہ رینگتے عبور کرنا چاہی لیکن اس کے ساتھ موجود مرد نے بازو سے پکڑ کر اسے روک لیا شاید وہ سانولی لڑکی کے ماں باپ تھے۔ مرد آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تب میں نے اور دوسروں نے دیکھا۔ سانولی لڑکی کی چیخ اور رونے کی آواز سن کر آگے نکل جانے والی لڑکیاں رک گئی تھیں، پھر وہ پلٹ کر واپس آنے لگیں۔ انہوں نے دوڑنا ترک کر دیا تھا۔ ریس کی انتظامیہ کے لوگ حیران تھے۔ کچھ اور لوگ بھی سانولی لڑکی کو اٹھانے کے ارادے سے آگے بڑھے تھے لیکن وہ بھی ان لڑکیوں کو واپس آتے دیکھ کر رک گئے۔

لڑکیوں نے اپنی ساتھی لڑکی کو دیکھا۔ ایک نے ٹراؤزر کا پانسچہ بلند کر کے اس کے گھٹنے کو دیکھا اور باقیوں نے اس کے گرد حلقہ بنا کر پردہ کر دیا۔ سانولی لڑکی کو روکتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھیں پھر انہوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور سب ایک قطار بنا کر آگے بڑھنے لگیں دو لڑکیوں نے سانولی لڑکی کو دائیں اور بائیں سے سہارا دے رکھا تھا۔ اب وہ سب ساتھ ساتھ چل رہی تھیں حالانکہ لڑکی کو صرف دو لڑکیوں نے سہارا دے رکھا تھا اور باقی پانسچہ آزاد تھیں مگر انہوں نے اپنی رفتار نہیں بڑھائی تھی۔ یہ بہت سادہ لیکن بہت عجیب منظر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں ایک ایسا منظر دیکھ رہی ہوں جو عام زندگی میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور شاید ہم میں سے کسی کو دوبارہ ایسا



عقیدت میں مبتلا ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں ایک نوجوان یہودی عالم بھی شامل تھا۔ اس کا یہودی نام کیا تھا کسی کو نہیں معلوم لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد اس کا اسلامی نام سعید رکھا گیا۔ سعید کو خدا نے بڑا خلاق ذہن اور گداز دل دیا تھا۔ شعری مذاق بھی کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے مسلمان علما اور شعرا کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذوق شعری نے شعر گوئی پر مجبور کیا تو اس نے اپنے لیے وہ راہ اختیار کی جو روایتی شاعری سے الگ تھی۔

سعید نے اپنا کلمہ سرمد رکھا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا۔ خود بھی یہی اختیار کیا۔ خاندان کے دوسرے لوگ نفع و نقصان کی فکر میں رہتے مگر سرمد کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ حرص وہو بہت بری شے ہے۔ سرمد نے اپنی شاعری میں حرص وہو کی مذمت شروع کر دی۔ سرمد نے اپنے عزیزوں پر رشتے داروں کو فکر دنیا میں سرکھپاتے دیکھا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے حرص وہو کی مذمت میں کئی رباعیاں کہیں۔

دنیا ز حرص وہو کی زیادتی ہے  
بسیار پرست دنیا لبریز ہے  
جہاں دیکھے دینار کی فکر و محبت میں گرفتار ہیں  
بے شربت دینار کم است  
بیماروں کی کثرت ہے مگر شربت دینار قلیل ہے  
ایں خانہ ویرانہ دینار پرست  
یہ ویران مگر بیماروں سے بھرا ہوا ہے  
دوسری رباعی میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

ہر جاکہ گرفتار ہوا وہوں است  
جسے دیکھئے ہوا و ہوں میں گرفتار ہے  
مگر سلطنتش وہی ہو گویا کہ بس راست  
اگر انہیں سلطنت بھی بخش دی جائے تو بس نہیں کریں گے  
سررہیہ زندگی بے کوتاہ است  
حالانکہ زندگی چند روزہ ہے  
از طول ال حذر کہ دام و نفس است  
طول ال سے بچ کیونکہ یہی دام بھی ہے اور نفس بھی

ان رباعیوں نے خاندان میں تہلکہ مچا دیا، گھر کے بڑے بوڑھے سر جوڑ کر بیٹھے اور آپس میں مشورے کرنے لگے۔ چچا نے کہا: ”یہ سرمد کو ہوا کیا گیا ہے۔ یہ کیسی فضول باتیں کرنے لگا ہے؟“  
بیمار باپ کو بھی بڑی فکر تھی۔ اس نے کہا: ”اس میں غلطی ہماری ہی ہے۔ ایران اور اس کے مضافات میں مسلمان صوفیوں کی کثرت ہے۔ یہ لوگ ترک دنیا کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ سرمد بھی ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا اور ایسی فضول رباعیات لکھنے لگا۔“  
بہن نے پوچھا: ”لیکن اس کا علاج کیا ہے؟“

چچا نے جواب دیا: ”اس کا علاج یہ ہے کہ سرمد کو مسلمان صوفی اور شعرا کی صحبت میں نہ جانے دیا جائے۔“  
باب بہت مایوس تھا، اس نے پوچھا: ”مگر کس طرح؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ایران میں رہیں اور صوفیوں اور شاعروں سے محفوظ رہیں شاید ایسا بالکل ممکن نہیں۔“

چچا کو سب سے زیادہ فکر تھی، اس نے کہا: ”دولت، جو زندگی کا اصل مقصد ہے کیا اس کے بغیر آدمی خوش و خرم رہ سکتا ہے؟“  
بہن نے جواب دیا: ”زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا دولت.....؟ شاید یہ جواب ہر ایک کا ہو لیکن میں یہ کہوں گی کہ ایسا ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ سرمد کو اگر بدلنا ہے تو اس کے لیے انتہائی فکر و تدبیر سے کام لینا ہوگا۔ سرمد میرا بھائی غیر معمولی فکر و شعور کا حامل ہے، اگر معمولی فکر و شعور کے حامل افراد نے سرمد کو سختیں کیں تو یہ نوجوان اپنے آپ سے باہر ہو جائے گا۔“  
چچا نے ایک بار پھر تند و تیز لہجے میں کہا: ”صاحبان! میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اپنے بچے کی افتاد طبع سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ وہی کرے گا جو اس نے ٹھان لیا ہوگا۔“

باب نے کہا: ”اچھا، سرمد کو بلواؤ اور یہ ساری گفتگو اس کی موجودگی میں ہوتا اچھا ہے۔“

سرمد کو اسی وقت ان لوگوں کے سامنے طلب کر لیا گیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ شاید یہاں سرمد تکلف، لحاظ یا ادب سے کام لے لیکن اس کی تیزی اور طراری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ باب نے کہا: ”سعید! تو مسلمان ہو گیا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس معاملے میں شاید میں بھی تیرا ساتھ دوں لیکن یہ تو بتا کہ تو نے مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے شوق اور تجسس کو کیوں بدل ڈالا؟ دنیا آسودہ حال لوگوں کی ہوتی ہے مگر تو ہمیں یہ تعلیم دے رہا ہے کہ مال و زر بیکار چیزیں ہیں۔ اگر انسان مال و زر سے محروم ہو تو اس کی زندگی ہی کیا؟“

سرمد نے جواب دیا: ”باوا جان! میں مسلمان ہو گیا۔ میری اپنی سوچ، فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ جو میں نے کیا وہی آپ بھی کریں لیکن جس دن بھی آپ فکر اور تجربے کی اس منزل میں داخل ہو گئے جس میں، میں داخل ہو چکا ہوں تو آپ بھی اسلام قبول کر لیں گے۔ رہی یہ بات کہ میں مال و زر اور دولت سے نفرت کرتا ہوں اور لوگوں کو حرص وہوس سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین کرتا ہوں تو یہ میرے اندر کی آواز ہے۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔“

چچا کو غصہ آرہا تھا۔ ”لیکن تیری تعلیمات سے میرے خاندان پر برا اثر پڑے گا۔ مال و زر کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں، مفلسی میں انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور افلاس ہی وہ لعنت ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔“  
سرمد کو بھی غصہ آ گیا۔ جواب دیا: ”اور مال و زر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ مال و زر میں انسان خدا ہی کو نہیں، خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ تکبر جس نے معلم الملوک کو بلیس بنا دیا، یہ دولت و زر کا پھل ہے۔ ہوس کا بیج ڈالنے کا تو رنج و غم کی فصل کاٹے گا۔“  
باب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”اچھا، تم شاعری کرتے رہو اور جو جی میں آئے کرتے رہو لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

سرمد نے جواب دیا: ”آپ کا ایک کام نہیں دس کام کرنے کو تیار ہوں۔“  
باب نے کہا: ”تم مال و زر سے نفرت کرتے رہو لیکن کاروبار چونکہ ہمارا آبائی پیشہ ہے اس لیے تجارت میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ تم حرص وہوس سے دور رہو لیکن تجارت میں خسارہ بھی نہ ہونے دو۔ تمہیں مال و زر نہیں چاہیے لیکن مجھے اور خاندان کو تو یہ چیزیں درکار ہیں۔ تم جو کچھ کمادو، خاندان کے کام آئے گا۔“

سرمد نے کہا: ”میں نے کاروبار سے تو کبھی انکار نہیں کیا۔ میں تجارت ضرور کروں گا۔ شاعری اپنی جگہ تجارت اپنی جگہ۔“  
باب نے گھبر لب و لہجے میں کہا: ”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم تجارت کی غرض سے ہندوستان جاؤ گے۔ اب تمہارا اس ملک ایران میں رہنا مناسب نہیں۔“

سرمد سکتے میں رہ گیا۔ کچھ دیر باب کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر بولا: ”جو حکم باوا جان کا۔ ہندوستان کیا، میں دنیا کے دوسرے کنارے تک جاسکتا ہوں۔“

سرمد یہ کہہ کر چلا گیا لیکن اس کی بہن کی حالت غیر ہو گئی۔ باب سے جھنجھلا کر پوچھا: ”باوا جان! یہ آپ نے کیا حکم دے دیا۔ سرمد کو ہم سے جدا کیوں کر رہے ہیں؟“

چچا نے کہا: ”بھائی نے یہ بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب سرمد کا ایران میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر یہ یہاں رہے گا تو اس سے ہمیں دو نقصان پہنچیں گے۔ پہلا نقصان یہ کہ اس کے مسلمان ہو جانے کا اثر دوسرے نوجوانوں پر بھی پڑے گا اور دوسرا اثر یہ پڑے گا کہ نرم اور کمزور دل و دماغ والوں کو مال و زر سے نفرت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا ہندوستان چلے جانا مناسب رہے گا۔“

بہن نے کہا: ”عم محترم! آپ بڑے ظالم ہیں۔“  
چچا نے اس کو بھی ڈانٹ دیا۔ ”اچھا بچہ! رہ لڑکی! تو بھی سرمد ہی جیسی سوچ رکھتی ہے۔“  
باب نے دونوں کو منع کر دیا۔ ”اچھا اب تم دونوں فضول باتوں میں نہ پڑو۔ خاموش ہو جاؤ۔“  
بہن سرمد کے پاس چلی گئی۔ بھائی نے اپنے بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بھائی جان! مجھے تو اس لڑکی میں بھی چند برائیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ سرمد سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کو بھی قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔“

سرمد کے باب نے جواب دیا: ”اچھا اب خدا کے لیے تم چپ ہو جاؤ۔“  
سرمد کا چچا ایک ہی کانیاں تھا، بڑا اتنا ہوا چلا گیا۔

\*\*\*

سرمد نے سامان تجارت لیا اور خلیج فارس کی ایک بندرگاہ کی سرائے میں اتر پڑا۔ یہاں اس کو اس جہاز کا انتظار تھا جس پر بیٹھ کر وہ ہندوستان جانے والا تھا۔ اس کی بہن یہاں تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ وہ بہت اداس تھی۔ اس نے سرمد سے اصرار کیا: ”بھائی! تم جاتو رہے ہو لیکن واپس ذرا جلدی آنا۔“



سرمہ نے بہن کی پیشانی کو چوم لیا بولا۔ ”بہن! تو فکر نہ کر، میں اگر واپس آؤں گا تو تیری وجہ سے، تیری خاطر۔ ورنہ میرا جی دنیا سے بھر گیا ہے۔“

بہن نے روتے ہوئے کہا۔ ”بھائی! باپ کے بعد اپنا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ بس تم ہی ہو جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔“

سرمہ نے جواب دیا۔ ”بہن! میں بھی تجھ سے پیار کرتا ہوں، میں نے کہہ جو دیا کہ جب میں واپس آؤں گا تو اس میں تیری چاہت اور پیار کو بڑا دخل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں، اس حرص و ہوا کی دنیا کو تو بھی چھوڑ دے۔“

بہن نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں تمہاری ہر بات کو مان لوں گی مگر تمہیں بھی یہ اقرار کرنا ہوگا کہ واپس ضرور آؤ گے۔“

سرمہ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”میں واپسی کا وعدہ تو نہیں کروں گا لیکن آنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ پھر اپنی بہن کے دونوں گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”پیاری! بہن! تو اداس نہ ہو میں ایک نہ ایک دن واپس ضرور آؤں گا تو بے فکر رہ۔“

جہاز ساحل پر کھڑا مسافروں کا منتظر تھا۔ سرمہ نے اپنی بہن کو روتا چھوڑ کر جہاز میں قدم رکھا اور ایران پر آخری الوداعی نظر ڈالی، اس وقت سرمہ کے دل کی عجیب سی حالت تھی، گداز دل پر چوٹ لگی اور دنیا اور کاروبار دنیا بچ نظر آنے لگے۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور سفر شروع کر دیا۔ کئی دن اور کئی راتیں جہاز پر ہی کٹ گئیں۔ اس میں بیشتر تاجر سفر کر رہے تھے۔ سرمہ اپنے افکار میں گم رہا اور کسی سے ربط و ضبط نہ بڑھا سکا۔ دوسرے لوگ باتوں میں مشغول رہے، یہ سب اپنے مستقبل کی باتیں کر رہے تھے۔ انہیں اپنی اپنی تجارت کے ممکنہ سود و زیاں کی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے اپنے ہمسفروں میں سرمہ جیسا خاموش جوان دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ انہیں یہ شخص کسی طرح بھی تاجر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سرمہ کو بار بار باتوں پر مجبور کرتے مگر اس کا بھرپور مگر مختصر جواب انہیں خاموش کر دیتا۔

جہاز کے عرشے سے سرمہ نے سمندر کی امواج کا مشاہدہ کیا اور یہیں سے جب اوپر نظر کی تو لامتناہی نیلے آسمان کی وسعتوں نے سرمہ پر ایک دہشت سی طاری کر دی اور انہیں اپنا وجود ایک تنکے سے بھی حقیر تر محسوس ہونے لگا۔ دنیا کی ہر شے ایسی نظر آرہی تھی جو ایک بار نظر آنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی تھی۔ سرمہ کو تجارت، سامان تجارت اور علاقہ دنیا بچ نظر آرہے تھے۔ اس جہاز میں سرمہ نے ایک تاجر کو مرتے ہوئے دیکھا جس کا سارا سامان تجارت دھرا کا دھرا رہ گیا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے کہیں اور جا چکا تھا۔ سرمہ کو تاجر کی موت نے اور زیادہ تڑپا دیا۔

کئی دنوں بعد یہ جہاز ٹھٹھہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ سرمہ نے ساحل پر چھلانگ لگائی اور وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ یہ شاہجہانی عہد تھا۔ ہندوستان پر مغل خاندان کی حکومت تھی۔ سرمہ نے دودن آرام کر کے اپنے سفر کی ٹکان دور کی اور اس کے بعد بازار کا جائزہ لینے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھٹھہ کے بازار میں بڑی رونق تھی۔ سرمہ کو یہاں کے عربوں سے مشابہ لوگ بہت اچھے لگے۔ لوگ ان غیر ملکی تاجروں کو بڑے شوق سے دیکھتے۔ خاص کر بچے ان میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ سرمہ کو یہاں ایک راہنما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک دکان پر ایک ہندو لڑکے کو پیٹھے ہوئے دیکھا جو ٹنگی باندھے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ سرمہ نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ لڑکا بے حد حسین تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا۔

سرمہ نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ فوراً ہی اٹھا اور سرمہ کے قریب جا کر پوچھا۔ ”مجھے تم کوئی غیر ملکی نظر آتے ہو، کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

سرمہ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں ایک ایرانی تاجر ہوں۔ میرا آبائی وطن کاشان ہے مگر بغرض تجارت تیرے گھر آیا ہوں، تو میری رہنمائی کرتا کہ میں یہاں کی پریشانیوں سے بچ جاؤں۔“

لڑکا سرمہ کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا، بولا۔ ”تاجر تم ہو اور رہنمائی میں کروں، خوب۔ تم یہاں کس کے بھروسے پر آئے ہو؟ کیا میرے بھروسے پر؟“

سرمہ کو لڑکے کی بھولی بھالی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ انہوں نے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا تو اس میں کچھ اور ہی نظر آیا۔ لڑکا حسین بھی تھا اور سادہ لوح بھی۔ چہرے پر مصومیت نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ سرمہ نے کہا۔ ”لڑکے! میں نہیں جانتا کہ تیرا نام کیا ہے، تو کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے اور تیرا مذہب کیا ہے؟ مگر مجھے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں تجھے ابد سے جانتا ہوں۔ تیری صورت میں آشنا کی شاہت ہے، آ میرے قریب آ جا۔ تاکہ میں جی بھر کے تجھے دیکھ لوں اور یہ جاننے کی کوشش کروں کہ تو مجھے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں تجھے کب سے جانتا ہوں۔“

لڑکے کو سرمہ کی باتیں عجیب سی لگیں۔ یہ شخص لڑکے کو بھی اچھا لگا۔ کوئی اندر بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے اور یہ کچھ جانتا پچھانا شخص معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میرا تعارف یہ ہے کہ ہندو ذات سے تعلق رکھتا ہوں، یہیں قریب ہی ٹکڑ والے مکان میں رہتا ہوں، ابھی کرتا کچھ بھی نہیں۔ رہی یہ بات کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں اور تم مجھے ایک عرصے سے جانتے ہو، تو یہی کیفیت میری بھی ہے، میں نے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے، میں تم سے کہیں مل چکا ہوں، کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔“

سرمہ نے کہا۔ ”یہ تو بڑی مشکل بات ہوگئی کہ میں خود تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ میں تجھ سے دوستی قائم کرنا چاہتا ہوں، پتا نہیں تو اس پر راضی بھی ہوگا یا نہیں؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”دوستی قائم کرنے میں آخر ہرج ہی کیا ہے۔ رہی ذات پات کی بات اور اس کا فرق، تو یہ باتیں مجھے بذات خود اچھی نہیں لگتیں۔“

سرمہ نے اپنا دانا ہاتھ لڑکے کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ”لڑکے! اپنا دانا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے۔ میں بیان و قبا باندھنا چاہتا ہوں۔“

لڑکے نے بے چون و چرا اپنا ہاتھ سرمہ کے ہاتھ میں دے دیا اور دونوں نے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ سرمہ نے لڑکے سے کہا۔ ”لڑکے! اب ہماری ملاقات روز ہونی چاہیے۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”بالکل، میں تو تم سے ہر روز ملا کروں گا۔“

جب لڑکا اجازت لے کر چلا گیا تو سرمہ کی حالت غیر ہوگئی انہیں ہر طرف وہی لڑکا نظر آ رہا تھا۔ مقامی تاجروں نے سرمہ سے ملاقات کی اور پوچھا کہ ان کے پاس کس قسم کا سامان موجود ہے تاکہ اس کا معاملہ کیا جائے؟

سرمہ نے جواب دیا۔ ”صاحبان! میرے پاس جس قسم کا سامان ہے اس کا تمہارے شہر میں ایک بھی خریدار نہیں، میں کیا بتاؤں کہ میرے پاس کس قسم کا سامان ہے۔“

ایک تاجر نے مسکرا کر دوسرے تاجروں کو دیکھا اور سرمہ پر طنز کیا۔ ”بھائی! تو نو جوان ہے اور یہاں تجارت کرنے آیا ہے۔ یہ تو باتیں کس قسم کی کر رہا ہے، اس طرح تو تو کاروبار کر چکا۔“

دوسرے تاجر نے کہا۔ ”میں نے تو یہ سنا ہے کہ اسے کاروبار اور مال و زر سے کوئی محبت نہیں۔ یہ ایک نا اہل تاجر ہے۔“

سرمہ نے جواب دیا۔ ”واقعی میں ایک نا اہل تاجر ہوں لیکن میں ایک ایسی تجارت بھی کر رہا ہوں جو کسی اور کو دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے ایک ایسی گراں مایہ متاع عزیز پالی ہے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی خواہش نہیں رہی۔“

ایک تاجر نے پوچھا۔ ”سرمہ! ذرا یہ تو بتا کہ وہ ہندو لڑکے والا کیا چکر ہے۔ سنا ہوں تو اس پر عاشق ہو گیا ہے؟“

سرمہ نے جواب دیا۔ ”عاشق ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، بوا! ہوس تو کبھی کرتے ہیں۔“

کسی اور تاجر نے پوچھا۔ ”یہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟“

سرمہ اس وقت گویا اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ جواب دیا۔ ”یہ زمین خدا کی ہے اور... میں اس کا عاجز و ناتواں بندہ ہوں۔ جب تک وہ چاہے گا میں یہاں رہوں گا۔ پھر جب یہاں سے چلے جانے کا حکم ملے گا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گا۔ فوراً چلا جاؤں گا۔“

کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ”جوان غیر ملکی تاجر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میری پیش گوئی لکھ لو کہ یہ شخص جس کا نام سرمہ ہے قابل اعتبار شخص نہیں ہے ہمیں تو یوں لگتا ہے گویا اس کا دماغ چل گیا ہے۔“

سرمہ نے نرمی سے کہا۔ ”میں قابل اعتبار نہیں ہوں تو پھر اور کون قابل اعتبار ہوگا۔ میرا دماغ نہیں چل گیا۔ دماغ تو تم لوگوں کا چل گیا ہے جو دن رات مال و زر رکمانے کی فکر میں مٹتے رہتے ہو۔“

کسی تاجر نے برامان کر سرمہ سے سوال کیا۔ ”اچھا اب یہ فضول باتیں بند ہونی چاہئیں۔ سرمہ! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کون سا اور کس قسم کا مال ہے تاکہ اس کا سودا کیا جاسکے۔“

سرمہ نے بیزار سے جواب دیا۔ ”میرے پاس کوئی مال نہیں اور نہ ہی میں تاجر ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ کیسا دھندا اختیار کر لیا ہے۔“

ایک تاجر نے سرمہ کو سمجھایا۔ ”سرمہ! یہ تمہاری مرضی کہ کاروبار کرو یا نہ کرو لیکن میری ایک بات ذہن نشین رکھنا، جس ہندو زادے سے تم نے عشق لڑانا شروع کر دیا ہے وہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں تمہیں رسوائی، شرمندگی اور نقصان بھی اٹھانا پڑ جائے۔“

سرمہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”معلوم نہیں تم لوگ کتنے گندے خیالات رکھتے ہو۔ میں لڑکے سے عشق کروں گا۔ سبحان اللہ، یہ میرے سر الزام ہے، بہتان ہے۔“

کسی طرف سے آواز آئی۔ ”ایران سے آئے تھے تاجر بن کر اور اب تجارت ہی سے توبہ کر لی۔ آخر کیوں؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی۔ ہماری سمجھ میں جو وجہ آئی بیان کر دی۔ ہمارا کام سمجھانا ہے سمجھائے جا رہے ہیں۔ ورنہ تم پڑھے لکھے عقلمند انسان ہو۔ یہ بات تو تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ جو یوکر گندم کی فصل نہیں کاتی جاسکتی۔“

سرمہ کو غصہ آ گیا۔ چیخ چیخ کر تاجروں کو دھتکارنا شروع کر دیا۔ ”تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تشدد پر آمادہ آؤں گا۔ تم لوگ تو



مخبوط الحواس ہو گئے تھے بھی اپنے ساتھ ویسا ہی بنانا چاہتے ہو، بھاگ جاؤ، چلے جاؤ۔“  
تاجر حضرات وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ سرمد پر غشی سی طاری ہو گئی۔ وہ نڈھال ہو کر ایک طرف لیٹ گئے اور معلوم نہیں کب تک بے ہوش پڑے رہے لیکن جب ہوش آیا تو ہندو زادے کو اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ سرمد کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا۔  
”لڑکے تو کب آیا؟“

لڑکے نے پوچھا۔ ”ذرا دیر پہلے، تمہیں ہو کیا گیا تھا؟“

سرمد نے کہا۔ ”تاجر حضرات مجھ پر شک کر رہے تھے، کہتے تھے، میں اپنا مال تجارت ان کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ میں نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ بس اس بات سے وہ لوگ مشتعل ہو گئے اور مجھے پاگل اور مخبوط الحواس کہنے لگے۔ لڑکے! تو ہی بتا کیا میں پاگل ہوں؟“  
لڑکے نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، مجھے تو تم صبح الدماغ معلوم ہوتے ہو۔“  
”اور دوسری بات بڑی شرمناک کہہ گئے وہ لوگ۔“ سرمد نے کہا۔

لڑکے نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

سرمد نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ ”وہ لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے، کہتے تھے میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تجھ کو دیکھ کر وارفتہ ہو جاتا ہوں اور ایک ایسی کبک اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہوں، شاید میں اپنے رب کے عشق میں مبتلا ہو جاؤں۔“

لڑکا سرمد کی باتیں بڑی توجہ اور اٹھناک سے سنتا رہا۔ شاید یہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں، وہ سرمد میں خود بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”بابا مجھے نہیں معلوم تم کیا اور کیوں کہہ رہے ہو لیکن اتنی بات میں بھی جان گیا ہوں کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو، کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تمہارے پاس اٹھ بیٹھ لیا کروں؟“

سرمد نے کہا۔ ”تو نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے اب یہ آگ میرے پورے وجود کو جلا کر رکھ کر دے گی۔ لڑکے! بخدا پہلے میں اپنے اندر ایک سوزش ضرور محسوس کیا کرتا تھا لیکن اس سوزش نے لوہے دی ہے اور میں خود کو اس آگ میں جلا کر جسم کر دینا چاہتا ہوں۔“  
لڑکا گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور سرمد کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر حاضر ہو گیا۔ لڑکا بھی سرمد میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ وہ سرمد سے دور رہ کر یہی محسوس کرتا کہ کوئی چیز کم ہو گئی ہے اور کوئی اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، سرمد پر الزام لگنے لگے۔

لڑکے کے باپ کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ دوست احباب، عزیز اقارب لڑکے کے باپ کو طعنے دینے لگے۔ کسی نے کہا۔  
”اپنے لڑکے کو سنبھالو، یہ کاشانی تاجر اسے بدنام کر رہا ہے۔“  
کوئی کہتا۔ ”مارنے والے کے ہاتھ پکڑے جاسکتے ہیں مگر کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جاسکتی۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو، لوگ تیرے لڑکے اور سرمد کی بابت کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

باپ کو غصہ آ گیا اس نے لڑکے کو منع کیا۔ ”خبردار! جو تو اب سرمد کے پاس گیا۔“  
لڑکے نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر باز بھی نہیں آیا۔ اس کے فوراً بعد سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد نے لڑکے سے پوچھا۔ ”آج تیرا باپ تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“

لڑکے نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“

سرمد نے کہا۔ ”لڑکے! جھوٹ نہ بول۔ اس نے تجھے میرے پاس آنے سے منع کیا تھا۔“

لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔ ”لیکن اس کی خبر تمہیں کیسے ہوئی؟“

سرمد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میرے سینے میں ایک آگ سی روشن ہے اور میں اس روشنی میں نادیدہ چیز بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اس روشنی میں، میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تیرے نام نہاد دوست نما دشمن تیری بابت کس قسم کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔“  
لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ ”میں مجبور ہوں خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن یہ طے ہے کہ میں یہاں کے علاوہ کہیں سکون نہیں پاتا۔“

سرمد نے کہا۔ ”لڑکے! اگر بدنامی سے بچنے کے لیے کچھ کرنا پڑے تو اس میں یہ بات سرفہرست ہوگی کہ سرمد نے ایک بھولے بھالے لڑکے کو بدنام کر دیا۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”سرمد! میں کچھ نہیں جانتا، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں نے آپ کی محبت میں بہت کچھ حاصل کیا ہے اور یہ حصولیابی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔“

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ لڑکے کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اپنے لڑکے کو دیکھ کر سرمد پر گرم ہوا، بولا۔ ”سرمد! تم تمہارے تاجر، آج ہو، کل اپنے وطن ایران چلے جاؤ گے لیکن مجھے اپنے خاندان کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”تیرے لڑکے کو میں تو نہیں بلاتا۔ اس کو روک کر کسی کوٹھڑی میں بند کر دو۔“  
لڑکے کے باپ نے کہا۔ ”میں گھر میں اسے قید کر دیتا ہوں لیکن یہ کسی نہ کسی ترکیب سے باہر نکل بھاگتا ہے۔“

سرمد نے کہا۔ ”بس ایک بار اور قید کر دو۔“

باپ نے کہا۔ ”لیکن تم اسے منع کیوں نہیں کر دیتے؟“

سرمد نے لڑکے سے کہا۔ ”لڑکے! اب تو میرے پاس نہیں آئے گا۔“

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا اور باپ اپنے لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن اس کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دوپہر کو ماں نے رحم کھا کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر ممکن ہو گئی کہ وہاں لڑکے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ماں نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو تلاش کر کے میرے روبرو لاؤ، حیران ہوں کہ یہ نکلا کدھر سے؟

نوکر نے جواب دیا۔ ”ماتا جی! جب کمرے میں باہر سے قفل لگ گیا تھا تو یہ لڑکا جائے گا کہاں؟ میں اس کو کہاں تلاش کرتا پھروں؟“

ماں نے سختی سے کہا۔ ”لڑکے کو گھر میں نہ پا کر میرا پتی تو مجھے زندہ جلا دے گا۔“

لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ دوپہر کو شوہر گھر میں داخل ہوا تو بیوی سے پوچھا۔ ”لڑکے کو کچھ کھانے پینے کو دیا تھا یا نہیں؟“

بیوی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ شوہر نے خاموش بیوی کو سوالیہ نظروں سے گھورا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“

بیوی نے ڈر سے سب سے سچے میں جواب دیا۔ ”کس کی بات کر رہے ہیں؟“

شوہر بیوی کے سر پر جا کھڑا ہوا، بولا۔ ”میں لڑکے کی بات کر رہا ہوں۔ اس لڑکے کی جسے میں صبح کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں نے کھانا کھلانے کے لیے جب کمرے کو کھولا تو وہ خالی تھا۔“

شوہر نے غصے میں اپنی بیوی کی چوٹی پکڑ لی۔ ”تو بکیتی ہے، جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے اپنی مامتا میں لڑکے کو آزاد کر دیا۔“

بیوی نے عاجزی سے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”میں نے اس کو نہیں رہا کیا۔ اس سلسلے میں، میں ہر قسم کی قسم کھانے کو تیار ہوں کمرے سے کس طرح نکلا، میں نہیں جانتی لیکن جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو یہ بالکل خالی تھا۔“

شوہر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی لاتا ہوں اس کو تلاش کر کے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔“  
وہ سیدھا سرمد کے پاس پہنچا۔ وہاں لڑکا سرمد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ باپ نے لڑکے کا نام لے کر اسے آواز دی۔ لڑکا سہم گیا اور بالکل سرمد سے بھڑک بیٹھ گیا۔

باپ نے پوچھا۔ ”کیا میں نے تجھے منع نہیں کر رکھا ہے یہاں آنے سے؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”یہ میں کب کہتا ہوں کہ منع نہیں کیا تھا۔“

باپ نے پوچھا۔ ”پھر تو کیوں اور کس طرح یہاں آ گیا؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کیوں اور کس طرح آ گیا۔“

باپ نے پوچھا۔ ”کمرے کا دروازہ کس نے کھولا تھا؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کیونکہ میں نے دروازے کو ذرا سادھکا دیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔“

باپ نے سرمد کو مخاطب کیا۔ ”تاجر! تو نے اس لڑکے کو کیوں اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ خدا کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دے۔“

سرمد نے کہا۔ ”بابا یہ اپنی مرضی سے آتا جاتا ہے۔ میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اپنے گھر میں رہے اور میرے پاس آئے۔“

باپ نے کہا۔ ”مسلم تاجر! تم مجھ پر اتنا کرم کرو کہ جب یہ تمہارے پاس آئے تو بھگا دیا کرو۔“

اس کے بعد باپ لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

چند دنوں بعد سرمد کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ انہیں اپنا ہوش تک نہ رہا۔ جدھر سے گزرتے، لوگ آوازے کتے، مذاق اڑاتے،



سرمہ کو اس عالم میں بھی یہ خیال رہا کہ ان کی جو حالت ہے اور اس کا جو سبب سمجھا جا رہا ہے اس سے ان کے دین کو نقصان پہنچا ہے، اس عالم میں انہوں نے ایک رباعی کہہ ڈالی۔

سرمہ! افسوس کہ تو نے دین میں رخسہ پیدا کر دیا  
ایمان بخدائے چشم مستی، کردی  
اپنا ایمان کسی مست آنکھ والے کے حوالے کر دیا  
باغزو نیاز جملہ نقد سے باعجز و نیاز  
تیرے پاس جو نقد تھا اسے باعجز و نیاز  
گرفتی و نثار بت پرستی کردی  
سارا سارا بت پرستی نثار کر دیا

ٹھٹھہ میں ان کے خلاف جو ہم اٹھی، تو سرمہ نے دہلی کی راہ لی۔ دہلی میں پہنچ کر انہوں نے لباس سے بھی نجات حاصل کر لی۔ برہنہ رہنے لگے۔ بس پورے جسم پر ایک لنگوٹی باقی رہ گئی۔ دن رات رباعیات کہتے رہتے۔ انہیں حرص و ہوس سے نفرت تھی اور دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس تھا۔ انہیں دنیا والوں سے ذرا سی امید نہ تھی کیونکہ وہ دنیا کے ہر شے کو عارضی اور کمزور سمجھتے تھے۔ دہلی میں ان کا شہرہ ہوا تو جاننے والوں کو اس پر سخت حیرت ہوئی کہ اتنا بڑھا لکھا شخص یوں محبوس آٹھواں اور پیکار مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے آخری عہد کی باتیں ہیں۔ جانشینی کے چرچے چاروں طرف گشت کر رہے تھے اور بادشاہ کے ولی عہد کی حیثیت سے داراشکوہ کا نام لیا جا رہا تھا۔ شہزادہ داراشکوہ ایک عالم فاضل اور صوفی منش نوجوان تھا۔ اس نے سرمہ کا ذکر سنا تو ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ایک دن داراشکوہ نے ایک آدمی سرمہ کی خدمت میں روانہ کیا اور ملاقات کی اجازت مانگی۔

شہزادے کے نمائندے کو سرمہ نے جواب دیا۔ ”شہزادہ جب چاہے ملاقات کر لے اس میں اجازت کی کیا بات تھی۔“  
شہزادے کے نمائندے نے کہا۔ ”حضرت! شہزادہ ایک اصولی انسان ہے، وہ آپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر نہیں آسکتا۔“  
سرمہ نے جواب دیا۔ ”تب پھر شہزادے کو میری طرف سے مطلع کر دو کہ وہ جب چاہے چلا آئے۔“  
داراشکوہ اجازت پاتے ہی سرمہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس نے سرمہ کو ایک لنگوٹی میں دیکھا تو بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”حضرت! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے آپ کی بابت سن رکھا ہے کہ آپ نہایت پڑھے لکھے انسان ہیں اور علم و فضل میں آپ کا کوئی جواب نہیں۔“  
سرمہ نے جواب دیا۔ ”اگر عالم فاضل ہوں تو اس پر تمہیں اعتراض ہے؟“  
شہزادے نے گھبرا کر عرض کی۔ ”حضرت! اعتراض کی بات نہیں۔ مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ آپ اپنی وضع قطع اور لباس سے اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے کہ آپ بے مثل عالم و فاضل انسان ہیں۔“  
سرمہ نے جواب دیا۔ ”میں نے قناعت کو اپنا لیا ہے اور حرص و طمع سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے کیونکہ میں نے اہل دنیا کو بہت ہی خوار و زبوں دیکھا ہے۔ میری ایک رباعی سن جو کل ہی موزوں ہوئی ہے۔“

سرمہ! تو بچ خلق سے یاری کی امید نہ رکھ  
سرمہ! خلق سے یاری کی امید نہ رکھ  
از شاخ برہنہ ہو وہ سایہ داری مطلب  
کیونکہ جو شاخ برہنہ ہو وہ سایہ کیونکر دے گی  
عزت زقاعت است و خوار از طمع  
قناعت اختیار کر کہ اس میں عزت ہے اور طمع میں خوار ہے  
باعزت خویش باش خواری مطلب  
عزت کو بچا اپنے آپ کو خوار نہ کر

داراشکوہ سرمہ سے بہت متاثر ہوا بولا۔ ”کیا آپ میرے پاس رہنا پسند فرمائیں گے؟“  
سرمہ نے جواب دیا۔ ”میں ایک صوفی منش آوارہ انسان، مجھے محلات کی زندگی راس نہیں آسکتی۔“  
داراشکوہ نے کہا۔ ”مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔“  
سرمہ نے کہا۔ ”کیسی خدمت، کہاں کی خدمت۔ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔“

داراشکوہ نے پوچھا۔ ”مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تو رہے گی؟“  
سرمہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”بابا! یہ کوئی شاہی دربار تو ہے نہیں، جب چاہو آ جاؤ۔ یہ فقیروں کی کٹیا ہے۔“  
داراشکوہ نے عرض کیا۔ ”حضرت چند رباعیاں اور سنا دیجیے، ان کے نشے میں مت و سرشار چلا جاؤں گا۔“  
سرمہ نے کہا۔ ”تو سن۔“

از مصیبت بیش بود فضل کہیں زیادہ ترا  
میرے گناہوں سے تیرا فضل کہیں زیادہ ہے  
ہر لحظہ بخود حساب اور ہر جگہ کر کے دیکھ لیا  
میں نے یہ حساب ہر کہیں اور ہر جگہ کر کے دیکھ لیا  
ہر چند کہ سرتا ہر قدم گناہ ہوں  
حالانکہ میں سرتا ہر گناہ ہی گناہ ہوں  
از بخشش تو نیست فزوں جرم مرا  
مگر پھر بھی تیری بخشش کے مقابلے میں میرے گناہ کچھ بھی نہیں  
داراشکوہ وجد کرنے لگا، جھومنے لگا۔ اس کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ بے اختیار بولا۔ ”حضرت کچھ اور کچھ اور.....“  
سرمہ نے دوسری رباعی سنائی۔

انسان کہ شکم سیری از یک نان است  
آدمی کا ایک روٹی سے پیٹ بھر جاتا ہے  
از حرص وہوا شام و سحر نالان است  
اس کے باوجود اس کی حرص وہوا اسے دن رات محو نالوں و فغاں رکھتی ہے  
در بحر وجودش بگر، طوفان است  
زندگی کے سمندر میں ایک طوفان بپا ہے  
آخر چو حباب یک نفس مہمان است  
اور اس میں انسان بلبلے کی طرح ایک سانس کا مہمان ہے  
داراشکوہ نے سرمہ کی پیشانی کو فرط عقیدت سے چوم لیا اور واپس چلا گیا۔

اورنگ زیب کے آدمی داراشکوہ کے پیچھے لگے ہوئے تھے کیونکہ اورنگ زیب کو داراشکوہ کی ولی عہدی گوارا نہ تھی اور اس نے اپنے باپ شاہجہاں اور اپنے بھائی داراشکوہ کے آس پاس مخبروں اور جاسوسوں کا جال سا پھیلا دیا تھا۔ سرمہ اور داراشکوہ کی ملاقات کا حال بڑی رنگ آمیزی سے اورنگ زیب تک پہنچا دیا گیا۔ اورنگ زیب نے ہدایت کی کہ اس معاملے پر کڑی نظر رکھی جائے اور ان دونوں میں جو جو باتیں ہوں انہیں حرف بہ حرف لکھ کر مجھے روانہ کر دیا جائے۔

دوسری طرف دہلی کے خواص و عام تھے جو سرمہ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے اور ان بلند پایہ رہاویوں کو لکھ لکھ کر محفوظ کر رہے تھے۔ اسی دوران شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب میں معرکہ آرائی ہو گئی۔ اورنگ زیب کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی مراد بھی ہو گیا اور ان دونوں نے مل کر داراشکوہ کو عبرتناک شکست دے دی اور اورنگ زیب نے ہندوستان کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب نے ان لوگوں کی فہرست تیار کرائی جو داراشکوہ کے ہمدرد یا اس کے ساتھ تھے۔ وہ ان سے غمنا چاہتا تھا۔ ان میں سرمہ کا نام بھی شامل تھا۔ مخبروں نے اورنگ زیب کو یہ خبر بھی دی تھی کہ سرمہ داراشکوہ کو بادشاہت کی بشارت دیتے رہے ہیں۔ اورنگ زیب نے سرمہ کے قریب رہنے کے لیے چند آدمی متعین کر دیے اور انہیں یہ ہدایت کر دی کہ وہ سرمہ میں ایسی باتیں تلاش کریں جو قابلِ اعتراض ہوں۔

سرمہ اپنے حال میں مگن دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔  
ایک دن کسی نے سرمہ سے پوچھا۔ ”سرمہ! معراج مصطفیٰ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یعنی وہ جسمانی تھی یا روحانی؟“  
سرمہ نے کہا۔ ”اے شخص! میں تیری نیت سے واقف ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت میں جو کچھ کہوں گا وہ بھی نہ بھی میرے خلاف یہ طور شہادت استعمال ہوگا۔ مگر سن، میں کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ تو معراج کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ میری رباعی سن، میں نے اس میں کھل کر بیان کر دیا ہے۔“



ہر کسی کے پاؤں حقیقت کے راز سے بندھ گئے  
 اس کی وسعت پاؤں جولا نگاہ آسمانوں سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی  
 ملا گویہ کہ برفلک شد احمد  
 ملا کا کہنا ہے کہ نبی اکرم آسمانوں پر تشریف لے گئے  
 لیکن سرمد کا قول یہ ہے کہ خود آسمان رسول کے قدموں میں آگیا  
 اس ربائی سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ درباری علمائے سرمد کو لائق گردن زدنی قرار دے دیا۔

اورنگ زیب نے قاضی القضاۃ ملا قوی کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ سرمد سے ملیں، باتیں کریں اور سزا کے لیے جواز تلاش کریں۔  
 قوی نہایت قیمتی ریشمی لباس پہن کر سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد حسب دستور برہنہ تھے۔ صرف ایک لنگوٹی سے ستر پوشی کر رکھی تھی۔  
 قوی نے پوچھا۔ ”سرمد کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں پہچانتا ہوں۔ تو میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ مجھ میں ایسی چیزیں تلاش کرے جس سے میں سزا کا مستحق قرار پا جاؤں۔“

قوی نے کھیا کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس ملک کا قاضی القضاۃ ہوں۔ میرا نام ملا قوی ہے، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“  
 سرمد نے کہا۔ ”پوچھ، میں تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔“  
 قوی نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم ایک عالم اور فاضل انسان ہو اس کے باوجود تم برہنہ رہتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”کیا کروں شیطان قوی ہے۔“  
 قوی تلملا کر رہ گئے۔ سرمد نے کہا۔ ”ملا قوی! میری ربائی بھی سن لے۔“

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا  
 ایک سرو قد محبوب نے مجھے پست قد ٹھکنا بنا دیا ہے  
 چشمے بدو جام بردہ از دست مرا  
 اس کی آنکھ کے دو پیالوں نے مجھے آپے سے باہر کر دیا ہے  
 اور بغل من است دمن در طلبش  
 میرا محبوب میری بغل میں چور کی طرح چھپا بیٹھا ہے اور میں دیوانہ!  
 دوزے عجبے برہنہ کردہ است مرا  
 وہ عجیب چور ہے کہ اس کی سراپا لوٹ کے ہاتھوں میں ننگا ہو چکا ہوں  
 ملا قوی جزبہ ہو کر رہ گئے۔ غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کرنے سکے، پوچھا۔ ”سرمد! میں نے سنا ہے تم بھنگ پیتے ہو؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں پیتا ہوں، پھر تجھے کیا۔ کوئی اعتراض؟“  
 ملانے کہا۔ ”ہاں مجھ کو اعتراض ہے کیونکہ بھنگ حرام ہے۔“

سرمد نے ملا کے ریشمی لباس کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تو نے محض سنا ہے کہ میں بھنگ پیتا ہوں مگر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تو ریشم پہنتا ہے حالانکہ بھنگ کی طرح ریشم بھی مردوں کے لیے حرام ہے۔“  
 ملا قوی شپٹا گئے مگر آدمی ذہین تھے، فوراً جواب دیا۔ ”ریشم حرام ہے لیکن تم نے شاید غور نہیں کیا کہ حرام ریشم میں حلال سوت کی آمیزش کر دی گئی ہے جس سے یہ حرام شے حلال ہو گئی ہے۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”پھر تو ہم پر معترض کیوں ہے، میں بھی تو حرام بھنگ میں حلال پانی استعمال کرتا ہوں۔“  
 قوی نے محسوس کر لیا کہ ان سے پیش پانا مشکل ہے، چپ چاپ واپس چلے آئے اور اورنگ زیب کو مطلع کیا کہ سرمد کو برہنگی کے جرم میں سزا دی جاسکتی ہے۔

اورنگ زیب نے کہا۔ ”سزا کے لیے یہ عذر شرعی ناکافی ہے، کچھ اور ہونا چاہیے۔“  
 اس دوران یہ خبر عام ہو گئی کہ سرمد مسلمان ہونے کے باوجود پورا کلمہ نہیں پڑھتے صرف لا الہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

اورنگ زیب نے علمائے عصر کی ایک جمعیت کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرمد سے ملے اور اس سے مناظرہ کرے۔  
 علمائے تیار ہو گئے۔ یہ لوگ سرمد کے پاس پہنچے اور اس سے باتیں شروع کر دیں۔

ایک عالم نے پوچھا۔ ”سرمد! تم برہنہ کیوں رہتے ہو؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب میں ملا قوی کو دے چکا ہوں اس لیے بار بار اپنے جواب نہیں دہرا سکتا۔“  
 دوسرے عالم نے پوچھا۔ ”رسول مقبول کی معراج کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے یعنی کیا عقیدہ ہے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب میں اپنی ربائی میں دے چکا ہوں، اس کو پڑھ لو۔“  
 ایک عالم اپنی دانست میں دور کی کوڑی لایا، پوچھا۔ ”سننے میں آیا ہے کہ تم نے داراشکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے اسے یہ مژدہ سنایا تھا مگر وہ سلطنت دینی نہیں، آخرت کی تھی۔“

کسی دوسرے عالم نے مذکورہ عالم کے کان میں کہا۔ ”یہ کیا سوال کر دیا۔ اس سوال کے جواب پر تعزیری فتویٰ کس طرح دیا جاسکتا ہے۔“  
 ایک عالم نے سرمد سے کہا۔ ”سرمد! ہم علماء تمہیں حکم دیتے ہیں کہ بہت دن برہنہ رہ چکے اب لباس پہن لو۔“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”میں جس مقام پر ہوں وہاں علماء کا حکم نہیں چلتا۔“

علماء عاجز آ گئے۔ انہوں نے اورنگ زیب سے ملاقات کی اور عرض کیا۔ ”سرمد ہماری باتوں میں نہیں آتا۔ بس ایک ہی ایسی بات ہے جس پر اسے تعزیری فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔“  
 اورنگ زیب نے پوچھا۔ ”کس بات پر؟“  
 علمائے یک زبان جواب دیا۔ ”برہنگی پر۔“

اورنگ زیب نے بیزاری سے منہ بنایا، کہا۔ ”غلط، فضول، محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔“  
 علماء نے عرض کیا۔ ”سرمد خردمند دیوانہ ہے اس کو باتوں سے زیر نہیں کیا جاسکتا۔“  
 اورنگ زیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد خوش ہو گیا۔ بولا۔ ”میں نے سنا ہے سرمد پورا کلمہ نہیں پڑھتا صرف لا الہ کہہ کر رہ جاتا ہے۔“

عالموں نے جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہے تو یہ بات وجہ قتل بن سکتی ہے۔“  
 اورنگ زیب نے کہا۔ ”یہ بات ہے، جاؤ اس سے پوچھو۔ اس کے بعد فتویٰ دے دو۔“  
 علمائے ایک بار پھر سرمد کو گھیر لیا اور کہا۔ ”سرمد! ذرا کلمہ تو پڑھنا۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں پورا کلمہ نہیں پڑھ سکتا۔“  
 کسی عالم نے سوال کیا۔ ”وہ کیوں؟ آخر کیوں؟“  
 سرمد نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ میں حالت نفی میں ہوں۔ ابھی مقام اثبات نہیں آیا۔“

دوسرے عالم نے پوچھا۔ ”ہم حالت نفی اور حالت اثبات کی بات نہیں کر رہے، کلمہ پڑھنے کو کہہ رہے ہیں۔“  
 سرمد نے کہا۔ ”میں بھی اپنی مجبوری بیان کر رہا ہوں۔ میرے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا چونکہ میں مقام نفی میں ہوں اس لیے کلمہ کا اثباتی حصہ اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا۔“

کسی جو شیلے عالم نے کہا۔ ”میں کلمہ پڑھنے کی بات کر رہا ہوں، فضول بحث میں مت الجھا۔“  
 سرمد نے نصف کلمہ پڑھ دیا۔ ”لا الہ۔“  
 عالم نے کہا۔ ”آگے۔ اور؟“

سرمد نے پھر کہا۔ ”لا الہ۔“  
 عالم نے غصے میں اصرار کیا۔ ”آگے اور بقیہ کلمہ کیوں نہیں پڑھتے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ابھی میں حالت نفی میں ہوں اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا۔“  
 پرجوش عالم نے دھمکی دی۔ ”سرمد! اگر تم پورا کلمہ نہیں پڑھو گے تو میں کفر کا فتویٰ دے کر دار پر چڑھا دوں گا۔ تم پورا کلمہ پڑھو۔“  
 سرمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ ابھی تو میں نفی کی لذتوں میں گم ہوں۔ اثبات کا مزہ نہیں جانتا۔ پھر میں پورا کلمہ کس طرح پڑھوں۔“

عالم نے کہا۔ ”سرمد! تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ یہاں اورنگ زیب کا دور حکومت ہے، یہاں فقہ اسلامی نافذ ہے اور اس سلطنت اسلامیہ میں کسی مسلمان کے منہ سے کلمات کفر برداشت نہیں کیے جاسکتے۔“  
 سرمد نے مسکرا کر ایک شعر پڑھا۔



کشورے بہت کہ دروے رو داز کفر سخن  
جاگفت وشنو برسرائیاں زرد  
(ایک سلطنت ایسی بھی ہے جہاں پر صرف اور صرف کفر موضوع سخن ہے۔ (اے سادہ لوح لوگو!)

ہر جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں ایمان پر ہی گفت و شنید ہوتی ہے)  
کسی عالم نے اتمام حجت کے طور پر سوال کیا۔ ”سرمدا پورا کلمہ پڑھتے ہو یا نہیں؟“  
سرمدا نے جواب دیا۔ ”تم لوگ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو جس لیے آئے ہو اسے کر گزرو۔ میں اپنا کام کر چکا۔ لا الہ۔“

خرقہ پوشاں ہمہ گر مست گزشتہ گزشتہ  
قصہ پامست کہ در کوچہ و بازار بماند  
(خرقہ پوش یعنی لباس فاخرہ پہن کر اٹھتے ہوئے چلنے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم ننگ دھڑنگ لوگوں کے قصے کوچہ و بازار میں رہ جاتے ہیں۔ جنہیں لوگ دہراتے رہتے ہیں)

علما کا کام آسان ہو چکا تھا۔ انہوں نے بلا تامل قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سرمدا کو گرفتار کر لیا گیا۔  
اس کام میں عجلت اختیار کی گئی۔ گرفتاری کے بعد سرمدا کو قتل گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی، لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کر دیا تھا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں چلنا دشوار ہو گیا تھا لیکن سرمدا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔  
مقتل میں جلاد شمشیر برہنہ لیے تیار کھڑا تھا۔ تلوار کی چمک سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ سرمدا نے مسکراتے ہوئے جلاد سے آنکھ ملائی اور ایک خاص ادا سے کہا۔ ”فدائے تو شدم، بیابا کہ تو بہر صورتے کدی آئی، من ترا خوب می شام“ (میں تیرے قربان جاؤں۔ آجا، بس آجا، تو کسی بھیس میں بھی آئے، میں تجھے ہر رنگ میں خوب پہچان سکتا ہوں)  
جلاد نے سرمدا کو ابھی سر رکھنے کا حکم بھی نہ دیا تھا کہ سرمدا نے ایک شعر پڑھا۔

شورے شد داز خواب عدم چشم کشودیم  
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ نمودیم

(ایک شور اٹھا تو ہم نے ہیشکی کی نیند سے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ ہمیں صرف اتنا دکھائی دیا کہ فتنہ بھری رات ابھی باقی ہے لہذا ہم پھر سو گئے)

جلاد کے ایک بھرپور وار نے سرمدا کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس عالم میں لوگوں نے سنا سرمدا کے کٹے ہوئے تن سے تین بار لا الہ الا اللہ کی آواز بلند ہوئی۔

حاضرین حیران و ششدر رہ گئے۔ جلاد خوفزدہ ہو گیا۔ علما کا کام ختم ہو چکا تھا۔  
کاشان کا رہنے والا نو مسلم سعید سرمدا یا غیر میں فتنوں بھری رات سے بیزار ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سوچا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ جامع مسجد کے گرد و نواح میں ہے۔ کہتے ہیں چاروں فصلوں میں یہاں سرسبز گھاس رہتی ہے اور لوگ اس کے مزار کی زیارت کر کے عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔

برسر تربت من چوں گزری بہت خواہ

کہ زیارت گہ زندان جہاں خواہد بود

(اے دوست! (اگر کبھی) تو میری قبر پر سے گزرے تو (صرف) یہ دعا مانگنا کہ مٹی کا یہ ڈھیر دنیا بھر کے بادہ خواروں کی زیارت گاہ بن جائے)

چنانچہ آج بھی مشہد سرمدا زیارت گاہ خاص و عام ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے لیے اٹھنے والے ہاتھ دروہ آسمان رہتے ہیں۔

آنا نکہ غم تو برگزیدہ ندہمہ

در کوئے شہادت آرمید ندہمہ

در موکہ دو کون فتح از عشق است

با آنکہ سپاہ اوشہید ندہمہ

(وہ جنہوں نے تیرا غم سارے کا سارا اختیار کر لیا۔ آخر کار شہادت کے کوچے میں انتہائی سکون کی نیند جاسوئے۔

دونوں جہانوں کے محر کے میں انجام کار فتح عشق ہی کو حاصل ہوتی ہے حالانکہ لشکر عشق سارے کا سارا رکھتے رہا)

\*\*\*



## کمائی دھائی

منظر امام

لفظ ایک غم روزگار نے جانے کتنی قوموں کی سوچ کا دھارا بدل ڈالا ہے... جب بہتادریارستہ بدل جائے تو کہیں ہریالی بڑھتی ہے، کہیں زمین پانی کو ترستی ہے... مگر موسم کی طرح رستوں کا بدلنا ان کا مشغلہ نہیں بلکہ ان کا روزگار تھا اور ان کا طریقہ واردات بھی بڑا انوکھا تھا۔

محبت کے دام کھرے کرنے والی ایک معصوم حسینہ کی چالاکیاں

مجبوری ہے اس لیے آپ سے درخواست کر رہی ہوں۔“  
اس کا لہجہ بھی شائستہ تھا۔ سگنل کھلنے والا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”چلیں بیٹھ جائیں۔ ویسے کہاں اتریں گی؟“  
”آگے۔“ اس نے اشارہ کیا۔

میں نے اسے ساتھ بٹھالیا۔ رکشا پھر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور آنے کے بعد اس نے کہا۔ ”اگر آپ برائے مانیں تو مجھے مارکیٹ کے پاس اتار دیں۔ یہاں سے میں خود چلی جاؤں گی۔“  
”اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے؟“ میں مسکرا کر بولا۔

”ویسے آپ جہاں کہیں جائیں میں آپ کو پہنچا سکتا ہوں۔“  
”ارے نہیں، میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔“  
میں نے رکشے والے کو ہدایت دی اور وہ رکشا رکنے کے

رکشا سگنل پر رکا تھا کہ وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

بہت معقول سی لڑکی تھی اور وہ یقیناً بھکارن بھی نہیں تھی۔

بھکارنوں کے انداز کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس کے انداز

کچھ اور تھے۔ وہ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

اساتر سی لڑکی، دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے۔

صاف ستھرے کپڑے، ہاتھ میں ایک خوبصورت سا

پاک۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز کیا آپ

مجھے لفت دیں گے؟“

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ

میں اسے کیا سمجھنے لگا ہوں۔ اس لیے جلدی سے بولی۔ ”آپ

کے غلط نہ سمجھیں۔ میں کوئی بھکارن یا فلرٹ نہیں ہوں۔



بعد میرا شکر یہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی اور میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ویسے اس لڑکی نے مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ وہ مہذب لڑکی تھی اور ساتھ ہی خوبصورت بھی تھی۔ راہ چلتے، کبھی کبھی ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو ایک طویل عرصے تک یاد رہتے ہیں، ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ دوبارہ مل سکیں۔

میری یہ خواہش حیرت انگیز طور پر تیسرے یا چوتھے دن ہی پوری ہو گئی۔ میں رکشا یا ٹیکسی کے لیے بس اسٹاپ پر تھا اور وہ شاید بس کے انتظار میں تھی۔

ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔ آج آپ کو کس طرف جانا ہے؟“ ”اوہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”کہیں جانا تو ہے لیکن آپ کو زحمت نہیں دوں گی۔ ابھی میری بس آ جائے گی۔“

اسی دوران ایک رکشا ہمارے قریب آ کر رک گیا۔ میں نے اس رکشے والے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی نوجوان رکشے والا تھا جو اس دن تھا جب اس لڑکی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

ویسے یہ خوش آئند بات تھی کہ آج کل نوجوانوں نے یہ شعبہ سنبھال لیا تھا۔ بہت سے بڑے لکھے نوجوان رکشا یا ٹیکسی چلاتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے اور یہ بہت مثبت رویہ تھا۔

میں نے اس لڑکی سے کہا ”پلیز بیٹھ جائیں۔“ ”پتا نہیں۔ آپ کس طرف جارہے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”میں تو اس طرف جاؤں گا، جس طرف آپ کو جانا ہے۔“

پھر آپ کو اتار کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔“ ”اوہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”مجھے تو صدر کی طرف جانا ہے۔“ ”یہ اتفاق ہے کہ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی اور رکشا چل پڑا۔ دوران سفر اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے اپنا نام صائمہ بتایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اب جاب ڈھونڈنے کے مرحلے میں تھی۔

وہ ایک زندہ دل لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اچھے فکروں کا استعمال کہاں کرنا ہے۔

صدر آ کر میں نے اس سے درخواست کی۔ ”اگر برائے سمجھو تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لو۔“ ”ٹھیک ہے۔“

میں نے رکشے والے کو فارغ کرنا چاہا لیکن وہ جلدی سے بولا ”جناب۔ آپ لوگ ہو کر آ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

رکشے والے نے یہ اچھی سہولت دے دی تھی، ورنہ صدر میں کبھی رکشا تلاش کرنا عذاب بن جاتا ہے۔ ہم دونوں ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔

ہمارے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت کم اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ بہت کچھ میں نے بتایا۔ گفتگو اسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اسی طرح ملاقاتیں ہوا کرتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں۔

اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اگرچہ میرے علاقے سے کچھ فاصلے پر رہتی ہے لیکن وہ روز اپنی بہن کے پاس میرے علاقے میں آیا کرتی تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام شایان ہے اور میں ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہوں۔ اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا ہوں کیونکہ گھر والے لاہور میں رہتے ہیں۔

ادھر ادھر کی باتوں کے دوران میں اس نے کہا۔ ”شایان صاحب۔ آج میرا موڈ سمندر کی طرف جانے کا ہو رہا ہے۔“

”خیریت؟“ ”جانے کیوں۔ میں ہفتے میں ایک بار سمندر کی طرف ضرور جاتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت دیر تک بیٹھ کر سمندر کو دیکھتی رہتی ہوں۔ اس سے میرے اندر ایک ٹھہراؤ، ایک سکون سا پیدا ہو جاتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔ سمندر اسی طرح اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور کون ہوتا ہے تمہارے ساتھ؟“

”کوئی نہیں۔ صرف میں اور میرے احساسات ہوتے ہیں۔“ ”لیکن آج تم اکیلی نہیں ہوگی بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”تو پھر چلیں؟“

رکشے والا ہمارے انتظار میں تھا۔ ہم اس کے رکشے پر سمندر کی طرف آ گئے۔ یہاں بھی رکشے والا ہمارے لیے کھڑا رہا بلکہ میں نے اسے خود رکنے کے لیے کہا ورنہ ساحل پر کسی سواری کا ملنا خواب سے کم نہیں ہوتا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ میں نے دفتر والوں کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں دفتر نہیں آ سکوں گا۔

ہماری واپسی دوپہر کو ہوئی تھی۔ میں اسے اس کے گھرا تار کر اپنے گھر آ گیا تھا۔ رکشے والے نے مروتا ایک ہزار روپے لیے تھے حالانکہ بے چارہ بہت دیر تک میرے ساتھ رہا تھا۔

دو دنوں کے بعد صائمہ کا فون آ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے موبائل نمبرز دے دیے تھے۔ اس کا موڈ بہت تفریح کا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا ”میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟“

”ضرور بتاؤ۔“ ”اس وقت بھی وہی رکشے والا میرے ساتھ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کو لے لو۔“ اس نے بتایا کہ میں بس اسٹاپ پر آ جاؤں گی۔ میں اس کی بات سن کر خوش ہو گیا۔ اب وہ لڑکی میرے دل کو بھانے لگی تھی۔

میں نے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ”میری کوشش تھی کہ میں اس کی کسی بات کو نہ دلوں۔ اسی لیے میں نے جلدی سے اپنے دفتر فون کیا کہ میں نہیں آ سکوں گا پھر جیب میں کچھ پیسے رکھ کر بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی آ گئی تھی۔ وہ اسی رکشے پر تھی۔ رکشے والا مجھے پہچان کر مسکرایا۔ وہ ایک طرح سے ہمارا راز دار بننا جا رہا تھا۔

اس دن بھی ہم نے پورے شہر کی سیر کی۔ سمندر، پھر ہوٹل اور جانے کہاں کہاں۔ اس دن بھی میں نے رکشے والے کو آٹھ سو روپے دیے تھے۔ کچھ بھی ہو، میں اپنی جگہ بہت مطمئن تھا۔

صائمہ کی صورت میں ایک اچھی لڑکی، اچھی محبت بن کر میری زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے ایک دن صائمہ سے محبت کا اظہار کر دیا۔ میری محبت کے اظہار کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ یقین کریں گے کہ میں بھی آپ سے بہت متاثر ہوں؟“

”صرف متاثر؟“ ”نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ میں ہنس پڑا۔ ”اب بتاؤ۔ تمہیں کیا کام دیا جائے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میرا تو صرف ایک ہی شوق ہے۔ پورے شہر کی سیر کرنا۔“ ”تو چلو۔ اسی خوشی میں پھر پورے شہر کی سیر کرتے ہیں۔“ پھر سیر شروع ہو گئی۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ، پھر تیسری جگہ۔ اس کے ساتھ خود اپنا شہر بھی بالکل نیا نیا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم سزا گرا چھا ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔

اس شام رکشے والے کے پندرہ سو روپے پنے تھے لیکن صائمہ کی خوشی کے لیے ان پیسوں کی کیا حیثیت تھی اور ایک دن یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

میں صائمہ کے ساتھ ایک مارکیٹ سے شاپنگ کر کے باہر نکلا تھا کہ ایک دوست نے مجھے آواز دی۔ ”ارے شایان صاحب۔ کیا حال ہیں؟“

پھر وہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک عجیب بات ہوئی کہ صائمہ نے اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے سامنے کھڑے ہوئے رکشے کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے مجھ سے کچھ کہا بھی نہیں تھا جبکہ میں اسے آواز دیتا رہ گیا۔ ”ارے بھائی! کیوں آواز دے رہے ہو؟ وہ تو گئی۔“

میرے دوست نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو گئی۔ صائمہ نام ہے نا اس کا؟“ ”ہاں۔ لیکن تم کیسے جانتے ہو؟“

”اس لیے کہ یہ سب ڈراما میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نہیں سمجھا کیسا ڈراما؟“

”یہی، رکشے پر سیر کرنے کا ڈراما۔“ اس نے کہا۔ ”یہ دونوں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔“ ”کیا؟“

”ہاں بھائی! مجھے بھی یہ بات اتفاق سے بتا چلی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”رکشے والے کا نام امتیاز ہے۔ اب رکشے سے بہترین کمائی کا یہ طریقہ نکالا گیا ہے کہ لڑکی تم جیسوں کو پھانس کر سارا دن رکشے کی سیر کرتی رہتی ہے اور شام کو رکشے والے کو اچھے خاصے پیسے دلا دیتی ہے۔ کیوں، یہی ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔ یہی ہو رہا ہے۔“ میں مر جھائی ہوئی آواز میں بولا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد سے میں نے رکشے میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ اب یا تو بس میں سفر کرتا ہوں یا پیدل چلتا ہوں۔



# چار سمت ایک چوراہا

انجانے میں ہی سبھی مگر... بے سمت چلنے والوں کی بھی کوئی نہ کوئی سمت تو ہوتی ہی ہے، یہ اور بات کہ سفر کے اختتام پر ان کے حصے میں کیا آتا ہے... منزل یا پڑاؤ... بعض اوقات زندگی کسی چوراہے سے شروع ہو کر چوراہے پر ہی اکرتا ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بھی ایک ایسی جگہ سے ہوا جس کے گرد چار سمتیں پھیلی ہوئی تھیں اور... اتفاق سے ان کی تعداد بھی چار تھی۔ جانے وہ آپس میں دوست تھے یا جانی دشمن... مگر حیات کے فلسفے سے ان کا مقابلہ بڑا عجیب تھا... اور جب ان کی جھکی گردن میں تناٹو آیا اور مانگنے والے ہاتھ دنیا پر جھپٹ پڑے تو ہر مقام پر انقلاب سے ان کی شناسائی بڑھتی چلی گئی۔ پتھر لے رستوں کے انتخاب اور رجگوں کے عذاب نے ان کی خواہشوں اور خوابوں کو ایک الگ ہی رنگ ڈھنگ میں ڈھال دیا تھا۔ محبتوں سے چھیڑ چھاڑ... حالات سے مار دھاڑ اور... زندگی کا کاروبار کرتے ہوئے وہ انجانے منزلوں کی جانب رواں دواں تھے کہ اچانک ایک موڑ کاٹتے ہوئے ان کے پیروں تلے اسی چوراہے کی زمین پھیلی ہوئی ملی جو ان کے سفر کا نقطہ آغاز تھا مگر... اس آغاز اور اختتام کے درمیان گویا صدیوں کا فاصلہ حائل تھا... قدرت نے انہیں دوبارہ اس جگہ پر شاید اس لیے بھی پہنچا دیا تھا کہ یہاں ان کی زندگی کا اثاثہ دفن تھا۔

رشتوں کی بگڑتی صورت حال... جذبات کے بھونچال اور قدر کی لڑکھائی چالوں کا احوال





شام کے بڑھتے سایوں کے ساتھ ماحول میں ایک دل دوز اداسی کا تاثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سرنگوں کھڑے درختوں کے زرد پتوں سے گزرنے والی ہوا سسکیاں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ تھکا ہارا سورج آسمان کی ویرانی کو الواداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آخری بار قبر کی گہرائی میں دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی جانب اجازت طلب نظریں اٹھائیں۔۔۔ ان میں سے ایک نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ دوسرا آہستہ آہستہ جھکا اور قبر میں مٹی ڈالنے لگا۔ قبر کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص نے گھاس کا ایک خشک تنکا چبانا موقوف کیا اور مٹی ڈالنے والوں میں شامل ہو گیا۔ چوتھا ہنوز ناگلیں مضبوطی سے پھیلانے اور ہاتھوں کو سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ پہلے نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ ”تم بھی مٹی دے لو۔“

”ہاں۔۔۔ اس کے بعد ہم مل کے دعا کریں گے۔“ دوسرا بولا۔ چوتھے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ باقی تین کو دیکھتا رہا جو قبر کو مٹی سے بھرنے کے بعد زمین کو ہموار کر رہے تھے۔

”کچھ عرصے بعد قبر کا سراغ تک نہیں ملے گا۔“ چوتھے نے اچانک کہا۔

دوسرا بولا۔ ”ہاں۔۔۔ ہم خود بھی چاہیں تو اس مدفن کو تلاش نہ کر پائیں گے۔“

چوتھے نے خشکی سے کہا۔ ”آخر کیا ضرورت ہے ایسی باتیں کرنے کی۔ ایسا ہی ہے تو لگا دو یہاں کوئی کتبہ۔“

تیسرے نے خشکی سے کہا۔ ”یہ مطلب کسی کا نہیں تھا۔۔۔ کہ ہم میں سے کوئی یہ گڑے مردے اکھاڑنے آئے گا۔“

وہ چاروں نوجوان تھے۔ ان کی عمریں بائیس سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ ان سب نے جینز پہن رکھی تھی اور مختلف رنگ کی ٹی شرٹس جس پر عجیب و غریب الفاظ اور پیغامات کے پرنٹس تھے۔ صرف ایک کی سرخ ٹی شرٹ پر ”جی گویرا“ کے چہرے کا نقش تھا۔ وہ چاروں صحت مند، لمبے، چہروں سے بے فکرے اور لاابالی ہیر وٹائپ نظر آتے تھے اور ان کے درمیان بے غرض دوستی کا مضبوط رشتہ نظر آتا تھا۔

”اب ہم دعا کریں گے۔۔۔“ چوتھے نے چیونٹ تھوک دی اور باقی سب کے ہاتھ اٹھاتے ہی بولنے لگا۔ ”اے رب العالمین۔۔۔ ہماری اس غلطی کو معاف فرما۔“

”ہم ہرگز ناشکرے اور کفرانِ نعمت کرنے والے نہ تھے۔“ پہلا بولا۔ ”ہمارے ماں باپ کو صبر جمیل عطا کر۔“

تیسرا بولا۔ ”ہم نے ان کی امیدوں کا خون کیا۔ ان کے خوابوں کے محل سہار کر دیے۔ ہم ان کی توقعات پر پورے اترنے میں ناکام رہے۔“

”ہم ہرگز نالائق یا نااہل نہ تھے۔ ہم نے بہت محنت کی

اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے ہر امتحان پاس کیا۔ لیکن آج اپنی ڈگریوں کو دفن کرنے پر مجبور ہوئے۔“

”ہماری بد قسمتی صرف یہ تھی کہ ہم بے وسیلہ تھے۔ کوئی سفارش نہ رکھتے تھے اور نہ رشوت دینے کی استطاعت۔۔۔“

”ہم ہر جگہ کوشش کرتے رہے۔ ہمیں انٹرویو کے لیے بلوایا گیا تو فیل کر دیا گیا۔ ہم کب تک بے روزگاری کی ذلت اور فرسٹریشن جھیلتے۔“

”ہمیں مجبوراً یہ کرنا پڑا۔ ڈگریاں ہمارے لیے بارتھیں۔“

”اور آج کے بعد ہم جو کریں گے۔ مجبوری کے باعث کریں گے۔ ہمارے گناہ کو نظر یہ ضرورت کا جواز حاصل ہوگا۔“

چوتھے نے پھر خشکی دکھائی۔ ”ناؤ شٹ اپ۔۔۔ آل آف یو۔“ باقی تینوں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”لیکن ہم نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

”زبان سے نہیں کہا۔ لیکن تمہارے خیالات پڑھ سکتا ہوں میں۔ سن سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے تھے۔“ چوتھے نے کہا۔ ”فارموو۔۔۔ چلو۔“

وہ ایک پرانی فاکسی دیگن میں بیٹھ گئے جس کی چھت کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے پلٹ کے آخری بار اس جگہ کو دیکھا جہاں قبر تھی۔۔۔ وہ سب دل گرفتہ اور دنیا سے بے حد فراق تھے۔

اس قبر میں ان چاروں نے اپنی اپنی ڈگریاں دفن کی تھیں۔ ناکامی اور مایوسی کے ایک طویل، پر عذاب دور سے گزرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ڈگریوں کا مصرف کوئی نہیں۔

ایک کے بعد دوسری ہر یونیورسٹی سے ہر سسٹر کے بعد ڈگریاں لینے والوں کی نئی کھپ مارکیٹ میں فراہم ہو رہی تھی۔ اس مال کی طرح جو یکے بعد دیگرے مختلف ممالک سے بھیج کر بندرگاہ پر جمع ہوتا جا رہا ہو اور بحری جہازوں کی آمد کا سلسلہ روکنے کی کوئی صورت نہ ہو مگر مال کا خریدار ناپید ہو۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ انجینئر۔۔۔ ایم بی اے۔۔۔ ایم سی ایس۔۔۔ کراچی سے خیبر تک اور آزاد کشمیر تک سیکڑوں سرکاری، پرائیوٹ، ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کے جاب مارکیٹ پر یلغار کر رہے تھے۔

ان کے لیے مشکلات کے ساتھ خطرات بڑھ رہے تھے۔ فریش گریجویٹس کے مقابلے میں وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو سکتے تھے۔ ان کی نانچ پرانی ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ انٹرنیٹ سے خود کو اپ ڈیٹ کرتے تھے اور کسی طرح بھی نئی ڈگریوں کے ساتھ مقابلے پر آنے والوں سے کم تر نہ تھے۔ ان کے علم میں آیت کیس بھی تھے جن کو کسی کی سفارش نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

چار سمت ایک چوراہا

دیا۔ ”قصور اس بے وقوف کا ہے جو راستہ نہیں بدلتا۔“

حیدر نے پیڑ پر مکا مارا۔ ”راٹ۔۔۔ ہم بے وقوفوں کو بھی راستہ بدل دینا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ خاور نے سر کھجایا۔

”ہمیں کچھ اور کرنا چاہیے۔“ حیدر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وقار اور کمال ایک ساتھ ہنس پڑے۔ جیسے حیدر نے انہیں کوئی فریض ڈرتی جوک سنایا ہو۔

”میں اچھا شیف ہوں۔“ کمال بولا۔ ”اور حق حلال کی روزی جیسے بھی کمائی جائے۔۔۔ آدی کو اس پر فخر محسوس کرنا چاہیے۔ میں ریزمی پر بریانی بیچنے کے لیے تیار ہوں۔“

”لو کیوں کے لیے۔“ وقار نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ”اگر میں ایک بیوٹی پارلر کھول لوں۔۔۔“

”اپنی اپنی بکواس بند کرو۔ میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔“ حیدر نے متانت سے کہا۔ ”مجھے ایک سگریٹ دو۔۔۔ پھر میں بتاتا ہوں۔“

وقار نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کے سیدھی کی اور حیدر کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کی۔ ”آج کی شام کا آخری جام۔“

حیدر نے سگریٹ جلائی اور کسی عظیم مذہب کی طرح ایک لمبا کش لے کر دھوئیں کو اوپر چھوڑتے ہوئے بولا۔

”علامہ نے کیا فرمایا تھا میرے بچو۔۔۔ یاد کرو۔“

”کون سے علامہ نے۔۔۔ یہاں تو سارے ہی علامہ ہیں جو فرماتے رہتے ہیں۔“ وقار نے کہا۔

”ابے شاعر مشرق نے۔۔۔ جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی۔ اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو۔“

خاور پھر سر کھجائے لگا۔ ”یار کھیت کو آگ لگانے کی بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔“

”بے وقوف۔۔۔ ابو جہل۔۔۔ کھیت ہے یونیورسٹی۔۔۔ دہقان ہیں ہم۔۔۔ اور خوشہ گندم ہیں ہماری ڈگریاں۔“

خاور نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”او کے۔۔۔ او کے۔۔۔ مگر کسی یونیورسٹی کو جلانے سے کیا ہوگا۔“

کمال نے کہا۔ ”وہی ذمے دار ہیں ہمیں ایسی ڈگریاں دینے کے جن کو نہ دنیا میں کوئی پوچھتا ہے نہ پاکستان میں۔۔۔“

وقار نے سوچے ہوئے کہا۔ ”انقلاب بے شک ایسے ہی آتا ہے جب مایوسی کی انتہا کو پہنچنے والے گھبراؤ، جلاؤ، لوٹ مار اور توڑ پھوڑ پراتر آتے ہیں۔۔۔ مگر میرا خیال ہے

بہ صرف تین دن پہلے کی بات تھی جب وہ سخت مایوسی اور ناراضی کے جذبات سے بوجھل دل کے ساتھ کچا ہوئے۔ ناراض وہ سب سے تھے۔ اپنے ماں باپ سے جنہوں نے شیخ چلی کی طرح خواب دیکھتے ہوئے ان کو ڈاکٹر انجینئر، بزنس ایڈمنسٹریشن آف آئی ٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا، ان اداروں سے جنہوں نے ان کے ہاتھوں میں کامیابی کی اسناد تھما کے انہیں دنیا میں دھکے کھانے بھیج دیا۔ دھکے دینے والوں سے۔۔۔ اپنی تقدیر سے۔۔۔ اس نظام سے۔۔۔ ساری دنیا سے۔

”بس یار۔۔۔ سب بے کار ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ ہم نکلے، نااہل اور غیر ضروری ہیں۔“

حیدر نے کہا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔

”ذہن کا بوجھ۔۔۔ ماں باپ کے لیے باعث شرمندگی۔ خود اپنے لیے باعث ذلت۔ علم کا فضول بوجھ اٹھا کے بھٹکنے والے گدھے۔“ انجینئر وقار نے غصے سے کہا۔

”ڈگریوں والے احق۔۔۔ بد بخت اور بے کار انسان۔“

خاور نے جو ایم بی اے تھا، کہا۔ ”کاش ہم جاہل اور احق ہوتے۔ لوہر اور بگڑے ہوئے نوجوان ہوتے۔۔۔ مگر کسی وزیر، سفیر یا جنرل کی اولاد ہوتے جو ہمیں نقل کرا کے یا پیسا خرچ کر کے پاس کرا دیتا۔ انٹربی اے کی ڈگری خرید کے ہمیں کسی اونچی جگہ فٹ کر دیتا۔“

کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کی ڈگری لینے والے کمال نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”جو نہیں ہے اسے کیوں روتے ہو یارو۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ میرے ماں باپ نے کیا، سارے زمانے نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مستقبل میرا انتظار کر رہا ہے کیونکہ آنے والا وقت آئی ٹی کے انقلاب کا ہے۔ لیکن اب مجھے کسی بینک میں دس ہزار کی نوکری بھی آفر ہوتی ہے تو کنٹریکٹ پر۔ لعنت ہو ایسی قسمت پر۔۔۔“

وقار اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کاش ہم قسمت کو بدل سکتے۔“ حیدر نے برہمی سے کہا۔ ”یار! اسٹاپ دس۔۔۔ روز وہی باتیں۔۔۔ کیا حاصل قسمت کو اور دنیا کو کون سے۔ اس سے کچھ بدلے گا؟“

”پھر کیسے بدلے گا۔۔۔؟“ وقار نے ٹپکتے ہوئے کہا۔ ”آدمی اگر ایک ہی راستے پر چلتا جائے یہ جاننے کے بعد بھی کہ راستہ کسی منزل کی طرف نہیں لے جا رہا ہے تو قصور کس کا ہے؟ راستے کا۔۔۔ یا منزل کا؟“ حیدر نے سوال کیا۔

خاور نے سر ہلایا۔ ”گڈ۔۔۔ ویری گڈ پوائنٹ۔“

کمال نے جیسے سب کی طرف سے سوال کا جواب



”کر سکتے ہیں... بہت کچھ کر سکتے ہیں...“ حیدر نے حوصلہ افزا لہجہ میں کہا۔

کچھ دیر وہ اپنی اپنی سوچ میں غوطہ زن رہے۔ یہ غور کرتے رہے کہ وہ اکیلے یا سب مل کے کیا کر سکتے ہیں۔ کون سا کام ہے جو ان کے دن پھیر دے۔ ان کی سوئی تقدیر جگا دے۔ ان پر دولت کی دیوی کو مہربان کر دے... جو دنیا میں عیش کر رہے ہیں... ان کے پاس کیش کیسے آتا ہے؟ خاور نے چٹکی بجا کے کہا۔ ”یار ہم ڈاکا ڈالیں؟“

”ڈاکا ڈالیں...“ حیدر نے زیر لب تبسم کے ساتھ دہرایا۔

”ہاں، کسی بینک میں... ایک گروہ بنالیں۔“ خاور نے جوش کے ساتھ کہا۔ ”ہمارا لیڈر ہوگا تو... ہم تیرے پلان پر عمل کریں گے۔ اس کام کے لیے صرف گنز چاہیں۔“

کمال نے خفی سے کہا۔ ”مرنے کا حوصلہ بھی چاہیے بیٹے... سوچ اگر بینک کے گارڈ نے یا پولیس نے اچانک آ کے ہم سب کو اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا... تو ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا... کسی مردہ خانے میں ہماری خون آلود لاشیں دیکھ کر...“

وقار لرز گیا۔ ”نہیں یار... میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے مرنے سے... کفن... جنازہ... عذاب قبر... یہ سب اپنے لیے سوچ کے تو میری پتلون ڈھیلی ہو جاتی ہے۔“

”ڈھیلی یا گیلی...؟“ کمال نے کہا۔

”مجھے بھی اپنی زندگی بہت عزیز ہے... کیونکہ یہ بہت قیمتی ہے اور مجھے دوبارہ نہیں ملے گی... جو باہر نے کہا تھا... وہی ہے اپنا نظریہ...؟“

خاور نے کہا۔ ”کون باہر... وہ جس کی بہن کے ساتھ...“

حیدر نے پھر سر پکڑ لیا۔ ”ابے گاودی... باہر بادشاہ... ظہیر الدین باہر۔ خاندان مغلیہ کا بانی... وہ کہتا تھا... باہر پے عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔“

کمال نے طنز سے کہا۔ ”تجھ سے کہتا تھا؟ فارسی آتی ہے تجھے۔“

”مطلب یہ کہ عیش کرو عیش کیونکہ دنیا پھر نہیں ملے گی۔ لیکن میرے پیارے گدھو... عیش کے لیے کیش ہونا چاہیے... اور اس کے لیے ڈاکا نہیں ڈالنا چاہیے اور حرام موت نہیں مرنی چاہیے۔“

”پھر کیا کرنا چاہیے استاد محترم...؟“ وقار نے کہا۔

”ڈاکا ڈالیں...“ حیدر نے مضمر رہے۔

عزت، شہرت اور دولت۔ اسے ہمیشہ اپنی زندگی کے تیرہ برس رانگاں جانے کا دکھ رہا۔ دوسرے حوالہ ہے ایسے شخص کا جسے اچانک کمپنی کام سے فارغ کر دیا... گولڈن مینڈ شیک کے ساتھ اسے چونٹھ لاکھ روپے بھی دیے مگر وہ اتنا اداس تھا جیسے نوکری نہیں رہی تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اب وہ کیا کرے گا۔ کمپنی اس کے بغیر کیسے چلے گی۔“ حیدر ہنس پڑا۔

خاور نے سر ہلایا۔ ”تجربہ کار لوگ نہ رہیں تو نقصان ہوتا ہے۔“

”مائی فٹ... دنیا اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے... سورج نکلتا ڈوبتا نظر آتا ہے... گھڑی کی سوئیاں چلتی رہتی ہیں۔ دکان، فیکٹری، حکومت کا کاروبار... سب چلتے ہیں... جب قائد اعظم کا انتقال ہوا تو بدخواہوں نے کیا کیا تھا؟ اب پاکستان نہیں رہے گا۔ پاکستان ہے اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہے... ہے کہ نہیں!“

سامعین نے اعتراف میں سر کو اوپر سے نیچے حرکت دی۔

حیدر نے خطاب جاری رکھا۔ ”میرے اس دوست کو کسی نے مشورہ دیا کہ وہ چونٹھ لاکھ میں سے نصف کاروبار میں لگائے۔ ایک پلاٹ خریدے، اس پر مکان بنائے اور بیچ کر دوسرا شروع کر دے۔ نوکری پیشہ دوست کاروبار میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مشورہ دینے والے نے کہا کہ اس میں کون سا مسئلہ ہے... زمین بھی تمہاری مکان بھی بننے تک تمہارا... وہ مان گیا۔ صرف دس سال میں وہ بلڈر بن گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاؤسنگ پروجیکٹ اٹاؤنس کر دیا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ خدا نے اس کے اندر کاروبار کی کیسی زبردست صلاحیت رکھی تھی جس سے وہ بے خبر تھا۔ اب اسے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے تیل کمپنی میں تیس برس کیوں گنوائے۔“

حیدر کی خاموشی پر خاور نے کہا۔ ”ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں... بلڈر کیسے بن جائیں... چونٹھ لاکھ ہوتے میرے پاس تو میں سوچتا۔“

حیدر نے اس کے احقانہ سوال کو معاف کر دیا۔ ”برخوردار، نور چشم... الو کے پٹھے... غور کر... اپنے اندر جھانک... دیکھ خدا نے تیرے اندر کیا صلاحیت رکھی ہے... آزما کے دیکھ۔ ہو سکتا ہے تو ایم بی اے سے زیادہ بہت کچھ ہو...“

”کیا ہم سب مل کے کچھ نہیں کر سکتے...؟“ وقار نے

سوال کیا۔

برنس یا موروثی زمینداری۔ ہمارے پاس صرف ارادہ ہے، عقل ہے اور ہمت ہے۔“ وقار نے جیسے خود سے کہا۔ ”آخر میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میں انجینئر ہوں۔“

حیدر نے سگریٹ کا آخری کش لیا۔ ”پاگل کے بچے... آدمی بھول جاتا ہے اپنے باپ کو۔ حالانکہ اس کا نام ساری عمر لکھتا رہتا ہے۔ وقار احمد ولد افتخار احمد... بھول جاتا ہے کہ نہیں۔“

کمال نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ”میرا بھائی امریکا جا کے سب کو بھول گیا۔ باپ کے علاوہ ماں کو... بہنوں کو... مجھے... دس سال ہو گئے۔ ہم بھی بھول چکے ہیں اسے۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔“

”دنیا اسی کا نام ہے۔“ خاور نے اسے تسلی دی۔ ”بھول جاؤ اپنی ڈگریوں کو...“ حیدر نے جیسے حکم دیا۔ ”جیسے طارق نے اسپین میں کشتیاں جلا دی تھیں۔“

خاور نے کمال کی طرف دیکھا۔ ”طارق کون؟“

”یار بہت لوگ اسپین چارے ہیں۔ ترکی اور یونان کے راستے... طارق بھی کسی کشتی میں گیا ہوگا۔“ کمال نے کہا۔

وقار نے کہا۔ ”حیدر کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ ہم اسے نہیں جانتے۔“

حیدر نے پھر اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”جہالت کے نمونو... میں طارق بن زیاد کا حوالہ دے رہا تھا جس نے اسپین فتح کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ کشتیاں جلا دو تاکہ واپسی کی امید اور امکان ہی نہ رہے۔ ہم باریں گے یا مر جائیں گے۔ تم بھی جلا دو ان ڈگریوں کو جو تمہیں جھوٹی آس پر زندہ رکھتی ہیں۔ بار بار ناکامی کی ذلت اور فرسٹریشن دیتی ہیں۔ یہ تمہاری دوست نہیں... دشمن ہیں۔“ حیدر ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک فلاسفر، سوشل ریفارمر بہت کچھ تھا۔

خاور متفکر ہو گیا۔ ”پہلے سوچ لو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

حیدر نے کہا۔ ”مثالیں بہت ہیں۔ لیکن میں صرف دو کا حوالہ دوں گا... میرا ایک دوست زمانہ طالب علمی میں رائٹر تھا... مگر رائٹر شاعری یا افنڈ نگاری سے صرف نام کھاتا تھا۔ نان کا مسئلہ اس کی نیپلی کے لیے بھی ہوتا تھا چنانچہ وہ کلر کی کرتا تھا۔ تیرہ سال بعد اسے پھر موقع ملا کہ وہ کھانا کھانے کا اس نے کلر کی جھوٹی ڈاکو کے سب کھایا۔“

کسی انقلاب میں یونیورسٹیوں کو آگ نہیں لگائی گئی...“ حیدر نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”جاہلو... بڑی غلطی کی میں نے تمہارے سامنے شعر پڑھ کے... میرا مطلب تھا... ہم جیسے لاکھوں نوجوانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا ڈگریوں کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے...؟ باعزت اور خوشحال زندگی کا ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں...؟“

کمال نے اعتراف کیا... ”راستے یقیناً ہوں گے لیکن ہم نے چوبیس پچیس سال جھک ماری ہے...“ وقار گرم ہو گیا۔ ”تو نے ماری ہوگی جھک... میں نے بہت محنت کی تھی، نیک نیتی کے ساتھ۔ دن رات ایک کر دیا تھا۔“

خاور نے اس کا ساتھ دیا۔ ”میں نے بھی...“ کمال نے غرا کے کہا۔ ”آپ کو اس مت فرمائیں۔ ہم سب جانتے ہیں آپ کی ڈگری کی حقیقت کو۔ نقل باز سبنا۔“

خاور دھیمپا پڑ گیا۔ ”یار... بس ایک دن مدد لی تھی اور اس دن کیا ہوا تھا تم جانتے ہو۔“

”ہاں... تیری محبوبہ کا دلیمہ ہوا تھا۔“ وہ سب بولے۔

حیدر نے کہا۔ ”میرے پیارے دوستو... عزیز ہم وطنو... آج میں آپ سے ایک اہم قومی مسئلے پر بات کروں گا۔“

”کیا یہ تقریر براہ راست کسی مواصلاتی رابطے پر دکھائی جا رہی ہے؟“ وقار بولا۔

”مذاق کی بات نہیں۔ اب ہمیں واقعی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ کامیابی کا متبادل راستہ کون سا ہے۔ آخر صرف ڈاکٹر، انجینئر۔ ایم بی اے یا ایم سی ایس تو نہیں ہیں جو کروڑ پتی، ارب پتی ہیں۔ بڑی بڑی کوشیوں میں رہتے ہیں اور بی ایم ڈبلیو جیسی گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔ شاید ان میں سے نوے فیصد ایسی کوئی ڈگری نہیں رکھتے۔“

”بلکہ کوئی ڈگری نہیں رکھتے...“ وقار نے کہا۔

”شاید میٹرک پاس ہوں گے...“ کمال بولا۔

”نوے فیصد نہیں... پچانوے فیصد...“ خاور نے کہا۔

”رائٹ... دنیا میں عزت، دولت، شہرت کی منزل پانے والوں کے پاس کوئی تعلیمی سند نہیں تھی۔“

”مثلاً ایڈن...“ خاور بولا۔

”آج اگر ہم بھی یہ بھول جائیں کہ ہمارے پاس کوئی ڈگری ہے۔ پھر فرض کر لیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ نہ اعلیٰ تعلیم۔ نہ سفارش۔ نہ رشوت کے لیے مال۔ نہ باپ کا



”فراڈ...!“ کمال نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں... جو سب کر رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس۔ ہر جگہ ہر وقت... لیڈر... بلڈر... انجینئر اور ڈاکٹر... تاجر اور صنعتکار... امپورٹر اور ایکسپورٹر... استاد اور طالب علم... ذرا مجھے بتاؤ فراڈ کہاں نہیں ہو رہا ہے... اور پکڑا کون جا رہا ہے؟ مال کون سیٹ رہا ہے... دیواری اہل قلم، اور عامل سے عالم تک... بیچنے والے سے خریدار تک... اسرائیل سے کشمیر تک... کورٹ سے اقوام متحدہ تک۔“

وہ سارے چپ اور مسکور سے بیٹھے رہے۔ ایک ہی مسئلے پر غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ حقائق کے اور امکانات کے علاوہ اور ان گنت پہلو یوں ان کے سامنے آتے رہے جیسے گلیڈ اسکوپ کی حرکت سے اندر شیشوں کے ٹکڑے متحرک ہوتے ہیں تو مسکور کن اور نئے نئے پیٹرن سامنے آتے ہیں یا آتش بازی میں ایک انار بلندی پر جا کے پھٹتا ہے تو تاریک آسمان میں سیکڑوں ہزاروں رنگین ستارے روشن ہو جاتے ہیں۔

بالآخر انہوں نے سوال کیا۔ ”ہم کیا فراڈ کریں اے عظیم لیڈر... ہماری رہنمائی فرما۔ ہم تیری عقل و دانش کا اعتراف کرتے ہیں۔“

”اور تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔“ گریٹ لیڈر... کہ جس کا ترجمہ قائد اعظم ہرگز نہیں کیا جاسکتا... سب پر شفقت کی نظر کی... ڈاکٹر سے زیادہ وہ ایک دانش ور تھا۔ کورس کی سب کتابیں اس نے بہ امر مجبوری پڑھ لی تھیں اور امتحان میں پڑھا ہوا ایسے لکھ دیا تھا جیسے تے کرنے والا وہی اگتا ہے جو لگتا ہے... لیکن اس سے سو گنا، ہزار گنا ادھر ادھر کی کتابیں اس نے بڑے شوق سے چالی تھیں۔ تاریخ، فلسفہ، ادب۔ چنانچہ ہم جماعتوں، ہم عصروں، ہم زادوں اور ہم زادوں نے اس کو افلاطون کا خطاب دیا تھا۔

افلاطون نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ ”اپنے چار اطراف میں تم کیا دیکھتے ہو؟“

شاگردوں نے کہا۔ ”دھوکا، فریب، غبن، لوٹ مار، فراڈ اور کرپشن، ہر جگہ میں، ہر کاروبار میں... ہر جگہ۔“

”اور یہ کون لوگ کر رہے ہیں... کیا یہ سب وہ کر رہے ہیں جو ان پڑھ اور احمق ہیں... جن کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں۔“

شاگردوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ سب ذہین و فطین لوگ کر رہے ہیں استاد محترم۔“

”ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اگر تمہارے وجود کے اس حصے میں...“ افلاطون نے سر کو انگلی سے بجایا۔ ”عقل و ذہانت ہے... تو سمجھو تم خوش قسمت ہو... پیدا کنی طور پر۔ اب آگے رہ جاتا ہے صرف اس کا استعمال۔ اگر تم عقل کو استعمال کرنے کی عقل بھی رکھتے ہو تو سمجھو کامیابی تمہارے ارادے کی غلام ہے۔ تم ہانکنے والے ہو... جو ایک دو فیصد ہوتے ہیں... یا شاید اس سے بھی کم۔ باقی سارے ہانکے جاتے ہیں، استعمال ہوتے ہیں... اور ایسے ہی خرچ ہو جاتے ہیں جیسے بارود ہے یا کلاشکوف کی گولیاں... کیا میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہیں؟“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”ہم وہی کریں گے جو تو کہے گا عظیم رہنما۔“

”اچھا... تو سب سے پہلے اپنی ڈگریاں جلا دو... لیکن ٹھہرو... جلانا ایک تکلیف دہ عمل ہے... پتا نہیں چتا پر لینے باب یا بیٹے یا ماں کو خود اپنے ہی کیسے آگ لگاتے ہیں۔ ہم تدفین کو سکون سے برداشت کرتے ہیں... عزت اور احترام سے مردے کو زمین کے سپرد کر دیتے ہیں... آگے زمین اس کے ساتھ جو چاہے کرے... ہم دیکھتے کچھ نہیں... تو دوستو... ساتھیو... ہم اپنی ڈگریاں دفن کریں گے۔“

”اور اس قبر پر فاتحہ بھی پڑھیں گے... ہر جمعرات۔“

”قبر پر چراغ روشن کریں گے... ہر پیر۔“

”چادر چڑھائیں گے... ہر سال۔“

”شٹ اپ... شٹ اپ... اینڈ شٹ اپ...“

حیدر نے دھاڑ کے کہا۔ ”ہم یہ سب ہرگز نہیں کریں گے۔ ہم ڈگریوں کو دفنائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔“

اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پہلی سمت:

اس سے سامنے ایک سرسبز جنگل تھا جس کا سارا فرش گرین کارپٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ قالین کے نیچے زمین ناہموار تھی۔ لہروں کی صورت میں کہیں اس کی بلندی بڑھتے بڑھتے نشیب میں ڈھلنے لگتی تھی، بھی دائیں جانب تو بھی بائیں جانب۔ یہ چھوٹے بڑے ٹیلے دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان میں آگے ہوئے چیز اور پوکھلیس کے بلند و بالا درخت تھے جو بارش میں اپنی مہکار چھوڑتے تھے۔

چار سمت ایک چوراہا

پہلے وہ خود رو پھول جمع کرتا گیا۔ ان کے ان گنت رنگ تھے اور انداز تھے۔ کہیں یہ بالکل نئے نئے تھے۔ چنے کی دال کے دانے سے بھی چھوٹے۔ تو ان کے ساتھ سورج کبھی کے ایک بالشت سے بھی چوڑے دھوپ میں جگمگاتے زرد پھول تھے... وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ہر پھول کے ساتھ پتیوں کی بناوٹ پر غور کر کے حیران ہوتا رہا۔

اچانک اس کی توجہ پرندوں یا کیڑے مکوڑوں کی طرف ہو جاتی تھی جو ہر جگہ پھدک رہے تھے یا اپنی مختصر چچی پرواز سے پودوں کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ایک ٹپ کی پیچھے وہ نہ جانے کدھر نکل گیا... اچانک اس کے سامنے وہ مصروف سڑک آگئی جو اسلام آباد ہائی وے کہلاتی تھی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی دور غلط سمت میں نکل آیا ہے۔

حسب توقع شام کے لیکچر کا دیباچہ ماں نے شروع کیا۔ ”آگے ہو لوٹ کے گھر بیٹا... اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے مجھے۔“

”وہ... ماما... وقت کا خیال ہی نہیں رہا مجھے...“ اس نے منمننا کے کہا۔

”ہاں... گھڑی جو تمہارے ہاتھ پر بندھی ہے، اتنی قیمتی... وہ تو وقت بتاتی ہی نہیں۔“ ماں نے طنز سے کہا۔

”آئی ایم سوری ماما۔“

”مجھے سوری کہنے سے کیا ہوگا۔ اپنے بابا کو کیا کہو گے۔ معلوم ہے وہ کتنا غصہ کر گئے ہیں۔ ایک گھنٹے تمہارا انتظار کرتے رہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے...؟“

اس نے زیر لب دہرایا۔ ”مسئلہ... یہ تو مجھے بھی سمجھ نہیں آتا... آخر بابا کا مسئلہ کیا ہے۔“

”کیا...؟“ ماما کا منہ دکھ اور حیرانی سے کھلا رہ گیا۔ ”حیدر... کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔“

وہ چونکا۔ ”مطلب کچھ نہیں ماما... سارا جھگڑا تو مطلب کا ہے۔“

”حیدر... تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ماما نے بگڑ کے پوچھا۔

”نہیں ماما... بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ... کچھ نہ سمجھتا تھا کہ کوئی۔“ حیدر بولا اور پلٹ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

باب نے شام کو سخت تشویش کا اظہار کیا۔ ”غالب کا شعر پڑھا اس نے تمہارے سوال کے جواب میں... تمہیں کیسے معلوم۔“

”کیا مطلب... میں نے تازہ کرنے میں...“

”آپ بھی حد کرتے ہیں... میں نے اردو میں ایم اے کیا تھا اور پھر یہ شعر تو میٹرک کے اردو نصاب میں ہے۔“ ڈاکٹر سجاد علی شاہ بہ دستور متکبر رہے۔ ”اور تم نے خود دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دیوان غالب تھا۔ آخر یہ لڑکا کدھر جا رہا ہے...؟“

”دیوان غالب کسی کو ڈاکٹر بننے سے روکتا نہیں۔“

”کمال کرتی ہوتا جو... اگر ابھی سے وہ اس شعر و شاعری اور ادب وغیرہ کے چکر میں پڑ گیا تو سمجھو کیا کام سے۔“ سجاد نے چائے کا گگ دھڑ سے میز پر رکھا۔

”آخر ایسا کیوں سمجھتے ہیں آپ کہ دنیا میں صرف ڈاکٹری ایک پیشہ ہے... اور ادیب، شاعر، افسانہ نگار... ان کو تعلیم یافتہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔“

”دیکھو... دیکھو... تم نے پھر وہی پرانی بحث چھیڑ دی۔ اب تم نام لوگی فیض کا اور اقبال کا۔ اور کون ہیں وہ... قاضی صاحب... پاکستان میں کتنے ہیں فیض اور اقبال۔“

تاجور نے آہ بھری۔ ”اب آپ کو معلوم ہی نہیں تو میں کیا کہوں۔“

”معلوم کیسے نہیں۔ علامہ اقبال کا مکان دیکھا ہے میں نے۔ سیالکوٹ والا بھی اور گڑھی شاہو والا بھی۔ کون سی جامد ادھوڑی انہوں نے اولاد کے لیے۔ بیٹے نوکری نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اور فیض... کتنی بار تو جیل گئے... ملک سے فرار ہوئے... ہجروں کی طرح۔“

”آپ کے نزدیک ڈاکو اور منشیات فروش زیادہ عزت دار ہیں کیونکہ ان کے پاس زیادہ دولت ہے۔“ وہ نفی سے بولی۔

”تاجور... خالی عزت آج کل پیٹ نہیں بھرتی۔ میں نے دیکھا ہے بڑے نام والے شاعروں ادیبوں کو، بس میں لنگ کرتی وی اسٹیشن جاتے۔ جہاں کسی مشاعرے میں ہر شعر پر ہونے والی واہ، واہ، تو کیمبر اساری دنیا کو دکھا دیتا ہے۔ بعد میں انہیں آدمی رات کو حقیر سی رقم کا چیک سنبھال کر جوتیاں چمکاتے گھر جاتے کوئی نہیں دیکھتا۔ یہاں گلی میں دس شاعر اور بیس ادیب پڑے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا انہیں۔“

”یہ تو خیر ٹھیک ہے... مگر حیدر کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جاسکتی۔“

”کی جاسکتی ہے... ایک بچے کو کیا معلوم اس کا فائدہ کس میں ہے... وہ تباہی کے راستے پر جا رہا ہو...“

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے

تاجور نے تازہ کرنے میں... ”کیا مطلب... میں نے



کچھ دن میں معاملہ دب جائے گا۔

”کیسے دب جائے گا۔“

”سرم... میں خوب جانتا ہوں ایسے صحافیوں کو... کتا

آخر کیوں بھونکتا ہے... اس کے سامنے ہڈی ڈال دو...

بھونکتا بھول جائے گا... اس صحافی کے ناجائز نطفے سے میں

بات کر لوں گا... وہ خود تر دید شائع نہ کرائے تو آپ میرا نام

بدل دیتا۔ یہ سارے بلیک میل ہیں۔ سب کی ایک قیمت

ہے... اگر یہ کچھ زیادہ لے گا... دے دیں گے۔“

لیکن شاہ جی کی بد قسمتی کہ اسی دن اخبار کی خبر پر خود

سپریم کورٹ نے ”سوموٹو“ ایکشن لے لیا اور اعلیٰ حکام کو

عدالت میں طلب کر لیا گیا۔ شاہ جی کی گرفتاری تاگزیر تھی،

تاہم وہ گھبراہٹا ہوا نہیں تھا۔ ڈی جی اور محکمے کے سیکریٹری نے

مذموم کو عدالت عالیہ میں پیش کیا اور تفتیش کے بعد رپورٹ

کے لیے مہلت مانگی لیکن یہ معاملہ قانونی الٹ پھیر کا نہیں

تھا۔ عدالت عالیہ نے صرف دو دن دیے۔

مذموم کو تفتیش کے لیے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

تھانے میں شاہ جی کے ساتھ تمام کارروائی قانون کے

مطابق ہوئی۔ تمام ثبوت اس صحافی نے عدالت کے سامنے

رکھ دیے تھے۔ شاہ جی کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اسے سات سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ دیگر شریک جرم

لوگوں میں سے کوئی سال بھر کے لیے اندر ہوا تو کوئی چھ مہینے

کے لیے۔ اس کے افسر اعلیٰ کو برطرفی کی سزا ملی۔

گرفتاری کے بعد شاہ جی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا

تھا اور اسے یقین تھا کہ بڑے وکیل ہوں گے تو اسے تمام

الزامات کی دلدل سے یوں نکال لیں گے جیسے مکھن سے

پال نکالتے ہیں۔ تھانے میں تفتیش کے دوران بھی اس پر وہ

تختی نہیں ہوئی جو عام طور پر روارکھی جاتی ہے۔ تھانہ انچارج

ہو شیار آدمی تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کیس میں شاہ جی کا

اندر ہو جانا یقینی ہے چنانچہ اس سے جو لینا ہے آج لے لو۔

شاہ جی نے دو بڑے وکیل کے جن کا بڑا نام تھا۔ ان

کی فیس سن کے اسے پسینا آ گیا تھا لیکن اس نے یہ سوچ کر

ادا کر دی کہ رہائی کے بعد مجھے پھر بحال کیا جائے گا تو سال

دو سال میں سارا خسارہ پورا ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا تو

زندگی میں پہلی بار شاہ جی کی نیند، بھوک اڑ گئی اور مستقبل اس

کے سامنے ایک اندھے تاریک غار کی طرح آیا جس میں وہ

گرچکا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی

درخواست سے اسے مزید نقصان ہوا۔ اس کی وہ دولت جسے

وہ قارون کے خزانے سے زیادہ سمجھتا تھا ناقابل اعتبار حد

نہ اسٹیکل کر دینے والے وزیر ہوتے ہیں۔“

صوفی بڑا بھائی تھا اور ایسی کوئی دلیل اس کے ایمان کو

کمزور نہیں کر سکتی تھی۔ ”اللہ تجھے ہدایت ہے... برا وقت

کہہ کے نہیں آتا شاہ جی۔“

سجاد علی کو آج اپنا باپ یاد آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہاتھی کے لیے مشہور ہے کہ اسے اور کوئی چاہے نہ

گر اپائے مگر ایک چوٹی گرا دیتی ہے۔

شاہ جی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اپنی دانست میں

اس نے ایک ایسے ضرورت مند کو پھانسا تھا جس سے لمبی رقم

اٹھنی جاسکتی تھی۔ وہ شکل سے بھی بہت مصیبت زدہ، رنجور

اور بے کس لگتا تھا۔ انتہائی بے وقوف اور بے ضرر۔ اس نے

شاہ جی سے کام کرانے کے لیے اس کی ہر بات مانی۔ ہر کام

کے پیسے دیے۔ وہ کچھ جھکی ضرور تھا۔ سوال بہت کرتا تھا اور

گھبراتا بہت تھا۔ شاہ جی ایسے تو نہیں ہو جائے گا... ویسے تو

نہیں ہو جائے گا... پیسے دینے کے لیے بھی اس کو کبھی کہیں

بلاتا تھا کبھی کہیں... اس نے بڑی اچھی ایکٹنگ کی اور شاہ

جی کو پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ وہ ایک صحافی ہے اور بڑی

خاموشی سے سارے ثبوت اکٹھے کرتا جا رہا ہے۔ اس نے

ساری گفتگو ریکارڈ کی اور سارے سودے کی فلم بھی بنالی پھر

اس نے پوری اسٹوری اخبار میں چھاپ دی۔

شاہ جی نے دفتر جا کے اخبار دیکھا جب اس کے افسر

اعلیٰ نے اسے اپنے کمرے میں بلا کے کہا۔ ”شاہ

جی... مروادیا نا ہمیں کچھ۔“

”کیا ہو گیا سرم...“ اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان

سے کہا۔

”یہ دیکھو۔“ افسر اعلیٰ نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کے اخبار پڑھا اور پریشان بھی

ہوا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ ”ماں کا

یار... استادوں کے ساتھ استادی کر گیا... مگر فکر کی کوئی

بات نہیں۔“

”شاہ جی۔ میرے پاس ڈی جی صاحب کا فون

آچکا ہے۔ فکر مند تھے کہ سیکریٹری نے پوچھا تو کیا جواب

دیں گے۔“

شاہ جی نے اخبار رکھ دیا۔ ”آپ یوں کریں سرم...

میری معطلی کے احکامات جاری کر دیں۔ اور ڈی جی

صاحب سے کہیں وزیر صاحب کے پریس سیکریٹری کو

بتا دیں۔ ڈی جی صاحب چاہیں تو ایک انکوائری بٹھا دیں۔

پالی لے کر کھڑا نظر آتا تھا اور ہر ایک سے اس کی روزگاری

فلوچ ہو جاتی تھی کیونکہ اسے پانی لانے میں دیر ہوتی تھی تو

وہ دیر سے آفس پہنچتا تھا جہاں وہ ایک معمولی کلرک تھا جسے

ہر افسر بے عزت کر سکتا تھا۔

کلرک تو سجاد علی کا اپنا باپ بھی تھا لیکن اس کا محکمہ

انتہائی زرخیز اور سجاد کا باپ پیدا گیری میں بہت بڑا فنکار

تھا۔ ویسے تو لنگا میں جو تھا سو باون گز کا... اپنی اپنی نیت،

ہمت اور قسمت کے مطابق سب ہی مال بنانے میں مصروف

تھے مگر شکار کو تارنے... پھانسنے اور پیسا پیسا نچوڑنے کے

فن میں اس کا ذہن کسی جینٹلمن کی طرح کام کرتا تھا۔

شاہ جی بہت پریکٹیکل آدمی تھا۔ کبھی اس کا بڑا بھائی جو

آغاز شباب سے ہی مذہبی رجحان رکھنے کے باعث صوفی مشہور

ہو گیا تھا اسے سمجھانا یا انجام سے ڈراتا تھا تو وہ اس کا تمسخر اڑاتا

اور لٹا اسے یہ سمجھانے لگتا کہ اس کی سوچ کتنی غلط ہے۔ ”صوفی

صاحب... کام میں نہیں کروں گا تو کوئی اور کرے گا۔ میرے

حصے کا مال کوئی اور سمیٹ کر لے جائے گا۔“

”پکڑا بھی تو وہی جائے گا شاہ جی...“

”رہنے دو بھائی... پکڑا وہ جاتا ہے جو اکیلا کھانے

کی کوشش کرے۔ مل بانٹ کر کھانے والے سب ایک

دوسرے کو بچاتے ہیں۔ پنجابی میں کہتے ہیں نا... ککھ دی

چوری تے ککھ دی چوری برابر... ایک پیسا چرانے والے کو

عمر قید ہو جاتی ہے... بلکہ کرا دی جاتی ہے... ایک لاکھ کی

ڈکیتی کرنے والا صاف بچ جاتا ہے... پوچھو کیسے...“

صوفی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”یہ بھی تم ہی بتا دو۔“

”رشوت دے کر صوفی صاحب اور کیسے۔ وہ کسی

شاعر نے کہا ہے نا... لے کے رشوت چھنٹ گیا ہے، دے

کے رشوت چھوٹ جا۔ ایک روپیہ چرانے والا کیا خاک

رشوت دے گا۔ جس کے پاس ایک لاکھ ہوں، وہ دے دے سکتا

ہے... چور سے ڈا کو بھلا۔“

”لاحول ولا قوۃ... حرام کھانے میں کیا مقابلہ اور

کیسی بڑائی۔“

”میرے بھائی... کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟ یہاں کیا

ہور رہا ہے... اربوں کا قرض لینے والوں کے قرضے سحاف

ہو جاتے ہیں۔ جو تمہارے جیسا کلرک اپنے اور بیوی بچوں

کے سر چھپانے کے لیے حکومت سے تھوڑا سا قرض لے لے اور

اردو ادب میں ایم اے کیا تو میں تباہ ہو گئی۔“

”تمہاری اور بات ہے... تم عورت ہو۔ صرف

شوق کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہو۔ تمہیں کسی فیملی کو سپورٹ

نہیں کرنا ہے۔ تم ستارہ بجاؤ... مصوری کرو... شاعری

لکھو... تم سارے شوق افروز کر سکتی ہو کیونکہ تم سبز سجاد علی

شاہ ہو۔ بے شک میں کوئی بہت بڑا اسپیشلسٹ نہیں بن سکا

اپنے بھائیوں کی طرح... لیکن ڈاکٹر تو ہوں... اور اچھا

خاصا کما لیتا ہوں...“

”واہ... بیوی کو اجازت ہے... لیکن بیٹے کو اپنا کوئی

شوق پورا کرنے کی اجازت نہیں۔“ اس نے جی سے کہا۔

”ابھی نہیں... اسے پہلے باپ کی طرح بلکہ باپ

سے بھی بڑا سرجن بننا ہے... بیٹے ہی باپ کے نام کو آگے

لے جاتے ہیں۔“

”اور وہ اتنا بڑا ادیب بن جائے کہ لوگ آپ کو اس

کے نام سے جانیں... یہ آپ کو منظور نہیں۔“

”تا جو تمہاری یہی عادتیں اسے شہ دے رہی ہیں۔

بگاڑ رہی ہیں۔ تم میرے ارادوں کی راہ میں حائل ہونے لگی

ہو۔ اس کی اجازت میں ہر گز نہیں دوں گا...“ سجاد علی شاہ

نے سخت لہجہ اختیار کر لیا۔ ”جاؤ اسے میرے پاس بھیجو۔“

تا جو راتھی۔ ”سرجن سجاد علی شاہ... کیا کرو گے تم اگر

بیٹے میں ماں کے جینز (GENES) غالب ہوئے۔ کیا تم

جینز کو شکست دے سکتے ہو؟ اس کی شخصیت کا جینٹل پیٹرن

اپنی سرجری سے بدل سکتے ہو یا دنیا میں کوئی ایسی دوا ایجاد

ہوئی ہے جس سے یہ ہو سکے؟ کسی بچے کو صادقین یا جہانگیر

خان بننے سے روکا جاسکے یا مہدی حسن نہ بننے دیا جائے۔“

سجاد علی شاہ نے اپنی بیوی کو لان کر اس کر کے گھر میں

غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ تا جو ر کے سوال نے اسے کسی حد تک

خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ ایسی ان گنت

مثالیں تھیں کہ غریب گھروں اور گمنام دیہات میں پیدا

ہونے والے بچوں کا نام ساری دنیا نے جانا اور مانا... اگر وہ

اپنی سیدھی سادی بی اے ٹیل تا جو ر سلطانہ کو اردو ادب میں

ایم اے نہ کرنے دیتا اور اسے شوقیہ افسانہ نگاری کی اجازت

نہ دیتا اور اس کی کہانیاں ملک بھر کی عورتوں کے ڈائجسٹوں

میں دھوم نہ مچاتیں... تب بھی فرق نہ پڑتا۔

تا جو ر کا باپ خاصا نامور شاعر تھا۔ تمام پڑھے لکھے

لوگ اس کا نام جانتے تھے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے

لیکن وہ دو کمروں کے سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا جس کے

سامنے گٹر ابلتے تھے اور وہ باہر لگے ہوئے نلکے پر قطار میں



تک کم ہوگئی۔

اسے جیل میں سات سال گزارنے کے لیے، جو درحقیقت تین سال ہی ہوتے، اپنے لیے آسانیاں خریدنا تھیں۔ قید بامشقت کاٹنے والے ہر قیدی کو جیل میں گھر جیسا آرام بھی فراہم کر دیا جاتا ہے لیکن اسے ہر سہولت کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ آرام دہ بستر، خدمت گار، گھر کا کھانا، ہر روز ملاقات، چائے سگریٹ، موبائل فون اور ٹی وی۔ کبھی کبھار بیوی کے ساتھ خلوت... سب کی قیمت مقرر ہے۔ پیسا نہیں تو کچھ نہیں۔ باہر آپ ہوں گے بڑے معزز اور معتبر۔ یہاں آپ کے لیے ہر مشقت ہے۔ ذلت ہے اور عذاب ہی عذاب ہے جس کی نہ حد ہے نہ حساب۔

شاہ جی نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ شاید زندگی میں اس نے یہی ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جو چیز ہمیں اپنی بد قسمتی سے نہیں ملی اس سے ہمارے بچے کیوں محروم رہیں۔ ہم نے پیسا کمایا... وہ عزت بھی کمائیں۔ اس کے تین بیٹوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے انہیں اپنی اپنی پسند کی فیلڈ میں اسپیشلائز کرنے کے لیے باہر بھی بھیجا۔ وہ اے ایس کے لوٹ کر نہیں آئے۔ انہوں نے وہیں شادیاں کر لیں اور ملازمت بھی۔ شاہ جی کو اس کا کوئی رنج نہیں تھا۔ وہ فخر سے ہر ایک کو بتاتا تھا کہ اس کے دو بیٹے کتنے بڑے ڈاکٹر ہیں اور برطانیہ میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد لندن میں رہائش اختیار کر لے گا۔ اور لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

تیسرا بیٹا ارشاد تھا جو اس کی امیدوں پر پورا نہیں اترتا۔ معلوم نہیں کیسے وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے مختلف رہا۔ شروع سے اس کا دھیان پڑھائی لکھائی کی طرف نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے میٹرک کیا اور آوارہ گرد ہو گیا۔ مجبوراً باپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ قدرت کی طرف سے اس کو طبع موزوں عطا ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن گھر سے اس کا رابطہ ختم ہوتا گیا۔ وہ ہفتوں کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔ پھر پتا چلا کہ وہ نشر کرنے لگا ہے۔ ایک بار وہ گھر آیا تو ماں اسے نہ پہچان سکی۔ اس کے بڑے بڑے بالوں میں دھول مٹی تھی اور وہ الجھ کے کسی پرندے کا گھونسلہ نظر آرہے تھے۔ شیونہ کرنے سے اس کے چہرے پر جھاڑ جھنکار ڈاڑھی اگ آئی تھی۔ اس کے کپڑے میلے اور تار تار تھے۔ ماں نے دینک پر دروازہ کھول کے اسے دیکھا اور ”بابا معاف کرو“ کہہ کے بند کرنے ہی والی تھی کہ اس نے کہا ”ماں!“ اور

ماں بے ہوش ہوتے ہوتے پئی۔ یہ شاہ جی پر کیس بننے سے کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی۔

شاہ جی گھر آیا تو اس نے ایک دیوانے مجذوب کو فرش پر بیٹھ کے وحشیوں کی طرح کھانا کھاتے دیکھا۔ اس کی بیوی سامنے بیٹھی اپنی محبت اس پر نچھاور کر رہی تھی اور روپے کے پلو سے آنسو پونچھتی جا رہی تھی۔

شاہ جی بگڑ گیا۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو۔ کون ہے یہ...؟“

بیوی نے کہا۔ ”اپنا ارشاد ہے جی۔“

”ارشاد؟“ شاہ جی کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ”یہ پاگل... ہیرو مچی، آوارہ گرد، یہ میرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے گھر میں رہے گا تو ناک کٹ جائے گی میری۔ لوگ کیا کہیں گے۔“

ارشاد اٹھ کھڑا ہوا۔ ”گالی گلوچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود چلے جاتے ہیں آپ کے گھر سے۔ آپ اپنی ناک سنبھالیں... اب رہی لوگوں کی بات تو ہم جانتے ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کون سی بنیادوں پر کھڑا ہے آپ کی عزت کا یہ قطب مینار...“

اس کے جانے کے تیسرے دن شاہ جی نے ارشاد کی تصویر کے ساتھ ایک عاق نامہ اخبار میں شائع کر دیا۔ چوتھے دن کے اخبار میں وہ خبر شائع ہوگئی جس نے اس کی جموٹی عزت کے قطب مینار کو زمیں بوس کر دیا۔ حرام کی دولت کی جن بنیادوں کی طرف ارشاد نے اشارہ کیا تھا وہ اس کی عزت نہ بچا سکیں۔

ارشاد کے اس دور ابتلا میں لوٹ کر آنے اور حق فرزندگی ادا کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ شاہ جی کو امید تھی کہ لندن میں اس کے بیٹوں کو پتا چلے گا تو وہ ضرور آئیں گے۔ ماں نے فون کر کے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے باپ کو کچھ دشمنوں نے جموٹی سازش سے مقدمے میں الجھا دیا ہے لیکن وہ نہیں آئے اور مصروفیت کا عذر پیش کرتے رہے، یہاں سے آنا اتنا آسان نہیں ہوتا ماں... چھٹی نہیں ملتی۔ گھر آنے میں بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ بچوں کے امتحان چل رہے ہیں۔ بیوی بیمار ہے، ان کے پاس بہانوں کی کمی نہ تھی۔ آخر میں انہوں نے صاف کہا کہ ہم آ کے کیا کریں گے۔ اتنے بڑے نام والے وکیل ہیں نا... پاکستان میں پیسا چلتا ہے اور وہ ان کے پاس بہت ہے۔

بیٹوں کے اس رویے نے سجاد علی کی بیوی کو بہت مایوس کیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سات سمندر پار گوریوں کے ساتھ بس جانے والے سپوت اب کبھی لوٹ کے گھر نہیں

آئیں گے اور اس اعتبار سے ان میں اور عاق کر دیے جانے والے بیٹے میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہ گیا... تاہم اس نے یہ بات اپنے شوہر سے چھپائی۔ ان دنوں ویسے ہی اس کا ستارہ گردش میں تھا اور بڑے نام والے وکیل بھی اس کے کیس میں مایوسی کا اظہار کر چکے تھے۔

جب شاہ جی جیل چلا گیا تو گھر پر اس کی بیوی جو چار جوان بیٹوں کے ناتے بڑی خوش نصیب سمجھی جاتی تھی، اکیلی رہ گئی۔ خوش نصیبی اچانک اس گھر سے روٹھ گئی تھی اور اس کی جگہ نحوست نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ جن ڈاکٹر بن جانے اور پھر ولایت جانے والے بیٹوں پر اسے ناز تھا وہ جیسے کسی حادثے میں بچھڑ گئے... (بعد میں شاہ جی نے کہا کہ ہمارے لیے تو مر گئے) تیسرے کو انہوں نے خود نکال دیا۔ وہ رہتا تو کون سا سکھ دیتا۔

☆☆☆

اس وقت سجاد نے لندن پہنچ کے نیا داخلہ لیا تھا اور ہنوز اس کی رہائش کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا تھا۔ دونوں بڑے بھائیوں نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ یہ پاکستان نہیں ہے جہاں پورے پورے خاندان بن بلائے وارد ہو جائیں اور میزبان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے جے رہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گھروں کے کرائے بہت زیادہ تھے۔ ان میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی کہ ماں باپ یا بھائی بہن کو بھی ساتھ رکھا جاسکے۔

اصل بات یہ تھی کہ گھر نہیں دل چھوٹے تھے چنانچہ جگہ نہیں نکلی تھی۔ یہی لوگ پاکستان میں ہوتے تو ایک کمرے کے فلیٹ میں سب کے ساتھ رہتے۔ سجاد علی کو اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی۔ پھر اس نے الگ رہائش کے لیے مزید پیسے منگوائے تو ماں نے الٹا اس سے مطالبہ کر دیا کہ وہ واپس آجائے۔ وہ اکیلی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہائی بلڈ پریشر کے ساتھ اسے شوگر کا پرانا عارضہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتی اتر آیا تھا لیکن شوگر کنٹرول ہونے تک ڈاکٹر آپریشن کے لیے تیار نہ تھا۔

سجاد علی چھوٹا ہونے کے سبب ماں کا لاڈلا رہا تھا۔ اسے واپس آنا پڑا۔ ماں نے کہا تھا کہ اسپیشلسٹ نہ سہی وہ ڈاکٹر تو ہے۔ انجی اپنی پریکٹس کرے... پھر یہیں سے اسپیشلائز کر لے... سجاد نے اس تجویز پر مجبوری میں کپرو مائر کر لیا۔ تب تک اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ مالی طور پر بھی اس کے گھر کے حالات بگڑ چکے ہیں۔

واپس آنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اب ایک

چار سمت ایک چوراہا

کوٹھی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ وہ خزانہ خالی ہو چکا ہے جس پر انہیں گمان تھا کہ ہمیشہ بھرا رہے گا۔ ڈیم کی طرح جس میں پیچھے سے آنے والا پانی شامل ہوتا رہتا ہے مگر موسم بدلتے ہیں تو دور یا بھی سوکھ جاتے ہیں۔

سجاد اپنی ماں کے ساتھ جیل گیا تو باپ کا مزاج سخت برہم تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک لفافہ دیا... یہ اسے جیلر کی معرفت ملا تھا اور اس پر نام کے ساتھ قیدی نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ ”یہ تمہارے ہونہار سپوت شاعر اعظم ارشاد علی ارشاد نے لکھا ہے۔“ شاہ جی نے کہا۔

اس نے لکھا تھا۔

”محترم و مکرم والد صاحب۔ السلام علیکم! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے دام فرزندگی سے آزاد کیا۔ اس طرح آپ پر میری تربیت و پرورش کی دنیاوی و دینی ذمے داری کا سلسلہ ختم ہوا۔ دوسری طرف مجھ پر بھی آپ کے اس احسان کے بدلے ہر قسم کی اخلاقی ذمے داری کا بار نہیں رہا اور ہمارے درمیان رشتوں کی مجبوری نہیں رہی جس نے ہم دونوں کو مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ نہ میری شہرت سے آپ کو طمانیت مل رہی تھی اور نہ آپ کی دولت سے مجھے عزت۔ اگرچہ قانونی طور پر اس اعلان کی کوئی حیثیت نہیں جو آپ نے اخبار میں شائع کرایا ہے لیکن میں تو آپ کی جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ سے دستبرداری بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کو نہ سہی مجھے اپنی عاقبت عزیز ہے۔ فقط السلام۔“

آپ کا سب سے زیادہ نالائق بیٹا ارشاد۔“

”تم نے دیکھا... اس حرامزادے نے ایسے پلٹ کے پتھر مارا ہے مجھے... ایسے وقت میں۔“

اس کی بیوی نے کہا۔ ”جانے بھی دو... عاق نامہ بھی تو تم ہی نے شائع کرایا تھا۔“ اس کی بیوی بولی۔ ”اور باقی دو نے کون سا حق فرزندگی ادا کر دیا جو تم ایک کو رو رہے ہو۔ یہ ہمارے نصیب کی سزا ہے۔“

شاہ جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو، چلو چھوڑو... یہ بتاؤ... وہ چیک کیش ہو گیا...؟“

بیوی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بینک والوں نے کہا ہے کہ پیسے کم ہیں چیک واپس کر دیا۔“

”کیا مطلب؟ بینک میں پانچ لاکھ بھی نہیں بچے۔“

اب سجاد بولا۔ ”اس کا اندازہ تو آپ کو ہونا چاہیے لیکن



میں نے معلوم کیا تھا... بینک میں دو لاکھ اسی ہزار ہیں۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے...“ شاہ جی بولا۔  
 ”میں اسٹینٹ لے آیا ہوں۔“ سجاد نے ایک کاغذ آگے بڑھا دیا۔

شاہ جی نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ اس میں ہر چیک کی تفصیل تھی اور اسے یاد آتا گیا۔ یہ پہلے وکیل کا ایڈوانس، یہ دوسرے کا، یہ تھانے دار کو دی گئی رشوت۔ یہ فلاں کو، یہ فلاں کو۔ پہلے وکیل کی ادائیگی، پھر دوسرے وکیل کی۔ شاہ جی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔  
 ”اگر میں نے یہاں جیسا نہ کھلایا تو یہ میرے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔“  
 ”اگر باقی سب انہیں دے دیا تو ہمارا کیا بنے گا۔“  
 جب تمہاری اولاد ہی کچھ دینے پر راضی نہیں تو اور کون دے گا۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

سجاد نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”اب صرف ایک ہی صورت ہے ابا۔ ہم کوٹھی بیچ دیں گے۔“  
 ”کوٹھی بیچ کے خود کہاں رہو گے؟“

”کرائے کے کسی چھوٹے سے مکان میں... ہم گاڑی بھی انورڈ نہیں کر سکتے۔ مجھے اپنے لیے کلیںک کا بندوبست کرنا ہے۔ ایک موقع کی جگہ ہے، آدھی رقم اس میں نکل جائے گی لیکن اس طرح آمدنی کی ایک صورت پیدا ہو جائے گی۔ میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں نوکری کے لیے درخواست دی ہے۔“

شاہ جی چپ چاپ سنتا رہا۔ اب اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ قدرت کی سزا اتنی جلدی شروع ہو جائے گی۔ دیکھتے دیکھتے معاملات اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور وہ عرش سے فرش پر آگرے گا۔ سجاد نے دن رات ایک کر دیا لیکن پرائیویٹ اسپتال میں جہاں وہ ٹائٹ ڈیوٹی دیتا تھا تنخواہ بہت کم تھی۔ عام طور پر رات کے وقت اسے فراغت رہتی تھی اور وہ آرام میں اوکے کمرے میں سوتا رہتا تھا یا ایک دو بار نرس اسے جگہ کے کسی مریض کی حالت کے بارے میں آگاہ کرتی تھی تو وہ اسے دیکھ لیتا تھا۔ وہاں سارے کیس اسپیشلسٹ دیکھتے تھے۔ سجاد کو کسی مرض کے علاج کا نسخہ بدلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ صرف وقتی تکلیف دور کرنے کے لیے کوئی دوا دے سکتا تھا۔ وہ اپنا کلیںک صبح دس بجے کھولتا تھا اور شام سات بجے اٹھتا تھا تو سیدھا اسپتال چلا جاتا تھا۔ ایک نئے ڈاکٹر کے لیے اپنی پریکٹس جمانا مشکل اور وقت طلب کام تھا مگر سجاد

نے اس کا روبرو باری نکلتے کو نظر انداز نہیں کیا کہ مریض کی آدھی تکلیف ڈاکٹر کا رویہ دور کر دیتا ہے۔ وہ مریض کی بات دھیان سے سنتا تھا اور ان کا نفسیاتی اعتماد حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا کہ دوا جو کرے سو کرے۔ مریض یہ ضرور کہیں کہ ڈاکٹر اچھا ہے... بات سچی ہے۔

آمدنی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ جیل میں شاہ جی کو دی آئی پی ٹریٹمنٹ دلانے کا اندازہ دیا جاسکے۔ جب اس سے ساری مراعات واپس لے لی گئیں تو وہ بڑی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس موقع پر شاہ جی کے بھائی نے ان کے ساتھ رشتہ نبھایا اور جیل حکام کو تھوڑی بہت رقم پہنچاتا رہا۔ اس سے اتنا ہوا کہ شاہ جی کی مشقت ختم ہو گئی۔ اس کی جسمانی سزا اور ذلت سے جان چھوٹ گئی اور اسے مناسب کھانا ملنے لگا۔

عرصہ دراز سے دونوں بھائیوں کے خاندانوں کی دوری ایک طرح سے لا تعلقی میں ڈھل گئی تھی۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے صوفی پہلے شاہ جی کو سمجھاتا تھا لیکن مسلسل بے عزتی وہ کب تک برداشت کرتا۔ ایک فرق ان کے عقائد و نظریات کا تھا لیکن دوسرا زیادہ نمایاں محسوس ہونے والا فرق ان کے سوشل اسٹیٹس کا تھا۔ شاہ جی کی دولت مندی کے مقابلے میں صوفی کی لوئر میڈل کلاس کا اسٹینڈرڈ غربیانہ محسوس ہوتا تھا۔

ان کے تعلقات ختم ہونے کا ایک سبب اور بھی تھا... اگر بھائی کو بھائی کی پروا ہوتی تو شاہ جی اپنے ساتھ بڑے بھائی کو بھی آگے بڑھاتے۔ بے شک وہ حرام کی آمدنی میں سے کسی قسم کی امداد قبول کرنے کا روادار نہ تھا لیکن کوئی کرنا چاہے تو مدد کرنے کے سوا طریقے ہیں۔

ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ شاہ جی کو خدا نے چار بیٹے دیے تھے تو صوفی کو چار بیٹیاں عطا کی تھیں۔ شاہ جی کی بیوی بیٹوں پر بہت اتراتی تھی اور بڑے بھائی کی بیوی اس غم میں مری جاتی تھی کہ وہ کوئی بیٹا پیدا نہ کر سکی حالانکہ اس کا شوہر سمجھاتا رہتا تھا کہ بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ اور بعد میں فی الحقیقت ایسا ہی ثابت ہوا۔

اس کی تین بیٹیوں کے رشتے بہت اچھے گھروں میں ہوئے۔ صوفی نے بیٹیوں کو واجبی تعلیم دلائی تھی۔ پہلی دو نے میٹرک کیا اور پیا گھر سدھار گئیں۔ باقی دو نے بی اے تک پڑھا۔ تیسری بی اے کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی رخصت ہوئی۔ دوبار ترقی پانے سے صوفی کے مالی حالات بھی بہتر ہو گئے تھے چنانچہ جب شاہ جی پر مشکل وقت آیا تو بیوی کے

منع کرنے کے باوجود بڑا بھائی اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ شاہ جی نے پہلے اس کی مدد کو شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔ اسے خالی ہمدردی کے الفاظ اور دعاؤں کی نہیں پیسے کی ضرورت تھی اور جتنے پیسے کی ضرورت تھی وہ صوفی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم بعد میں بڑے بھائی نے ہی اسے جیل کے عذاب سے بچایا۔ اس کے اپنے لائق فائق بیٹے تو پیچھے ہٹ گئے تھے۔

سجاد کو سب معلوم تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ تایا کے گھر چلا جائے لیکن دیورانی جیٹھانی کے تعلقات ہندوستان پاکستان جیسے ہو رہے سے ماں نے اس کی سخت حوصلہ شکنی کی کہ وہاں جائے گا تو ذلیل ہو کے آئے گا۔ تیرے تایا نے جو کیا اپنے بھائی کے لیے کیا، ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“

ان حالات میں سال بھر کے اندر اندر بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ ایک دن وہ اسپتال پہنچا تو کاؤنٹر پر ایک نئی لڑکی کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

”تا جورو... تم...“ اس نے سامنے جا کے کہا۔  
 ”ڈاکٹر سجاد... آپ بھی یہاں ہوتے ہیں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔  
 ”مجھے تو سال سے زیادہ ہو گیا۔“

تا جورو مسکرائی۔ ”کمال ہے... ایک سال مجھے بھی ہوا ہے... مجھ سے پہلے باجی یہاں تھیں۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس نے مجھے یہاں رکھوا دیا۔“

سجاد اسے دیکھتا رہا۔ اس کے حسن میں سادگی کے ساتھ بڑی پرکاری تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکی رہتی تھیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو نظراٹھا کے دیکھتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہے۔

”آج سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا کیوں نہیں؟“ سجاد نے ایسے سوال کیا جیسے قصور وار وہ خود ہے۔ وہ ہنسی۔ ”میں صبح کی شفٹ میں تھی۔ دیکھیے پہلے ابا نے باجی کو بھی اسی شرط پر ملازمت کی اجازت دی تھی کہ ٹائٹ شفٹ نہیں ہوگی... وہ دو سال رہی۔ صبح آٹھ بجے آتی تھیں، رات آٹھ بجے چلی جاتی تھیں۔“

”پھر تم نے ٹائٹ شفٹ کیسے قبول کی؟“  
 ”تین سال میں اندازہ ہو گیا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مالک پرانی وضع کے شریف مگر ڈسپلن میں سخت گیر آدمی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں... میرے پریشاں تھے۔“

چار سمت ایک چور اھا

”ابا کو میں نے راضی کر لیا کہ صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے پھر آجائے گی کوئی نئی لڑکی۔ اب امیر جیسی ہے اور مالکوں نے پہلی بار کہا ہے... پھر اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ دراصل میں چاہتی تو انکار کر دیتی اور مالک مجھے مجبور بھی نہ کرتے۔“

”ٹائٹ ڈیوٹی زیادہ مشکل ہوتی ہے... پھر تم کیوں چاہتی تھیں؟“

”وہ دراصل... میں ایم اے کا امتحان دے رہی ہوں۔ دن میں یونیورسٹی جاتی ہوں۔ باقاعدگی سے نہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”شروع کے ایک دو پیریڈ اکثر نکل جاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن خود ہی چھٹی کر لیتی ہوں۔ اتنی باقاعدگی سے پڑھائی کہاں ہوتی ہے۔ حاضری لگنی چاہیے۔ پڑھنا خود ہی پڑتا ہے... وہاں سے واپس آ کے کھانا کھاتے ہی سو جاتی ہوں۔ اٹھ کے سیدھی یہاں آتی ہوں۔ یہاں رات کی شفٹ میں فراغت ملتی ہے تو کچھ پڑھ لیتی ہوں۔ کچھ سو بھی لیتی ہوں، آدھی رات کے بعد صبح پانچ بجے تک۔ اب ابا ایک بار مان گئے ہیں تو میں آگے بھی منوالوں کی۔ آپ آئیں تاکہ دن ہماری طرف۔“

یہ بات اس نے اتنی اچانک کہہ دی کہ وہ چونک پڑا۔ وہ بڑی محویت کے عالم میں اسے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اطوار میں معصومیت کے ساتھ کتنا اعتماد ہے، کتنی شائستگی ہے۔ اس نے فرسٹ کزن کے طور پر سجاد کے ساتھ بے تکلفی اختیار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن یہ اپنائیت کا اظہار وہ ہر ایک کے ساتھ بھی نہ کرتی۔ اس نے سجاد کے ماضی کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس کے باپ کی بات نہیں کی تھی۔ کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

”آئی ایم سوری۔ اگر آپ آنا نہیں چاہتے تو...“ سجاد نے پھر چونک کے کہا۔ ”نہیں نہیں... میں تو سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا آخر... ہم پہلے کیوں نہیں ملے۔“ تا جورو کے چہرے پر حیا کا رنگ جھلکا۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی اپنے سرمایہ حسن کی قدر و قیمت اور اپنی قوتِ تخیل سے پوری طرح واقف تھی اور اپنی فطری حیثیت کے باعث اس نے سجاد کی محویت کو بھی نوٹ کر لیا تھا۔ سجاد خود ایک وجہ شخصیت کا مالک تھا لیکن تا جورو چند لمحوں کی ملاقات میں یہ بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

سجاد نے فوراً کہا۔ ”میرا مطلب تھا... یہ کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے دونوں گھرانوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں رہا۔ اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود... جو...“



جو ہوا برا ہوا مگر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں صبح تمہارے ساتھ چلوں گا۔

وہ چونکی۔ ”میرے ساتھ۔“

”ہاں... ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد۔ کیا ہوگا... تمہارے ابا مجھے ڈانٹیں گے... وہ تو میرے ابا کو بھی ڈانٹتے تھے... میں سن لوں گا۔“

تاجور مسکرائی۔ ”سنائیں گی تو تمہیں اماں... ایسی کہ دوبارہ ادھر جانے کا نام نہیں لو گے۔“

لیکن تاجور بھی جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ سجاد کے لیے تو یہ پہلی نظر میں محبت والا معاملہ بن گیا تھا۔ رشتے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تاجور نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور باقی معاملات خود بخود طے ہوتے چلے گئے۔ وہ تاجور کے ساتھ گیا تو تانیا نے اسے گلے لگا کے ڈانٹا۔

”نالائق... خود نہیں آسکتا تھا پہلے۔ راستہ بھول گیا تھا تانیا کے گھر کا۔“ پھر تانیا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور پچھلا سارا حساب برابر کر دیا... لیکن ان کا سارا گلہ اپنی دیورانی سے تھا جس نے انہوں کے ساتھ غیروں کا سلوک کیا۔

بالآخر وہ ہوا جو نظر آ رہا تھا۔ تاجور کی ایک ہفتے کی ٹائٹ شفٹ مستقل ہو گئی۔ ان کے درمیان فاصلے تیزی سے کم ہوئے اور نہ چاہنے کے باوجود بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر سجاد کی ماں نے تاجور کا رشتہ مانگا... وقت اور حالات بدل گئے تھے۔ رشتہ طے ہو گیا اور یہ بھی کہ شادی اس وقت ہو گئی جب تاجور ایم اے کر لے گی اور شاہ جی بھی رہا ہو جائیں گے۔ یہ دونوں کام دو سال کی مہلت مانگتے تھے۔

بڑا بھائی خوش تھا تو چھوٹا شرمندہ اور احسان مند... لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا... اس سے پہلے کہ تاجور بہو بن کے اس کے گھر میں آتی، سجاد کی ماں نے گھر خالی کر دیا۔ وہ دل کی پرانی مریض تھی لیکن علاج اور احتیاط میں اپنے ڈاکٹر بیٹوں کی بھی ایک نہیں سنتی تھی اور اپنی کرتی تھی۔ ایک رات اس نے کہا۔ ”آج کچھ زیادہ ہی درد ہو رہا ہے سینے میں اور بازو میں۔“ جس کا مطلب یہی نکالا جاسکتا تھا کہ درد ویسے تو ہوتا رہتا ہے... بیٹا اسے اسپتال لے گیا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کے ایمرجنسی میں لے گئے۔ ڈاکٹروں نے دیکھا اور ڈیڑھ گھنٹہ سرفیقا پر لکھ دیا۔ DOA... جس کا مطلب ہوتا تھا ڈیڈ آن اریوئل... جب اسے لایا گیا تو وہ مر چکی تھی۔ وجہ...؟ M.I... مایو کارڈ ایک انفارمیشن... عرف عام میں دل کا دورہ۔

اس کے بعد اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں کا اختیار

سجاد کے اپنے پاس آ گیا۔ یہ رشتہ ہو جانے کے بعد تانیا خوشی سے پھولی نہ سہی اور ماضی کے سارے گلے شکوے بھول کے اس پر صدقے واری ہو جاتی تھی۔ سجاد کی ماں نے رہی تو جیسے آخری کاٹا بھی نکل گیا۔ اب صرف باپ تھا جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ شادی میں سجاد کا اپنا کوئی شریک نہ تھا۔ لندن سے دو بھائیوں نے فون پر مبارکباد دینا کافی سمجھا... ارشاد نہ جانے کہاں تھا۔ وہ بڑا آدمی بنا تھا یا نہیں۔ اس کی سجاد کو خبر نہ تھی مگر وہ بڑا شاعر ضرور بن گیا تھا۔ سجاد نے دو چار مرتبہ اسے فی وی پر دیکھا تھا۔ ماں مر گئی تھی اور باپ جیل میں تھا۔ دو سال بعد وہ بھی مر گیا۔

☆☆☆

آج یہ سب سجاد علی شاہ کو اس لیے بھی یاد آیا کہ اس کی ملاقات چند روز قبل اپنے بڑے بھائی ارشاد احمد ارشاد سے ہو گئی تھی... سجاد رات کے وقت اپنے خیالوں میں مگن کسی تقریب سے لوٹ رہا تھا کہ ایک ویران سڑک پر کوئی بھول شخص اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے بریک لگا کے گاڑی روکی اور اس دیوانے کو بچالیا مگر اس کوشش میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی تو اس کا پیپر ٹوٹ گیا اور ایک لائٹ چمکنا چور ہو گئی۔

سجاد سخت گرمی کھا کے نکلا تو کھد کے لیے کرتے اور جینز کی پرانی پتلون کے ساتھ پھٹی ہوئی چپل میں وہ بڑے بڑے بالوں اور گھنی ڈاڑھی اور مونچھوں والا مجذوب صفت شخص ایک طرف سہا کھڑا تھا...

سجاد اس پر برس پڑا۔ ”بے وقوف... پاگل کے بچے... مرنا چاہتے ہو تو جاؤ کسی ٹرین کی پٹری پر لیٹ جاؤ... دوسروں کو مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو... میری گاڑی کے نیچے آ جاتے تو بھگتا مجھے پڑتا... اور یہ جو دس ہزار کا نقصان ہوا ہے گاڑی کا... یہ تمہارا باپ پورا کرے گا۔“

وہ سجاد کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کردیتا منے... اگر وہ جیل نہ جاتا۔“

سجاد بری طرح چونکا کیونکہ اسے منا کہنے والا اب کوئی نہیں رہا تھا... وہ سب سے چھوٹا تھا اور ماں اسے منا کہہ کے پکارتی تھی... اور آخری وقت تک کہتی رہی... اس کا باپ اور بھائی سب اسے منا ہی کہتے تھے حالانکہ بڑا ہونے کے بعد وہ اس سے چڑنے لگا تھا۔

”تو سجاد ہے نا... ڈاکٹر سجاد علی شاہ...“

”بھیا...“ سجاد کی زبان گنگ ہو گئی۔ ”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی...“

وہ ہنسا۔ ”جانے دے منا۔ ہم تو دیوانے تھے جو بیانے ہوشیار تھے ان کی کیا حالت ہوئی...؟“

سجاد سمجھ گیا کہ وہ اپنے باپ کی ذلت کا حوالہ دے رہا ہے۔ ”چلو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو... کہاں سے آرہے ہو اس وقت۔“

”ایک مشاعرے سے... انہوں نے نقد نہیں دیا۔“

چیک پکڑا دیا... اپنے پاس اس وقت زہر کھانے کو پیسے نہیں اور بینک بند ہیں۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ لہرایا۔ ”تو مجھے کچھ پیسے دے سکتا ہے...؟“

سجاد نے پرس میں سے سارے نوٹ نکال کے گنے بغیر اسے تھما دیے۔ ”اب کہاں جاؤ گے... چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

ارشاد نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا... ”سب پہلے مجھے چھوڑ چکے ہیں... میں نے بھی سب کو چھوڑ دیا ہے۔“

سجاد اسے سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر اندھیرے میں گم ہوتا دیکھتا رہا... اس نے جان لیا تھا کہ ارشاد نشہ کرتا ہے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ ہیروین کا۔ اسے بھائی کی حالت دیکھ کے دکھ ہوا... ایک طرف وہ بھائی تھے جو لندن میں اسی طرح سب سے لائق اپنی زندگی جی رہے تھے، دوسری طرف یہ بھائی تھا... وہ ایک ہی چھت کے نیچے پرورش پانے والے اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے۔ ان کے درمیان خون کا وہ رشتہ کیوں نہ رہا جو اس نے دنیا میں سب بھائیوں کے درمیان دیکھا تھا۔

وہ کئی دن ذہنی طور پر ڈسٹرب رہا۔ ارشاد کی اس حالت کا ذمے دار شاعری کو نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی ادبی تخلیقات کا اچھا معاوضہ پانے والے خال خال تھے ورنہ ادیب، شاعر کو صرف عزت ملتی تھی جس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا... موسیقار اکثریت کے لیے میراثی تھے۔ مصور اور مجسمہ ساز گناہگار تھے لیکن کسی کی وہ حالت نہیں تھی جو ارشاد نے اپنی بنا رکھی تھی۔

حیدر نے اندر آ کے اس کے خیالات کے تسلسل کو ختم کر دیا۔ ”آپ نے مجھے بلایا یا پا...؟“

سجاد نے گھڑی دیکھی۔ ”بلایا تو بہت پہلے تھا... خیر... یہ بتاؤ صبح تم کہاں نکل گئے تھے۔ میں تم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔“

حیدر نے ہمت کر کے کہا۔ ”میں اسپتال نہیں جانا چاہتا۔“

چار سمیت ایک چور اھا

”کیوں...؟“

مجھے وحشت ہوتی ہے سرکاری اسپتالوں میں بیماروں کی حالت دیکھ کر... اور انہیں مرتا دیکھ کر۔“

”فضول باتیں مت کرو... تمہیں اس کا عادی ہونا چاہیے۔ میں تمہیں پریکٹیکل ٹریننگ دینا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کے دیکھو آپریشن کیسے ہوتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کیسے ہوتے ہیں...“

”پاپا... میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔“

سجاد کو شاک لگا۔ ”کیا؟ ڈاکٹر نہیں بنو گے... پھر کیا بنو گے؟“

”میں کچھ بھی بن سکتا ہوں۔ پروفیسر، وکیل یا جج... کیا کسی کالج کے پرنسپل یا وائس چانسلر کی یا سپریم کورٹ کے جج کی کم عزت ہوتی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ڈاکٹری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں جانتا ہوں دادا کی طرح آپ بھی دولت کو کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔“

سجاد دم بخود رہ گیا۔ اس کا میٹرک میں پڑھنے والا بیٹا اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر وہ سجاد کو مایوس کر رہا تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیدر ایسا ہی نامور سرجن ہو جیسے ادیب رضوی۔

اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”حیدر... یہ زبردستی ہے تو زبردستی ہی سہی۔ میں تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں اور بنا کے چھوڑ دوں گا۔ ایک دن تم خود مانو گے کہ میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔“

اگلے دن وہ حیدر کو اپنے ساتھ لے گیا اور اس کے بعد ہر ہفتے لے جاتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیدر کے دل میں ڈاکٹری کے لیے رغبت پیدا ہو۔ اسے میڈیکل سائنس کی معجزہ نمائی متاثر کرے۔ خالق کائنات کی سب سے عظیم اور پیچیدہ مخلوق یعنی انسانی جسم کی حیرت ناک اسے اپنے طلسم میں گرفتار کر لے۔ اور کچھ نہ سہی تو دھی انسانیت کی حالت اسے یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔

لیکن یہ سب کسی طرح نہ ہوا۔ ایک طرح کی ضد نے بھی حیدر کو باپ کے پیٹے سے دور کیا۔

اس نے سائنس پڑھنے سے صاف انکار کرتے ہوئے انٹر آئرس میں داخلہ لیا تھا اور سجاد اب یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کون سے منافع بخش پیشے کی طرف لے جائے۔

حیدر یار باش تھا اور خوش پوش بھی۔ وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا تھا اور صبح جاگنگ کے لیے جاتا تھا۔ وہاں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا جو ایک بیچ پر بیٹھی کچھ پڑھتی یا لکھتی



فرہاد نے پہاڑ کاٹ کے نہر نکالی تھی۔ تم میری خاطر اتنا نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹر بن جاؤ۔“  
عافیہ نے غصے سے جبرئیل کے کہا اور واک آؤٹ کر گئی۔

اس سے اگلے دن حیدر نے کالج کے پرنسپل سے مل کے اپنی فیکلٹی تبدیل کرائی۔ وہ آئرس چھوڑ کے سائنس پڑھنے لگا۔ جب حیدر کے اس فیصلے کی خبر سجاد تک پہنچی تو قدیم کہانیوں کے کردار کی طرح وہ پہلے ہنسا اور پھر رویا... ہنسا اس خوشی کے باعث جو حیدر کے بالآخر ڈاکٹری پڑھنے پر ہوئی تھی... رویا یوں کہ ماں باپ ہونے کا زعم رکھنے کے باوجود جو بات وہ بیٹے سے نہ منوائے وہ ایک اجنبی لڑکی نے چاروں کی شناسائی میں منوالی... مائیں اسی کو روتی ہیں کہ بہو نے جادو کر دیا ہے... اب ہم کچھ نہیں رہے۔

لیکن خود حیدر نہیں جانتا تھا کہ آدمی کے ارادے اور خواب، منصوبے اور دعوے... سب قابل شکست ہوتے ہیں۔ اگر عشق عام رفتار سے وصل کی منزل تک کا سفر طے کر لیتا تو زندگی ویسے ہی گزرتی جیسے سب کی گزرتی ہے... حیدر کے باپ کی تاجور کے ساتھ گزر رہی تھی... لیکن درمیان میں انتظار کا طویل صحرائے ہجران تھا... وہ ملتے رہے... کالج میں بھی... میڈیکل کالج میں بھی... دن میں بھی، رات میں بھی... محفل میں بھی اور تنہائی میں بھی اور چونکہ دونوں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے اور ڈاکٹروں کے ساتھ تھے اس لیے انہوں نے ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ تو برآمد نہیں ہونے دیا مگر شادی سے پہلے ہی شادی شدہ زندگی کے سارے تجربات سے گزر جانے کے بعد دونوں کے لیے شادی کے تصور میں نہ کوئی دلکشی رہی، نہ سنسنی خیزی... بیزاری اور اختلافات کی جو منزل شادی کے دو چار سال بعد آتی ہے وہ شادی سے قبل ہی آ گئی۔

عافیہ نے بالآخر اسی صنعت کار کے بیٹے سے شادی کی جو اسے لندن میں ملا تھا اور جس کا باپ فیصل آباد میں کئی ٹیکسٹائل ملوں کا مالک تھا۔ عافیہ نے ڈاکٹری سے صرف اتنا فائدہ اٹھایا کہ ساری عمر خود کو ڈاکٹر عافیہ لکھتی رہی۔

حیدر نہ چاہنے کے باوجود دلدل میں اترا اور پھنس گیا۔ عشق کا دریا اور ڈاکٹری کی تعلیم دونوں آگ کا دریا تھے جن سے اسے گزرنا تھا اور اس کی کتابوں سے زیادہ اس نے زندگی کی کتاب کو پڑھا تھا اور اس سے یہ عملی سبق بھی حاصل کیا تھا کہ دولت کا شارٹ کٹ روایتی صراطِ مستقیم کی مخالف سمت میں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ڈگری کو دفن کر دیا۔

نے آخری لفظ پر زور دیا۔

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہ اسپتال ہی میں ملی تھی۔“

”کیا صرف دوستی ہی ہے یا...؟“

”بالکل نہیں... البتہ اس کے والد نے آپ کو انوائس کیا تھا۔ جب میں ان کے گھر گیا تھا... تین دن ہوئے۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد تاجور نے کہا۔ ”کیا ہم پیغام لے کر جائیں؟“

حیدر چونکا۔ ”نہیں... بالکل نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ابھی...؟ گویا بعد میں ہوگی۔“ سجاد نے کہا۔ ”کیا تمہارے درمیان عہد و پیمان ہو چکے ہیں...؟ ڈاکٹر افتخار نے تمہیں پسند کر لیا ہے...“

”نہیں پاپا... ابھی تو ہم پڑھ رہے ہیں... اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی کے دل میں ایسی کوئی بات ہے۔“

”اس کا پتا چل جائے گا... دیکھو، زندگی تمہیں گزاری ہے۔ لیکن دونوں گھروں کے ماحول میں شاید زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے گھروں کی لڑکیاں اتنی فارورڈ نہیں ہوتیں۔“ سجاد بولا۔

”فارورڈ کیا... بے شرم کہو۔“ تاجور نے خفگی سے کہا۔

حیدر کے اصرار پر وہ ڈاکٹر افتخار سے ملے... اس ملاقات سے کوئی اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ اخلاقا انہوں نے بھی ڈاکٹر افتخار کو انوائس کیا... پھر ایک طویل عرصہ ان کے درمیان لا تعلقی رہی لیکن حیدر کی عافیہ سے دوستی نے عشق تک کا مرحلہ طے کر لیا... دونوں کے لیے آغاز شباب کا یہ پہلا تجربہ ہی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ حیدر نے صاف کہہ دیا کہ ابھی نہ سہی... بالآخر میں تم سے شادی کروں گا... جواب میں عافیہ نے اسے اپنے والدین کی شرط بتادی۔

”میری شادی کسی ڈاکٹر ہی سے ہوگی۔“

”کیا یہ تمہارا فیصلہ ہے۔“

”میرا بھی... اور میرے والدین کا بھی۔“

حیدر بھونچکا رہ گیا۔ تم نے انہیں بھی بتا دیا...؟“

وہ تڑخ کے بولی۔ ”کیوں نہ بتاتی... ہم گھر میں ایک دوستانہ ماحول رکھتے ہیں... ہر معاملے میں مشورہ کرتے ہیں... اور ایک دوسرے کا مشورہ مانتے ہیں۔“

”واٹ نان سنس... میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا۔ تم مجھے جذباتی بلیک میلنگ سے مجبور کر رہی ہو۔“

”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی کسی... تم نے نہیں کہا تھا کہ

پھولوں پر شبنم ہے... پھولوں کے رنگ کتنے شوخ ہیں۔ ہوا میں کتنی فرحت ہے۔ پرندوں کی چہکار میں کتنی موسیقی ہے۔“  
”صبح کے اس ماحول میں جو پڑھا جائے یا درہتا ہے۔“  
”کل تم نے میرے سوال کا بہت برا مانا تھا۔“

وہ سوچ کے بولی۔ ”ہاں... بعد میں مجھے احساس ہوا کہ ایسی کوئی بات تو نہیں تھی... میں کہہ سکتی تھی کہ ہاں... میں خود ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔“

حیدر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”مر گئے... اب تو مجھے بھی ڈاکٹر بننا پڑے گا۔“ اس نے زیر لب کہا۔

”کیا کہا تم نے؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”میں نے کہا، اچانک مجھے بھی ڈاکٹری سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے لیے مجھے اپنے مضمون بدلنے پڑیں گے۔ سائنس پڑھنی ہوگی۔ خیر... اللہ مالک ہے... فرہاد نے تو پہاڑ کاٹ کے نہر نکال دی تھی۔ میرا نام ہے حیدر... تمہارا میں نے معلوم کر لیا تھا... عافیہ... اچھا، پھر ملیں گے۔ خدا حافظ!“ وہ اٹھا اور چل پڑا۔

عافیہ کی تربیت ایک روشن خیال گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں بھی ڈاکٹر تھیں۔ وہ صرف شام کو اپنے شوہر کے ساتھ کلینک کرتی تھیں۔ عافیہ نے اپنے والدین کے ساتھ ساری دنیا گھومی تھی۔ وہ کسی دقیانوسی ماحول میں سخت پابندیوں کے ساتھ مل کر جوان ہونے والی دیو اور جینیو قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ اسے سجاد کا بے تکلف اور کسی حد تک جارحانہ انداز برا نہیں لگا تھا۔ اعتماد اس کی شخصیت کا حصہ تھا اور عافیہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔

پھر ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور چند بار حیدر اس کے گھر بھی ہو آیا۔ ایک دن وہ خود آ گئی... کال بیل بجی تو دروازہ تاجور نے کھولا... اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں عافیہ نے کہا۔ ”حیدر ہے گھر پر...؟“

”ہاں... لیکن آپ...؟“

”میں عافیہ ہوں... ڈاکٹر افتخار کی بیٹی... جو میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں۔“

تاجور نے کہا۔ ”اچھا اچھا... آؤ، اندر آؤ... میں بلاتی ہوں حیدر کو... تم اسے کیسے جانتی ہو؟“

”ہم دوست ہیں۔“ عافیہ نے بے خوفی سے کہا اور پھر دو گھنٹے تک سب سے باتیں کرتی رہی۔ جب وہ چلی گئی تو سجاد نے پوچھا۔

”کب سے ہے تمہاری اور اس کی دوستی...؟“ اس

رہتی تھی۔ اسے باغ کی اور موسم کی خوبصورتی سے یا صبح کے وقت کی دلکشی سے یہ ظاہر کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کو ڈانٹے کہ مس پڑھا کو... ذرا کتاب کی دنیا سے نکل کے اپنے آس پاس کی دنیا کو بھی دیکھو... بے شک یہ دنیا تم سے زیادہ خوبصورت نہیں اور اس دنیا کی خوبصورتی کا ایک سبب تم بھی ہو... مگر کیا یہ بات تمہیں معلوم ہے...؟

ایک دن اچانک اس نے لڑکی کو اسپتال میں دیکھ لیا... سجاد آپریشن ٹیمز میں تھا اور حیدر کو موبع ملا تو وہ کوک پیٹنے کیسے ٹیریا پھینچ گیا جہاں میڈیکل کالج کے لڑکے لڑکیاں پھرتے رہتے تھے۔ وہاں وہ لڑکی ایک میز پر اکیلی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کتاب تھی۔

حیدر سے برداشت نہ ہو سکا... وہ اس کے سامنے جا بیٹھا... کیسے ٹیریا میں یہ انوکھی بات نہ تھی... جگہ نہ ہو تو کوئی کسی بھی میز کو شیز کر لیتا تھا۔ مگر حیدر نے بیٹھتے ہی کہا۔ ”ہیلو... تم تو وہی ہو... مس پڑھا کو۔“

لڑکی نے کتاب بند کر دی۔ ”تم یہاں بھی آ گئے... پارک میں تو جاگنگ کے بہانے مجھے گھورنے آتے ہی تھے۔“  
”غلط فہمی ہے آپ کی... میرے والد یہاں ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر سجاد علی شاہ۔“

”میرے والد میڈیکل کالج کے پرنسپل ہیں... ڈاکٹر افتخار قریشی اور میں خود فرسٹ ایر میں پڑھ رہی ہوں ابھی... لیکن ایک دن مجھے اپنے والد سے بھی بڑا ڈاکٹر بننا ہے۔“

حیدر ہنس پڑا۔ ”کیا سارے باپ اسی طرح اپنے بچوں کی زندگی پر اپنی خواہشات کی اجارہ داری رکھتے ہیں۔“  
”کیا مطلب...؟“ وہ ماتھے پر شکن ڈال کے بولی۔  
”میرے والد بھی یہی چاہتے تھے... مگر میں نے کہا کہ زندگی میری ہے... میں جو چاہوں گا کروں گا۔“

”ماں باپ ہماری بھلائی کا سوچتے ہیں۔“  
”غلط... وہ اپنی نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کا سوچتے ہیں اور ہمیں اس کا وسیلہ بناتے ہیں۔ عامل معمول کا کھیل کھیلتے ہیں ہمارے ساتھ۔ مجھے ایمانداری سے بتاؤ۔ کیا تم خود بھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہو... یہ پیشہ تمہیں اپیل کرتا ہے...؟“ حیدر نے کہا۔

”یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں...؟“ وہ تنک کے بولی اور کتاب اٹھا کے چلی گئی۔  
اگلے دن جاگنگ کے بعد حیدر اس کے ساتھ بیچ پر جا بیٹھا۔ ”یہ باغ ہے... کلاس روم نہیں... دیکھو گھاس پر اور



مستری گلزار احمد گوردہ سپوری عرف گلو استاد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چالیس سال بعد وہ اپنا گھر بار، بیوی بچے اور اپنی ورکشاپ کا ساز و سامان لے کر اس شہر کے کس حصے میں جائے جہاں اس کے لیے کچھ بھی نہ بد لے۔ سب وہی رہے اور ویسا ہی ہو جیسا یہاں تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا گلو استاد کا باپ اپنے بیوی بچوں اور مال و متاع کے ساتھ گوردہ سپور سے روانہ ہوا تھا تو اسے یقین تھا کہ وہ بہتر مستقبل کی جانب جا رہا ہے جہاں اسے اپنے زیادہ تر خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔

گلو کے باپ فقیر محمد ماہی گوردہ سپوری کو یقین کامل تھا کہ اپنے اسلامی ملک پاکستان میں بالآخر ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی جو خلافت راشدہ کا نمونہ نہ سہی... اسی کے مطابق کاروبار مملکت چلائے گی۔

اس کا باپ ایک اسکول میں اسلامیات اور فارسی کا ٹیچر تھا... وہ اپنے محلے کی مسجد کمیٹی کا صدر بھی تھا اور مسجد میں درس قرآن بھی دیتا تھا... وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باخبر شخص تصور کیا جاتا تھا کیونکہ وہ ہر روز ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے اسکول لائبریری کے لیے آنے والا انگریزی اخبار STATESMAN اٹھا لاتا تھا اور خود اس کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد اپنے حلقہ احباب اور اہل محلہ سب کو عالمی واقعات اور ملک کی سیاسی صورت حال سے باخبر رکھتا تھا۔

عام خیال اور یقین یہی تھا کہ گوردہ سپور کا ضلع پاکستان کو ملے گا چنانچہ سکھ ہندوؤں میں خوف کا احساس غالب تھا مگر پھر اچانک باؤنڈری کمیشن کی بے ایمانی سے اس کا الٹ اعلان ہوتا... مسلمانوں پر تیارست ٹوٹی اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ بیشتر اپنا گھر بار اور ساز و سامان چھوڑ کے بھاگے تو پاکستان بھی نہ پہنچے پائے۔ راہ میں شہید کر دیے گئے۔

ماسٹر ماہی چھ ماہ تک تو دن رات گوردہ سپور کے شب و روز کو یاد کر کے آہیں پھرتا رہا۔ وہ زندگی اب اسے کسی حسین خواب کی طرح لگتی تھی جس کی تعبیر کے لیے خواہش کرتا بھی دیوانگی تھی۔ بالآخر اسے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری مل گئی جس میں اس نے اپنی زندگی کے باقی دن بڑی عسرت میں گزارے... اس کی بیوی بیمار ہوئی تو مناسب علاج کی سہولت نہ ملی اور وہ مر گئی۔ اسے مجبوراً اپنے دو بچوں کو موٹر ملکینک کا کام سیکھنے کے لیے ایک گیراج

اس کا خیال تھا کہ گلزار اور اسرار کو وہ صبح شام خود پڑھا سکتا ہے اور گورنمنٹ اسکول میں دی جانے والی تعلیم سے بہتر تعلیم دے سکتا ہے۔ دن میں وہ کام کریں گے تو کچھ لائیں گے اور مستقبل کا ہنر بھی سیکھیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ بڑا لڑکا اسرار صرف دو سال بعد لاپتا ہو گیا۔ گلزار نے کام تو سیکھا مگر تعلیم سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ماسٹر نے اسے ہی اللہ کا احسان مانا کہ اس کی کوئی بیٹی نہ تھی، اگر وہ پاکستان پہنچ بھی جاتی تو یہاں اس کی ماں کے مرنے کے بعد اسے کون سنبھالتا... کون رخصت کرتا۔

ماسٹر چھیاٹھ سال کی عمر پا کے دنیا سے رخصت ہوا تو گلزار ایک موٹر ملکینک بن چکا تھا اور اس نے ایک دکان کرائے پر لے کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ دکان چلتی ہوئی سڑک پر تھی اور اس بازار سے دور نہ تھی جہاں سے گاڑیوں کے پرانے پرزے ملتے تھے۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا مگر اس سے بھی زیادہ وہ باتوں سے گاہک کو مطمئن کرنے کے فن میں ماہر تھا۔

موقع ملتے ہی اس نے دائیں طرف والی دکان پکڑی... پھر بائیں ہاتھ کی دکان خالی کرائی۔ اس نے گلزار موٹر ورکشاپ کا سائن بورڈ لگوا دیا اور ٹھیکے پر اپنے ساتھ ڈینٹر پیئٹر کو اور آٹو الیکٹریشن کو رکھ لیا۔

ہجرت کے وقت ماسٹر ماہی کی عمر اڑتالیس سال تھی اور گلزار دس سال کا بچہ تھا۔ اب اس کی عمر اٹھائیس سال ہو چکی تھی۔ اپنی ورکشاپ ہی کے ایک حصے کو اس نے رہائش کے قابل بنالیا تھا۔ آخری حصے میں اس کی چارپائی کے ساتھ ایک الماری تھی جس میں اس کے کپڑے تھے۔ وہیں ایک کونے میں لگے ہوئے تل کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ روم بنارکھا تھا۔ اس لی ٹائی براہ راست گھر میں نہ لگتی تھی۔

وہ عیاش آدمی نہیں تھا۔ اس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کے لیے پیسے کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اچھے کپڑے وہ پہن ہی نہیں سکتا تھا۔ صبح سے رات تک اس کے جسم پر ایک نیلی زین کی ڈاگری رہتی تھی۔ سوتے وقت وہ ایک پاجامہ اور بنیان پہنتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اسے کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ پھر ایک رات وہ ایک دوست کے گھر رکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دوست کے ساتھ وہ اکثر رات کے وقت گھومنے نکل جاتا تھا۔ وہ گوالمنڈی میں کچھ کھاتے پیتے تھے اور بعض اوقات شاہی قلعے کی کسی سیڑھی پر بھی چڑھ جاتے تھے۔ پھر

گلو نے کہا۔ ”سوچ رہا ہوں یہ احاطہ لے لوں۔“  
”کیا کرے گا احاطہ لے کر...“ دوست بولا۔  
”دو کمرے، غسل خانہ، باورچی خانہ نکل آئے گا... اپنا گھر ہو جائے گا۔“

دوست نے پھر کہا۔ ”کیا کرے گا گھر بنا کے؟“  
”یہ تو کس قسم کے سوالات کر رہا ہے۔“

”وہی جو میری بیوی کرنا چاہتی تھی... لیکن میں نے اسے روک دیا تھا کہ مہمان کو تنگ نہیں کرتے۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تم دوست ہو تو اپنے دوست کے لیے کچھ کرو۔ زندگی صرف خراب گاڑیوں کو ٹھیک کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔“

”پھر کس لیے ہوتی ہے؟“ گلو نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

”ابے تیرا باپ اور میرا باپ... ان کے باپ دادا... یہ سب تیری طرح جیتے تو میرا تیرا وجود کہاں ہوتا۔ آدمی کی ساری جدوجہد آخر کس لیے ہے... کہ وہ اپنا گھر بنائے، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے۔“

گلو سستا رہا اور اتنا اداس ہوا کہ اس کا دل چاہا رونا شروع کر دے۔ ”تو نے بالکل ٹھیک کہا لیکن میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں... کون دے گا مجھے اپنی بیٹی۔“

”تو اس کی فکر مت کر... ہم ہیں نا۔ آخر کیا کمی ہے تجھ میں... جوان اور صحت مند ہے۔ اچھا کما رہا ہے۔ کوئی بری عادت نہیں۔ تجھے لڑکیوں کی کیا کمی... تیری بھائی کہہ رہی تھی کہ گلو بھیا سے پوچھو... وہ راضی ہوں تو میں بات کروں۔“

اور یوں گلو استاد کا گھر آباد ہوا.....

شاہین نے گلو استاد کے گھر کو ہی نہیں گلو استاد کی زندگی کو ایسے بدل دیا کہ ایک مرتبہ اس نے خاصے جذباتی اور شاعرانہ انداز میں اپنے دوست سے کہا۔ ”یار اپنی زندگی تو ایسے تھی جیسے بنجر زمین... اس نے اپنی محنت سے اسے شالیمار باغ بنا دیا۔“

وہ اپنے دوست کی بیوی کا بھی بہت احسان مند تھا کہ اس نے گلو کے لیے ایسی لڑکی چنی کہ اس جیسی شاید دوسری نہیں ہو سکتی۔ دونوں میاں بیوی اس کی باتوں پر بہت ہنستے تھے اور بیوی کے لیے اس کی دیوانگی پر بھی... اس نے شاہین کو پورا موقع دیا کہ وہ آگے بڑھے۔ اس کے لیے گلو نے پہلے بچے کی پیدائش کو بھی بیوی کے ایف اے سی ٹی کرنے تک موخر کیا۔ پھر پہلا بچہ وقار پیدا ہوا اور اس کی تعلیم میں رخنہ آیا۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو شاہین

اس دوست نے شادی کر لی... وہ اس کی شادی میں شریک ہوا تھا تو اس نے بڑی رونق دیکھی تھی۔ وہاں اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار موجود تھے۔ وہ سب خوش تھے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔

اسی رات گلو استاد کو پہلی بار اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ ماں، باپ تو خیر کسی کے بھی نہیں رہتے۔ اس کا ایک بھائی تھا جو ایسا گیا تھا کہ اس نے لوٹ کر کسی کی خبر نہ لی تھی۔ دوسرے رشتے داروں کے وجود سے وہ تقسیم کے وقت محروم ہو گیا تھا۔

شادی کے بعد اس دوست نے بار بار اسے اپنے گھر بلایا لیکن گلو فرصت نہ ہونے کا بہانہ کر کے ٹال گیا۔ ایک دن وہ خود اسے لینے آ گیا۔ اس کا گھر بڑا نہیں تھا لیکن وہ واقعی گھر لگتا تھا، مکان نہیں۔ اوپر والی منزل پر اسے دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ جہیز میں ملنے والا بیڈ روم سیٹ اور دوسرا فرنیچر... فرنیچر اور ٹی وی کمرے کا نیارنگ روغن اور اس کی سجاوٹ۔ سب دیکھ کر گلو مسحور ہو گیا۔ اس کا دوست بھی ایک ملکینک تھا مگر وہ کتنے سلیقے سے رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں کتنا حسن تھا اور کتنا آرام تھا، یہ اس نے پہلی بار محسوس کیا۔

رات کو اسے بارش کی وجہ سے دوست کے گھر رکنا پڑا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی اور اتنی ہی خوش اخلاق اور شائستہ اطوار بھی۔ اس نے گلو بھائی، گلو بھائی کی رٹ لگا کے پہلے اسے بہت کھلا دیا۔ اس کے ہاتھ کے کھانوں کا لطف بھی نیا تھا جو ہوٹل میں کھانے کے عادی گلو کو بہت پسند آیا پھر اس نے بڑے اصرار سے گلو بھائی کو روکا کہ جلدی کیا ہے صبح چلے جائیے گا۔ اس کی ملنساری اور مہمان نوازی نے گلو کو بے بس کر دیا۔

رات کو وہ چائے بنا کے لے آئی اور دیر تک اپنی باتیں کرتی رہی۔ اپنے گھر، ماں باپ، بھائی بہن اور اسکول کی باتیں۔ اس کا دوست فخر سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا پھر وہ سونے چلے گئے۔ گلو کے لیے انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بستر لگا دیا تھا لیکن درمیانی دروازہ بہت ہلکا تھا۔ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے آنکھ کا پردہ ضرور رہا مگر رات بھر سنائی دینے والی آوازوں نے گلو کو سونے نہیں دیا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی بار اس کا دوست آیا تو گلو نے کہا۔ ”یار یہ چیخے والا احاطہ مل سکتا ہے... مگر بندہ پیسے بہت مانگ رہا ہے۔“  
”پیسے تیرے پاس کم تو نہیں ہیں۔ کیا کرے گا ان



ایسا ہوا تھا... لیکن اس نے تحقیر آمیز رویہ اختیار کرنے والوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اپنی بے عزتی کے احساس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ یہ محبت کا تقاضا تھا۔ آج وہ جس مقام پر تھی، گلو کی محنت سے زیادہ اس کی فراخ دلی اور قربانی کی وجہ سے تھی۔ وہ بھولی نہیں تھی کہ اولاد کی فطری خواہش رکھنے کے باوجود گلو نے بچے کی پیدائش کو صرف اس لیے موخر کر دیا تھا کہ شاہین ایف اے سی ٹی کر لے۔ ایسی قربانی ہر شوہر نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ہی وہ بی بی اے بی ایڈ اور بعد میں ایم اے بھی کر سکی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک جھٹکے میں فیصلہ کر دیتا کہ بی بی... میری آمدنی بہت ہے اور تم نے میٹرک کر لیا کافی ہے۔ بس اب گھر سنبھالو۔ صرف محبت ہی آدمی کو اپنے محبوب کی خوشی کو مقدم رکھنا سکھاتی ہے۔

کالج میں پہنچنے تک وقار نے بھی ورکشاپ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے کسی کلاس فیلو یا دوست کو اپنے باپ کی ورکشاپ کے بارے میں خود کچھ نہیں بتاتا تھا۔ کسی کو یہ بات معلوم ہو جاتی تھی تو وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتا تھا۔ دوسروں کے باپ بڑے نام اور بڑے عہدوں والے تھے۔ ان کے درمیان وہ خود کو اچھوٹ محسوس کرتا تھا۔ اس کے لاکھ چھپانے کے باوجود بھی نہ بھی افشائے راز ہو جاتا تھا۔

یہ مسئلہ اس کی دو بہنوں کا بھی تھا لیکن وقار کی طرح ان کی سوشل لائف محدود تھی۔ انہیں بھی کلاس فیلوز کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور کلاس مپلس رکھنے والی لڑکیاں ان سے دور دور رہتی تھیں۔ بہت کم تھیں جو محنت کی عظمت کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہوئے ان دونوں سے دوستی کرنا اور انہیں اپنے گھر بلانا پسند کرتی تھیں۔ اصل مسئلہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد سامنے آیا۔

اس مسئلے پر گلو کا پھر اپنی بیوی سے اختلاف رائے ہوا۔ ان کا بی بی اے کا نتیجہ آیا تو گلو نے کہا۔ ”ان دونوں کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“

شاہین سمجھ لیتے کے باوجود انجان بنی رہی۔ ”سوچے کی کیا بات ہے وہ پڑھ رہی ہیں۔“

”میرا مطلب تھا ان کی شادی کی عمر ہے۔“

”شادی میرے سوچنے سے تو نہیں ہوگی۔ کوئی رشتہ بھی تو آئے مناسب۔“ شاہین نے کہا۔

”مناسب کیا ہوتا ہے... رشتے تو آئے ہیں مگر تمہیں پسند نہیں آئے۔“ گلو نے کہا۔

”مجھے کیا... تمہاری بیٹی کو پسند نہیں آئے۔ ابھی بچھلے

”کام نہیں کرے گا تو کام کیسے گا؟“

”اے کوئی ضرورت نہیں کام کیسے کی... کام دوسرے کر سگے۔ وہ صرف کنٹرول کرے گا۔“

”او جھلی... یہی تو میں سمجھا رہا تھا۔ کنٹرول کیسے کرے گا جب اسے کام آتا ہی نہیں ہوگا۔“

شاہین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کچھ بھی ہو... وقار اے لیول کر چکا ہے۔ کالج کے بعد یونیورسٹی جائے گا۔ انجینئر بنے گا۔ کیا وہ تمہاری ورکشاپ میں گاڑیاں مرمت کرے۔ ڈانگری پنکھ کے... اور گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر ہاتھ منہ کالے کرے۔“

”کوئی کام برا نہیں ہوتا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے کسی کی بے عزتی نہیں ہوتی۔“

”رہنے دو... یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ اگر یہی سب کرانا تھا وقار سے تو اسے انگلش میڈیم اسکول کیوں بھیجا۔ لے جاتے اپنے ساتھ اور وہ جو چھوٹے کام کرتے ہیں... انہی کی طرح لگا دیتے۔“

”یہی تو میں نہیں کر سکتا تھا... لیکن جو میں نے کیا...“

”کیا اب وہ میری غلطی شمار ہوگا؟“

”دیکھو... ہمارے معاشرے میں موٹر مکینک کی کوئی عزت نہیں۔“

گلو کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ ہو گیا۔ ”مجھے معلوم ہے پرنسپل صاحبہ! تمہاری کتنی عزت ہے اس شہر میں۔ کیا بتانی ہو تم لوگوں کو؟ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔“

”تم تو برا مان گئے۔“

”نہیں... مجھے بتاؤ کہ تم اپنی عزت کیسے بچاتی ہو۔“

”تم مکینک نہیں ہو... ورکشاپ کے مالک ہو۔“

شاہین نے کہا۔

”تمہارے شاگرد... ان کے گھر والے... سب کاروں والے ہیں... کیا انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا

ڈانگری پہنے۔ کالے ہاتھوں میں پلاس پائے اٹھاتے۔ کسی گاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے۔ ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ خود فریبی ہے کہ کسی کو معلوم نہیں۔ سب جانتے ہوں گے کہ تمہارا میاں ایک موٹر مکینک ہے۔ لیکن کیا

اس سے تمہاری عزت کم ہوگی؟ کبھی کسی نے تمہاری بے عزتی کی کہ بڑی پرنسپل بنی پھرتی ہو... تمہارا شوہر ایک

موٹر مکینک ہے۔ کل ہی میں نے گاڑی ٹھیک کرائی تو اس نے رعایت نہیں کی۔“

شاہین خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ بے شک

پولیس سے بھی مدد لی اور چوری کے مرتکب ہونے پر تھانے میں ایسی چیخوڑ کرانی کہ باقی سب سیدھے ہو گئے۔ وہ ظالم یا سفاک نہیں تھا، وہ سب سے زیادہ اجرت دیتا تھا اور اپنے کاریگروں کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ حادثات اور مشکل وقت میں گلو استاد کسی باپ کی طرح ان کے کام آتا تھا۔ لیکن ہر باپ کی طرح ہر وقت ان پر نظر رکھنا ضروری تھا۔

اچانک اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اسے کچھ ہو گیا تو ورکشاپ کا کیا کیا بنے گا۔ آدمی کا کیا ہے... اچھا بھلا صحت مند آدمی کینسر میں مبتلا ہو کے چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ حادثہ تو پھر حادثہ ہے، سڑک پر بھی ہو جاتا ہے... گھر میں بھی... ورکشاپ میں بھی۔

یہ سوال اس نے شاہین سے کیا۔ ”شانی! میرے بعد میری ورکشاپ کا کیا ہوگا؟“

وہ گھبرا گئی۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو... تمہیں کیا ہوا ہے؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”او جھلی... کوئی بندہ کبھی زندگی کی گارنٹی دے سکتا ہے تو مجھے بتا... میں بھی لے لوں۔“

شاہین کی تسلی نہیں ہوئی۔ ”سچ بتاؤ... کوئی ایسی ویسی بات ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوا ہے... لیکن ہو سکتا ہے۔“

”فضول باتیں مت سوچو... کام کرنے دو مجھے۔“

گلو نے کہا۔ ”تم تو پڑھی لکھی ہو... مجھے بتاؤ جو دنیا

میں سب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ میرے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا ہمیں آنے والے وقت کے لیے پہلے سے تیاری

نہیں کرنا چاہیے... مثلاً بڑھا پاس پر آتا ہے۔ جب آدمی کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔“

”تم بھی حد کرتے ہو۔ اتنی دور کی سوچ رہے ہو۔“

”شاہین... دنیا بھر میں باپ کا کام بچے سنبھالتے

ہیں۔ کام کچھ بھی ہو۔ کوئی دکان ہو یا امپورٹ ایکسپورٹ کا

بزنس... ورکشاپ ہو یا کارخانہ۔“

شاہین مسکرائی۔ ”وقار تمہاری ورکشاپ کو سنبھالے گا

ہی نہیں، ترقی دے کے آٹو انڈسٹری بنا دے گا۔“

گلو نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ ”کیسے؟“

”کیسے... اپنی صلاحیت سے۔ محنت اور ہمت سے۔“

گلو مسکرائے لگا۔ ”بیوی... آدمی جس کام میں ہاتھ

ڈالے وہ اسے آنا چاہیے۔“ دیکھو... میں سمجھ رہی ہوں تم کیا

کہنا چاہتے ہو... لیکن یہ ناممکن ہے کہ وقار کسی مکینک کی

طرح تمہاری ورکشاپ میں کام کرے۔“

نے بی بی اے بی ایڈ کیا۔ اس وقت بھی شاہین ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ وہاں سے دوسرے اسکول میں گئی پھر تیسرے میں... یہاں تک کہ اسے ایک ایسے انگلش میڈیم اسکول میں جگہ مل گئی جہاں وہ وقار کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور ساتھ ہی واپس لاتی تھی۔ ٹیچر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی فیس بھی معاف تھی۔

وقار کے بعد دو لڑکیاں ہوئیں... گلو استاد دن رات محنت کرتا رہا اور اس کے نام کی ایک گڈول بن گئی۔ خرابی صرف ایک ہوئی لیکن جب گلو کو اس کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاہین اب اسی انگلش میڈیم اسکول میں سینئر ٹیچر تھی اور پرنسپل ہونے کی امید دار تھی۔ اس کی آمدنی تو گلو استاد کے برابر نہیں تھی۔ شاید اس کی نصف بھی نہیں تھی مگر اس کی عزت شہر کے ان تمام گھرانوں میں تھی جن کے بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے یا پڑھ چکے تھے، وہ سب اونچے عزت دار گھرانے تھے۔

یہ احساس گلو استاد کو ایک دن اچانک ہوا کہ اس کا اکلوتا بیٹا اس کا جانشین نہیں ہوگا۔ اور یہ سوال اس کے سامنے آکھڑا ہوا کہ جس کاروبار کو اس نے اتنی محنت سے کھڑا کیا تھا، ایک چھوٹی سی دکان سے پوری ورکشاپ بنا دیا تھا۔ اسے بعد میں کون سنبھالے گا؟

ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی... اس کی صحت بھی اچھی تھی اور وہ توقع رکھ سکتا تھا کہ اگلے بیس بائیس سال خود کام کر سکے۔ یہ ایسا کام نہیں تھا کہ شاگردوں پر چھوڑ کے وہ کسی ایرکنڈیشنڈ، صاف ستھرے اور آرام دہ آفس میں بیٹھ جائے۔ اس کے پاس کام کرنے والے بچے اور پرانے ہیلپر جو اب مکینک بن چکے تھے دن میں سو بار اس سے مدد کے طلبگار ہوتے تھے اور آواز لگاتے رہتے تھے کہ استاد... ذرا ایک نظر دیکھو... یہ کیا چکر ہے! اور اسے خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا پڑتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے... اسی لیے وہ استاد تھا... جو ورکشاپ میں استاد جتنے تجربہ کار ہو جاتے تھے وہ عموماً اپنا کام خود شروع کر دیتے تھے۔ ورکشاپ میں بچوں کے آنے، تربیت پانے، تجربہ حاصل کرنے اور بڑے ہونے پر چھوڑ کر چلے جانے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

اس کے علاوہ یہ چھوٹے بڑے سب موقع پاتے ہی ہاتھ کی صفائی بھی دکھا جاتے تھے۔ پرزے غائب کرنا یا کسی گاڑی سے کوئی چیز نکال لینا عام بات تھی۔ وہ اس پر سخت نظر رکھتا تھا اور کسی کو پکڑ لیتا تھا تو نکالنے سے پہلے اس کی کھال ادھیڑ دیتا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ دو چار مرتبہ اس نے



میں نے جو رشتہ آیا وہ لڑکا صرف ایک سلازمین تھا۔ دس بارہ ہزار کماتا تھا۔“

”آج دس بارہ کماتا تھا۔۔۔ ابتدا سب کی ایسے ہی ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ترقی نہیں کرے گا۔ براہ راست کسی فیکٹری کے ڈائریکٹر یا جنرل منیجر کا رشتہ تو آنے سے رہا۔“ گلو نے حلقی سے کہا۔

”اس کا باپ بھی ریلوے میں بکنگ کلرک تھا۔ دھرم پورے میں پانچ مرلے کے گھر میں رہنے والا۔“ گلو بڑ گیا۔ ”آخر تم کیا سوچ رہی ہو۔ ان کے لیے گلبرگ اور ڈیفنس میں رہنے والے کسی جنرل یا وزیر کا رشتہ آئے گا۔“

وہ تنگی سے بولی۔ ”نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں سوچ رہی۔ گلبرگ یا ڈیفنس میں رہنے والا کسی ملکیت کے گھر رشتہ لے کر کیوں جائے گا۔“

گلو کو سخت غصہ آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ ”جانتے بوجھتے میں ان کو کنویں میں دھکا نہیں دوں گی۔ آخر میں بھی ماں ہوں۔ ابھی انہیں پڑھنے دو۔“

”شاہین۔۔۔ عورتوں کی تعلیم بری چیز نہیں۔۔۔ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ میں ایسا نہ سمجھتا تو تمہیں کیوں پڑھنے دیتا۔ لیکن اب وقت کچھ اور ہے۔۔۔ اگر انہوں نے ایم اے کر لیا تو انہیں ایم اے پاس لڑکے نہیں ملیں گے۔۔۔ یونیورسٹیوں میں جا کے تو دیکھو۔ صرف لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ کہیں ساٹھ فیصد۔۔۔ کہیں اسی فیصد۔ یہی حال ڈاکٹری کا ہے۔ صرف لڑکیاں ڈاکٹر بن رہی ہیں مگر پریکٹس کتنی کر رہی ہیں۔۔۔ اکثریت ہاؤس وائف بن کے وہی کر رہی ہیں جو ایک میٹرک پاس لڑکی کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے باہر بھاگ رہے ہیں یا وزیروں، سفیروں، جنرلوں اور صنعتکاروں کے گھر داماد بن رہے ہیں۔“

شاہین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بحث لا حاصل تھی۔ گلو نے جو کہا غلط نہیں تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے وقت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کرنے دے۔ انہیں ایم اے نہ کرنے دے کیونکہ انہیں ایم اے پاس لڑکے دستیاب نہ ہوں گے۔ گلو نے ایک دن اپنے بیٹے وقار سے بات کی۔

”تمہارا ایف ایس سی کارڈ لٹ آنے والا ہے۔“

”یس پاپا۔۔۔ اسی ہفتے میں۔“

”اس کے بعد تم کیا کرو گے؟ میرا مطلب ہے کیا پڑھو گے؟“

”میں انجینئر بنوں گا۔“

”ویری گڈ۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم آٹو موبائیل انجینئر بن لو۔“

وہ ہنسا۔ ”نو دے پاپا۔۔۔ آپ اس طرح مجھے موٹر ملکیت نہیں بنا سکتے جو آپ کی ہمیشہ سے خواہش تھی۔“

”ملکیت اور انجینئر میں فرق ہوتا ہے۔“

”صرف نام کا۔۔۔ آٹو انجینئر بن کے بھی مجھے کرنا تو وہی پڑے گا جو آپ عمر بھر کرتے رہے۔ مجھے آپ کی ورکشاپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

وہ بڑ گیا۔ ”آج تم جو بھی ہو اسی کی کمائی سے ہو۔ میں چاہوں تو دس آٹھ انجینئرز کو ملازم رکھ لوں۔“

”ان دس میں سے میرا نام کاٹ دیں۔“

گلو نے ایک اور کوشش کی۔ ”تم اس ورکشاپ کے مالک بنو گے۔“

”پاپا۔۔۔ ایک طوائف کی بیٹی اگر پڑھ لکھ کے وہی کام کرنے لگے جو ماں کرتی تھی۔“

گلو کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ وقار پر بہت چیخا چلایا مگر وقار نے اسے صاف بتا دیا کہ وہ سول انجینئر بننے پڑے گا اور ورکشاپ میں کبھی قدم نہیں رکھے گا۔ وہ اٹکوتا بیٹا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ باپ جب تک زندہ ہے ورکشاپ کی آمدنی ملتی رہے گی۔ جس دن وہ نہ رہا ورکشاپ کوئی خرید لے گا اور اس کے بہت اچھے پیسے ملیں گے۔

گلو کے لیے صبر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس کی دونوں بیٹیوں نے جو جڑواں تھیں ایم اے کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا اور ان کے فیشن دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی موٹر ملکیت کی بیٹیاں ہیں۔ ابھی تک وہ اسی گھر میں رہتے تھے جو ورکشاپ کے عقبی حصے والے احاطے میں پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا لیکن اس کا راستہ پچھلی گلی سے تھا۔ گلو نے پہلے اس پر ایک منزل تعمیر کی تھی۔ بعد میں دوسری کا اضافہ کیا۔ اس میں جگہ کم نہ تھی مگر یہ پرانے شہر کا علاقہ تھا۔ بچے اب کسی پوش علاقے میں رہائش اختیار کرنے کے حق میں تھے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب گھر کے ساتھ گلو اپنی ورکشاپ کو بھی فروخت کر دے۔۔۔ پوش علاقوں میں مکان بہت مہنگے تھے۔

ورکشاپ ان کے عیش و آرام کی ضامن تھی۔ اس کی بیوی کو ایک دن ریٹائر ہونا تھا۔ پرائیویٹ اسکول سے کوئی پنشن بھی نہ ملتی تو گزرا صرف ورکشاپ کی آمدنی سے ممکن

تھا۔ اسے بچنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جو پس انداز کیا تھا وہ اپنے مستقبل کے لیے تھا۔ اسے بیٹیوں کی شادی کی فکر تھی اور اپنی طرف سے اس کی تیاری مکمل تھی۔

ایک اندازے کے مطابق اس کے مکان کی قیمت بائیس چوبیس لاکھ تھی تو ورکشاپ کی جگہ اور گڈول اس سے ڈیڑھ گنی۔ اگر ستر پچاس لاکھ سے وہ دس مرلے کا مکان کسی ماڈرن آبادی میں لے بھی لیتے تو وہاں کے معیار زندگی پر رہنے کے لیے اخراجات پورے کرنا ناممکن ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی بچوں کی طرف سے دباؤ کے باوجود وہ ورکشاپ کے معاملے میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”اسے بیچ کے میں بے روزگار نہیں ہو سکتا۔ جس دن بیٹا تمام اخراجات اٹھانے کے قابل ہو گیا اس دن دیکھیں گے۔“

پھر وہ ہوا جو ناقابل تصور تھا۔ چانگ موٹر وے بنی اور لنک روڈ بنانے کے منصوبے میں وہ سڑک آگئی جس پر گلو کی ورکشاپ تھی۔ اسے نوٹس مل گیا کہ فلاں تاریخ تک ورکشاپ ہٹالے۔ اس کے بعد سرکاری مشنری اسے گرا دے گی۔ وہ ساری جگہ نئی سڑک بنانے کے لیے صاف کی جا رہی تھی۔

گلو کرائے کے ایک مکان میں شفٹ ہو گیا اور خود ورکشاپ کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ یکھت اس ورکشاپ کی قیمت پچاس لاکھ سے پانچ ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرح سے ناجائز تعمیر تھی جسے کبھی آبادی کی لیز مل گئی تھی۔۔۔ اب سرکاری طرف سے جو معاوضہ دیا جا رہا تھا وہ اس کا دس فیصد بھی نہیں تھا۔ گلو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاہور جیسے شہر میں وہ پانچ لاکھ لے کر کیا کرے گا۔ اس قیمت میں تو شہر کے مرکزی اور کاروباری علاقے میں ایک مرلہ زمین بھی نہیں ملتی۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں کی گڈول اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی بڑی ورکشاپ کو کسی غریب آبادی یا غیر معروف گلی میں منتقل کرنا عملاً ناممکن تھا۔ ہر نئی جگہ پر کاروبار بھانے میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ یہاں کے لگے بندھے گا ہک وہاں کیوں آنے لگے۔ وہ چلے جائیں گے جہاں سہولت ہوگی، ہر جگہ پرانے ورکشاپ پہلے سے موجود ہیں۔

حکومت کے اس فیصلے کے خلاف نہ داد بھی نہ فریاد۔ نہ کسی عدالت انصاف میں اپیل کہ معاوضہ بہت کم ہے۔ سرکاری مہلت بھی تمام ہونے والی تھی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ورکشاپ کا سارا ساز و سامان اونے پونے بیچ دیا جائے۔ اس کے پاس تو اس کباڑ کو رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ وقار کے سول انجینئر بننے کی ڈگری لینے تک حالات

چار سمت ایک چور اھا

انتہائی دگرگوں ہو چکے تھے، آمدنی نہ ہونے کے باعث پس انداز کیا ہوا سرمایہ دھوپ میں رکھی برف کی طرح کم ہونے لگا تھا، بے کاری نے گلو کو خود اپنی نظر میں بے وقعت کر دیا تھا۔۔۔ وہ سارا دن پڑا سوچتا رہتا تھا کہ کیا کرے جس سے اس کا گھر پہلے کی طرح چلنے لگے۔۔۔ اس کے نام کی ایک گڈول تھی۔۔۔ ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی دوسرے کی ورکشاپ میں کام مانگنے جائے۔ وہ نفسیاتی مریض بننا چاہتا تھا، بیشتر وقت وہ سوتا رہتا تھا یا کھلی آنکھوں سے خلا میں گھورتا رہتا تھا۔ گیراج میں ہر وقت چائے چلتی تھی۔ اب وہ گھر میں طلب محسوس کرتا تھا تو اسے چائے بنانے دینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ غصے میں چیخا چلاتا تھا اور برتن توڑتا تھا۔۔۔ سگریٹ وہ پہلے ہی پیتا تھا، اب سکون کی خاطر اس نے نشے کا سہارا لیا اور بہت جلد اس کا عادی ہو گیا۔

وقار اپنی ڈگری کے ساتھ جہاں بھی انٹرویو دینے گیا وہاں کوئی سفارشی پہلے ہی منتخب ہو چکا تھا۔۔۔ دو جگہ اس سے لاکھوں میں رشوت مانگی گئی اور کہا گیا کہ لاکھوں دیے بغیر کروڑوں کماتے کا سوچنے والا خود احمق ہے یا ساری دنیا کو احمق سمجھتا ہے۔۔۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وقار کی توقعات کا مینار زمین بوس ہونے لگا۔ گھر کے حالات متقاضی تھے کہ وہ فوری طور پر کچھ کمائے۔۔۔ اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کو کیش کرائے، ورنہ نہ کاغذ کے اس کلرز کو پھاڑ پھینکے اور کسی ریڑھی پر دی بھلے بیچے۔ اسٹیشن پر قلی بن جائے یا رکشا چلائے۔

آخری بار جب اسے انٹرویو کے لیے ملک اینڈ برادرز نے لیٹر جاری کیا تو وہ طے کر چکا تھا کہ یہ بالکل آخری بار ہے۔۔۔ وہ صبح ٹھیک وقت پر پہنچا تو آفس میں سوائے ایک چوکیدار اور چیر اسی کے کوئی بھی نہ تھا۔۔۔ اسے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ پھر کنسرکشن کمپنی کے مالک اپنی لمبی چوڑی قیمتی دکانی کار میں تشریف لائے۔ وقار کو حیرانی یہ تھی کہ آج یہاں انٹرویو دینے والوں کا اڑھام تھا مگر اسے فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔

”ہاں بھی وقار احمد۔۔۔ تو گلو استاد کا بیٹا ہے نا؟۔۔۔“ ملک صاحب نے کسی نخوت کے بغیر کہا۔ ”دس ہزار مہینہ پر نوکری کرنا ہے تو یہ ہے تیرے بیٹھنے کی جگہ، ابھی بیٹھ جا۔“

☆☆☆

وقار نے صوفے پر پڑے ہوئے گوشت کے عظیم الشان ڈھیر کو دیکھا۔ ابھی تک اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔ ”دس ہزار! سر آپ جانتے ہیں میں ایک کوالیفائیڈ



سول انجینئر ہوں۔“

گوشت کے پہاڑ میں حرکت ہوئی۔ ”اودیکھ یار... یہ جو باہر بیٹھے ہیں نا... یہ سارے ہی سول انجینئر ہیں۔ اور تیرے سے پہلے جو آئے تھے ان کے پاس بھی ڈگری تھی۔“ ایک خوشامدی بچے نے کہا۔ ”آج کل تو ملک صاحب یہ حال ہے کہ پتھر پٹاؤ تو نیچے سے لکھتا ہے انجینئر یا ڈاکٹر۔“ دوسرے بچے نے ارشاد کیا۔ ”ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا۔“ ملک صاحب نے غرا کے کہا۔ ”چپ کر اوئے شاعر دے پتر۔“

وقار کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ ”اشتہار میں لکھا تھا کہ ایک ملٹی نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کے دوسرے تعمیراتی پروجیکٹ کی نگرانی۔“

”اوئے آہو... تو نے دیکھا ہوگا اودھر لہری کے پاس ملٹی اسٹوری پروجیکٹ پورا ہو گیا ہے۔ اس کا ڈیزائن بنایا ہے ایک غیر ملکی کمپنی نے۔ تعمیراتی ٹیم کا بھی دعویٰ کی ایک کمپنی کا ہے۔ راج مزدور سے چیف انجینئر تک سارے بندے ان کے ہیں۔“

”وہ دعویٰ والی کمپنی ملک صاحب کی ہے۔“ پہلا چچہ بولا۔

”ملٹی نیشنل تو ہوگئی... کراچی اور دہلی۔“ دوسرے نے کہا۔

”ملک نے کہا۔“ یہ ہمارا دوسرا پروجیکٹ ہے۔ پبلک کو امپریس کرنے کے لیے حوالہ تو دینا پڑتا ہے کہ ہم پہلے کیا کر چکے ہیں... اب ہم پانچ اور دس مرحلہ کے چھوٹے رہائشی یونٹ بنارہے ہیں۔ اودھر ملتان روڈ پر۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کام کہاں ہے... اور کیا ہے۔ میں کام کر کے دکھانا چاہتا ہوں... مگر دس ہزار! ملک ہنسا تو گوشت کا ڈھیر ملنے لگا۔ ”دیکھ کا کا دس ہزار میں تجھے کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ کام کرنے والے راج مزدور سارے پرانے تجربہ کار لوگ ہیں۔ انہیں نہ کسی لالیفائیڈ ڈرافٹ مین کے بنائے ہوئے نقشے کی ضرورت ہے، نہ انجینئر کی۔“

پہلا چچہ بولا۔ ”اودھر تو بندے کاغذ پر نقشہ بنا کے لاتے ہیں۔ اتنے کمرے ہوں گے، اودھر کچن ہوگا، اودھر ڈرائنگ۔ وہ ایک نظر ڈال کے کہتے ہیں کہ بن جائے گا۔“ ”کتنا سہرا ہوگا، کتنا سینٹ اور کتنی ریت۔ سب پتا ہوتا ہے ان کو۔“ دوسرا چچہ بولا۔

”پھر میری کیا ضرورت ہے آپ کو...“ وقار نے کہا۔

”تو بیٹھ اودھر سائٹ آفس پر۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرہ ہے۔ صوفے لگے ہیں۔ کارپیٹ ہے۔ ایک بڑی چمک دمک والی چھمک چھلو بھی تیرے سامنے ہوگی، ڈیکوریشن پس۔ وہ فون کال ریسپونڈ کرتی ہے اور تجھے چائے بھی بنا کے دے گی۔“

”ہر خدمت بجالائے گی۔“ پہلا چچہ بولا۔ ”دن ہو یا رات۔“

”بس خدمت کے حساب سے معاوضہ لے گی۔“ ”لا حول ولا قوۃ... میں چلتا ہوں۔“ وقار اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک نے چچوں کو ڈانٹا۔ ”تم چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اپنے وقار صاحب... جو لوگ اودھر آئیں گے۔ ان کو بتایا جائے گا کہ آپ ہو چیف انجینئر... باہر سے ڈگریاں لے کر آئے ہو۔ منصوبہ آپ کی نگرانی میں مکمل ہوگا۔ اس سے اعتبار قائم ہوتا ہے کہ کوالٹی کنٹرول ہے۔ آپ انہیں قائل کرو گے کہ تعمیرات کا معیار وہی ہے جو یورپ میں اور امریکا میں ہے۔ نام بھی ہم نے یورپین ہو مزرکھا ہے۔“

”لیکن درحقیقت ہوگا کچھ بھی نہیں۔ آپ ریت کی دیواریں کھڑی کر دو گے۔ پانچ سوت کی جگہ تین سوت کا سر یا ڈالو گے۔ باہر سے لیپ پوت کے رنگ روغن سے ڈیزائن میں چمک دمک پیدا کر دو گے... اور پائیداری کا سرٹیفکیٹ لو گے مجھ سے۔“

”دیکھ کا کا... اتنا ٹائم تیرے ساتھ اس لیے ضائع کیا ہے میں نے... کہ تیرا باپ چنگا بندہ ہے۔ اپن اودھر سے ہی گاڑی ٹھیک کرواتے رہے ہمیشہ... اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ورنہ بندے کیا کم ہیں۔ تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔“ ملک نے بے رخی سے کہا۔

وقار باہر نکل آیا۔ غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا... گزشتہ چھ ماہ میں اس نے درجنوں جگہ اپلائی کیا تھا۔ اگر کہیں سے کال آئی تھی تو وہاں ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ بالکل ان پڑھ اور جاہل لوگ جو کبھی ریت کی تنگاری اٹھاتے تھے اور بعد میں راج بن گئے تھے آج بلڈز کہلاتے تھے اور کنسٹرکشن کمپنی کے مالک تھے۔ کوئی فائینڈ انجینئر کسی کو ضرورت تھی تو محض دکھانے کے لیے۔ ٹھپا لگوانے کے لیے یا قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔ اصل کام ویسے ہی لوگ کر رہے تھے جیسے کمپنی کے مالک تھے۔

دوسرے شعبوں میں بھی صورت حال مختلف نہ تھی۔ ان انجینئرز پر اس کے باپ جیسے لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ چھوٹے سے بڑے ہو کے میکانک اور پھر استاد کہلانے لگے تھے۔ الیکٹریکل انجینئرز پر کئی جگہ پر الیکٹریٹیشن رکھ لیے جاتے تھے کیونکہ یہ ہنرمند لیکن غیر تعلیم یافتہ کاریگر کم اجرت پر بدترین حالات میں کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ وہ کام درست ماحول یا کام کے مقررہ اوقات کار یا لیبر لاز کی بات نہیں کرتے تھے۔ مالکان کی زبان میں خخرے نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے۔

وقار کا دل اب گھر جانے کو نہیں چاہتا تھا... گھر اب پہلے سے بھی زیادہ ناقابل قبول جگہ ہو گئی تھی۔ اس کا باپ گھر میں بڑا رہتا تھا۔ بے کاری کے عذاب نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ ہیروئن کا نشہ بھی کرنے لگا تھا جو ہر پریشانی کے خلاف ایک عارضی پناہ گاہ بن جاتا تھا۔

اس کی ماں دیوار سے ٹیک لگائے اسکول کے سالانہ امتحانات کی رپورٹ بکس پر سائن کر رہی تھی۔ دو بیچ کم ہونے سے سوواٹ کا بلب بھی ٹھنڈا ہوا تھا اور کم روشنی میں اس کی آنکھوں پر بہت زور پڑ رہا تھا۔ وہ بار بار چشمہ ہٹا کے آنکھوں سے بہنے والا پانی صاف کرتی تھی۔ ماں اب تیزی سے بڑھاپے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے سارے شوق ختم ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے بنوانا، بیوٹی پارلر بنانا اور میک اپ کرنا سب چھوڑ دیا تھا۔ ہیئر ٹکرنہ لگانے سے اس کے بالوں میں اچانک سفیدی کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ وقار کو دیکھ کے ماں نے چشمہ اتارا اور آنکھیں صاف کر کے پوچھا۔ ”کیا ہوا...؟“

وقار نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”اتنی کم روشنی میں تمہاری آنکھوں پر زور پڑتا ہے ماں۔“ ”کام تو کرنا ہے... کل رزلٹ دیا جائے گا۔“

”تم دوسرا چشمہ بنوا لو۔“ ”ماں نے دھکی لہجے میں کہا۔ ”کہاں سے بنوا لوں... پیسے رکھے تھے پرس میں... تمہارے باپ نے نکال لیے۔“ اس کے باپ نے ٹی وی پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ”میں نے نہیں نکالے۔“

”جھوٹ مت بولو... تمہیں ہیروئن کی طلب تھی۔“ وہ چیخ کے بولا۔ ”ہاں تھی... ہیروئن میری ضرورت ہے ساری عمر میں نے سب کی ضرورت پوری کی... جتنا مناسب تم پر لانا دیا۔“

وقار چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کی

چار سمت ایک چور ابا

چھوٹی بہن بہ ظاہر کتاب پر نظریں جمائے چپ بیٹھی تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے آنے والی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔ ”مجھے بتادیں کیا کروں۔ اب مجھے بارہ ہزار تنخواہ ملتی ہے، اس سے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا ہے۔“

”جب میری ورکشاپ تھی تو اس سے زیادہ ایک ہفتے کی کمائی تھی۔“

”وہ تو اب رہی نہیں... جو ورکشاپ کی جگہ کا حکومت نے دینے کا اعلان کیا تھا... وہ ملا نہیں تھیں۔“

”وہ کسی کو بھی نہیں ملا... میری ورکشاپ کا سامان بیچ کے جو رقم ملی تھی اور کہاں گئی؟“

”وہ گھر میں خرچ ہوئی اور کہاں... اس مہینے تو گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں ہوا۔ مالک مکان کب تک رعایت دے گا۔“

”گلو نے چیخ کے کہا۔ ”کرایہ کیوں ادا نہیں ہوا؟“ ”جلاؤ مت... تم جانتے ہو کرایہ بڑی ادا کرتی تھی۔ اپنی تنخواہ میں سے... اب اس نے شادی کر لی ہے... پہلے وہ استانی تھی۔ اب اسکول کی مالکن ہے مگر اسے تنخواہ نہیں ملتی۔“

دوسرے کمرے سے چھوٹی ایک دم اٹھ کے درمیانی دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ ”اگلے مہینے سے کرایہ میں دوں گی۔“

ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر ماں نے کہا۔ ”تو کہاں سے دے گی؟“

”میں نے نوکری کر لی ہے۔“

باپ چلایا۔ ”ہمیں بتائے بغیر۔“

”کہاں نوکری کی ہے؟“ ماں نے سوال کیا۔

”میں کنسٹرکشن آفیسر ہوں... ملک بلڈرز اینڈ ڈولپرز میں۔ بہت بڑی کمپنی ہے... ملٹی نیشنل۔“

وقار اٹھ بیٹھا۔ اسے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو اس سے کچھ دیر پہلے ملک کے آفس میں ایک چچے نے کہے تھے۔ ایک بڑی چمک دمک والی چھمک چھلو بھی تیرے سامنے ہوگی، ڈیکوریشن پس۔

اس نے دھاڑ کے کہا۔ ”تم وہ نوکری نہیں کرو گی۔“

چھوٹی نے پلٹ کے پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا تم نے نوکری کر لی ہے؟“

اور اس وقت وقار نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ڈگری کو جلا دے گا۔ بھول جائے گا کہ وہ انجینئر تھا۔ کیا فائدہ اس کا جب وہ گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں کر سکتا اور اس کی بہن کو ملک



کے آفس میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال ہونا پڑتا ہے... (اور بعد میں اس کی شرا و بھی پوری کرنی پڑتی ہیں) ☆☆☆

### تیسری سمت:

میں فٹ لے اور دس فٹ چوڑے ہال جیسے کمرے میں پچھلے تو تین تھے لیکن درمیان والے کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور اب اس کے عین نیچے لیٹنے والوں کو بھی ہوا نہیں ملتی تھی۔ لمبائی کے رخ بجھی ہوئی دو دریوں پر سولہ افراد سوتے تھے۔ نادر کے بالکل ساتھ عبداللہ دراز تھا جو اپنی بہت سی صفات کے باعث بودا، بدھا اور بدھو سب کچھ کہلاتا تھا۔ سائیکس دوست اور اس کا معاون خصوصی..... دہشت فورس کا چیف اور اصل سے بڑا شیطان جلال داد عرف جلاد۔ سب اسے بودا کہہ کے پکارتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایسا ہی تھا۔ احمق، سچی اور بے کار۔ وہ خود اپنے آپ کو بدھا کہتا تھا۔ مہاتما بدھ کے بارے میں اس نے نہ جانے کس سے سنا تھا کہ وہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور انہی کے آسن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا تھا تو ہر مسئلے کا حل نکال لیتا تھا۔ کہتا تھا مجھے گیان ہوا ہے۔ بدھو وہ ہرگز نہ تھا مگر نظر آتا تھا اور بنتا بھی تھا۔

نادر کے ساتھ اس کی یاری بہت پرانی تھی۔ ویسے تو سب ہی سمجھتے تھے کہ بودا ان کا دوست ہے لیکن نادر کے سوا اس نے کسی کو بھی اپنے دل کی بات نہیں بتائی تھی۔ جو اس کے دل میں ہوتا تھا، نہ بھی اس کی زبان پر آتا تھا نہ چہرے پر جذبات کا عکس بن کے عیاں ہوتا تھا۔

جب نادر کو یہاں لایا گیا تھا تو اس کی حالت جنگل سے پکڑے جانے والے شیر جیسی ہو رہی تھی جو بالکل فطری بات تھی۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا اور اپنے عزم کا چنگ چنچ کے اعلان بھی کیا تھا کہ وہ مرجائے گا یا سب کو مار کے نکل جائے گا لیکن یہ بے عزتی اور بے غیرتی کی زندگی قبول نہیں کرے گا۔ کم و بیش سب نو وارد ایسا ہی کہتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ کرنے لگتے تھے۔ جیسے جنگل کا شیر سرکس میں ایک اشارے پر کرتب دکھانے لگتا ہے۔

نادر کو اب بھی یاد تھا کہ ابتدا میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ اسے بھوکا پیاسا اور ننگا رکھا گیا تھا۔ تین دن تک وہ ایک پنجرے میں بند رہا تو اس کی ساری خونخواری نکل گئی۔ وہ ملی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ پہلے وہ پھولا ہوا غبارہ تھا مگر تین دن بعد ہوا نکلے جھپڑے کی طرح ہو گیا۔ پھر اسے سائیکس دوست کے سامنے لایا گیا۔

سائیکس دوست اس وقت پوری شاہانہ حکمت کے ساتھ ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ تخت پر سرخ قالین تھا اور سائیکس کے پیچھے سرخ ریشم کے غلاف والا گاؤنکیہ جس پر اس نے اپنی کہنی ٹکا رکھی تھی۔ اس نے بے داغ سفید کرتے شلوار کے ساتھ کندھے پر سفید ریشمی چادر ڈال رکھی تھی جو اس کے شانوں پر پین کردی گئی تھی چنانچہ اٹھتے بیٹھتے پھسلتی نہیں تھی۔ وہ بھاری بھر کم جسم والا طویل قامت اور پرہیزگار شخص تھا۔ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ سخت غصے میں یا پھر نشے میں ہے۔ اس کے سر پر سندھی کام والی رنگین دھاگوں اور شیشوں والی گول ٹوپی منڈھی ہوئی تھی جس کا پیشانی والا حصہ درمیان سے ٹکون کی شکل میں کٹا ہوا تھا... اس کی ڈاڑھی بہت گھنی اور مہندی رنگ کی تھی۔

سائیکس کے پیچھے اور دائیں بائیں اس کے خاص مرید کھڑے تھے جو سب کے سب سفاک نظر آتے تھے۔ جلال داد عرف جلاد نے اسے سائیکس کے سامنے ایسے پھینک دیا جیسے وہ انسان کا بچہ نہیں، قربان کیا ہوا جانور ہے۔ نادر میں چوٹ لگنے کے باوجود کراہنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ وہ فرش پر بچھے قالین پر اسی طرح پڑا رہا۔ تین دن تک مار کے سوا کچھ اور نہ کھانے سے اس کی جسمانی قوت صفر پر آگئی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے دم توڑ دے گا۔ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ پنجرے میں ہی نکل گیا تھا۔

سائیکس نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے سیدھا کیا۔ پھر اس کے اوپر اپنا پیر جوتوں سمیت رکھ دیا۔ نادر کے سینے پر وہ بوجھ کسی چٹان کی طرح تھا۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دباؤ سے اس کی ساری پسلیاں چمڑ ہو جائیں گی۔

”کیوں اوئے... کچھ عقل آئی یا ابھی اکڑ باقی ہے...“ سائیکس نے کہا۔

جلاد نے مسکرا کے کہا۔ ”سائیکس! اب تو صرف جان رہ گئی ہے... چاہو تو نکال دو۔“

سائیکس نے پھر سوال کیا۔ ”بول... مرنا چاہتا ہے تو قبر تیار ہے... گاڑ دیں اسی حالت میں۔“

حیرت انگیز طور پر نادر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے مرنا قبول نہیں کیا جیسا کہ اس کا ارادہ تھا اور اس نے اعلان بھی کیا تھا۔ تب سے اب تک وہ زندگی کے لیے مسلسل سمجھوتے کرتا چلا آ رہا تھا۔ سائیکس نے ٹھوکر مار کے اسے دور کیا تھا اور جلاد نے اسے اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اگلے تین



دن اس کی بہت خاطر داری ہوئی تھی۔ پہننے کے کپڑوں کے علاوہ اسے اچھی خوراک دی گئی تھی اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اٹھ کر کھڑا ہو سکے۔

نادر کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ اسے اپنی پہلے والی زندگی کا ایک ایک دن یاد تھا۔ وقتی طور پر اس نے ہارمان لی تھی کیونکہ اس کا جسم ہار گیا تھا۔ طاقت بحال ہوتے ہی اس کی ذہنی توانائی بھی واپس لوٹ آئی۔ سائیکس دوست کے ڈیرے پر کیا ہوتا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ تربیت کے تمام عرصے کے دوران اس پر سخت پابندیاں تھیں۔ وہ ہر جگہ نہیں جاسکتا تھا۔ ہر ایک سے نہیں مل سکتا تھا۔ فرار ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جگہ زیر زمین تھی اور اوپر بھی آستانہ عالیہ کے گرد جیل خانے جیسی بلند دیواریں تھیں۔ مقفل دروازے کے اندر باہر مسلح پہرے دار ہر وقت متعین رہتے تھے اور چڑیا کا بچہ بھی اندر بلا اجازت پر مارنے کی کوشش کرے تو وہ اسی طرح گولی مار سکتے تھے جیسے اندر سے باہر جانے کی ناجائز اور غیر قانونی کوشش کرنے والے کو۔ قانون وہاں سائیکس دوست کا چلتا تھا۔

پہلے پہل اسے نقل و حرکت کی محدود اجازت ملی تو کچھ اسی کی عمر کے لڑکے بھی اس سے ملنے آتے۔ جو درحقیقت بھیجے گئے تھے۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز میں ایک ہی بات کہی۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اس میں جان جائے گی۔ تعاون کرنے میں بڑا فائدہ ہے۔ ہم جب آئے تھے تو تم جیسے ہی تھے لیکن بعد میں کوئی بھی لوٹ کے اپنے گھر نہیں گیا۔ حالانکہ پوری آزادی تھی۔

عبداللہ واحد لڑکا تھا جس نے اسے چپکے چپکے بتایا کہ تمہارے پاس آنے والے سب سائیکس کے بھیجے ہوئے غلام تھے اور سب بکواس کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بعد میں واپس جانا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ بہت سے لڑکے موقع ملنے ہی فرار ہو گئے اور بہت سے پکڑ کر واپس بھی لائے گئے۔ کئی جلاد کے ہاتھوں تشدد کے باعث ہلاک بھی ہوئے۔ ان کی قبریں آستانہ عالیہ کے پچھواڑے ان کھیتوں میں جہاں سبزی کاشت کی جاتی ہے۔ نادر بہت پر امید ہو گیا۔ ”میں بھی بھاگ جاؤں گا اور کبھی ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔“

”ابھی سے اعلان مت کرو۔ کیا پتا تم نہ جاسکو۔ کیا پتا پکڑے جاؤ کیا پتا مارے جاؤ۔ بس چپ کر کے دیکھو۔ سوچو اور سمجھو۔ یہ آج کے بدحا کے تین اصول ہیں۔“

”بدحا کون ہے؟“

”میں... آج کا بدھا۔“ وہ ہنسا اور مہاتما بدھ کے آسن میں آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے زیر لب بولنے لگا۔ ”یاد رکھو آدمی کی طاقت اس کی عقل ہے۔ بے وقوف بن کے دنیا کو بے وقوف بناؤ۔ صرف اپنے لیے جیو۔ یہ ہیں زندگی گزارنے کے تین اصول۔“

وہ ایسی عجیب و غریب باتیں کرتا تھا اور ہمیشہ تنہا رہتا تھا۔ ایک طرف اسے سائیکس دوست اور اس کے چیلوں کا اعتماد حاصل تھا تو دوسری طرف وہاں لائے جانے والوں کی اکثریت اسے اپنا دوست سمجھتی تھی۔ اس کی عمر نادر سے دو تین سال زیادہ ہوگی لیکن وہ گورا چٹا خوبصورت لڑکا تھا جو ہر وقت بناٹھنا، بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگائے پھرتا رہتا تھا۔ اسے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی اور نادر نے محسوس کیا کہ جلا بھی اس کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا۔ نادر کو آستانہ عالیہ پر دوسرا ہفتہ تھا اور عملاً اس کی تربیت کا آغاز ہو چکا تھا کہ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے عبداللہ نے اس سے پوچھ لیا۔ ”تم کہاں سے لائے گئے ہو؟“

نادر نے اسے اپنے گھر اور گاؤں اور پھر اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتایا۔ بتاتے بتاتے وہ رونے لگا۔ اسے وہ سب لوگ بہت یاد آتے تھے جن سے وہ بچھڑ گیا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گاؤں، اپنا کچا مکان اور اپنے دوست، سب سے بڑھ کر اپنی ماں۔

”ہم تو بہن بھائی تھے۔“ اس نے عبداللہ کو بتایا۔

”میرا نمبر چوتھا یا پانچواں تھا۔“

بودا ہنسنے لگا۔ ”تجھے یہ بھی یاد نہیں۔“

”دراصل... چوتھا کوئی اور تھا... میرا بڑا بھائی۔“

ماں تو کہتی تھی کہ وہ مر گیا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔

”کیا وہ زندہ تھا۔“

”جانتا نہیں... میری دادی نے مجھے بتایا کہ تیری ماں ڈائن ہے۔ کھا گئی اسے، بیچ دیا صرف پانچ سو روپے میں۔“

”کس کو بیچ دیا؟“

”جب میں نے دادی کی بات ماں سے کی تو ساس

بہو کی خوب لڑائی ہوئی۔ میری ماں ٹکڑی تھی اسی لیے ساس

کو پکڑ کے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے منہ پر تھوکا۔ دادی

نے اسے خوب کوسا اور خوب گالیاں دیں۔ اور بعد میں رورو

کے بتاتی رہی کہ شہر سے کوئی آیا تھا۔ ان کو نئے پیدا ہونے

والے بچے کی ضرورت تھی۔ دادی کو اس نے بتایا کہ انہوں

نے پانچ سو دیے تھے مگر یہ جھوٹ تھا۔ اس نے پورے ہزار

لیے تھے۔“

چار سہمت ایک چوراہا

”ہزار روپے میں اس نے اپنا بچہ بیچ دیا۔۔۔“

”کیوں؟“

”جانتا نہیں... جب شام کو میرا باپ گھر آیا تو اس نے

ماں کو بھی مارا اور دادی کو بھی گالیاں دیں کہ تیری زبان کاٹ

کے چھینک دوں گا۔“ نادر نے کہا۔ ”میری ہمت نہ پڑی کہ

اس سے کوئی سوال کرتا کہ جھوٹ کون بول رہا تھا اور بیچ

کون... لیکن بعد میں مجھے معلوم ہو گیا۔ دادی کا الزام غلط

نہیں تھا۔ ماں نے شوہر سے پوچھ کے بچہ دیا تھا۔“

عبداللہ دم بخود رہ گیا۔ ”ایسی کیا آفت تھی؟“

”ماں نے خود مجھے روتے روتے بتایا، میرے باپ

کو دو ہزار کا قرضہ چکانا تھا۔ زمیندار نے کہا کہ اس سال

سارا قرضہ ادا نہ کیا تو تیری بیٹی لے لوں گا۔ میری سب سے

بڑی بہن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی اور اگر میرے بڑے

بھائی کا سودا نہ ہوتا تو پھر بڑی بہن کا ہوتا۔ وہ زمیندار کے

گھر میں رہتی۔ وہ پینتالیس سال کا ہٹا کنٹا مرد تھا۔ میری

بہن تو مرجاتی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ ایسے میں

اچانک قدرت نے ان کی مدد کی۔ شہر سے کوئی بندہ آیا، اس

نے ماں کو برساتی ٹالے پر کپڑے دھوتے اور نہاتے

دیکھا۔ میرے بڑے بھائی کی پیدائش سے چند دن پہلے

اس نے کسی سے معلوم کیا اور جس دن بچہ پیدا ہوا اس دن

گھر آ گیا۔ میری ماں کی صحت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اسے

کافی عرصے سے بادی کا بخار تھا۔ اس کی چھاتیوں میں

دودھ ہی نہیں اترتا تھا۔ اس بندے نے دو ہزار میں بچہ خریدنا

چاہا اور کہا کہ اسے ایک امیر آدمی گود لینا چاہتا ہے جس کے

بچے نہیں ہوتے۔ میری ماں نے اسے گالیاں دیں اور باپ

نے بھی دھکے دیے مگر دو سے بڑھ کر وہ پانچ پر آ گیا تو

میرے ماں باپ دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ پانچ ہزار تھے

جو میری دادی نے پانچ سو سنے۔ ماں کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا

وہ آرام سے تو رہے گا۔ اچھا کھائے گا، اچھا پیے گا۔ اسکول

جائے گا، مگر وہ رونی بھی بہت تھی۔“

”کسی نے اس بندے سے پوچھا نہیں کہ گود لینے والا

کون ہے، کہاں رہتا ہے؟“

”نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب چھوڑ دیجیے خاموشی

سے میرے حوالے کر دو اور بس... اور اس طرح دیکھا

جائے تو ہم تو بہن بھائی نہیں تھے۔ چودہ تھے۔ پانچ بہنیں

اور نو بھائی۔“

”کیا... ہر سال کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا؟“

”ایسا ہی ہوگا۔ میرے باپ نے زمیندار کا سارا

قرضہ چکا دیا۔ وہ بہت مایوس ہوا اور گرم بھی کہ حرام زادے

اتنے پیسے کہاں سے لایا تو؟ کیا کڑی بیچ دی زیادہ پیسوں

میں۔ میرے باپ نے کہا کہ کڑی خیر سے گھر میں ہے۔

آکے دیکھ لے۔ اور پیسہ میں کہاں سے لایا اس سے تجھے کیا۔

میرے ماں باپ نے تو یہی مشہور کیا تھا کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا

تھا۔ اس کا جنازہ نہیں ہوا۔ ہم نے خود ہی دفن دیا۔ لیکن بعد

میں ساس نے بہو کے خلاف یہ الزام بھی نشر کر دیا۔ لوگوں

نے برا بھلا کہا مگر پھر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد والے دو

بچے واقعی مر گئے مگر میرے باپ نے دولڑکے اور بیچے۔“

عبداللہ پھر بھونچکا رہ گیا۔ ”اسے لالچ پڑ گیا تھا؟“

”ایسا ہی ہوگا... مجھے نہیں معلوم کہ خریدار وہی تھا یا کوئی

اور۔ اور میرے باپ نے ہر بچے کی کیا قیمت وصول کی۔“

”اسے زیادہ ہی قیمت ملی ہوگی۔ اولاد رینہ کی مانگ

بہت ہے اور وہ بھی تجربہ کار ہو گیا تھا، اس کا تو اچھا بزنس بن

گیا ہوگا۔ تیری ماں ہر سال ایک بچہ دے اور وہ بچہ پانچ

دس ہزار دے جائے۔“

نادر نے سر ہلایا۔ ”نہیں یار... پندرہ ہواں بچہ جتنے

وقت وہ مرتے مرتے بچی تھی اس کی صحت بالکل جواب

دے چکی تھی۔ ڈاکٹر نے بچے روک دیے۔“

”تجھے غصہ نہیں آتا ان پر... اپنے ماں باپ پر۔“

”شاید وہ مجبور تھے۔ اتنے بچوں کو کیسے پالتے؟ ہم

ایک کمرے میں سوتے تھے تو ایک دوسرے پر چڑھ جاتے

تھے۔ ایک وقت کھاتے تھے ورنہ ہمیں آزادی تھی کہ جہاں

سے چاہیں پیٹ بھر لیں۔ مانگ کے کھالیں یا چراگے۔

ہمارے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر جی ٹی روڈ

تھی۔ ہم وہاں چلے جاتے تھے اور آتی جاتی گاڑیوں کے

مسافروں سے ہاتھ جوڑ کے کچھ مانگتے تھے۔ بعض اوقات

کوئی سکے یا نوٹ پھینک دیتا تھا۔ ہم اسے اٹھانے دوڑتے

تھے۔ اصول یہ تھا کہ جو پہلے اٹھالے۔ انہی دنوں میں میرا

ایک بھائی کار کے نیچے آ گیا تھا۔ وہ مرا تو نہیں لیکن اس کی

دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑیں۔ کار والا اسے شہر لے گیا تھا۔

وہاں بڑے اسپتال میں اس کو چھوڑ کے بھاگ گیا۔“

”پھر وہ گھر کیسے واپس آیا۔“

”گھر کہاں آیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا کسی

نے۔ گاؤں کے کسی شخص نے دیکھا تو میرے باپ کو بتایا۔

اس نے کہا کہ اسے واپس لانے کا کیا فائدہ۔ میں نے یہ بھی

سنائے کہ کبھی کبھی میرا باپ اس کے پاس شہر جاتا تھا اور وہ

باپ کی مدد کرتا تھا۔ اسے بھیک میں اچھے پیسے ملتے تھے۔“



عبداللہ نے کہا۔ ”اور اس کے باوجود تو واپس جانا چاہتا ہے اپنے گھر... آخر کیوں؟“

”یار میں اپنے بہن بھائیوں کو اور ماں باپ کو کیسے چھوڑ دوں۔“

”تیری مرضی دوست۔ یہاں رہتا تو زیادہ عیش کرتا۔“ عبداللہ نے کہا۔ اور پھر نہیں کے بولا... ”یار میں تیرا بڑا بھائی تو نہیں ہوں۔“

نادر نے حیرانی سے کہا۔ ”تیری شکل تو مجھ سے بالکل نہیں ملتی۔“

”مجھے کچھ پتا نہیں میں کہاں سے آیا تھا... کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے تیرے ماں باپ سے خرید کے لائے ہوں۔“

آستانہ عالیہ پر سائیکس دوست کی پیری مریدی کا دھند الگ چلتا تھا۔ وہاں بے اولادوں کو اولاد، لڑکیاں جننے والی عورتوں کو اولاد دینے۔ قرض سے نجات اور ملازمت کے حصول تک ہر طرح کے تعویذ اور نقش بنائے دیے جاتے تھے۔ بہوئیں ساس کی موت مانگتی تھیں تو ساس بہو کو کالے جادو سے مارنا چاہتی تھی۔ سو کنوں کے معاملات الگ تھے۔ سائیکس دوست کے مشنڈے بھی خوب عیش کر رہے تھے۔ ان کے خصوصی چلے میں حاضری دینے والی کچھ بے اولاد عورتیں واقعی صاحب اولاد ہوتی تھیں اور کچھ نے بیٹے بھی جننے تھے۔ ظاہر ہے مراد پانے والوں کی پہلی زیادہ ہوتی تھی۔ نامرادوں کے پاس اپنی تقدیر کو الزام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

آستانہ عالیہ پر ایک یتیم خانہ بھی تھا جہاں فقیر بنائے جاتے تھے اور بچے اغوا کر کے لائے جاتے تھے۔ انہیں ٹریننگ دی جاتی تھی اور مختلف شہروں کے ٹھیکے داروں کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔ جلا یعنی جلال داد بچوں کو معذور بنانے کا ایکسرٹ تھا۔ وہ ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کے ایسے موڑتا تھا کہ وہ ریگنے والی عجیب کراہیت انگیز مخلوق نظر آتے تھے۔ خوبصورت بچے ویسے ہی شوقین مزاج خرید لیتے تھے۔ خود بود یعنی عبداللہ ایک ایسا ہی بچہ تھا جس کے اچھے پیسے مل سکتے تھے مگر سائیکس دوست کا اس پر دل آگیا اور وہ آستانہ عالیہ پر ہی رہا۔

معلوم نہیں نادر کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اسے بھی لنگڑا لولا پانچ بنا کے کہیں بھیج دیا جاتا لیکن اس موقع پر بودے نے دوستی کا حق ادا کیا اور اسے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے بچالیا۔ اس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ اندھا بن کے بھیک مانگے گا۔

نادر کی حالت غیر ہو گئی۔ ”کیا وہ میری آنکھیں لٹال دیں گے۔“

عبداللہ کا چہرہ سنجیدہ اور لہجہ مغموم ہو گیا۔ ”سوچ لے یار، تجھے کیا منظور ہے؟ لنگڑا معذور بن کے فٹ پاتھ پر پڑا رہنا... یا...“

”مجھے کچھ بھی منظور نہیں۔“ نادر نے چلا کے کہا۔ ”میں سب کو بارودوں کا اور خود بھی مر جاؤں گا، بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔“

بودے نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور نہیں پڑا۔ ”اوائے پاگل خانے... تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے اندھا بنانے کے لیے تیری آنکھوں میں لینسر لگا دیں گے۔ تیری آنکھوں میں سفیدی نظر آئے گی جیسے اندھوں کے ہوتی ہے۔“

نادر نے سکون کا سانس لیا۔ ”بودے... اگر میں بھاگ جاؤں؟“

”بھاگ جا...“ بودے نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جب میں بھیک مانگنے جاؤں گا تو کون ہوگا دیکھنے والا۔ یہ لوگ مجھے چھوڑ کے چلے جائیں گے۔“

بودا ہنسنے لگا۔ ”کہاں چلے جائیں گے۔ اب یہ ہر وقت ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ ان کی ہزار آنکھیں ہیں اور ہزار ہاتھ ہیں۔ تو جہاں جائے گا پکڑا جائے گا، کوشش کر کے دیکھ لے۔“

نادر نے اپنی طرف سے بڑی عاقلانہ کوشش کی... صبح جب بھکاریوں سے بھری گاڑی نکلتی تھی جسے بودا بھکاری ایکسپریس کہتا تھا جو ہر بھکاری کو شہر کے مختلف مقامات پر ڈراپ کرتی جاتی تھی۔ یہ سارے ٹھکانے طے شدہ تھے۔ یہاں کوئی دوسرا بھکاری نہیں آسکتا تھا۔ بھکاریوں کے ٹھیکے داروں کا آپس میں ایک کاروباری معاہدہ تھا جس کی رو سے انہوں نے ٹھکانے اور علاقے بانٹ رکھے تھے اگر کوئی ٹھیکے دار کوئی ٹھکانا لیتا چاہتا تھا تو متعلقہ ٹھیکے دار سے بات کر کے اس کی قیمت ادا کر دی جاتی تھی جو گنڈول کی طرح تھی۔ ٹھکانا زیادہ آمدنی والا ہے تو گنڈول بھی زیادہ... گنڈول کم زیادہ بھی ہوتی رہتی تھی مثلاً رمضان کے مہینے میں پارک اور میدانوں میں تراویح ہوتی تھیں تو آس پاس یا داخلے کے راستے پر۔ ان میں مساجد بھی شامل تھیں۔ بھکاری بہت کماتے تھے۔

نادر کے ساتھ ایک بچہ بھی رہتا تھا جو اس کی انگلی پکڑ کے چلتا تھا اور بڑا اٹھتا تھا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ وہ نادر کو مڑک بھی پار کرتا تھا۔ نادر کو یقین تھا کہ

ترتیب مکمل ہونے کے بعد اس کی اپائنٹمنٹ کرنے والے اب اس کی کارکردگی کا غور سے جائزہ لے رہے ہوں گے۔ محنت کرتا ہے یا کام سے جی چراتا ہے۔ پیسے تو نہیں مارتا۔

پورا ایک مہینہ نادر نے اعتماد سازی میں لگا دیا۔ اسے کافی حد تک خود مختاری بھی حاصل ہو گئی۔ دوبار ایسا ہوا کہ چھوٹا بیمار تھا تو وہ اکیلا ہی ڈیوٹی دیتا رہا اور اس نے معمول کے مطابق کمائی لا کے جلا دے ہاتھ میں رکھی۔ ایک بار بھکاری ایکسپریس کا انجن ٹپل ہو گیا تو وہ خود ہی بس میں بیٹھ کے آستانہ عالیہ پہنچ گیا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ نگرانی کرنے والے اس کی طرف سے بے شک ہو جائیں۔

بالآخر ایک دن نادر نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ دن بھر کی کمائی جیب میں ڈال کے وہ سیدھا ایک پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ اسے نا تجربہ کاری کے باعث یہ معلوم نہیں تھا کہ بھکاریوں کی مافیا کو بھی پولیس کی سرپرستی حاصل ہے۔ تھانیدار نے اس کی ساری بات سنی اور پھر اسے حوالات میں بند کر دیا۔ وہ چلاتا رہا کہ تھانے دار صاحب میرے ماں باپ کو بلائیں۔ مجھے کیوں بند کیا ہے۔ جواب میں اسے کہا گیا کہ اس کے ماں باپ کو بلانے کے لیے بندہ بھیج دیا گیا ہے۔ وہ رات تک آجائیں گے۔

حوالات میں کچھ پرانے پانی تھے تو کچھ نادر جیسے نوآموز۔ ایک تجربہ کار بوڑھے شخص نے جو تھانے دار کے عتاؤ کو دو سال سے بھگت رہا تھا نادر کی ساری کہانی سن کے آنسو سے سر ہلایا۔ ”تو نے بڑی غلطی کی یہاں آ کے بے وقوف۔ تو کیا سمجھتا ہے وہ تیرے ماں باپ کو بلائیں گے۔“

”کیوں نہیں بلائیں گے... تم دیکھ لینا۔ آج ہی رات کسی وقت پولیس آستانہ عالیہ پر چھاپا مارے گی۔ سائیکس دوست اور جلا سمیت سارے بد معاش پکڑے جائیں گے۔ وہاں جتنے لوگ قید ہیں سب ان کے خلاف گواہی دیں گے۔“

حوالات میں موجود سارے قیدی مسکرانے لگے۔ ”تو واقعی پاگل ہے۔ کون کی دنیا میں رہتا ہے۔“ ایک نے کہا۔ دوسرا بولا۔ ”وہ تجھے واپس انہی کے پاس لے جائیں گے۔ یہ سب پولیس سے ملے ہوتے ہیں جو ایسے دھندے کرتے ہیں۔“

بڑھے نے کہا۔ ”تجھے پولیس کی مدد لینا ہی تھی تو پہلے جاتا کسی وکیل کے پاس۔ کسی این جی او یا صحافی کے پاس۔ انہیں اپنی ساری کہانی سنانا۔ پھر شاید تیرا کام ہو جاتا۔“

چار سمت ایک چوراہا

”پھر اب میں کیا کروں؟“ نادر سخت مایوس ہوا اور گھبرایا۔

بڑھے نے کہا۔ ”دیکھ ابھی اخبار والا ایک بندہ آئے گا۔ وہ کرائم رپورٹر ہے۔ ویسے تو بہت سے کرائم رپورٹر بھی پولیس سے ملے ہوتے ہیں اور وہی خبر دیتے ہیں جو پولیس چاہے مگر ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے توجہ جائے۔“

بڑھے کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ اس کی ہدایات کے مطابق نادر نے کرائم رپورٹر کو دیکھتے ہی واویلا مچا دیا اور اس کا نام لے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے حوالات کے باہر کھڑے ہو کے نادر کی ساری بات سنی اور بولا۔ ”اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ تمہیں والدین سے ملانے کی ذمہ داری میری۔ لیکن تمہیں سائیکس دوست کے خلاف کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم صرف اتنا کہو کہ والدین سے بچھڑ گئے تھے۔ تم شہر آئے تھے ان کے ساتھ۔“

نصف شب کے بعد جلا دو سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ نادر کی روح فٹا ہو گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ صحافی کا سہارا لینا بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ شاید اس نے کوئی دوسرا مول نہیں لیا اور یونہی جان چھڑائی یا پھر وہ بھی پولیس سے ڈر گیا۔ جلا حوالات کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور اسے گھورتا رہا مگر کچھ بولا نہیں اور واپس چلا گیا۔ نادر کو یقین تھا کہ اب اسے واپس اسی جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اگلے دن نادر کو تھانیدار کے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں ایک چچی ڈاڑھی والا لمبوتر شخص ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مرد کی عمر شاید پچاس پچپن برس تھی عورت کی اس سے نصف۔ وہ بڑی بنی ٹھنی اور میک اپ تھوپے بیٹھی تھی۔

تھانیدار نے نادر کے داخل ہوتے ہی کہا۔ ”دیکھو... یہ ہے تمہارا بیٹا۔“

مرد نے پلٹ کے دیکھا اور چلایا۔ ”نادر... میرا پتر۔“ اسے گلے لگانے کے لیے لپکا۔

نادر نے اسے دھکیلا۔ ”کون ہو تم۔ میں تمہیں نہیں پہچانتا۔“

مرد رونے لگا۔ ”اوائے نا پتر... ایسا مت کہہ۔ میں تیرا ابا ہوں۔ کیا ہوا اگر میں نے دوسری شادی کر لی۔ تیری ماں کے مرنے کے بعد۔“

”یہ جھوٹ بولا ہے۔ یہ میرا باپ نہیں ہے۔“ نادر چلاتا رہا۔



تھانیدار نے نادر کو واپس بھیج دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جسے اس نے بھیج دیکھا نہیں آخر کیوں اسے اپنا باپ منوانے پر تیار ہوا تھا۔ یقیناً اس میں کوئی چکر تھا۔ بڑھے کی حالت اس رات بہت ابتر تھی۔ اس پر تشدد ہوا تھا اور لگتا تھا وہ مرجائے گا۔ اس نے نادر کو سمجھایا کہ وہ پولیس کی دشمنی مول نہ لے۔ جو شخص اس کا جعلی باپ بن کے آیا تھا وہ یقیناً سائیں دوست کا آدمی ہوگا۔ نادر کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہ اسے واپس آستانہ عالیہ پر پہنچا دے گا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ نادر نے بے بسی سے کہا۔  
”انتظار کر پتر... اللہ کوئی سبب پیدا کرے گا۔“

بڑھا بولا۔  
”اس صحافی نے بھی کچھ نہیں کیا۔“  
”اگر میں زندہ یہاں سے نکل سکا تو تیرے لیے کسی سے ضرورت بات کروں گا۔“ بڑھے نے کہا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس بڑھے کو صبح حوالات سے نکال کر اسپتال لے جایا گیا مگر اس کا فائدہ نہ تھا، وہ مر چکا تھا۔ نادر اب سخت دہشت زدہ تھا اور بالکل مایوس ہو چکا تھا لیکن اس دن دوپہر کے بعد نادر کو پھر حوالات سے نکال کے تھانے دار کے کمرے میں لے جایا گیا۔

وہاں اپنے ماں باپ کو دیکھ کر نادر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ چیخ مار کے آگے بڑھا ہی تھا کہ اسے ساتھ لے جانے والے سپاہی نے اسے پکڑ لیا۔ نادر کو سخت حیرانی ہوئی جب اس کے ماں باپ سپاٹ چہرے کے ساتھ یوں بیٹھے رہے جیسے وہ کوئی اجنبی ہوں۔

تھانیدار نے پوچھا۔ ”پہچانو اسے... یہ ہے تمہارا بیٹا۔“

اس کے باپ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں جناب!“  
نادر چلایا۔ ”بابا... میں نادر ہوں۔“  
اس کے باپ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”ہمارے بیٹے کا نام مراد تھا۔“

نادر نے ماں کو بیکار مگر وہ منہ بند کیے دوسری طرف دیکھتی رہی وہ پہلے جیسی کمزور تھی۔ فاقہ زدہ اور ہڈیوں کا ڈھانچا۔ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ نادر سمجھ گیا شاید اس نے اپنا ایک بچہ اور بیچ دیا تھا۔ اسی لیے نادر کی قیمت بھی وصول کر لی تھی۔ سائیں دوست کے پاس بہت دولت تھی۔ نادر اپنے بھائیوں میں سب سے پیش قیمت ثابت ہوا ہوگا۔ ایک گھنٹے بعد تھانیدار نے اسے پھر بلایا۔ ”چل

کا... تیار ہو جا۔ تیرا باپ اور سوتیلی ماں تجھے لئے آرہے ہیں۔ پاگل... سوتیلی ماں تو ظلم کرتی ہے۔ تجھے گھر سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔“

نادر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”تھانیدار صاحب، میں واپس آستانہ عالیہ جاؤں گا۔“

تھانیدار کے لبوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”دو دن میں بڑا سیانا ہو گیا ہے تو...“

☆☆☆

نادر نے عبداللہ کا شانہ پکڑ کے ہلایا۔ عبداللہ نے پلٹ کے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ نیند نہیں آرہی ہے تو چلا جا سائیں کے پاس، مجھے سونے دے۔“

نادر نے دوبارہ اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ اُمٹہ بینٹھا۔ ”آدھی رات کو کیا ضروری بات یاد آگئی اچانک... صبح تک انتظار نہیں کر سکتا بھوتی کے۔“ بودے نے ناگواری سے کہا۔

نادر اسے باہر لے گیا۔ آستانہ عالیہ کے اندر کی لائٹس آف تھیں مگر باہر کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ گیٹ پر چوکیدار کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی کلا شکوف اس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے عبداللہ کو دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس سے دور ٹپٹنے لگے۔

”عبداللہ! اب میں اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تجھے بتا رہا ہوں... مجھے بھوری سے محبت ہوگئی ہے۔“

بودے نے جمائی لی۔ ”... کون بھوری؟“  
”سائیں دوست کی بیٹی اور کون۔“

بودا بچ اچھل پڑا۔ اس کا جمائی لینے والا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر نادر کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”اس سے محبت کس کو نہیں ہے۔ میں بھی مرتا ہوں اس پر۔ سارے ہی عاشق ہیں اس کے۔“

نادر نے کہا۔ ”لیکن وہ صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔“  
”اچھا...؟ چل پھر شادی کر لے اس سے۔“

عبداللہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔  
”ہم نے یہی طے کیا ہے۔ کیا خیال ہے تیرا، میں سائیں دوست سے بات کر کے دیکھوں۔“

اب عبداللہ نے غور سے نادر کی طرف دیکھا تو اس کی صورت پر صرف سنجیدگی تھی۔ ”نادر... تو سیریس ہے۔“

”کمال ہے یا ر! اس وقت میں تجھے اٹھا کے لایا ہوں تو کیا یہ مذاق کرنے کے لیے۔“

”تو نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ اپنی اوقات پر غور کیا

چار سمت ایک چوراہا  
ہے، اگر سائیں کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی، اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو تیری ہڈیاں بھی کہیں نہیں ملیں گی۔“

”بودے! معاملات بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہم اب پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اس لیے تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں بھی تیار ہوں، کہاں تو ایک نکلے کا فقیر، لاوارث۔ کہاں سائیں دوست کی بیٹی۔“

نادر نے ایک فلمی ڈائلاگ بولا۔ ”محبت اونچ نیچ کو نہیں دیکھتی ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے چھپ چھپ کے کیوں ملتی۔“

بھوری کا یہ نام اس لیے پڑا تھا کہ اس کے بال بھورے تھے اور اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ وہ سائیں دوست کی تیسری بیوی کی پہلی بیٹی تھی۔ باقی دو سے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہیں سائیں دوست طلاق دے دی تھی۔ چوتھی بیوی سے اس کے لڑکا ہوا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس کا دماغ تین سال کے بچے جتنا تھا۔ عقیدت مند اسے بھی اللہ لوک کہتے تھے۔ دوسرا بیٹا بھی صرف تین سال کا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو بھوری اس کی واحد جوان اولاد تھی۔

وہ بالکل اپنی ماں پر گئی تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ شاید ہی کوئی ہوگا جو اسے دیکھے تو دم بخود نہ رہ جائے۔ وہ آستانہ عالیہ پر کھلتے ہوئے بڑی ہوئی تھی۔ وہ دس سال کی تھی جب اس کا باہر نکلتا بند کر دیا گیا تھا۔ تاہم وہ رہائشی حصے کے دروازے سے کار میں ماں کے ساتھ ہر جگہ آتی جاتی تھی۔ بودے کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس کلاس میں اور کس اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ آتے جاتے اس نے بھوری کی جھلک ضرور دیکھی تھی۔

اچانک اسے اپنے دوست نادر سے سخت حد محسوس ہوئی۔ بودا یقیناً نادر کے مقابلے میں بہت حسین و جمیل تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو کئی سال وہ سائیں کا منظور نظر کیوں رہتا۔

بڑے ہو کے اس نے قد بھی خوب نکالا تھا اور اس کے مقابلے میں نادر کچھ بھی نہیں تھا۔ سیاہی مائل سانولا رنگ۔ چٹائی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور کمزور جسم۔ بھوری نے آخر کیا دیکھ کے اسے پسند کر لیا۔ یہ بات سچ ثابت ہوگئی تھی کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ اور پھر ایک لڑکی کی نظر کیسے دیکھتی ہے...!

نادر نے کہا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہا ہے مجھے بودے۔“  
بودا چونک پڑا۔ ”کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟“  
”چھ سات مہینے ہو گئے۔“

”تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟“ بودے نے کہا۔

”سائیں دوست نے اس کو ایک گاڑی خرید کے دی ہے۔“

”چھوٹی سی کار ہے۔ وہ پہلے اسکول بس سے آتی جاتی تھی۔ ایک دن بس کو حادثہ پیش آ گیا بھوری آگے بیٹھی تھی اس کو چوٹیں آئیں اور چہرے پر شیشے کے ذرات سے خراشیں پڑ گئیں۔ کچھ عرصہ سائیں کا ڈرائیور اسے لے جاتا رہا۔ ایک دن اس کی نیت خراب ہوگئی۔ بھوری کو کسی کیمپل کے گھر جانا تھا، اس کی شادی تھی۔ بھوری خوب زیور اور اچھے کپڑے پہن کے گئی۔ رات کو واپسی میں ڈرائیور نے کہا کہ مجھے سائیں دوست نے ایک چیز پہنچانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی ایک ویران سڑک پر لے گیا۔ بھوری خفا ہوئی کہ اتنی دیر سے کھڑے تھے، یہ کام کیوں نہیں کیا۔ اس نے ایک دم گاڑی کو کسی احاطے میں موڑ دیا۔ بھوری کو اتر کے بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

بودا دم بخود ستارہا۔ ”اس نے بھوری کو خراب کیا؟“  
”نہیں... اللہ نے اسے بچا لیا۔ وہاں بھوری کی چیخ پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے بھیج کے اندر لے گیا۔ وہ کوئی موٹر ورکشاپ تھی۔ بھوری نے مزاحمت کی اور ایک دفعہ اس وحشی درندے سے خود کو چھڑا کے بھاگی تو اس کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ آ گیا۔ اس نے پلٹ کر وار کیا جو پیچھے آنے والے کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کے گرا تو بھوری نے پھر مارا۔ وہ مارتی رہی، وہ مر گیا۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ وہ پھر بھی مارتی رہی۔ پھر پائپ پھینک کے بھاگی۔ احاطے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی مگر اسے چلانا نہیں آتی تھی۔ وہ پیدل گھر تک گئی۔ آدھی رات کے وقت اکیلی لڑکی شادی بیاہ کے کپڑوں میں اور پورے زیور کے ساتھ۔ اس نے باپ کو ساری بات بتائی۔ اس نے کہا کہ ”شباباش! تو نے خود مار دیا اس کو۔ بہت بہادری کا کام کیا۔“ اس نے اپنے بندے بھیج کے لاش تو اٹھوا دی... مگر اس کے بعد بیٹی کو آنے جانے کے لیے گاڑی خرید کر دی۔ اس نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ بھکاری ایک سپر بس آج کل میں ہی چلا رہا ہوں۔ بھکاری ایک سپر بس کے نام پر وہ بہت ہنسنا۔ کہنے لگا کہ اچھا کل سے تم بھوری بی بی کو اسکول سے لاؤ گے، لے جاؤ گے۔“

عبداللہ نے رشک سے کہا۔ ”سالے، بڑی قسمت ہے تیری۔“

”سائیں نے یہ بھی کہا کہ تم بھوری بی بی کو گاڑی چلانا بھی سکھا دو۔ میں نے کہا کہ جو حکم سائیں!“

”یہ تو نے مجھے نہیں بتایا؟“

سائیں نے اس کو ایک گاڑی خرید کے دی ہے۔ وہ پہلے اسکول بس سے آتی جاتی تھی۔ ایک دن بس کو حادثہ پیش آ گیا بھوری آگے بیٹھی تھی اس کو چوٹیں آئیں اور چہرے پر شیشے کے ذرات سے خراشیں پڑ گئیں۔ کچھ عرصہ سائیں کا ڈرائیور اسے لے جاتا رہا۔ ایک دن اس کی نیت خراب ہوگئی۔ بھوری کو کسی کیمپل کے گھر جانا تھا، اس کی شادی تھی۔ بھوری خوب زیور اور اچھے کپڑے پہن کے گئی۔ رات کو واپسی میں ڈرائیور نے کہا کہ مجھے سائیں دوست نے ایک چیز پہنچانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی ایک ویران سڑک پر لے گیا۔ بھوری خفا ہوئی کہ اتنی دیر سے کھڑے تھے، یہ کام کیوں نہیں کیا۔ اس نے ایک دم گاڑی کو کسی احاطے میں موڑ دیا۔ بھوری کو اتر کے بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

بودا دم بخود ستارہا۔ ”اس نے بھوری کو خراب کیا؟“  
”نہیں... اللہ نے اسے بچا لیا۔ وہاں بھوری کی چیخ پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے بھیج کے اندر لے گیا۔ وہ کوئی موٹر ورکشاپ تھی۔ بھوری نے مزاحمت کی اور ایک دفعہ اس وحشی درندے سے خود کو چھڑا کے بھاگی تو اس کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ آ گیا۔ اس نے پلٹ کر وار کیا جو پیچھے آنے والے کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کے گرا تو بھوری نے پھر مارا۔ وہ مارتی رہی، وہ مر گیا۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ وہ پھر بھی مارتی رہی۔ پھر پائپ پھینک کے بھاگی۔ احاطے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی مگر اسے چلانا نہیں آتی تھی۔ وہ پیدل گھر تک گئی۔ آدھی رات کے وقت اکیلی لڑکی شادی بیاہ کے کپڑوں میں اور پورے زیور کے ساتھ۔ اس نے باپ کو ساری بات بتائی۔ اس نے کہا کہ ”شباباش! تو نے خود مار دیا اس کو۔ بہت بہادری کا کام کیا۔“ اس نے اپنے بندے بھیج کے لاش تو اٹھوا دی... مگر اس کے بعد بیٹی کو آنے جانے کے لیے گاڑی خرید کر دی۔ اس نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ بھکاری ایک سپر بس آج کل میں ہی چلا رہا ہوں۔ بھکاری ایک سپر بس کے نام پر وہ بہت ہنسنا۔ کہنے لگا کہ اچھا کل سے تم بھوری بی بی کو اسکول سے لاؤ گے، لے جاؤ گے۔“

عبداللہ نے رشک سے کہا۔ ”سالے، بڑی قسمت ہے تیری۔“  
”سائیں نے یہ بھی کہا کہ تم بھوری بی بی کو گاڑی چلانا بھی سکھا دو۔ میں نے کہا کہ جو حکم سائیں!“

”یہ تو نے مجھے نہیں بتایا؟“



”سائیں دوست نے منع کیا تھا۔ بھوری کو اسکول میں چھوڑ کے میں چلا جاتا تھا اپنے ٹھکانے پر۔ دوپہر کے بعد پھر اسکول پہنچ جاتا تھا اور بھوری کو گھر چھوڑ کے واپس چلا جاتا تھا۔“

”کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ...؟“

”ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے، ایک مہینہ دس دن...“

”بودے نے برہمی سے کہا۔“ اتنی جلدی پٹالیا تو نے اسے۔“

نادر نے سادگی سے کہا۔ ”میری اتنی ہمت کہاں، اس نے خود ہی کہا کہ تم سائیں بابا کے لیے کام کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں تو بولی کہ کیا کام کرتے ہو۔ میں نے صاف بتا دیا کہ پہلے بھیک مانگتا تھا، اب بھیک مانگنے والوں کی نگرانی کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا کب سے ہو یہاں۔ پہلے کہاں تھے، میں نے بتا دیا۔“

”اس کا مطلب ہے وہ رنجھ گئی تجھ پر ورنہ یہ کیوں پوچھتی، آخر کیا دیکھا اس نے تجھ میں؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم، پہلے اسکول سے آتے جاتے بات ہوتی تھی۔ پھر وہ گاڑی چلانا سیکھتی رہی، آستانہ عالیہ کے پیچھے والے گراؤنڈ میں۔ اس نے کہا کہ تمہیں کچھ اور کرنا چاہیے، کوئی عزت والا کام۔ صرف پرائیویٹ میٹرک کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہیں آگے پڑھنا چاہیے۔ بس ایسے ہی باتوں باتوں میں ہم قریب آ گئے۔ مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور میں تو دیوانہ ہو ہی گیا تھا۔ کئی بار وہ مجھے جھوٹ بول کے اپنے ساتھ لے گئی۔ سہیلی کی ساگرہ ہے، سہیلی کے بھائی کی مکتی ہے۔“

”سائیں دوست کیا اندھا ہے، اسے شک نہیں ہوا؟“

”میرا خیال ہے اسے بیٹی پر زیادہ بھروسہ تھا کہ وہ میرے جیسے دو کوڑی کے شخص کو پسند نہیں کر سکتی اور میں اس کی بیٹی کو بڑی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن بودے، عشق تو ایسے ہی ہوتا ہے۔“

”اب مجھے بھی یقین آ گیا لیکن بیٹے... کیا وہ تیرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہے؟“

”ہاں، ہر وقت۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا باپ کبھی اس کا اور میرا رشتہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ ڈرتی ہے کہ کہیں اسے معلوم نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔“

”عبداللہ کا موڈ اب بدل گیا تھا۔“ ابے یہ بھی سوچا ہے کہ بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔ جہاں جاؤ گے پکڑے جاؤ گے۔ تم کب تک چھپ کے رہ سکتے ہو اور کیسے رہو گے۔“

”تم خالی ہاتھ کیا کرو گے؟“

”وہ کہتی ہے پیسے کی فکر مت کرو۔“

”بودے کا پھر حسد سے برا حال ہو گیا۔“ وہ اپنے ساتھ لائے گی... باپ کے گھر سے؟“

”ہاں! لاکھوں کا زیور ہے اس کے گھر میں۔“

”دیکھ نادر... تو مارا جائے گا۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ سائیں دوست تم دونوں کو مروادے گا۔“

”ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”پھر مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے، پاگل کے بچے اور مجھے کیوں بتا رہا ہے۔ فرض کر میں ہی جا کے سائیں دوست کو سب بتا دوں... پھر۔“

”تو ایسا نہیں کر سکتا، مجھے معلوم ہے۔“

”وہ مہاتما بدھ کے آسن میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔“

”مجھے سوچنے دے۔ ابھی میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔“

”کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کے کہا۔“ سوات میں میرا ایک رشتے کا ماموں رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اب زندہ ہے کہ مر گیا۔ وہ قتل کر کے عمر قید کاٹنے جیل گیا تھا۔“

”کے قتل کیا تھا اس نے؟“

”اس شخص کو جس نے اس کی محبوبہ کو خرید لیا تھا۔ اس کے بعد وہ بھاگ جاتا مگر ماما پکڑا گیا اور اس لڑکی نے خودکشی کر لی۔ ماما جیل سے نکل گیا اور سوات چلا گیا۔ وہاں فرضی نام سے رہتا ہے۔ یہ دس بارہ سال پرانی بات ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ، راستے کی ذمہ داری میں نہیں لیتا۔ سائیں دوست کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ پولیس ہر طرف تمہیں تلاش کرے گی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پنڈی، لاہور یا کراچی جانے والی ٹرینوں، بسوں اور جہازوں کو دیکھیں گے۔“

”مگر ہم سوات جائیں گے کیسے؟“

”بھوری کو پہنا دے برقعہ، شل کا ک ٹائپ۔ خود اپنا بھی حلیہ بدل لے۔ سر پر چترالی ٹوپی رکھ، عینک لگا، شلوار قمیض پہن لے میلی ملیشیا کی۔ ہو سکے تو کسی سے میک اپ کرا کے بال سفید کرا۔ ڈاڑھی لگوا لے۔ ڈراما کرنے والے سب کر سکتے ہیں۔ تو پہلے نکل سکتا ہے۔ بعد میں وہ آ جائے گی۔ اگر تم مردان جانے والی بس میں بیٹھ جاؤ گے تو کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔ وہاں سے چلے جانا سوات۔ اگر میرا مامول گیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اور نہ ملتا تو...“

”بودے نے ایک آہ بھری۔“ تمہاری قسمت... لیکن یہ سارا کھیل ہی قسمت کا ہے جو تم کھیل رہے ہو۔ ایک جوا ہے

چار سمت ایک چور اھا

جس میں تمہارے زندگی ہار جانے کے امکانات تو بے فیصد ہیں اگر دس فیصد پر تم جیت گئے تو تمہاری خوش قسمتی۔“

بھوری کو ساری بات معلوم ہوئی تو وہ نادر پر سخت خفا ہوئی۔ ”عجب عقل سے بیدل آدمی ہو تم۔“

نادر ڈر گیا۔ ”کوئی غلطی ہوئی مجھ سے؟“

”کیا ضرورت تھی اس مہاتما بدھ کو یہ سب بتانے کی!“

”وہ دوست ہے میرا۔“

”فضول بات مت کرو۔ جتنا میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے۔ وہ خود کو سب کا دوست کہتا ہے مگر دوست کسی کا بھی نہیں ہے۔ دوست وہ ہے تو سائیں دوست کا، میرے باپ کا۔ کھن آتی ہے مجھے اس کے کردار سے۔ وہ جاسوسی کرتا ہے میرے باپ کے لیے۔“

”لیکن... اس نے تو مجھے اپنے ماما کا پتا دیا ہے... یہ ہو سکتا کہ بودا دیسا ہی ہو جیسا تم سمجھتی ہو۔ اس کا کردار واقعی قابل نفرت ہو لیکن میں نے اسے دیکھا ہے اور آزمایا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ آدمی سودن بنالے پھر بھی ایک دوست کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”چھوڑو یہ باتیں۔ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ اب تو تم پر بھی نہیں۔ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ وہ نہیں جو تمہارا دوست کہے گا۔“

”ٹھیک ہے... بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی، تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی جا کے پھر اسے بتا دو گے۔“

بھوری جس کا اصل نام مہناز تھا کچھ قدرتی طور پر ذہین تھی، کچھ ان حالات نے اسے اپنی عمر سے زیادہ تجربہ کار بنا دیا تھا جن میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالا تو آستانہ عالیہ کا ماحول دیکھا۔ اس میں سوائے دھوکے، فراڈ، بے ایمانی اور جھوٹ کے کچھ نہیں تھا۔ اس کا ضمیر فروش اور ایمان فروش باب سادہ لوح انسانوں کے لیے بڑا نیک پرہیزگار اور پہنچا ہوا شخص تھا مگر وہ جانتی تھی کہ اندر سے اس کا کردار کیا ہے۔

آستانہ عالیہ ایک عیاشی اور بدکاری کا ڈاکھا تھا۔ وہاں شراب ایسے پی جاتی تھی جیسے شریف گھرانوں میں چائے پی جاتی ہے۔ رات کو وہاں حجرہ خاص میں رقص و سرود کی محفلیں ہوتی تھیں جن کے لیے طوائفیں بلائی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ خود کو ماڈل یا ایکٹرس کہتی تھیں۔

مہناز کی ماں کی اپنے شوہر پر کبا چلتی۔ وہ بیوی سے زیادہ کنیز کی حیثیت رکھتی تھی اور جانتی تھی کہ اس نے شوہر

آخر ایسا ہی ہوا۔ مہناز کے دل میں باپ کے لیے احترام یا محبت کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ اس کے نزدیک وہ شیطان تھا جس سے صرف نفرت کی جاسکتی تھی۔ اسے اپنی ماں پر رحم بھی آتا تھا اور اس سے شکایت بھی رہتی تھی کہ وہ بیوی ہونے کے باوجود یہ سب برداشت کرتی رہی۔

نادر کی صورت میں کسی شہزادہ گلہ نام والی کوئی بات نہ تھی۔ نہ وہ فلمی ہیرو تھا نہ کسی تاجر صنعتکار یا وزیر سفیر کا بیٹا۔ نہ ولایت سے ڈگری لے کر آنے والا اور نہ کوئی نامور شخصیت۔ مہناز کو اس کی شرافت اور کردار کی مضبوطی نے متاثر کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جب اس نے نادر کو آزمایا کہ وہ زندگی کے سفر میں اس کا ہاتھ تھام کے چل سکتی ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس خراب خانے سے نکل کے اپنی الگ دنیا بسائے گی۔

اس نے ماں کو شریک راز کیا اور ماں جس نے ساری زندگی جہنم جیسا عذاب جھیلے گزاری تھی، بیٹی کو دعا دی اور حوصلہ دیا کہ جاؤ، اللہ تمہیں کامیابی اور خوشی دے اور وہ محبت دے جو میرے نصیب میں نہ تھی۔

مہناز نے بڑی ہوشیاری سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ اس کی ایک نیچر نے گھر سے فرار ہو کے شادی کی تھی۔ اس کا باپ ایک قبائلی سردار تھا اور قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق اس کو سترہ سال کی عمر میں ایک ایسے شخص کو دے دیا گیا تھا جو اٹھاون سال کا تھا اور پہلے بھی دو بیویوں کا شوہر تھا۔ اسے باپ کے ایک جرم کی سزا کے طور پر یہ قربانی دینی پڑی تھی لیکن اس نے بغاوت کی اور راتوں رات اپنے گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ نکل گئی۔ انہوں نے کورٹ میں شادی کی اور جان بچانے کے لیے روپوش ہو گئے۔ گزشتہ سات سال سے نام بدل کے زندگی گزار رہے تھے اور دو بچوں کی پیدائش کے باوجود ڈرتے تھے کہ کہیں قبیلے والے انہیں تلاش کر کے مار نہ ڈالیں۔

اس نیچر نے مہناز کی مدد کی۔ ایک رات مہناز اور نادر خاموشی سے نکلے اور اس نیچر کے گھر میں بند ہو گئے۔ نادر کو بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ نیچر کا گھر آستانہ عالیہ کے بہت



قریب تھا۔

مہناز نے کہا۔ ”تم نے سنا نہیں، چراغ تلے اندھیرا۔“

”کیا مطلب؟“

مہناز ہنسی۔ ”بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔ دوڑ بھاگ کرنے والے لاہور، کراچی، پشاور یہاں سے وہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ یہ خیال کسی کے دماغ میں کیسے آسکتا ہے کہ ہم صرف سو گز دور بیٹھے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے... لیکن ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں؟“

”جب تک تلاش کرنے والے تھک کر نہ بیٹھ جائیں۔ وہ ٹھنڈے پڑ جائیں، پھر ہم آرام سے نکلیں گے۔ جہاں جانا ہوگا چلے جائیں گے۔“

نادر کو اس پلان کی کامیابی بہت مشکوک نظر آتی تھی۔ اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی روز دروازے توڑ کر سامعین دولت کے غنڈے اندر آجائیں گے اور انہیں مار جائیں گے۔ نیچر کے ذریعے ان کو باہر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ سامعین دوست نے مہناز کے اور نادر کے غائب ہوجانے کے بعد ہر طرف اپنے آدمی لگوا دیے تھے۔ پولیس نے کراچی سے خیبر تک ہر بس، ٹرین اور جہاز کے اڈے پر انہیں دیکھا۔ ان کی تصویریں اخبار میں شائع ہوئیں مگر صرف ایک دن۔ دیکھنے والوں نے دیکھیں اور بھول گئے۔ تلاش کرنے والے ناکام رہے۔

مہناز اور نادر ایک کمرے میں بند رہے۔ وہ ایک منٹ کے لیے باہر نہیں آئے۔ انہیں وہیں کھانا پینا ملتا رہا۔ نیچران کی ہر ضرورت اندر ہی پوری کرتی رہی اور اس کے شوہر نے اس معاملے میں بیوی کا پورا ساتھ دیا۔ مہناز کو یہ بھی معلوم ہوا کہ باپ نے اس کی ماں کو بیٹی کے فرار کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور اسے اتنا مارا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ اس نیچر کا رول ایسا تھا کہ کوئی بھی اس پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ معمول کے مطابق اسکول آتی جاتی رہی اور دیکھنے والوں کو اس کے رویے میں بھی کسی فرق یا تبدیلی کا شبہ تک نہ ہوا۔ آستانہ عالیہ کے قریب ہونے سے اس کو فائدہ یہ ہوا کہ وہ سامعین دوست کے بارے میں افواہیں اور خبریں سنتی رہی۔ وہ جگہ مرجع خلافت تھی، عقیدت مند دیکھتے تھے کہ سامعین کی حالت خراب ہے۔ وہ بیمار لگتا ہے ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر اسکول سے بھوری کے غیر حاضر ہونے کی بات عام ہوئی۔ ان فقیروں نے جو سامعین کے

جیسے کہلاتے تھے، اندر کی باتوں کو باہر پھیلایا۔ ان میں سب سے زیادہ پریشانی بودے کو تھی۔ نادر اچانک غائب ہو گیا تھا اور سوات بھی نہیں پہنچا تھا۔

ایک مہینے سے زیادہ گزر گیا تو مہناز اور نادر اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے۔ ان کی مددگار نیچر نے اسکول کے ایک سابق چوکیدار کی مدد حاصل کی۔ وہ پٹان تھا اور اسکول چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ پشاور کی وین چلاتا رہا۔ پھر ایک حادثے میں اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا۔ اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس خدمت کے صلے میں اس کو اتنا معاوضہ دیا جائے گا کہ وہ کسی بہترین اسپتال سے مصنوعی ٹانگ لگوائے اور دوبارہ ڈرائیور بن جائے۔ اس کا نام بہرام خان تھا۔

بھوری کو سوات جانے میں تامل تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بودے نے دو غلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامعین دوست کو سب بتا نہ دیا ہو مگر نادر کو یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ بہرام خان چالیس سال کا خالص پٹان تھا۔ اس کا لباس، حلیہ اور شرعی ڈاڑھی کے ساتھ اس کی زبان سرحد کے ہر علاقے میں قابل قبول تھی۔

آخری وقت میں بھوری کے اصرار پر نادر نے اپنا حلیہ بدلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خود بھی بھوری کی طرح سفید شل کاک برقعے میں روپوش ہو گیا۔ برقعہ پن کے سوات تک سفر کرنا نادر کے لیے سخت ترین آزمائش تھا اور بھوری کا مذاق اسے مزید پریشان اور شرمندہ کرتا تھا لیکن بھوری کی یہی دانش مندی ان کی جان بچانے کا سبب بن گئی۔

جب بالآخر وہ سوات پہنچے تو بہرام خان نے مقامی لوگوں سے اس شخص کے بارے میں معلوم کیا جسے بودے نے اپنا نام اتر دیا تھا تو انہیں معلوم ہوا کہ نامعلوم افراد نے اسے گھر میں گھس کے قتل کر دیا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ رات کو آئے تھے اور دروازے توڑ کے اندر گئے تھے۔ صبح لوگوں نے اس کی لاش گھن میں پڑی دیکھی۔ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ قاتلوں نے اس کے کلبھاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا مگر دشمن مقامی لوگ نہیں تھے۔ یہاں کلبھاڑی سے قتل کرنے کا دستور بھی نہیں تھا۔

بہرام خان پر شک کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اور دو برقعہ پوش خواتین پشاور سے آئے تھے اور یہ بات سن کے واپس لوٹ گئے۔ بھوری تقریباً تین لاکھ نقد اور اس سے دینی مالیت کے زیورات سمیٹ لائی تھی۔ بہرام خان کو انہوں نے بیچاں ہزار دے کر شکر بے کے ساتھ رخصت کر دیا اور

چار سمت ایک چوراہا

خود اور لپنڈی سے کراچی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کراچی جانے کا آئیڈیا بھی بھوری کا تھا۔ ”ہم اور کہیں بھی گئے تو لوگ شک کریں گے۔ سرحد بلوچستان میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں زبان نہیں آتی۔ نہ پشتو نہ بلوچی۔ لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہی مشکل سندھ میں ہوگی۔ صرف کراچی ایک ایسا شہر ہے جہاں ہر صوبے اور ہر ملک کے لوگ آباد ہیں۔“

”یہ تمہیں کیسے معلوم، تم کب کراچی میں رہی ہو۔“

”مجھے... بودے نے بتایا تھا کہ وہاں برما، گوا، بنگال اور افغانستان سے آئے ہوئے لوگوں کے علاوہ پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ انسانوں کا ایک سمندر ہے۔“

”بودے نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا تھا؟“

”سچ بتاؤں۔ وہ تھا میرے چکر میں، بہانے بہانے سے اشاروں میں کچھ کہہ جاتا تھا۔ دراصل اسے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا۔ ایک دن اس نے موقع پا کے اظہار محبت کر دیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ ہم کراچی چلے جائیں گے۔ جو وہاں قسمت آزمانے جاتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ میں اتنی دولت کماؤں گا کہ ہمارا سمندر کے کنارے محل ہوگا، گاڑیاں ہوں گی، نوکر چاکر ہوں گے۔ میں پہلے تو سنتی رہی۔ پھر میں نے اسے وہ ذلیل کیا۔ ایسا بے عزت کیا کہ سارا عشق بھول گیا۔ میں نے کہا کہ محبت کرتے ہیں مرد۔ تم تو زنجے ہو۔ سامعین دوست کی داشتہ ہو۔ تم صرف ایک کام کر سکتے ہو...“ وہ رک گئی۔

”یہ سب کہہ دیا تم نے...“

بھوری کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ”ہاں... اور میں نے کہا کہ اب میں بتاتی ہوں اپنے باپ کو کہ تم مجھے درغلا رہے تھے۔ وہ میرے پاؤں پڑ گیا۔ سچ... میں نے ایک پاؤں اٹھا کے کہا کہ اچھا میرے تلوے چائو اور تمہارے اس دوست نے اپنی زبان سے تلوے چائے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بدلہ لے گا۔ اس نے تمہیں اعتماد میں لیا اور ہمارے ٹکٹے ہی سامعین دوست کو سب بتا دیا کہ ہم کہاں گئے ہوں گے۔“

انہوں نے ٹرین کی اکاٹومی کلاس میں سفر کیا۔ جب یہ کراچی میں اترے تو ان کے سامنے ایک اجنبی شہر تھا جو اپنی وسعت اور آبادی میں کسی ملک جیسا تھا۔ یہاں نہ ان کا کوئی شناسا تھا اور نہ گواہ۔ مگر کوئی دشمن بھی نہ تھا۔ مہناز نے یہاں سیاہ ریشمی برقعہ اوڑھا اور نادر نے بھی کسی حد تک چشمہ لگا کر اور مال بڑھا کے اپنا حلیہ بدلا۔ انہوں نے پہلے جوہر



اس نے بھی حصہ لیا اور ماں کے ساتھ ہی ماری گئی۔ خاور موقع پا کے چار پائی کے نیچے گھس گیا تھا وہ محفوظ رہا۔

ساتھیں دوست کے سامنے دونوں سر پیش کیے گئے تو وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے بھوری کے سر کو ٹھوکریں ماریں اور نادور کے سر پر پیشاب کیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کے کچھ مریدوں نے اسے پکڑ لیا اور حجرے میں بند کر دیا۔ وہ اپنی عمر، موروثی اثرات، مرغن غذاؤں اور شراب نوشی کے باعث بلند پریش کا پرانا مریض تھا۔ اس جذباتی بحران میں اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ بچ تو گیا مگر ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گیا۔ اس کے محبوب نظر اور مرید خاص عبداللہ نے ایک دن اس کا کام تمام کیا اور گدی نشین ہو گیا۔

خاور کی پرورش ایک ہمسائے نے کی۔ وہ بے اولاد تھا اور خاور ان سے بہت مانوس تھا۔ خاور نے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا۔ ایسی پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی کراچی میں بھر مار تھی جو اشتہار بازی سے طلباء کو پھینکتی تھیں اور تعلیم کی رسم پوری کر کے طلباء کے ہاتھ میں کامیابی کی سند تھما دیتی تھیں کہ جاؤ اب تم ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن ہو۔ بے شعور اور ناتجربہ کار طلباء کو عملی دنیا میں آکے پتا چلتا تھا کہ کاغذ کا وہ ٹکڑا ان کے لیے بے کار ہے۔

مانگ صرف آئی ٹی اے یا LUMS جیسے اداروں سے ڈگری پانے والوں کی تھی۔

خاور بھی اپنی ڈگری کا بوجھ اٹھائے بھٹکتا رہا اور ہر جگہ سے دھتکارا گیا۔ یہ شعبہ ایسا تھا جس میں سفارش لا حاصل تھی۔ بڑے کاروباری ادارے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں صلاحیت اور کارکردگی مانتے تھے اور ہر جگہ ایچ آر ڈیپارٹمنٹ موزوں ترین افراد کا انتخاب کرتا تھا۔ خاور نے محسوس کیا کہ ایسی ڈگری کے ساتھ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اس نے وہی کیا جو اس کے باقی سب دوستوں نے کیا تھا۔ اس نے ڈگری کو دفن کر دیا اور بھول گیا۔

☆☆☆

چوتھی سمت:

جمال الدین بڑی باقاعدگی سے اسی مسجد میں تراویح کی نماز پڑھنے آ رہا تھا۔ مقصد وہی تھا کہ ستائیسویں شب تک ختم قرآن کرے۔ اس مسجد کو شہر کی سیکڑوں مساجد پر ترجیح دینے کی وجوہات دو تھیں۔ ایک تو اسے امام صاحب کی فرات کا انداز پسند تھا۔ دوسرے یہ نئی اور خوشحال آبادی کے قلب میں واقع مسجد خاصی کشادہ تھی اور اس کے مرکزی حصے کے سامنے کا محن سرسبز لان تھا جس پر نماز پڑھنے سے

طبیعت کو بڑی فرحت سی محسوس ہوتی تھی۔

اس کا کام بہت محنت طلب تھا۔ صبح دس بجے سے وہ ایک اسکول کے سامنے وہی بڑے اور چاٹ بیٹتا تھا۔ آدھی چھٹی میں اس کا زیادہ مال بک جاتا تھا۔ جو بچ جاتا تھا وہ چھٹی کے وقت نکل جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک سینما میں گیٹ کیپر کی ڈیوٹی دیتا تھا۔ یہ کام مشکل نہیں تھا لیکن اسے رات نو بجے سے پہلے فراغت نہیں ہوتی تھی۔ جب آخری شو دیکھنے والے سارے تماشا خانے اندر بیٹھ جاتے تھے اور فلم شروع ہو جاتی تھی تو اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ مسجد میں پہنچتا تھا کیونکہ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس میں بیٹھ کے گھر جاسکے اور اپنے محلے کی مسجد میں نماز عشا اور تراویح پڑھ سکے۔ وہ رات ساڑھے گیارہ بارہ بجے گھر پہنچتا تھا تو تھکن سے اتنا چور ہوتا تھا کہ بعض اوقات کھانا کھائے بغیر ہی بستر پر گر جاتا تھا اور سو جاتا تھا۔ اس کے پاس بیوی بچوں کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اتوار کی صبح سے دوپہر تک جب اسکول میں چھٹی ہوتی تھی۔

اس کی بیوی اور ماں ہر صبح کے لیے وہی بڑے اور چھوٹوں کی چاٹ تیار کر کے رکھتی تھیں جو وہ اپنی سائیکل پر باندھ کے روز صبح نو بجے گھر سے چل پڑتا تھا۔ اس کا گھر ایک غریب آبادی میں شہر سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ابتدا میں یہ ایک جنگل تھا پھر اس نے ایک پختہ کمر اور غسل خانہ بھی بنالیا۔ اب اس کے پاس اوپر نیچے دو کمرے تھے۔ نیچے باورچی خانہ بھی تھا اور محن میں نکال بھی لگا ہوا تھا چنانچہ اسے یا بیوی کو پانی لانے کے لیے باہر جا کے لائن میں نہیں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ یہ نکال گوانے کے لیے اس نے تین ہزار رشوت دی تھی۔

اس کے گھر میں بجلی کا عارضی کنکشن بھی آ گیا تھا۔ بجلی کمپنی کے ایک لائن مین نے سو روپے ماہانہ کے عوض اسے لائن پر ایک کنڈا ڈال کے گھر میں ایک بلب، ایک پنکھا اور ٹی وی چلانے کی اجازت دے رکھی تھی مگر وہ دو ہفتے چلا رہا تھا اور اوپر نیچے تین بلب جلاتا تھا۔ ٹی وی اس نے قسطوں پر لیا تھا اور گزشتہ ماہ آخری قسط دے کر اس کا مالک ہو چکا تھا۔

چنانچہ جمال الدین اپنی ترقی سے مطمئن تھا۔ ایک رات وہ تراویح سے فارغ ہوا تو کچھ متفکر تھا۔ اس کی ماں کی طبیعت کچھ عرصے سے علیل چل رہی تھی۔ ایک مہربان ڈاکٹر نے بریسٹ کینسر کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور اسے ایک اوکولوجسٹ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس کی فیس بہت زیادہ تھی لیکن جمال

چار سمت ایک چور اھا

الدین ماں کو اس کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ بتائے جو خاصے مہنگے تھے۔ جمال الدین نے ہر سال کی طرح اس بار بھی عید پر بیوی بچوں کے لیے نئے کپڑوں کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ باپ کی موت کے بعد ماں نے تو عید پر نئے کپڑے پہننا چھوڑ دیے تھے لیکن اس کے دیگر اخراجات کا بار جمال دین پر آ گیا تھا جو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی چار بہنیں بیاہی گئی تھیں اور ایک بھائی بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔

ماں کی بیماری کا پتا چلانے کے لیے ٹیسٹ ضروری تھے۔ یہ ٹیسٹ کرانے میں وہ ساری رقم خرچ ہو جاتی جو عید کے کپڑوں کے لیے سینما کے مالک نے قرض دی تھی۔ دو سو روپے ماہانہ کے حساب سے یہ قرض دس ماہ میں ادا ہوتا تھا۔ پھر رمضان آ جاتے تھے اور اگلی عید کے ساتھ ہی نیا قرض شروع ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایسے ہی جاری تھا۔

جمال کو معلوم تھا کہ نئے کپڑے نہ ملے تو بچوں کو کتنا رنج ہوگا اور اس کی بیوی کا موڈ کتنا خراب ہوگا۔ ساس کے ساتھ اس کی بالکل نہیں بنتی تھی اور اسے وہ اپنے گھر کی معیشت پر اور خود پر بوجھ سمجھتی تھی لیکن جمال ماں کے حقوق اور اپنے فرائض کو نبھاتا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ ماں کے علاج کے لیے وہ کہیں سے قرض لے لے گا۔

پریشانی اسے یہ تھی کہ ماں کے ٹیسٹ کے رزلٹ یازینو ہوئے تو کیا ہوگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جو سرطان کے علاج کی ماہر سمجھی جاتی تھی اس کی ماں کو کھل کے سب بتا دیا تھا۔ ”مرض قابل علاج ہے اگر اس کا پتا ابتدا میں ہی چل جائے لیکن تمہاری سرطان سے متاثرہ چھاتی کو کاٹ دیا جائے گا۔ ایسا نہ کیا گیا تو سرطان پھیلے گا اور تمہاری زندگی بچاکی نہیں جاسکے گی۔“

گھر پہنچتے ہی اس نے اوپر جا کے ماں کو سلام کیا اور اس کی حالت پوچھی۔ اس کی طبیعت میں بہت بے چینی تھی اور سارے جسم میں درد کی وجہ سے وہ کراہ رہی تھی۔ درد کم کرنے والی گولیاں اب بے اثر ہونے لگی تھیں۔

وہ خاصا متفکر نیچے آیا۔ اسے اب رپورٹ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماں یقیناً کینسر میں مبتلا تھی۔ یہ بات اس ڈاکٹر نے بھی ویسے ہی سمجھ لی ہوگی مگر ڈاکٹر آج کل ٹیسٹ کرانے کے شوقین تھے۔ خرچہ ہوتا تھا مریض کا۔ انہیں لیبارٹری سے کمیشن ملتا تھا۔

اس کی بیوی نے تنک مزاجی سے کہا۔ ”کھانا تو کھا لیتے تلی سے۔ سیدھے اوپر چڑھ گئے۔“

جمال نے کہا۔ ”تم رپورٹیں لائی ہو؟“

بیوی نے لفافہ اس کے سامنے بچ دیا۔ ”اب رپورٹوں میں کیا رہ گیا ہے دیکھنے کو۔“

”تم نے پوچھا تھا؟“

”ہاں! لیبارٹری کے بڑے ڈاکٹر نے صاف کہا کہ خرچہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مرض بہت بڑھ گیا ہے۔“

جمال سر جھکا کے کھانا کھانے لگا۔ ”اسے کیا پتا۔ وہ ریڈیا لوجسٹ ہے۔ علاج تو وہ ڈاکٹر کرے گی۔“

”علاج اس کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے۔ وہ صرف آپریشن کی فیس وصول کرے گی۔ مرنے جینے کی کوئی گارنٹی نہیں دے گی۔ ماں کی عمر بھی ایسی ہی ہے۔ پھر آپریشن سے پہلے اور بعد میں دواؤں کا جو خرچہ ہے...“

جمال نے نوالا رکھ دیا۔ ”آخر کیا کہنا چاہتی ہے تو؟ میں کچھ بھی نہ کروں؟ ماں کو مرنے دیکھتا رہوں اور مرجائے تو دفنا دوں۔“

بیوی نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ ”میں تو تمہاری طرف سے فکرمند ہوں، اتنا کرتے ہو پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ آگے عید ہے۔“

جمال نے غمی سے کہا۔ ”ہاں! آگنی نادل کی بات زبان پر۔ ماں کا علاج ہوگا تو تیرے اور بچوں کے لیے نئے جوتے کپڑے کہاں سے آئیں گے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتا۔ میری جگہ ہوتا کمال، اور میری ماں کی جگہ ہوتی تو...“

بیوی نے رونے کی تیاری کی۔ ”اللہ نہ کرے، تمہارا جو جی چاہے کرو مگر انہوں کے لیے ایسی منحوس بات تو زبان سے مت نکالو۔“

جمال کورات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کے دل میں چھپ کر بیٹھا ہوا خوف بھی کہتا تھا کہ بیوی کی بات غلط نہیں۔ ہوگا کچھ بھی نہیں، ماں بچے کی نہیں۔ اگر وہ آپریشن کے لیے کہیں سے قرض لینا بھی چاہے تو اتنا بڑا قرض دینے والا کوئی نہیں اور بالفرضی حال قرض مل جائے اور آپریشن ہو جائے تو بعد میں علاج کے اخراجات کے لیے رقم کہاں سے آئے گی، وہ قرض کیسے اتارے گا؟

تو کیا ہوگا وہی جو اس نے کہا تھا۔ وہ صرف ماں کو مرنے دیکھتا رہے گا؟

اگلے روز لیڈی ڈاکٹر نے رپورٹیں دیکھ کے فیصلہ صادر کر دیا۔ ماں کا فوراً آپریشن ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دیر کی گئی تو اس کی دوسری چھاتی بھی کینسر کی لپیٹ میں آجائے گی۔ ان چھاتیوں سے جمال نے دودھ پیا تھا، زندگی پائی تھی، اب اس کی باری تھی۔ وہ ماں کو مرنے سے



جمال نے اپنی پریشانی کا ذکر سنیا کے مالک حاجی عبدالرزاق سے کیا۔ انہوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کیا اور ماں کے آپریشن کا انتظام بلا معاوضہ سرکاری اسپتال میں ہو گیا۔ وہیں آپریشن کے بعد کیمو تھراپی بھی فری ہو گئی مگر صحت یابی تک دی جانے والی دوائیں بہت مہنگی تھیں اور اسپتال میں دستیاب نہ تھیں۔ ان کے لیے پچاس ہزار اضافی درکار تھے۔ حاجی صاحب نے قرض کی درخواست مسترد کر دی۔ ایک معمولی گیٹ کیپر کو اتنی بڑی رقم کیسے ادھار دی جاسکتی ہے، وہ چکائے گا کیسے؟ اور اتنا کیا کم ہے کہ آپریشن کا خرچہ بچ گیا میری کوشش سے، ان لوگوں کا بھی تو مسئلہ ہے۔ خود کچھ نہیں کرتے۔

مایوسی کے گرداب میں چکر کھاتے ہوئے اس کے دماغ کا بحرمانہ ترغیب میں گرفتار ہونا لازمی بات تھی۔ آخر کیا کرے؟ چوری کرے، ڈاکا ڈالے، قہن کرے۔ ادھار نہیں مل سکتا تو پھر ایسے ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں۔

”اگر تم اسے سودا کرتے رہو۔ تو وہ کبھی اصل رقم  
کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرے گا۔“  
”اور سود کتنا ہوگا۔“

مسائل کی جس چٹان کے سے دیا ہوا تھا وہ ہٹ گئی ہے۔ ہزار روپے ماہانہ ادا کرنا اس وقت جمال کو زیادہ مشکل نہ لگا۔

چند ماہ بعد ماں مر گئی۔ جمال پر پچاس ہزار کے قرض کا بوجھ چھوڑ گئی۔ اس کی موت تک جمال پوری دل جمعی سے کوئی کام کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ ادھر اسکول میں ہتھکڑیاں ہو گئیں۔ اس کے دبی بڑے اور چھپولوں کی چاٹ کی فروخت کا سلسلہ معمول کے مطابق دو ماہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ پہلے وہ اس عارضی بے روزگاری کے لیے تیار رہتا تھا اور دس ماہ کی آمدنی کو بارہ ماہ پر تقسیم کر کے کام چلاتا تھا۔ اب قرض کے سود کی ادائیگی کا مسئلہ آمدنی میں اضافے کا تقاضا کرتا تھا۔

بے روزگاری نے جمال کی کمر توڑ دی۔ اس نے  
ت دوڑ بھاگ کی مگر اسے ریلوے اسٹیشن پر قتل کی جگہ بھی  
ملی۔ قلیوں کا ٹھیکے دار اسے نمبر دلوانے کے پانچ ہزار مانگتا  
ا۔ وہ ایک ماہ سود کی قسط نہ دے سکا۔ دوسرے مہینے  
ہزار کہاں سے دیتا۔

”چلو ہمارا ساتھ... تم ابھی جوان ہے، خوبصورت۔۔۔ دھند اکر کے قرض دو۔ ہم چھوڑے گا نہیں۔“

”جمال...“ اس کی بیوی نے چیخ ماری۔ بچے رونے لگے۔ جمال آگے بڑھا تو قرض خواہ نے بیوی کو چھوڑ کے

اس رات بیوی روتی کوستی رہی۔ وہ سوچتا رہا کہ اب وہی راستے ہیں یا وہ مکان بچ کے قرض ادا کرے یا سب کو مار کے خود بھی مر جائے۔ اس کی بیوی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ ہمیں زہر لا دو تا کہ ہماری جان اس عذاب سے چھوٹے۔ تمہاری ماں خود تو قبر میں جا کے لیٹ گئی، ہم سب کو زندہ درگور کر گئی۔

وہ سائیکل کے پیڈل مارتا واپس جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر اس پر جینے کے راستے بند کیوں ہو گئے ہیں؟ اسے مزدوری تک نہیں ملتی۔ وہ بھیک انگے یا ڈاکے ڈالے۔ دونوں کام اس کے بس کے نہیں۔ بس اسے مکان کو بیچ ہی دینا چاہیے۔

جمال کو یوں لگا جیسے اس کی ٹانگ میں انگارہ اتر گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے گولی لگی ہے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور ایک لمحہ سے ٹانگ کو پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہی خون سے تر ہو گیا۔ مخالف سمت سے ایک پولیس کار نمودار ہوئی۔ سائرن بجائی دیے اور مزید قائل ہوئے۔ جمال نے دوڑ کر باہر آنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کوسڑک کے درمیان گرنا دیکھا۔ وہ پچاس قدم دور توڑ پھاڑا اور پھر سہارا پا گیا۔

اب ہر گھر سے لوگ نکل آئے تھے۔ دوسرا بھاگنے  
لا محض پولیس کی گرفت میں تھا۔ خطرے کا احساس ہونے

سے پہلے پولیس نے جمال کو بھی ہی دبوچ لیا۔ اسے اٹھا کے پولیس کی موبائل میں ڈال دیا گیا۔ کسی نے اس کے چیخ چیخ کے بے گناہ ہونے پر توجہ نہ دی۔

جمال آخری وقت تک انکار کرتا رہا لیکن یہ نہ بتا سکا کہ اس علاقے میں عین جائے واردات پر وہ کیا کر رہا تھا۔ اسے وہاں کوئی جانتا نہیں۔ اس کا گھر دس بارہ کلومیٹر دور ہے۔ تراویح کے لیے وہاں کی مسجد میں آنے والی بات ایک احقانہ اور مضحکہ خیز جھوٹ تھی۔ پولیس نے مار مار کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔

ایک خرابی یہ ہوئی کہ سوچے سمجھے بغیر گواہوں نے سے شناخت کر لیا، ہاں یہ بھی ڈاکوؤں کے ساتھ تھا، شاید نہیں پہلے سے جمال کی تصویر دکھادی گئی تھی۔ پولیس اپنا کیس پکا کر ناچاہتی تھی۔ تمام ثبوت جمال کے خلاف تھے۔ سے ناکام ڈکیتی کی کوشش کے جرم میں سات سال قید مشقت کی سزا سنائی گئی۔

جیل بھیجے جانے کے بعد وہ ڈاکو جمال کے پاس خود ہی گیا۔ اس کا نام تو رحمان تھا مگر وہ مافی کہلاتا تھا۔ جمال اسے کہتے ہی نفرت سے گالیاں دینے لگا۔ وہ مسکراتا رہا۔

”بھی دے لے جینی گالیاں وینی ہیں۔ اب رہتا تو  
اتھ ہی ہے۔ جس دن تیرا غصہ نکل جائے گا اس دن میں  
ت کروں گا۔“

”مجھے تمہاری شکل سے نفرت ہے۔“



جمال نے کہا۔ ”ہاں... ہاں۔ وہی ہوں گے۔“  
”انہوں نے کہلایا تھا کہ جمال بہت جلد رہا ہو جائے گا۔ میں بھی روز رات کو تمہاری رہائی کے لیے نفل پڑھتی ہوں اور ہر وقت دعائیں مانگتی ہوں۔ اللہ بڑا منصف ہے اور سب دیکھنے والا ہے۔ وہ کسی بے گناہ کو عذاب کیسے دے سکتا ہے۔ تمہاری اپیل ہوگئی ہے نا؟ دیکھ لینا منظور ہو جائے گی۔ عدالت انصاف کرے گی تمہارے ساتھ۔“  
وہ بولتی جا رہی تھی اور جمال اسے تک رہا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔ صاف ظاہر تھا کہ دس ہزار اس کے گھر بھجوانے والا مانی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ جو سوال جمال کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا یہ تھا کہ مانی نے ایسا کیوں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمدردی کی آڑ میں وہ کچھ اور نیت رکھتا ہو۔ کئی بار وہ ناصرہ کے حسن کی تعریف کر چکا ہے۔ اگر اس کی عدم موجودگی میں وہ ناصرہ کو درغلانے لگا پھر، عورت ذات بڑی جلدی پھسل جاتی ہے۔ تعریف، میسے عیش و آرام..... روپیہ!  
”کس سوچ میں پڑ گئے۔ دیکھو میں کیا لائی ہوں تمہارے لیے۔ گا جڑ کا حلوا ہے اور پائے پکائے ہیں خاص تمہاری پسند کے۔“

جمال کو اپنے خیالات کی بے راہروی پر سخت شرم آئی۔ ناصرہ کے جانے کے بعد جب وہ مانی کے ساتھ روغنی نان اور پائے کھا رہا تھا تو اس نے پوچھا۔ ”دس ہزار تم نے بھیجے تھے؟“

”اور کون ہے جواب اتنا مہربان ہو جائے۔“  
جمال نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہوتا تو میں یہاں نہ پہنچتا۔ لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟“

مانی مزے لے لے کے گا جڑ کا حلوا کھانے لگا۔  
”بھئی کیا سواد ہے تیری بیوی کے ہاتھ میں۔ واہ واہ۔“  
”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔“ جمال نے ناگواری سے کہا۔

”ہاں... یا جمال الدین! یہ اپنا اصول ہے یا دستور ہے۔ جو بھی سمجھ لو۔ کوئی سنگی بیل مشکل میں ہو تو اس کے گھردلوں کا خیال رکھتے ہیں۔ سکھ سانچا تو دکھ بھی سا نچھا۔“  
کچھ عرصہ میں جمال کو اپنے نئے دوست اور محسن کی نیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کی مہربانیوں میں کسی بد نیتی کو دخل نہ تھا۔ وہ اب بھی ناصرہ کے حسن کی یا اس کے لائے ہوئے کھانوں کے ذائقے کی تعریف کرتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملاقات کے وقت وہ بھی جمال کے ساتھ گیا ہو۔

ساتھ ہوا۔ جو کوئی تمہاری ٹانگ میں لگی وہ دل میں لگتی تو خبر آتی کہ دوڑا کو مارے گئے۔ ایک پکڑا گیا۔ کچھ کے بغیر تم میرے ساتھ جیل کاٹ رہے ہو۔ خیر... اب ماضی کو بھول جاؤ۔ آج سے تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔“  
جمال پلک جھپکائے بغیر اس کی صورت دیکھتا رہا۔  
”یعنی؟“

”تم اب واقعی میرے ساتھی ہو۔ میرے گروہ میں شامل ہو۔“  
”لیکن اس کا فائدہ؟“ جمال نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

مانی نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”اوائے پاگل خانے۔ ادھر تو ہم مہمان ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔ باہر ہمارا خیال رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔“

”کون لوگ؟ تمہارے ساتھی ڈاکو۔“  
”ڈاکو کا لیبل تو ہم پر بلا وجہ لگا دیا گیا ہے۔ باہر سب ڈاکو ہیں بلکہ ہم سے بھی بڑے ڈاکو ہیں جو ہمیں لوٹتے ہیں۔“  
”تمہیں کون لوٹ سکتا ہے؟“ جمال سادگی سے بولا۔

”ادبھولے بادشاہ، ہمیں لوٹتے ہیں وردی والے۔ جو تھانوں میں پیٹ نکالے کرسیوں پر رکھے رہتے ہیں اور وہ لالچی جج جو ہماری ضمانت منظور کرتے ہیں۔ ہمیں فرار کرانے والے اور ہمیں پناہ دینے والے بڑے لوگ۔ بس تو دیکھتا جا اور سیکھتا رہ۔“

مانی کی بات غلط نہ تھی۔ جیل خانے میں انہیں دو ہی مہینے گزرے تھے کہ ان کی سزا کے خلاف اپیل دائر ہوگئی۔ ان دو مہینوں میں بھی جیل کے اندر انہیں ہر طرح کی سہولت حاصل رہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جب اس کی بیوی ناصرہ اس سے ملنے آئی تو وہ بہت خوش تھی۔ اس کے کپڑے اور اس کا میک اپ دیکھ کے جمال حیران بھی ہوا اور اس کے دل میں حسد کی خلش بھی بیدار ہوئی۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی اور لگتا تھا اسے سلاخوں کے پیچھے شوہر کی حالت پر کوئی صدمہ نہیں ہے۔

”مجھے وہ دس ہزار روپے مل گئے۔“ اس نے بتایا۔  
جمال حیران ہوا۔ ”کون سے دس ہزار روپے؟“  
”جو حاجی صاحب نے بھیجے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جمال کی رہائی تک ہر ماہ باقاعدگی سے خرچہ ملتا رہے گا۔ یہ وہی سنیما والے حاجی صاحب ہیں نا؟ جو سنیما کی جگہ پلازا بنارہے تھے۔“

تردید نہیں کی۔“

”آخر کیوں... کیا دلچسپی تھی تمہیں مجھے جیل پہنچانے میں۔“  
”دلچسپی نہیں... مجھے ہمدردی تھی تم سے۔“ مانی بولا۔  
”یہ اچھی ہمدردی ہے۔“

”دراصل، مجھے تمہاری ساری کہانی سن کے... جو تم نے کورٹ میں سنائی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم میں اپنے حالات سے نمٹنے کی وہ صلاحیت ہی نہیں ہے جو آج کے دور میں ہونی چاہیے۔ اگر تمہاری مدد نہ کی جائے تو بالآخر تم اپنے بیوی بچوں کو بھی مار دو گے اور خود مر جاؤ گے۔ تم مایوسی اور ناکامی کی آخری حد پر تھے۔“

”یہ اچھا طریقہ ہے مدد کا۔“ جمال نے تلخی سے کہا۔  
”فرض کرو یہ واقعہ پیش نہ آتا تو تم کیا کرتے؟ اس سود خور کا قرضہ کیسے چکاتے۔ تمہارے پاس تو سود ادا کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ بے غیرت تم ہو نہیں کہ بیوی اس کے حوالے کرتے اور دوسری کر لیتے۔ تم میں نہ شہن کی ہمت تھی نہ چوری کی۔ نہ تم ڈاکا ڈال سکتے تھے اور نہ بھیک مانگ سکتے تھے۔ ورنہ ایک آسان طریقہ یہ بھی تھا۔ بیوی ایک سنگل پر گود میں بچہ لیے کھڑی ہو، باقی بچے کسی دوسری جگہ میاں تیسری جگہ۔ دن بھر میں تمہارا خاندان ہزار روپے کھیلتا۔“  
جمال نے سر ہلایا۔ ”یہ سب کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے واقعی یہ سوچا تھا کہ خود کشی کر لوں لیکن اس سے پہلے اپنے خاندان کو ختم کر دوں۔“

”اخباروں میں تم جیسے کم ہمت لوگوں کے ایسے ہی حالات میں بیوی بچوں سمیت مرجانے کے واقعات آتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ کیا دنیا بدلتی ہے؟ انسانیت کا ضمیر جاگتا ہے کہ پھر ایسا المناک واقعہ نہ ہو؟ حکومت کے کانوں پر جوں رینگتی ہے؟ لاکھوں کی کارروں میں اور کروڑوں کی کوشیوں میں رہنے والے جو کہیں بھی بیٹھ کے ہزاروں ایک وقت کے کھانے پر اڑا دیتے ہیں۔ کیا انہیں کوئی احساس ندامت ہوتا ہے؟“  
جمال نے نفی میں سر ہلایا اور کچھ سوچنے لگا۔

”یہ تم جیسے کم ہمت لوگ کرتے ہیں، ارے بھائی مرنا ہے تو کسی کو مار کے مرو۔ پہلے کوشش کرو کہ حق ملتا نہیں تو چھینو۔ کون سا جرم زیادہ سنگین ہے۔ چوری، ڈکیتی یا قتل۔“  
”ظاہر ہے قتل۔“

”تو اپنے بیوی بچوں کو قتل کرنے کا سنگین جرم کرنے سے پہلے چوری ڈکیتی کرو۔ اس سے کیا ہوگا؟ کامیابی یا ناکامی۔ کامیاب ہو گئے تو واہ واہ۔ ورنہ وہی جو تمہارے

”اور محبت کس سے ہے؟ اپنی بیوی سے۔ وہ واقعی بڑی سوہنی ہے۔ سود خور اسے لے جاتا تو لاکھوں کما لیتا۔ تو بھی پاگل ہے۔ سالے سود خور سے کہتا کہ لے جا اسے اور لکھ رسید۔ قرض بے باقی۔“  
”بکواس بند کر...“

مانی اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا۔ ”اگر تجھ میں عقل ہوتی تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی بھی تیرے گھر میں۔ دو چار ہزار تو ایک رات میں لے آتی۔“

جمال نے اسے چنچ کر گالی دی اور اس کی طرف پتھر پھینکا۔ ”اپنی بہن سے کراتا یہ دھندا۔ تو ڈاکو کیوں بنا؟“  
اس نے خود کو بچالیا۔ ”ایسی کوئی بہن بھی نہیں میری۔ تو بلا وجہ شرافت کے چکر میں پڑا رہا۔ محنت مزدوری اور حق حلال کی روزی تلاش کرتا رہا۔ حاصل کیا ہوا؟ اور تو یہاں رہے گا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں سے کھائے گی۔ بچوں کو کیا کھلائے گی؟“  
”وہ کر لے گی کچھ نہ کچھ۔“

مانی ہنسا۔ ”محنت مزدوری، لوگوں کے برتن مانجھنا، کپڑے سینا۔ شریف عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں مگر بیٹے، اسے کیا ضرورت ہے اتنی تکلیف اٹھانے کی جب وہ آسانی سے ہر رات...“

جمال نے اس پر حملہ کیا۔ مانی نے تول کے اس کو ایسا مکا مارا کہ جمال چپ ہو گیا۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ ایک وارڈن ان کی طرف آیا۔ ”کیوں لڑ رہے ہو...“

مانی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ لڑائی کہاں ہے جناب!“

”پھر کیا ہے۔ چلو میرے ساتھ جیلر صاحب کے پاس۔“

مانی نے کہا۔ ”اب جانے بھی دوسرا کار۔ ہم پرانے دوست ہیں۔ مذاق کر رہے تھے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“  
وارڈن انہیں گھورتا ہوا چلا گیا تو مانی نے سہارا دے کر جمال کو اٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”کیا اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

جمال نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟“  
”میری بات سنو گے تو فائدہ میں رہو گے۔ ابھی میں نے وارڈن کے سامنے تمہیں اپنا دوست کہا۔ مقدمے کے دوران بھی یہی کہا گیا کہ تم میرے ساتھی ہو اور میں نے



اگلے دو ماہ میں انہیں چار بار اپیل کی سماعت کے لیے کورٹ لے جایا گیا۔ یہ سب رشوت کا کھیل تھا ورنہ جیل میں ایسے بھی قیدی تھے جن کو سالہا سال کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کہنے کو جیل حکام کے پاس ہمیشہ ایک عذر ہوتا تھا کہ گاڑی نہیں یا گاڑی نہیں۔ عدالت میں بھی مہینوں کی تاریخ اس لیے نہیں پڑی کہ ریڈر کی جیب گرم کر دی جاتی تھی۔ پولیس کے پراسیکیوٹر کی دلچسپی ڈاکوؤں کو سزا دلوانے سے زیادہ کیس ختم کرانے میں رہی۔ اس کے پیچھے بھی پیسا تھا۔ اصل مدعی وہ تھے جن کے گھر میں ڈکیتی ہوئی تھی۔ واردات ناکام ہونے سے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن تھانے کچہری کے چکر میں ان کا وقت اور پیسا برباد ہو رہا تھا وہ اس کیس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ ماتحت عدالت سے ڈاکوؤں کو سزا ہونے تک انہیں خاصی پریشانی اٹھانا پڑی تھی لیکن اب اپیل ہوئی تو حریف کی حیثیت سے انہیں پھر طلب کر لیا گیا۔

تاہم عدالت عالیہ کے جج کا رویہ مانی کے لیے باعث تشویش ہو رہا تھا۔ اس نے ایک دن جج کو گالی دے کے کہا۔ ”وہ رشوت قبول ہی نہیں کرتا، کسی صورت نہیں مانتا۔“ جمال نے گھبرا کے کہا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟ کیا ہماری سزا برقرار رہے گی۔“

”یہی لگتا ہے۔“ مانی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”کیا ہم اس کے خلاف سپریم کورٹ میں جائیں گے؟“

مانی نے اسے ناراضی سے دیکھا۔ ”دماغ خراب ہے تیرا۔ ہر کیس سپریم کورٹ میں نہیں جاتا اور وہاں کسی کی نہیں چلتی۔“

جمال مایوس ہو گیا۔ ”مطلب یہ کہ ہم پوری سزا کاٹیں گے۔“

جمال کی شکل دیکھ کے مانی ہنس پڑا۔ ”اوائے فکر مت کر میرے یار۔ ہم نے کہا ہے تاکہ ادھر نہیں رہنا تو بس نہیں رہنا۔“

مانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ عدالت عالیہ کا موڈ دیکھتے ہوئے مانی نے سیدھا قانونی راستہ چھوڑ دیا۔ اگر ہائی کورٹ سے ایک بار فیصلہ صادر ہو جاتا تو پھر ان کی رہائی صرف ایک صورت میں ممکن تھی کہ وہ جیل سے فرار ہوں لیکن یہ مشکل ترین راستہ تھا۔ مانی نے کمرشل راستہ اختیار کیا۔

انہیں پیشی کے لیے عدالت لے جایا جا رہا تھا کہ وہ فرار ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں نے پولیس پارٹی پر حملہ کیا اور

اپنے ساتھیوں کو چھڑا لیا۔ درحقیقت ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ صرف ایک خبر تھی جو اخبارات کو دی گئی۔ معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے کہ راستے میں جمال اور مانی کو کہاں اور کیسے چھوڑا جائے گا۔ اس کے لیے پورا منظر نامہ خود پولیس نے بنایا تھا کیونکہ انہیں اس ”کیوتا ہی اور مجرمانہ غفلت“ کی بہت بھاری قیمت ادا کر دی گئی تھی۔ مانی اور جمال کے فرار ہونے کے بعد پولیس کی محافظ نفری کو گرفتار اور معطل بھی کیا گیا لیکن وہ سب ضابطے کی فرضی کارروائی تھی جو پریس اور پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کی گئی تھی۔

ناصرہ کو یہ اطلاع پہلے ہی دے دی گئی تھی کہ اسے جمال کے فرار ہونے کی خبر ملے تو وہ پریشان نہ ہو۔ پولیس یقیناً مغرور مجرم جمال کو برآمد کرنے کے لیے گھر پر چھاپا مارے گی اور اس کی نگرانی بھی کرے گی مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ نہ گھر پر نہ تھانے میں۔ بہت جلد جمال اس سے ملنے آئے گا۔

جمال نے پورا ایک مہینہ ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے ڈیرے پر گزارا جہاں اس کی پیشہ ورانہ تربیت ہوئی۔ اس کا دل ناصرہ سے اور اپنے بچوں سے ملنے کے لیے تڑپتا تھا مگر وہ صبر و ضبط سے کام لیتے پر مجبور تھا۔ پھر ایک رات ناصرہ کو بچوں کے ساتھ ایک نئے گھر میں لے جایا گیا جو شہر کے دوسرے کنارے پر بالکل مخالف سمت میں تھا۔ یہ بھی چھوٹا سا گھر تھا لیکن یہاں ضروریات زندگی کے تمام اسباب مہیا تھے۔ اس سے کہا گیا کہ اب وہ اپنے پرانے گھر کو بھول جائے۔ ایک اخبار میں چھوٹی سی خبر بھی شائع کرائی گئی کہ فلاں محلے سے ایک عورت اور اس کے بچوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا پرانی دشمنی کا شاخسانہ لگتا ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بکواس اور جھوٹ تھا۔

ایک ہفتے بعد جمال نصف شب کے بعد اپنے گھر پہنچا تو اسے دیکھ کر ناصرہ نے خوشی سے چیخ ماری اور بچے اس سے لپٹ گئے۔ وہ رات اور اس سے اگلی دو راتیں جمال نے ان کے ساتھ گزاریں۔ وہ ان کے لیے ڈھیروں کپڑے، جوتے اور قیمتی تحائف لے کر آیا تھا۔

چوتھی شام کا سورج ڈھلتے ہی جمال نے کہا۔ ”اب میں جاؤں گا۔“

ناصرہ نے سادہ سا سوال کیا۔ ”کہاں؟“ ”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ ”اپنی بیوی پر بھی اعتبار نہیں؟“

جمال نے کہا۔ ”جو میں خود نہیں جانتا تمہیں کیا بتاؤں۔“

ناصرہ نے کہا۔ ”جو جانتے ہو وہ بتا سکتے ہو۔“ ”ہاں۔ میں جیل سے رہا نہیں ہوا، فرار ہوا ہوں۔“ جمال بولا۔

”کس کے ساتھ؟“ ناصرہ نے پوچھا۔ ”انہی کے ساتھ جن کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔“ ناصرہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ”اس کا مطلب ہے...“

”ہاں، وہ رقم جو تمہیں ہر ماہ ملتی رہی کسی حاجی نے نہیں بھیجی تھی۔“

”شک مجھے بھی تھا لیکن میں تمہاری بات پر یقین کیسے نہ کرتی۔ میں اس کو بچ ماننے پر مجبور تھی۔“ ”مجبور میں بھی ہوں ناصرہ۔“

”ڈاکوؤں کا ساتھ دینے پر۔“ ناصرہ نے کہا ”کیوں؟“

”اس لیے کہ شریفوں نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ نیکی کے راستے پر چل کے مجھے ذلت اور عذاب کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔“

”تم بہت جلدی ہمت ہار گئے۔“

”یہ بات نہیں، میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میں اس انتہا تک پہنچ گیا تھا جہاں میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب سارے مسائل کا ایک ہی حل باقی رہ گیا ہے کہ میں تم سب کو مار کے خود بھی مر جاؤں۔“

”یہ ہمت تھی تم میں؟“

”ہر روز نہ جانے کتنے لوگ زندگی کے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ زندہ رہنا ان کے لیے ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ اسے تم جو چاہو کہو۔ میں سمجھتا ہوں اس میں بھی مشیعت ایزدی تھی کہ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ میری سائیکل کی چین ٹوٹی اور میں رک گیا۔ میری ٹانگ پر گولی لگی اور میں پکڑا گیا۔ یہ سب میں نے تو پلان نہیں کیا تھا۔ پھر کس نے کی تھی میرے لیے یہ ساری منصوبہ بندی۔“

”تم غلط سوچ رہے ہو۔“

”دیکھو! جس راستے پر میں جا رہا ہوں اب اس سے واپسی ممکن نہیں۔ اگر تم اپنے لیے بہتر راستہ منتخب کرنا چاہو تو تمہیں اس کا حق ہے۔“

”تم اتنی آسانی سے چھوڑ سکتے ہو مجھے، ہم سب کو؟“ ناصرہ رونے لگی۔

چار سمت ایک چوراہا

”تمہارے بغیر میرے لیے زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ اس راستے پر نہیں چلا سکتا جو میں نے اپنے لیے چنا ہے۔“

”یہ مجبوری میری بھی ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ دکھ سکھ میں اور اچھے برے حالات میں۔“ ناصرہ نے سر جھکا یا جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔

”تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟ بولو رک کیوں گئیں۔“ ”کچھ نہیں، بچے کچھ نہیں جانتے اور سب مان لیتے ہیں۔“

”ہاں! جب تک وہ بچے ہوں۔“ ”ان کے بڑے ہونے سے پہلے میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا۔“

ناصرہ نے کہا۔ ”کیا دلدل میں اپنی مرضی سے اترنے والا اپنی مرضی سے باہر آ سکتا ہے؟“ جمال برہم ہو گیا۔ ”میں کوشش ضرور کروں گا اگر تم کہو کہ بشرط زندگی... تو میں بھی کہوں گا کہ ہاں سب کچھ زندگی سے مشروط ہے۔“

وہ چلا گیا اور پھر وقفے وقفے سے آتا رہا۔ یہ وقفہ کبھی ہفتہ دس دن کا ہوتا تھا تو کبھی مہینے دو مہینے کا بھی ہو جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حالات میں انقلاب آیا۔ جمال نے ایک خوشحال علاقے میں گھر لے لیا۔ ایک کار خریدی جسے ناصرہ خود ڈرائیو کرتی پھرتی تھی۔ اس کے بچے ایک انگلش میڈیم اسکول میں جانے لگے۔ ناصرہ خود انہیں لاتی لے جاتی تھی۔

پاس پڑوس کے اور جاننے والوں کے لیے جمال ایک بزنس مین تھا جس کا زیادہ وقت باہر مختلف ممالک کے کاروباری دوروں میں صرف ہوتا تھا۔ اس بیان کی صداقت پر کون شک کرتا۔ نہ کسی کو اس کی ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ناصرہ اپنے تمام معاملات میں خود مختار تھی۔ جمال بہت خوش اور مطمئن تھا کہ وہ اندر باہر کے سارے معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔

پھر ایک واقعے نے اس کی دنیا بدل ڈالی۔ ڈاکوؤں کے گروہ کے ساتھ جمال ہر واردات میں شریک ہوتا تھا تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ وہ اپنے علاقے اور ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ کئی بار وہ محصور ہوئے اور بڑی مشکل سے جان بچا کے نکلے۔ ان کے کئی ساتھی مارے گئے۔ ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے۔ ایک سال میں جمال نے لاکھوں کمائے اور اس کمائی سے بیوی بچے عیش کرتے



ناصرہ نے چار مہینے دس دن انتظار کیا جو درحقیقت اس کے لیے عدت کا زمانہ تھا پھر وہ گھر چھوڑ دیا۔ بچے کافی عرصہ پوچھتے رہے۔ ”امی... ابو کب آئیں گے۔“ اور وہ بڑے سکون سے ایک ہی جواب دیتی رہی۔ ”پتا نہیں بیٹے۔“ بالآخر بچوں نے بھی پوچھنا چھوڑ دیا۔

ناصرہ کے لیے فوری طور پر مانی سے شادی کرنا مشکل تھا۔ وہ راتوں کو چھپ کے آتا رہا اور مال غنیمت میں سے جمال کا حصہ باقاعدگی سے اسے پہنچاتا رہا۔ اصول بھی آخر کوئی چیز ہے۔

دو سال بعد ایک صبح ناصرہ نے اخبار اٹھایا تو دوسرے صفحے پر مانی کی تصویر تھی۔ اس کی خون آلود لاش کسی سڑک یا گلی میں پڑی تھی۔ اس کے ساتھ دی ہوئی خبر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کسی ڈکیتی کے دوران مارا گیا تھا۔

ناصرہ کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہہ نکلے۔ اسے اب اپنے دنیا میں اکیلے رہ جانے کا احساس ہوا تھا۔ اب وہ آدمی نہیں پوری بیوہ ہو گئی تھی۔ تاہم وہ ایک ہمت والی اور ذہین عورت تھی۔ ایک حقیقی اور دوسرے اختیاری شوہر نے مل کے اسے اتنا دے دیا تھا کہ اب زندگی گزارنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

اس نے اپنی جمع پونجی کو بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا۔ صرف چھ مہینے بعد وہ ایک بزنس مین کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی جس نے اسے اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ پہلے ڈنر میں... پھر بیڈروم میں اور بالآخر بزنس میں۔ وہ ہر جگہ اس ترتیب سے چلتی رہی۔

اس نے کامل کو بہت اچھے اسکول میں داخل کرایا تھا لیکن پہلے باپ کی غیر موجودگی اور پھر ماں کی عدم دلچسپی نے اس کے لیے گھر کو بھی گھر نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنا بیشتر وقت باہر صرف کرتا تھا۔ نہ اسے ماں کے آنے جانے کی خبر ہوتی تھی نہ ماں کو اس کے لیکن ہائی سوسائٹی میں تو یہ ہوتا ہے۔ گھر میں دو ملازم تھے جو تمام امور نمٹاتے تھے۔

ایک شامیر جو ڈرائیور ہونے کے ساتھ رات کے وقت چوکیداری کرتا تھا۔ دن میں بازار سے سودا سلف لانا اور بچوں کو اسکول چھوڑنا اور چھٹی کے وقت واپس لانا سب اس کے ذمے تھا۔ دوسری ادھیڑ عمر کی ملازمہ رشتے میں شامیر کی خالہ لگتی تھی اور اسی کی سفارش پر شامیر کو رکھا گیا تھا۔

ناصرہ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتی تھی۔ بچوں کو کہاں اپنے ساتھ لے جاتا کہاں نہیں لے جاتا ہے، اس کا فیصلہ بھی وہی کرتی تھی۔ خیر خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے لیے

کوئی بات نہیں اس وقت یہ آواز کسی نے نہیں سنی ہوگی۔“ پھر وہ جمال پر جھکا۔ ”تمہیں اس طرح بن بتائے اور چوروں کی طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔“ جمال نے خون اگلا۔ ”مجھے...؟“ اور ساکت ہو گیا۔

مانی نے جمال کے مردہ جسم کو ایک بہت بڑے پلاسٹک بیگ میں ڈالا پھر اس نے قالین کو لپیٹا جس نے جمال کے دل سے نکلنے والے خون کو جذب کر لیا تھا۔ ”اب تم سو جاؤ آرام سے۔“ وہ ناصرہ کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ ناصرہ کانپ رہی تھی اور اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ ”یہ بہت برا ہوا مانی!“

”کیا برا ہوا؟ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں رہا۔ میں تو بہت پہلے اس سے تمہیں مانگ لیتا چاہتا تھا۔ اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ تم میری ہو مگر تم نے ہمیشہ سے روکا۔“ وہ اسے پلاسٹک کا تھیلہ کھینٹ کر باہر لے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ پھر آیا اور قالین اٹھا کے لے گیا۔ ”اب اپنا دروازہ بند کر لو۔“

”مانی، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ دروازے تک آئی۔

”فکرمات کرو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“ اس نے آخری بار ناصرہ کو چومنا اور باہر نکل گیا۔

باہر ایک نیکی کھڑی تھی جو جمال کو یہاں لائی تھی۔ اس گھر میں جسے وہ ابھی تک اپنا ہی گھر سمجھتا تھا چنانچہ بن بتائے آ گیا تھا، اپنی بیوی کو سر پر اندر دینے کے لیے۔ یہ جانے بغیر کہ اس سے بڑا سر پر اندر خود اس کے سامنے آئے گا۔

مانی نے نیکی والے کو دس ہزار دیے۔ اس نے وہی کیا جو مانی نے کہا اور تمام عمر لب نہیں کھولے۔ اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا۔ عورت راز کو راز نہیں رکھ سکتی۔ وہ کسی کے سامنے یہ کہانی رازداری کے وعدے پر سنا دیتی تو وہ مصیبت میں پڑ جاتا۔

ایک مہینے بعد ناصرہ نے اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی۔ وہ کیا کرتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں ناصرہ نے کسی عام گھریلو عورت کی طرح معصوم بن کے جواب دیا۔ ”مجھ سے تو وہ یہی کہہ کے جاتے تھے کہ بزنس کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا ان کا۔ وہ کہہ گئے تھے کہ وہی جا رہا ہوں۔ اس سے پہلے وہ سنگاپور گئے تھے۔ ہانگ کانگ بھی جاتے تھے۔ اور مجھے پتا نہیں۔“

سے مختصر سے کاریڈور میں آ گیا۔ کاریڈور کے دائیں بائیں دو بند دروازے بیڈرومز کے تھے۔ پھر ٹی وی لائن تھا۔ اس کے بالکل سامنے ایک دروازہ بیڈروم کا تھا اور دوسرا ڈرائنگ روم کا۔ دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔

وہ تاریکی میں آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ نے اندازے سے دیوار پر سونچ بورڈ تلاش کیا اور لائٹ جلادی۔ ایک دم جیسے ساری کائنات تہ وبالا ہو گئی۔ وہ سونچ کسی جم کا تھا جو پہناتا تو اس نے جمال کی دنیا کو تباہ کر دیا۔

جو منظر جمال کی نظروں کے سامنے روشن ہوا اس کے ہوش گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ اپنی جگہ پر جم رہا تھا۔ یہی ایک لمحہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس نے ناصرہ کی چیخ سنی پھر ایک جرس لگا کے مانی اس کے مقابل آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریو اور تھا اور جسم پر کچھ بھی نہیں تھا۔ بستر پر ناصرہ خود کو چادر میں چھپا رہی تھی۔

”مانی... تو... میرے ہی گھر میں۔“ جمال چلا یا۔ ”اپنے ہی دوست کی عزت پر ہاتھ ڈالنا تو نے!“ ”دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔“ مانی نے سفاکی سے کہا۔

”لیکن تو نے دوست بننے کے مدد کی تھی۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں اور اس عورت کو...“

”سیدھا کھڑا رہ جمال۔ میں تیرا دوست بنا تھا اس عورت کے لیے۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ تیری بیوی ہے۔“ جمال چلا یا۔ ”یعنی تم پہلے سے جانتے تھے ایک دوسرے کو؟“

”ہاں! تو نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ اب میں نے اسے تجھ سے چھین لیا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔“ مانی بولا۔

جمال نے ناصرہ کی طرف دیکھا۔ ”تیرے دعوے تو کچھ اور تھے۔ بڑی نیک اور با وفا تھی تو۔“

ناصرہ نے ترخ کے کہا۔ ”تم بھی بہت شریف اور عزت دار تھے۔ اب تم نے جرم و گناہ کی راہ اختیار کر لی ہے تو شرافت اور وفاداری کے راستے پر چلنا میری ہی مجبوری کیوں؟“

جمال نے چیخ کے کہا۔ ”بے حیا... قاحش۔“ مانی نے سائیکلسر لگے پستول سے ایک فائر کیا۔ جمال پلٹ کے پیچھے گرا۔ ناصرہ ایک دم اٹھ کے کپڑے پہنے لگی۔ ”جاؤ... تم نکل جاؤ۔“ اس نے مانی سے کہا۔ ”جلدی کرو۔“

مانی نے آہستہ سے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”فکر کی

رہے۔ وہ بھٹکا رہا، دہری زندگی جیتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ دن کب آئے گا جب ہر لمحہ خوف، ہر گھڑی مارے جانے یا زخمی ہو کے پکڑے جانے کے ڈر، مسلسل روپوشی، فرار اور احساس جرم کا بوجھ بڑھنے کا یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ وہ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے گا اور معاشرے میں وہ عزت حاصل کرے گا جو پیسے سے مل جاتی ہے۔

اچانک ایک دن اسے بیوی بچوں کی یاد نے اتنا بے قرار کیا کہ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنے گھر جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ گھر سے تین چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح تک وہ بہ آسانی لوٹ آئے گا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس نے رات بھر کے لیے دگنے کرائے پر ایک نیکی سی لی اور تین گھنٹے بعد اپنے گھر کے دروازے پر جا اترا۔

وہ اچانک پینچ کے ناصرہ کو سر پر اندر دینا چاہتا تھا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا۔ وہ سوئی ہوئی آنکھیں ملتی دروازے تک آئی اور پورچ کی لائٹ جلائی تو اپنے سامنے جمال کو دیکھ کر پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد رہ گئی۔

عہد اجمال نے کال بیل نہیں بجائی اور گیٹ کے اوپر سے پورچ میں اتر گیا جہاں اس کی نئی سیاہ رنگ کی کرولا لشکارے مار رہی تھی حالانکہ پورچ کی لائٹ آف تھی۔ برآمدے میں ایک دروازہ ڈرائنگ روم کا تھا۔ دوسرا ناصرہ

اور اس کے بیڈروم کا۔ اسے بیڈروم میں روشنی دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ رات کے ایک بجے ناصرہ کیوں جاگ رہی ہے پھر اس نے کسی مرد کی آواز سنی پھر ناصرہ کھلکھلا کے ہنسی۔ جمال کا خون اس کے سر میں مچھ آ گیا۔ یہ آواز کسی ٹی وی ڈرامے کے کردار کی نہیں تھی۔ ٹی وی خاموش تھا۔ گھر میں کوئی اور مرد تھا، اس کے اپنے بیڈروم میں، ناصرہ کے ساتھ۔ ایک لمحے کے لیے اسے یہ شک بھی گزرا کہ آواز اس کی سنی ہوئی ہے۔

اس نے پھر کان لگا کے سنا لیکن اب اندر خاموشی تھی لیکن اب اس کے دماغ میں شک نے پنچے گاڑ دیے تھے اور وہ تصور میں عجیب لہو بخند کر دینے والے مناظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنا وہم قرار دینے کے لیے بے چین تھا چنانچہ وہ پچھلی طرف سے گیا۔ آخری حصے میں دس فٹ چوڑی ٹیلیزیون تھی جس میں کپڑے سوکھ رہے تھے۔ اس کے سامنے بچن کی کھڑکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جالی والا عقیں دروازہ تھا۔

اس نے پہلے جالی والے دروازے کو دھکیلا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس نے کھڑکی پر کوشش کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ بچن میں اتر گیا اور گھر میں کھلنے والے دروازے

اس نے پہلے جالی والے دروازے کو دھکیلا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس نے کھڑکی پر کوشش کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ بچن میں اتر گیا اور گھر میں کھلنے والے دروازے

اس نے پہلے جالی والے دروازے کو دھکیلا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس نے کھڑکی پر کوشش کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ بچن میں اتر گیا اور گھر میں کھلنے والے دروازے



دیکھی تھی۔ تم نے ایسا کیوں کیا ماں؟ ایک ڈاکو کو چھوڑ کے دوسرے ڈاکو کو اپنا لیا۔“  
وہ روتی رہی۔ ”تم نہیں سمجھو گے سب۔ یہ دوسرا ڈاکو مجھ سے وہ محبت کرتا تھا جو سوائے سبکی مجھوں جیسی داستانوں کے اور کہیں نہیں ملتی۔“

”پھر اس نے تم سے شادی کیوں نہیں کی؟“  
”پہلے اسے میں نے دھوکا دیا پھر قسمت نے۔ غلطی میری تھی کہ میں مانی کے ساتھ نہیں نکلی عزت اور شرافت کے چکر میں۔ اور دیکھو آج ایک ماں اپنے بیٹے کے سامنے مجرم بنی کھڑی ہے۔ جواب دہی کر رہی ہے۔ کیا ایسا دیکھا ہے تم نے کہیں؟“

کمال نے کہا۔ ”بس کرو ماں۔ بہت ہو گئی۔ اب کل سے تم باہر نہیں جاؤ گی۔“

”باہر نہیں جاؤ گی تو کام کیسے چلے گا۔ تیری گرل فرینڈز کو تحفے دینے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ کل سے کیا تو کما کے لائے گا؟ میں تو رہ لوں گی۔ تو رہ سکتا ہے دو کمروں کے فلیٹ میں، کسی بھگی میں۔ بغیر کار کے پھر سکتا ہے؟“ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

کمال دانتوں سے اپنے ناخن کاٹا رہا۔ ”اب ہم اتنے غریب بھی نہیں ہو گئے۔“

”تو کیا جانے غریب کیا ہوتی ہے۔ اور دیکھنا چاہتا ہے تو جا چلا جائیہ گھر چھوڑ کے پھر پتا چل جائے گا تیری گرل فرینڈز کیا ہیں۔ وہ کیا طوائف نہیں ہیں؟ تیرے تحائف کے بغیر وہ تجھے گھاس ڈالیں گی۔ آزمائے۔“

کمال اب وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ ”اچھا ابھی تو دس ہزار دے دو ماں۔“

ناصرہ اٹھ کے الماری تک گئی اور اپنا بیگ نکالا۔ ”یہ لو دس ہزار۔۔۔ لیکن آئندہ کے لیے ایک بات سن لو۔ میری زندگی میں دخل مت دینا۔ جیسے میں تمہاری زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ میں مردوں کی دنیا میں ایسا کاروبار کرتی ہوں۔ ان کی مدد کے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتی اور یہ مدد شرط ہوتی ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ اپنے افعال و کردار کی ذمہ داری میں خود ہوں اور کسی کو جواب دہ نہیں۔ تمہارے لیے یہ اطمینان کافی ہونا چاہیے کہ تم ایک نکاح کی پیداوار ہو حرامی نہیں ہو۔ اب جاؤ۔“ اس نے دس ہزار کمال کی طرف پھینک دیے۔

کمال نے جھک کے دس ہزار اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ ناصرہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ کیا وہ لوٹ کے آئے گا؟ اس کے دل میں ایک اندیشے نے سراٹھایا۔

ہے۔ مجھ سے مانگو گے تو تمہیں سب بتانا پڑے گا۔“  
”میں سچ بولوں گا تو آپ مجھے پیسے نہیں دیں گی۔ اور آپ کو برا بھی بہت لگے گا۔“  
وہ چلائی۔ ”آخر کیا کرتے ہو تم؟ شراب پیتے ہو، جو کھیتے ہو؟“

”یہ بھی کرتا ہوں لیکن ابھی تو مجھے اپنی ایک گرل فرینڈ کے لیے گفٹ لینا ہے۔“  
”ابھی ایک ہفتے پہلے بھی تم نے یہی کہا تھا۔“  
کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ”وہ دوسری گرل فرینڈ تھی ماں۔“

”دوسری کے بعد تم تیسری کے لیے مانگو گے۔۔۔ پھر چوتھی کے لیے۔ تو کمال! میں اپنی محنت کی کمائی ایسے نہیں لٹا سکتی۔“

کمال ہنسا۔ ”محنت۔۔۔ کیسی محنت ماں۔ جو کچھ آپ کرتی ہیں اس کو محنت، حق حلال یا شرافت کی کمائی نہیں کہا جاسکتا۔“

اس نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ”کمال۔۔۔“

کمال نے ماں کی نازک کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لی۔ ”آپ کیا سمجھتی ہیں میں جانتا نہیں۔ آخر میں بھی تو اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ اور دنیا خود مجھے بتاتی ہے کہ تمہاری ماں کیا کرتی ہے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”کیا کرتی ہوں میں؟“

”تم خود کو پیچتی ہو۔“

”کتنے۔۔۔ کینے۔۔۔ حرامزادے۔۔۔ وہ ہسٹریا میں جتلا ہو گئی۔“ اور کیا کروں میں؟ کیا ہے میرے پاس بیچنے کو۔ اسی کمائی سے تو پلا بڑھا ہے، آج مجھ سے سوال کرتا ہے۔ کبھی اپنے باپ سے سوال کیا کہ وہ کیا کرتا تھا؟“

کمال کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے کمزور لہجے میں سوال کیا۔ ”وہ کیا کرتا تھا۔“  
”وہ ایک ڈاکو تھا۔۔۔ یقین نہیں آتا تو چلا جا کسی تھانے میں اور دیکھ لے اس کا سارا ریکارڈ۔ جو عیاشی کی زندگی تم نے گزاری وہ کیا حق حلال کی کمائی سے ممکن تھی؟ اس نے صرف تمہیں پیدا کیا اور بس۔ اسے مجھ سے یا اپنی اولاد سے محبت ہوتی تو وہ ایسے کام نہ کرتا۔“

کمال نے اپنا سر تھام لیا۔ ”ماں۔۔۔ انکل مانی کیا تھے؟ وہ بھی تو ڈاکو ہی تھے۔ میں نے اخبار میں ان کی تصویر

تعلیم کی طرف سے کمال کی بے پروائی اور آوارہ مزاجی بڑھتی گئی۔ ناصرہ نے معلوم کیا تو مزید پریشان ہو گئی کیونکہ اس کی کمپنی اچھی نہیں تھی۔ ایک دن اس نے کمال کو اپنے پاس بٹھا کے پیار سے سمجھایا۔  
”دیکھو! تم تعلیم مکمل نہ کر سکتے تو کیا کرو گے؟“  
”میں آپ کا بزنس سنبھالوں گا۔“  
”بزنس سنبھالنے کے لیے بھی تو آج کل ایم بی اے کرنا ضروری ہے۔“ ناصرہ نے کہا۔

”کیا آپ نے ایم بی اے کیا تھا؟“  
وہ شپٹا گئی۔ ”ہم نے تو سخت حالات میں بہت کچھ کر لیا مگر اب دنیا بدل گئی ہے۔ تم اس کاروبار کو بڑھا سکتے ہو۔“  
”کون سا کاروبار ہے آپ کا؟“ وہ ناصرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ”مجھے آج تک پتا نہیں چلا۔“

ناصرہ اس سوال کے لیے ہمیشہ تیار تھی۔ ”میں بتاتی ہوں تمہیں۔ میں یہاں سے بینڈی کرافٹس اور لیڈر گڈز بھجواتی ہوں دہلی اور بنکاک۔ دہلی سے کاسٹمیکس لاتی ہوں، بنکاک سے گارمنٹس۔“  
”آپ کا کوئی آفس نہیں ہے؟“  
”میں ڈائریکٹ آرڈر لیتی ہوں۔“ ناصرہ نے کہا۔  
”پھر بھی۔۔۔ مال خریدنا بھیجننا۔۔۔ کسٹم کلیئر نس۔۔۔ حساب کتاب اور انکم ٹیکس۔۔۔ یہ سب کون کرتا ہے؟“

ناصرہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ کمال بچہ نہیں رہا اور وہ دنیا کے معاملات کو سمجھتا ہے۔ ”اس کے لیے دوسرے لوگ ہیں۔ کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ۔ انکم ٹیکس پریکٹیشنر۔ لیکن تم یہ جرح کیوں کر رہے ہو۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ سنو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ایم بی اے کرو پھر میرے بزنس کو آرگنائز کرو۔ کوئی پیداواری یونٹ لگاؤ۔ کسی ایک فیلڈ میں آگے بڑھو۔ صنعتکار بنو۔ ایم بی اے کے بغیر یہ نہیں ہوگا۔ تمہیں آئی بی اے یا لمز جانا ہے۔ اور اس کے لیے تمہارا بہت اچھے نمبروں سے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ تم انٹرنیشنل میں کوالیفائی کر سکو۔“

کمال بیزار ہو گیا۔ ”او کے۔۔۔ او کے۔ کر لوں گا ایم بی اے۔“ پھر مت دیں مجھے۔ دس ہزار روپے دیں۔“  
”دس ہزار۔۔۔ وہ کس لیے؟“ ناصرہ نے برہمی سے کہا۔  
”میرے پرسنل اخراجات۔“  
”پرسنل۔۔۔ پرسنل۔۔۔ مانی فٹ۔ ابھی تم پڑھ رہے ہو کوئی گھر نہیں چلا رہے ہو۔ پھر تمہیں اتنی رقم کی کیا ضرورت

بھی ڈرائیور رکھ لے کیونکہ شہر میں بڑھتے ہوئے ٹریفک کے مسائل کی وجہ سے گاڑی چلانا سخت مشکل ہوتا جا رہا ہے لیکن ناصرہ نے ان کی بات پر عمل نہیں کیا۔ دراصل وہ جانتی تھی کہ ڈرائیور ساتھ ہو تو نقل و حرکت کی رازداری برقرار نہیں رہی جاسکتی۔ ناصرہ کب کہاں گئی کس سے ملی، کتنی دیر کس آفس میں یا گھر کے گھر میں رہی۔ کس کے ساتھ کس ہوٹل میں لچ یا ڈنر کے لیے گئی یا شب ب سری کے لیے۔ ڈرائیور کو کچھ نہ بتایا جائے تب بھی اسے معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ اسے منظور نہ تھا۔

ایسا اکثر ہوتا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لیے دہلی کا کہہ کے جاتی تھی۔ لیکن دہلی نہیں جاتی تھی۔ ویسے وہ ساری دنیا گھوم رہی تھی اور اس کے یہ دورے بیک وقت کاروباری بھی ہوتے تھے اور تفریحی بھی اس کے دونوں بچے ماں کو ایک معروف اور کامیاب بزنس ویمن سمجھتے تھے۔

ماں اور باپ کا کنٹرول نہ ہونے کے نتائج اس وقت سامنے آنے لگے جب بچوں کو یہ احساس ہوا کہ اب وہ بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ اور معمولات میں آنے والی تبدیلی نے ناصرہ کو پریشان کر دیا۔ پہلے کمال کے اسکول سے غیر حاضری کی شکایات موصول ہونے لگیں۔ ناصرہ نے پہلے ڈرائیور کو طلب کیا۔ ”یہ کمال اسکول نہیں جاتا تو کہاں جاتا ہے؟“

شامیر گھبرا گیا۔ ”میڈم! میں تو روز اسکول میں چھوڑ کے واپس آ جاتا ہوں۔۔۔ واپسی پر اکثر فاخرہ بی بی بی آتی ہیں۔“

”کیوں؟ کمال کیوں نہیں آتا۔“

”وہ کسی دوست کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ دوست ہی گاڑی میں ان کو چھوڑ جاتا ہے۔“ شامیر نے کہا۔

ناصرہ نے کمال سے پوچھا تو اس نے سرکشی سے کہا۔ ”اب کیا دوستوں سے ملنے کے لیے بھی مجھے آپ کے اجازت نامے کی ضرورت ہوگی۔“

”آخر کون ہیں تمہارے دوست؟“

”دس از پرسنل۔ کیا کبھی میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے دوست کون ہیں؟“

”کمال! شٹ اپ۔۔۔ میں تمہاری ماں ہوں۔“

”میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔“ کمال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ناصرہ کو پریشان کر دیا۔ کیا وہ کہہ رہا تھا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھوں گا؟ میں تمہیں آوارہ گردی کرنے اور اپنی بدنامی کا سبب بننے کی اجازت نہیں دوں گا۔



دو سال کے کسی کسی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سسٹمز ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

”ابراہیم خان... مطلب کی بات کرو۔“

وہ بولتا رہا۔ ”میں بتاتا ہوں۔ تم نے مانی کے ساتھ مل کے اسے مار دیا ہوگا۔ وہ تم جیسی عورت کا شوہر کہلانے کے لائق نہیں تھا۔ مانی اچھا آدمی تھا... مرد کا بچہ، بہادر اور نڈر۔ کیا اس نے تم سے شادی کر لی تھی... مارے جانے سے پہلے؟“

ناصرہ کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہنے لگے۔

”چلو چھوڑو۔ ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ میرے یہاں آنے کا مقصد نہ تمہارا دل دکھانا تھا، نہ اپنا قرض وصول کرنا... اور نہ تمہیں بلیک میل کرنا۔“

میں نے سوچا جو بات اس دن نہ کہہ سکا جس دن پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، وہ آج کہہ دوں۔ تب سے تمہاری صورت میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی کمری کے کاروبار میں ملک ملک کی عورت دیکھی میں نے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ استعمال بھی کی لیکن تمہیں نہ بھلا سکا۔ ناصرہ... مجھ سے شادی کرو گی؟“

ناصرہ دم بخود رہ گئی۔ ”شادی...؟“

”شادی اب تک نہیں کی ہے میں نے۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں لائف پارٹنر بنوں گا تو تمہارا بزنس پارٹنر بھی ہو جاؤں گا۔ تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ تمہیں خوش رکھوں گا... بولو ناصرہ۔“

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابراہیم خان سود خور نے ناصرہ کو جتنا خوش رکھا، اتنی ہی اور نے نہیں رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں دکھ صرف ایک تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو پھر نہ دیکھ سکی۔ وہ گھر سے ایسا نکلا کہ کبھی لوٹ کے گھر نہ آیا۔

کمال نے بے گھر ہونے کے بعد زندگی کا دوسرا چہرہ دیکھا۔ بد صورت اور قابل نفرت۔ قاعدہ زدہ اور بے وسیلہ لیکن اسی دنیا میں بھٹکتے ہوئے اس نے ایم بی اے ضرور کر لیا جو اس کی ماں کی آخری خواہش تھی۔

اس کے نزدیک ماں اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے گھر چھوڑا تھا۔

☆☆☆

چوراہا:

چوراہا سو فٹ قطر کا پارک تھا جو چاروں طرف سے آنے والی سڑکوں کے مقابلے میں تقریباً ایک فٹ اونچا تھا۔ ہر سمت سے آنے والی گاڑیاں بائیں ہاتھ پر رہنے کے لیے گھوم کے ایک سڑک سے دوسری پر جاتی رہتی تھیں۔ ہر سڑک کے وسط میں گرین بیلٹ بھی اتنی ہی اونچی تھی اور سڑکوں کو دور رو بہ بناتی تھی۔

وہ غصے میں کھڑی ہو گئی۔ ”چلو ابراہیم خان، ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے ورنہ...“

”ورنہ کیا... تم پولیس کو بلاؤ گی۔ ضرور بلاؤ، میرے تو پولیس سے پرانے مراسم ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر ہم یہ ہنڈی کا غیر قانونی کاروبار کیسے چلا سکتے ہیں۔ وہ تم سے بھی پوچھیں گے کہ یہ ایک لاکھ دہائی سے کس نے بھیجے ہیں اور کیوں...“

ناصرہ صوفے پر گر گئی۔ ”آخر تم کیا چاہتے ہو ابراہیم خان... اگر اپنا پرانا قرض وصول کرنا چاہتے تو یہ لو...“

آدمی رقم واپس لے جاؤ۔

”یہ تو اصل ہوا... سود کا حساب بھی تو دو۔ ایک ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے کتنے مہینے ہو گئے۔“ وہ عیاری سے مسکرایا۔

”اوکے... اوکے... سب لے جاؤ۔“ ناصرہ نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ”لیکن رسید ضروری ہے۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ! تم ایک غریب ملا کی بیوی، ناکام ڈیکٹی کی واردات میں وہ جیل چلا گیا تھا۔ تم نے اتنی ترقی کیسے کر لی؟“

”اس سے تمہیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ برہمی سے بولی۔

”ہاں... لیکن قانون کو ہوگی۔ کہاں ہے تمہارا وہ شوہر، کیا بزنس کرتا ہے۔ کتنا انکم ٹیکس دیتا ہے۔ بہت سے سوالات کا جواب تمہارے پاس نہیں ہوگا ناصرہ۔“

”جواب تو تمہارے پاس بھی نہیں ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک۔ میں کل بھی خیر قانونی دھندا کرتا تھا، آج بھی کرتا ہوں۔ میں نے سود خور کیسے تھے۔ آج میں رن ڈیلر ہوں۔ نہ جائز ذرائع سے رقم منتقل کرنے والے مجھ پر بہت اعتبار کرتے ہیں اور وہ مولوی جمال الدین جیسے احمق... میرا مطلب ہے شریف لوگ نہیں ہوتے۔ ان سے پولیس بھی ڈرتی ہے۔“

ناصرہ پر سکون ہو گئی۔ ”تم مجھے بلیک میل کرو گے ابراہیم خان۔“

”کل سے اب تک میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ مولوی ڈاکوؤں کے ساتھ مل گیا تھا۔ بہت مال لوٹا اس نے مگر ایک ایک کر کے وہ سب مارے گئے۔ تم اس گروہ کے سرغنہ مانی کے ساتھ رہنے لگیں۔ مولوی جمال الدین کا کسی کو پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ مارا گیا کہ جیل میں ہے۔ جیل سے میں نے معلوم کر لیا ہے وہ دوبارہ جیل نہیں گیا۔ اس کے مارے جانے کی کوئی اطلاع نہیں۔ وہ کہاں ہے ناصرہ، تمہارا شوہر؟“

”خداوند... کیا میں نے اپنا بیٹا بھی گنوا دیا ہے؟“

وہ بستر پر گری اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

فون کی گھنٹی سن کے اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنی آواز میں سکون پیدا کر کے بولی۔ ”ہیلو...“

”مسز ناصرہ جمال۔“ کسی اجنبی نے سوال کیا۔

”جی میں بول رہی ہوں۔“

”میں گڈلک کارپوریشن سے بول رہا ہوں...“

ابراہیم خان۔

”آپ کرنسی ایکس چینج کرتے ہیں...“ ناصرہ کو یاد آ گیا۔

”بالکل صحیح سمجھا آپ نے۔ دہائی سے پارٹی نے آپ کو ایک لاکھ کی رقم ادا کرنے کے لیے کہا ہے، لوکل کمری میں لیکن آپ چاہیں تو ہم ڈالر پاؤنڈ اور یورو، سب دے سکتے ہیں۔“

ناصرہ نے ایک لمحہ سوچا۔ ”اگر یورو ہو تو آپ کس ریٹ پر دیں گے؟“

”آپ اگر آسکتی ہیں تو ہم بیٹھ کے معاملات طے کر لیں گے ورنہ میں خود آ جاتا ہوں۔ دراصل پرسنل ویری فیکیشن ضروری ہے۔“

”پھر آپ آجائیں پلیز! کل صبح۔“

اگلے دن ابراہیم خان آیا تو ناصرہ اسے بالکل نہ پہچان سکی۔ رقم ادا کرنے تک وہ ناصرہ کو گھورتا رہا جس سے وہ کچھ نروس ہوئی۔ جب رسید پر دستخط کرانے کے بعد بھی وہ بیٹھا رہا تو ناصرہ نے کہا۔ ”آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔“

”تم نے پہچانا نہیں مجھے؟“ وہ بد لے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔“

”لیکن میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔ تم اسی مولوی جمال الدین کی بیوی ہونا جو میرا مقروض تھا۔“

ناصرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”وہ تو نہ جانے کس کس کا مقروض تھا۔“

”اس نے ہم سے پچاس ہزار لیا تھا۔ ایک ہزار روپیہ مہینہ سود پر۔ اب یاد آیا؟ وہ سود بھی ادا نہیں کر پایا تھا پھر جیل چلا گیا تھا۔“

ناصرہ کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب یہ شخص ان کے گھر میں گھس کے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے الفاظ تیزاب کے قطرے تھے جو اس کے دل میں زخم ڈال گئے تھے اور ان کا نشان باقی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم جوان ہو، خوبصورت ہو، دھندا کر کے میرا قرضہ ادا کرو۔



چور ہے پر ٹریفک کے رش کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک سنگل کی تعین اب ضرورت بنتی جا رہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پارکس کے عین وسط میں جو دائرے کا مرکز تھا ایک بہت بڑا، بہت پرانا اور ہر طرف پھیلا ہوا برگد کا درخت، قدامت کے سارے حسن اور تکبر کے ساتھ استادہ تھا۔ اس کی قدامت کے بارے میں اندازے مختلف تھے۔ کوئی اسے سو سال پرانا بتاتا تھا تو کوئی پانچ سو سال سے بھی زیادہ۔ اسی برگد کی وجہ سے چوک کا نام بھی برگد چوک پڑ گیا تھا۔

ٹریفک سنگل نصب کرنے کے لیے برگد کو ہٹانا لازمی تھا لیکن کچھ پرانی یادگاروں سے محبت کرنے والے، کچھ حسن پرست اور کچھ ماحول دوست افراد اور ادارے اس خیال کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ برگد اس شہر کی تاریخ کا حصہ ہے۔ چوک کی خوبصورتی اسی سے ہے اور درخت کا ٹٹا دیے بھی ایکولا جیکل بیلنس کو خراب کرتا ہے چنانچہ کوئی متبادل راستہ اختیار کیا جائے مثلاً HANGING سنگل لگائے جائیں۔

پارک کی سرسبز گھاس کا نظارہ آنکھوں کو تراوٹ دیتا تھا چنانچہ اس پر چلنا یا بیٹھنا منع تھا۔ گولا کی کے ساتھ ساتھ بیٹھنے پر دوپہر کے سوا لوگ ہر وقت بیٹھے نظر آتے تھے۔ برگد کا سایہ سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا اور کبھی ایک طرف کی بیچوں پر آ جاتا تھا تو کبھی دوسری طرف۔ سایہ دار بیچ پر لوگ دوپہر کے وقت سوتے ہوئے بھی نظر آتے تھے۔

بیچ سے پیچھے پوری گولا کی میں پھولوں کی کیاری تھی جس میں سارا سال موسم کے مطابق رنگ کھلے رہے تھے۔ ایک سیکورٹی گارڈ ہر وقت سیٹی بجاتا ادھر سے ادھر دوڑتا نظر آتا تھا کہ کوئی پھول نہ توڑے، سبزے پر نہ چلے اور کوڑا کرکٹ نہ پھیلائے۔

وہ چاروں ساتھ ساتھ ایک ہی بیچ پر چپ بیٹھے تھے اور برگد کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑیاں ان کے پیچھے سے زن زن گزرتی جا رہی تھیں لیکن وہ اپنے خیالات میں اور اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ انہیں ٹریفک کے شور سے کوئی جھنجھلاہٹ نہیں ہو رہی تھی۔

ان میں سے ایک دبلا پتلا فاقہ زدہ چہرے والا اور گنجا تھا۔ اس نے چار خانے کی ڈھیلی اور میلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پرانی جینز کے ساتھ اس کے پاؤں میں سینڈل نما چپل نظر آرہی تھی۔ یہ حیدر تھا جو کسی زمانے میں ڈاکٹر تھا کیونکہ اس نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ اس وقت وہ ایک اسمارٹ، صحت مند اور باڈی بلڈر ٹائپ انقلابی نوجوان تھا جس کے

وجود میں ایک بے چین عقاب کی روح تھی جو بلند یوں کی جانب پرواز کرنا چاہتا ہو۔

دوسرا لمبی سفید ڈاڑھی اور اور سفید بالوں والا شخص بھی بیمار لگتا تھا۔ اس کی ڈاڑھی مٹی نہیں تھی اور سر کے بال بھی چاروں طرف جھار کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ سفید کرتے میں تھا جواب مٹایا ہو رہا تھا۔ چار خانے کی لنگی اور عینک کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے گردن کودائیں بائیں حرکت دیتا تھا تو کسی ویران درخت پر بیٹھا ہوا لوگ لگتا تھا جو دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا ہو، یہ انجینئر وقار تھا۔

تیسرا جو کر لگتا تھا۔ وہ بہت موٹا تھا اور اس کا سر کی تربوز کی طرح صاف اور چمکیلا تھا۔ اس کی گردن شانوں کے درمیان نظر ہی نہیں آتی تھی، رہی سہی کسر اس کے لباس نے پوری کر دی تھی۔ اس نے لال، نیلی، پیلی دھاریوں والی چست بنیان ٹائپ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے پیٹ کا پھولا ہوا غبارہ اور عورتوں جیسا لٹکا ہوا سینہ واضح ہوتا تھا۔ اس نے نیچے کئی جیبوں والا پاجامہ یا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ ہر جیب میں کھانے کے لیے کچھ بھرا ہوا تھا چنانچہ اس کا منہ مسلسل چل رہا تھا۔ بیفا در تھا جس کے پاس ایم بی اے کی ڈگری تھی۔ جو ایک پرائیویٹ یونیورسٹی نے عطا کی تھی۔

چوتھا دبلا پتلا، دراز قد، خاموش اور سنجیدہ صورت شخص ان سب کے مقابلے میں بہتر لباس پہنے ہوئے تھا۔ اجلی سفید قمیض گرے پتلون اور بلیک شوز۔ اس کے سر پر دوسروں کی نسبت زیادہ بال تھے۔ یہ ظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کم ہے لیکن اچانک وہ کسی وجہ کے بغیر ہنس پڑتا تھا۔ یہ کمال تھا جس نے کسی زمانے میں انفارمیشن ٹیکنالوجی پڑھی تھی۔

ان سب کی عمریں پینتالیس سال سے کم تھیں لیکن وہ ساٹھ کے نظر آتے تھے۔ وہ صبح باری باری یہاں آئے تھے۔ ملاقات کا وقت تو آٹھ بجے تھا مگر سب سے پہلے حیدر نو بجے آیا تھا۔ ساڑھے نو بجے خاور پھر کمال اور سب سے آخر میں وقار دوس بجے پہنچا تھا۔

حیدر نے اپنے گنجے سر پر رومال پھیر کے پسینا صاف کیا۔ ”خاور! تمہیں پورا یقین ہے؟“ وقار نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں... ہم اپنی ڈگریوں کے مدفن پر بیٹھے ہیں۔“

وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے چوک سے سڑک تک آئے۔ پھر ایک عیسائی میں بیٹھ گئے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ٹیکسی ایک پرانے ہوئے کے سامنے رک گئی۔ وہ اتر کے

چار سمت ایک چوراہا

ہوٹل کے نچلے حصے میں واقع ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ ان کے کمرے اوپر والی منزل پر تھے۔ ریسٹورنٹ اس وقت خالی پڑا تھا۔ وہ اس کے ایک گوشے میں براجمان ہو گئے۔

ویٹر گندے کپوں میں خوب ابالی ہوئی کوئڈ برانڈ چائے لے آیا حیدر نے کہا۔ ”چلو اچھا ہے اپنا دکھڑا رو کے ہم دل کچھ ہلکا کر سکتے ہیں۔ آج مجھے دیکھ کے تم لوگ سکتے میں رہ گئے تھے کیونکہ میں وہ حیدر نہیں تھا، پرانا حیدر...“

میں ڈاکٹر تھا۔ میں نے سوچا کہ زکام، بخار یا بدھنسی جیسے امراض کی گولیاں اور کچھ دے کر سو پچاس روپے مانگنے سے میرا گزارا نہیں ہوگا۔ ان غریبوں کو یہی بیماریاں ہوتی ہیں۔ طیر یا کیونکہ وہ پھروں کے ساتھ رہتے ہیں، پھروں کی بستی میں۔ سیورج اور پانی کی لائنوں کے مل جانے کے بعد جو پانی انہیں ملتا ہے وہ پی کے انہیں اسہال کی بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا۔ تازہ ہوا اور دھوپ نہ ملنے سے وہ بی بی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ صحیح خوراک یا تو اسے بالکل نہ ملنے سے ماں کوئی بی ہو تو وہ بچوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور مرتے دم تک بچے جینے کی مشین بنی رہتی ہے۔ خیر... پھر میں نے سوچا کہ دولت مندوں کا مسئلہ کیا ہے۔ شوگر، انجائنا، جوڑوں کا درد۔ کیونکہ وہ بہت کماتے رہے اور اچھا کھاتے رہے اور اپنی ٹانگوں پر چلنے سے مکمل پرہیز کرتے رہے۔ بے خوابی..... کیونکہ انہیں دولت کمانے یا گوانے کی فکریں لاحق ہوتی ہیں۔ اعصابی کمزوری کیونکہ وہ خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ انکم ٹیکس بچا کے پکڑے جانے کا خوف، تاوان کے لیے اغوا ہو کے مارے جانے کا خوف، ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے کا خوف یا انہوں کے ہاتھوں... لیکن وہ کسی گناہ ڈاکٹر کے پاس کہاں جاتے ہیں۔ وہ بڑے نام والے کسی اسپیشلسٹ کے سوا کسی ڈاکٹر کو منہ نہیں لگاتے۔ یا پھر باہر چلے جاتے ہیں مزے میں علاج کرانے۔

تو دوستو... یوں میں نے سوچا کہ کون ہیں وہ بے وقوف جن کے پاس پیسا بھی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پیسا کمانے والا بے وقوف نہیں ہوتا۔ وہ تنہی بھی ہوتا ہے اور ذہین بھی۔ لیکن اس کے گھر میں کئی بے وقوف ہوتے ہیں۔ نمبروں اس کی بیوی جو اس غم میں گھٹی ہے کہ عمر کے ساتھ اس کے حسن و شباب کو کھن لگ رہا ہے اور اسے شوہر کی... یا اپنے چاہنے والوں کی نظر میں پہلے کی طرح پرکشش نظر آنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کی بیٹی جو سانولے رنگ سے یا چہرے پر جھانپوں اور کیلوں مہاسوں سے نجات چاہتی ہے۔ بال لیے کرنا، نسوانی کشش کے اسباب میں

اضافہ، لمبا قد۔ یہ سب پیسے والوں کی نوجوان اولادوں کے وہ کمپلیکس ہیں جو کسی دوا سے دور نہیں ہو سکتے کیونکہ قد یا لمبے بال یا رنگ... سب موروثی ہیں۔ مرد گنجا ہونا نہیں چاہتے۔ بغیر ورزش کے سلم رہنے کے خواہش مند ہیں اور خوب کھانا پینا بھی چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے اشتہاری دوا میں ہیں۔ رنگ گورا کرنے والی کریم، قد بڑھانے کی گولیاں، وزن گھٹانے کے نسخے۔ ہوگا کچھ نہیں، بس اشتہار زبردست ہونا چاہیے۔ ٹی وی، پراخبار میں۔ مٹی بازاروں میں ہر جگہ ڈھول پیٹا جا رہا ہو تو کوئی کب تک نہیں سنے گا۔

دوسری اہم بات یہ کہ سستی دوا کو ایسا احمق ضرورت مند قابل غور ہی نہیں سمجھتا... قیمت سیکڑوں کے بجائے ہزاروں میں ہو تو وہ سوچتا ہے کہ اس میں ضرور کچھ ہوگا۔ اسے ضرور آزمانا چاہیے۔ امیر کو چھوڑو، غریب اور متوسط طبقے کی لڑکیاں اور لڑکے نہیں نہ کہیں سے ہزاروں لے آتے ہیں۔ نہ کسی کا رنگ گورا ہوتا ہے نہ کسی کا قد بڑھتا ہے۔ نہ وزن گھٹتا ہے۔ اشتہاری دوا بنانے، بیچنے والے کو ہزاروں مل جاتے ہیں۔ دو چار مہینے بعد ایک احمق جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ پہلا احمق دوسری دوا پر لگ جاتا ہے؟“

خاور نے بے صبری سے کہا۔ ”تو نے کیا بیچا؟“ ”یار یہ جلدی کیسی... ہمیں کہیں جانا تو نہیں ہے۔“ وقار بولا۔

حیدر نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ”اب آگے چلو... نوجوانوں کے بعد ہیں وہ بوڑھے جو بوڑھا ہونا نہیں چاہتے۔ جوان رہنے کے لیے وہ کیا نہیں کرتے لیکن یہاں تو جوانوں کو نامردی کے خوف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جو دیواروں پر لکھا ہے پڑھ لو۔ نوجوانی کی غلط کاریاں کسی مرد کو شب عروسی نامرد نہیں کرتیں مگر اشتہاری دوا میں بیچنے والے کہتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ قصہ مختصر... میں نے بہت سوچا اور پھر ایک فنانسر تلاش کیا۔

وہ ایک دوا ساز ادارے کا ایگزیکٹو تھا جسے بریک تھرو نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنی دوا ساز کمپنی بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بیچنے کے سارے حربے اور طریقے جانتا تھا اور اندر کی بات بھی۔ لیکن اس کے پاس بھی پیسا نہیں تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو ہمارے خیالات میں ایسی ہی ہم آہنگی تھی جیسی ساز اور مضرب میں ہوتی ہے۔ بجلی کے دو تاروں میں ہوتی ہے جن کے ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔“

ہم نے سب کچھ طے کر لیا۔ ہم کیا کریں گے، کیسے کریں گے؟ پھر مسئلہ آ گیا پیسے کا۔ اس کے لیے میں نے



ایک دولت مند لیکن بد صورت اور بد کردار عورت کو پھانسا جس کا شوہر کوئی آڑھتی تھا اور پیسا ہونے کے باوجود اس کے ارمان پورے نہیں ہوتے تھے۔ پھر شوہر نے دوسری شادی کر لی اور پہلی بیوی کو بھول گیا۔ وہ اپنی ضرورت ادھر ادھر سے پوری کرتی رہی۔ میں نے اس پر ڈورے ڈالے۔ سب سے پہلے اسے یقین دلایا کہ وہ میری نظر میں کتنی حسین ہے۔ عجیب بات ہے یا۔۔۔ دنیا کی ہر عورت یہی یقین کرنا چاہتی ہے۔۔۔ مگر آئینے پر یقین نہیں کرتی، کسی میرے جیسے جھوٹے مرد کے الفاظ کا اعتبار کر لیتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں جو بہت جلد آ گیا، میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ تیسرے مرحلے میں کہا کہ ہم شادی کر کے یورپ امریکا، فرانس اور سویٹزر لینڈ جاسکتے ہیں۔

میں تو چاہتا تھا کہ وہ شوہر کا قصہ تمام کرے اور ساری دولت اس کے ہاتھ میں آجائے تو میرا کام بن جائے۔ مگر ایک تو دوسری بیوی درمیان میں رکاوٹ تھی۔۔۔ پھر خود اس میں قتل کرنے کی ہمت نہ تھی حالانکہ میں نے اسے مرڈر کا بالکل پرفیکٹ پلان بنا کے دیا تھا۔ ایک رات وہ کوئی بیس لاکھ نقد اور تقریباً ایک کروڑ کے بونڈ اور زیورات لے کر آگئی، میرے ساتھ فرار ہونے کے لیے۔ یہ مال اس نے گھر میں سے اکٹھا کیا تھا۔ نہ کسی کو اس کے اور میرے تعلقات کی خبر تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ گھر سے نکلے تو کہاں گئی۔ میں نے اسے مار کر ایک کھنڈر میں ڈال دیا۔

”اس مال سے ہم نے آغاز کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرا شخص کچھ نہیں لایا۔ اس نے اپنے دولت مند سر کو عدم آباد بھیجا۔ خود نہیں، بیوی کے ذریعے۔ بیوی کو نصف جائیداد ملی کیونکہ اس کی ایک بہن بھی تھی۔ یہ نصف بھی کوئی بیس لاکھ نقد تھے اور ایک مکان۔ اس ابتدائی سرمائے سے ہم نے کام شروع کیا۔

کام کیا تھا۔ صرف اشتہار بازی۔ گولیاں اور دوائیں تو سب بوس تھیں لیکن بے ضرر۔ مثلاً وٹامن بی کی گولیوں کو ہم نے قد بڑھانے کا قدیم چینی نسخہ بنا کے پیلٹی کی۔ رنگ بدل کے انہی گولیوں کو قد بڑھانے کا روغن فارمولا کر لیا۔ اہل یونان جہاں بقرط اور سترط تھے۔ دائمی صحت کے لیے کیا کرتے تھے۔ تاریخ کا انمول راز۔ مصر کے فرعون بیک وقت سیکڑوں بیویوں کو کیسے خوش رکھتے تھے۔ اہرام مصر سے دریافت ہونے والا شاہی طبیب کا نسخہ جو اس کی حفوظ شدہ می کے ساتھ پایا گیا، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بکواس میں کمال کو اب ماس کیونی کیشن کہتے ہیں۔

بس دوستو۔ ہم شرطیہ ایڈز کا علاج کرتے رہے۔ ہیپاٹائٹس بی اور سی سے نجات کی گارنٹی دیتے رہے۔ مٹی بیک گارنٹی۔ دیواروں پر یورپ اور امریکا کی میڈیکل ریسرچ کو چیلنج کرتے رہے اور بے وقوف آتے رہے۔ سارا معاملہ یہ ہے کہ دنیا میں شاید 95 پچانوے فیصد عقل کے اندھے ہیں۔“

خاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”98 اٹھانوے فیصد۔“ کمال نے فوراً تردید کر دی۔ ”یار رنٹانوے اعشاریہ نو فیصد۔“

حیدر نے ہاتھ اٹھایا۔ ”یہ اپنا پنا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ جب کہیں میرے جھوٹ کا راز فاش ہونے لگتا تھا۔ کوئی میڈیا کا نمائندہ جسے مجھ سے مال کم ملے ناراض ہو جاتا تھا تو ہم غائب ہو جاتے تھے۔ پھر سال کچھ مہینے گم رہتے تھے۔ دہائی سنگاپور، ہانگ کانگ چلے جاتے تھے۔ میرے پارٹنر نے اپنی بیوی سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ایک دن غصے میں شری حق مہر بتیس روپے آٹھ آنے ہاتھ پر رکھ کے تین بار طلاق کہا اور ہاتھ پکڑ کے باہر کر دیا۔ ہمارا یہ کاروبار مختلف شہروں میں مختلف ناموں سے چلتا رہا۔ ہماری آمدنی کی کوئی حد نہ تھی۔ ہم نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے۔ لیکن پھر ہمارے درمیان ایک عورت آگئی۔ اس نے ہم دونوں کو پھانسا۔ دونوں کو اپنی محبت کا یقین دلایا۔ حسن سے کہیں زیادہ خطرناک اور پرفریب اس کی معصومیت تھی۔ ہم دونوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کس مہارت سے اپنا گیم کھیل رہی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہر راز چھپاتے رہے اور بالواسطہ طور پر اس کی مدد کرتے رہے۔

قصہ مختصر۔۔۔ اس نے میرے ہاتھوں میرے پارٹنر کا خون کرا دیا۔ یقیناً اس نے میرے پارٹنر کو بھی میرے قتل پر اکسایا ہوگا۔ وہ بزدل تھا یا اس نے سوچنے میں اور عمل کرنے میں دیر لگا دی۔ میں پہل کر گیا۔ اگر وہ پہل کر پاتا تو میں یہ سب سنانے کے لیے یہاں موجود نہ ہوتا۔ اس عورت کے نزدیک ہم دونوں غیر اہم تھے۔ اہم تھی ہماری دولت جس پر وہ قابض ہونا چاہتی تھی اور ہوگئی۔ اس نے مجھ سے شادی کی اور مہینے بھر بعد پولیس کو بتا دیا۔ وہ خود معصوم بن گئی کہ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ جس سے میں عمر بھر کے لیے پیمانہ وفا باندھ رہی ہوں وہ اتنا بڑا دھوکے باز اور خونی ہے۔ اس نے رازداری کے وعدے پر مجھے بتایا تو پولیس کو بتانا میرا فرض بن گیا۔

اس نے وعدہ معاف گواہ کی طرح میرا کچھا چٹھا کھول کے پولیس کے سامنے رکھ دیا۔ مجھے عرقید ہوگئی جبکہ مجھے پورا

چار سمت ایک چوراہا

یقین تھا سزائے موت ہوگی۔ وہ صاف بچ گئی یا بچا لی گئی۔ جب میں جیل کاٹ کے نکلا تو اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ میرا سب کچھ لے گئی تھی۔“

کچھ دیر بعد پھر چائے آئی تو دقار نے کہا۔ ”میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ یاد ہے جب ہم نے اپنی ڈگریاں دفن کی تھیں تو کیا کہا تھا۔ اب ہم محنت نہیں فراڈ کریں گے۔ کیونکہ ہر طرف فراڈ ہو رہا ہے اور کامیاب وہی ہیں جو فراڈ کر رہے ہیں۔“

میرے باپ نے ایک پلاٹ بک کرایا تھا۔ پچیس فیصد ڈاؤن پیمنٹ کے بعد میں اس کی ماہانہ اقساط بھی بڑی باقاعدگی سے دیتا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھوں اب کتنی رقم بقایا ہے۔ میرے حساب سے تو پانچ دس اقساط رہتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں متعلقہ ادارے میں جا کر علوم کروں گا۔ میری بات سن کے وہ ہنسنے لگا۔ ”اوائے یتیم خانے۔ اتنا عرصہ کدھر تھا تو۔۔۔ آج آگیا ہے مجھ سے پلاٹ مانگنے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ہر ماہ بینک میں قسط جمع کراتا رہا۔ ساری رسیدیں ہیں میرے پاس۔“

اس نے مجھے ساری رسیدوں کے بارے میں ایک ناقابل عمل مشورہ دیا۔ ان کی بنی پولیس کے ڈنڈے سے دگنی موٹی بنتی۔۔۔ غالباً میری شکل دیکھ کر اسے پہلے ہی آئی تھی پھر ترس آگیا۔ اس نے کہا۔ ”درمیان میں تو نے ایک بار بھی پتا نہیں کیا۔“

میں نے کہا۔ ”پوری رقم ادا کرنے سے پہلے یہ بات نامناسب ہوتی۔“

وہ پھر ہنس پڑا۔ ”اوائے نامناسب وقت کی پیداوار۔۔۔ اب بھی کیا ضرورت تھی پتا کرنے کی۔ لوگ تو سال بعد چکر لگانے لگے تھے کہ پلاٹ دو پھر ہر مہینے آجاتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”شاہ جی اب کہاں ہے؟“ وہ بولا۔ ”میں بتا بھی دوں گا تو کیا لگاؤ سکے گا تو اس کا۔ وہ پہلے غائب ہو گیا تھا پھر حلیہ بدل کے آیا اور اب ایک کنسٹرکشن کمپنی چلا رہا ہے۔ بہت بڑا بلڈر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا پتا چاہیے۔“

وہ بولا۔ ”ابھی سڑک پر ڈرا آگے دستگیر ٹاؤن بن رہا ہے۔ وہ اس کا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تجھے آفس میں مل جائے مگر میرا نام مت لینا کہ میں نے تجھے بھیجا ہے۔ تو صورت سے ہی یتیم مسکین لگتا ہے۔ اس لیے میں نے بتا دیا۔“

میں اس کا شکریہ ادا کر کے دستگیر ٹاؤن پہنچا۔ شاہ جی مجھے اپنے شاندار آفس میں مل گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا حالانکہ

اس نے اپنا حلیہ بالکل بدل لیا تھا۔ اس کی ڈاڑھی غائب تھی۔ اس کا لباس پینٹ شرٹ تھا اور تیج کی جگہ اس کے ہاتھ میں جام شراب تھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹے پلانے کا عادی تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر نشہ شباب سے معمور اور لباس میں بے لباسی کے ہوشر با انداز رکھنے والی سیکریٹری بیٹھی تھی۔

میں نے پلاٹ کی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے اس کے سامنے نوکری کی درخواست رکھ دی۔ ”میں ایک انجینئر ہوں جناب! ڈگری ہے میرے پاس۔“

اس نے چوکیدار کو بلایا۔ ”اس بندے کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”جناب میں بغیر تنخواہ کے کام کروں گا۔“

اس نے چوکیدار کو روک دیا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ ”کیوں؟ کھانے کے لیے اتنا ہے حیرے پاس تو جائیش کر۔ نوکری کیوں مانگتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ایک مہینے بعد آپ خود مجھے تنخواہ دیں گے۔“

وہ ایسے ہنسا کہ منہ سے شراب پھوار کی طرح نکلے اور اس حسینہ کے کھلے گریبان سے ظاہر حصوں پر گری۔ ”ایک مہینے بعد کیا میرا داغ خراب ہو جائے گا۔“

”جی نہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ جتنی تنخواہ آپ مجھے دے رہے ہیں اس سے سو گنا فائدہ آپ کو میری وجہ سے ہو چکا ہے۔“

”اچھا؟ یہ بات ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ہر مہینے چیک کر لیں۔ جتنی بحث میرے کام سے ہو۔ اس کا چالیس فیصد مجھے دے دیں۔“ وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا۔ ”اور نقصان ہو گیا پھر؟“

”پھر آپ مجھ پر ضمنی کاکیس بنوا کے جیل بھیج سکتے ہیں۔“

”آخر میں کیوں پڑوں اس چکر میں۔“

میں نے کہا۔ ”میں رسید لکھ دیتا ہوں کہ میں نے آپ سے ایک لاکھ روپے قرض لیے تھے، چھ مہینے پہلے۔“

اس کی داشتہ نے کہا۔ ”سری جی! بندہ کھرا ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے؟“

وہ مسکرایا۔ ”اچھا! تو سفارش کرتی ہے تو رکھ لیتا ہوں۔“

مجھے نوکری مل گئی۔ میں نے اپنی افادیت ثابت کی۔



میرے مشورے خطرناک تھے۔ جو انجینئر پہلے سے کام کر رہے تھے انہوں نے میری مخالفت کی لیکن شاہ جی کو بچت صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے میری مانی۔ پس پردہ مجھے اس کی سیکرٹری کی حمایت بھی حاصل رہی۔ میری معصومیت سے متاثر ہو کے اس نے مجھے اپنا منہ بولا عاشق بنالیا تھا۔ دس پندرہ دن میں ایک بار جب شاہ جی کہیں باہر ہوتا تھا، اس کے حسن کی خیرات مجھ پر ٹپکتی جاتی تھی۔ جیسے نوکروں کو بچا ہوا جھوٹا کھانا دیا جاتا ہے۔

صرف تین مہینے میں میری کوشش سے تین انجینئر فارغ کر دیے گئے اور شاہ جی کا مجھ پر اعتماد بڑھ گیا۔ مسئلہ کسی انجینئر کی قابلیت کا نہیں تھا۔ میں نے چوری چھپے شاہ جی کو رپورٹ دی تھی کہ ایک اس کی عدم موجودگی میں اس کی محبوبہ سے ملتا ہے۔ دوسرے پر میں نے الزام عائد کیا کہ وہ شاہ جی کے حریف بلڈر کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور پتا نہیں بندے توڑ کے لے جانا چاہتا ہے یا کوئی اندر کی بات بتانے کی قیمت وصول کر رہا ہے۔ تیسرے کے بارے میں خود شاہ جی کی معشوقہ نے شبہ ظاہر کیا کہ اس کی ڈگری جعلی ہے۔ شاہ جی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے تصدیق کی کہ اسے انجینئرنگ کا کچھ پتا نہیں۔ میرے ایما پر اس کی ڈگری کی مصدقہ کاپی یونیورسٹی کو بھیجی گئی۔ جواب آیا کہ اس نام کے کسی شخص نے اس سال انجینئرنگ کا امتحان پاس نہیں کیا۔ جواب کالیئر ہیڈ اور جسٹرار کے دستخط اور مہر سب جعلی تھے۔ خود میں نے بنوائے تھے۔ اس انجینئر کو وضاحت سے بغیر رخصت کر دیا گیا۔ یوں شاہ جی کی دنیا میں میری عملداری قائم ہو گئی۔

اب بات یہ ہے دوستو! کہ کلویٹر کے زمانے سے عورت ذات ہی کو تختے اٹھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ کہلاتی وہ ناقص العقل ہے مگر عقل مرد کی ماری جاتی ہے۔ میں نے بھی اس کی معشوقہ، سیکرٹری یا داشتہ۔ کچھ بھی کہو اسے۔ میں نے اس کو استعمال کیا۔ وہ دنیا بھر کے دھکے کھانے والی۔ ہر مرد کے بستر کی زینت بن کے پیسا کمانے والی۔ اپنے مستقبل کا تحفظ چاہتی تھی، اپنا گھر اپنا شوہر اور اپنے بچے چاہتی تھی جیسے ہر عورت چاہتی ہے خواہ وہ فقیرنی ہو یا ایشور یا رائے جیسی مس یونیورس۔ میں نے خفیہ طور پر اس سے شادی کر لی، نکاح پڑھوایا۔

”ہاں۔ مل گیا ہوگا کوئی فراڈ نکاح خواں۔“

”سب مل جاتا ہے دنیا کے بازار میں۔ قیمت ادا کرنے والا ہونا چاہیے۔“ کمال نے کہا۔

”اس کی مدد سے میں نے شاہ جی کی کمپنی میں نمین

کیا۔ شاہ جی کے خلاف فیکس بچانے اور بلڈنگ میں ناقص میٹر مل استعمال کرنے کے دستاویزی ثبوت اکٹھے کیے۔ وہ ثبوت ایف آئی اے کو بھجوائے اور پچاس لاکھ جیب میں ڈال کے نکل گیا۔ شاہ جی اس وقت جیل میں جوتے کھا رہا تھا۔ میری مفروضہ منکوہ میرا انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ میں لاہور سے کراچی پہنچ گیا۔

اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ میں نے یوگس ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنائیں جو اسکیم تینتیس میں بہت تھیں۔ جعلی دستاویزات کی مدد سے زمین کی ملکیت ظاہر کی۔ لون لیے اور لوگوں کا پیسا اکٹھا کرتا رہا۔ متعلقہ محکمے اور پولیس میرے معاون و مددگار تھے۔ میں کبھی پکڑا نہیں گیا۔ میں نے شادی کر لی اور کراچی کے ایک پوش علاقے میں کوٹھی بھی بنالی۔ ایک دن میں اپنی بیوی کے ساتھ کار میں حیدر آباد جا رہا تھا کہ جنگ شاہی سے ذرا آگے مجھے ایک شخص سڑک پر پڑا نظر آیا۔ سڑک پر خون بھی تھا۔

میری بیوی نے کہا۔ ”لگتا ہے اسے کوئی گاڑی والا مار کے نکل گیا۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ مر چکا ہے۔“

”ذرا دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو۔“ میری بیوی نے کہا۔

میرا ارادہ رکھنے کا نہیں تھا مگر میں نے گاڑی سلو کر لی۔ ”جانم! ایسے معاملات میں پڑنے والا مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ ابھی آئے گی کوئی ایڈی ایسولینس یا پولیس کی گاڑی تو اٹھالے گی۔“

میری بیوی چلائی۔ ”فوار... وہ زندہ ہے۔ دیکھو اس کا ہاتھ مل رہا ہے۔ وہ گردن گھما کے ہمیں دیکھ رہا ہے۔“

مجبوراً میں گاڑی روک کے اترا۔ میرے دل میں زخمی کی مدد سے زیادہ اپنی گاڑی کے خون سے گندنا ہونے کا خیال غالب تھا۔ ابھی میں نے اس کی طرف ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دھوکے باز ڈاکو ہے جو مجھے روک کے لوٹنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو! تمہیں جو چاہیے لے لو۔“

مجھے امید تھی کہ وہاں سے گزرنے والی کوئی گاڑی یہ سین دیکھ کے رک جائے گی۔ رات کے وقت بھی اس سڑک پر ٹریفک ختم نہیں ہوتی لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی جب ہر کار اپنی رفتار بڑھا کے نکل گئی۔

ڈاکو نے کہا۔ ”ہم کو جو لینا ہوگا لے لیں گے۔ تو چل۔“

چار سمت ایک چور اھا

میں نے کہا۔ ”کہاں چلوں؟ میرے ساتھ میری بیوی ہے۔“

اچانک سڑک کے دونوں جانب سے چار افراد نمودار ہوئے۔ وہاں خود رو جھاڑیاں تھیں، چاروں مجھے گھیر کر لے گئے۔ میری بیوی مسلسل شور مچا رہی تھی۔ پانچواں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے انہوں نے ناک آؤٹ کر کے جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دیا۔ بعد میں ان کی گاڑی آئی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ ہالہ کے گرد و نواح کا جنگل ہی ہوگا جہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ ڈاکوؤں کی پناہ گاہ ہے اور اغوا کیے جانے والے وہیں رکھے جاتے ہیں۔ مجھے وہ کئی دن آنکھوں پر پٹی باندھ کے ننگے پاؤں چلاتے رہے۔ بالآخر انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ اپنی بیوی کو فون کرو۔ پچاس کروڑ ادا کر دے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ پچاس کروڑ سن کے میرے ہوش اڑ گئے۔ میرے پاس اس کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں تھے۔ میں نے انہیں سمجھانا چاہا تو انہوں نے مجھے مارا۔ لیکن بالآخر وہ دس کروڑ پر آ گئے۔

وہ میری بیوی سے بات کراتے تھے تو اسے سمجھا دیتے تھے کہ اگر تم نے پولیس سے رابطہ کیا تو سمجھو بیوہ ہو جاؤ گی۔ اپنی بیوی کو میں نے ہمیشہ بے وقوف اور سیدھا سادا سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے کاروباری معاملات کی الف لے کا بھی پتا نہیں لیکن وہ اس کے برعکس ثابت ہوئی۔ اس نے کھل کے یہ نہیں کہا کہ مجھے بیوہ ہونا منظور ہے مگر بڑی ہوشیاری سے تاخیر کی۔

میری بے وقوفی دیکھو کہ میں نے بینک میں مشترکہ اکاؤنٹ رکھا تھا، اپنے اور بیوی کے نام سے۔ کوٹھی بیوی کے نام پر تھی۔ اپنی آمدنی چھپانے اور فیکس بچانے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ خود ان کے نام پر کچھ بھی نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے بیوی بچوں کے نام سے ہوتا ہے۔ میں نے بیوی سے کہا کہ سب پیسا نکال لو۔ کوٹھی بیچ دو، زندگی رہی تو سب پھر بن جائے گا۔ اس نے یہی کیا۔ لیکن اس کے بعد سب کچھ لے کر غائب ہو گئی۔

حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اکیلی عورت یہ سب کیسے کر سکتی ہے۔ ضرور اس کی مدد کوئی مرد کر رہا ہوگا۔“

وقار نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

ایک اور خاموشی کے وقفے کے بعد حیدر نے خادری طرف دیکھا۔ ”تیرے ساتھ کیا ہوا پیارے بھائی!“

”وہی جو تم سب کے ساتھ ہوا۔ میں نے ایم بی اے کیا

تھا۔ مجھے دوران سفر ایک شخص ملا جو کسی دفتر میں کلرک تھا لیکن عام لوگوں کی طرح خواب وہ بھی بڑے اونچے دیکھتا تھا۔“

حیدر بولا۔ ”ایسے خوابوں پر فی الحال کوئی پابندی نہیں۔“

”عام آدمی کے خواب کیا ہوتے ہیں۔ جیسے سکھوں کے پانچ کئے ہوتے ہیں۔ ننگے مطلب.... کنگھی، کیسی، کڑا، گرپان اور کچھی۔ یہ سب ان کے مذہبی عقیدے کا حصہ ہیں۔ تو عام آدمی پہلے کوٹھی، کار، کیش، کاروبار اور کڑی، یعنی لڑکی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس نہ علم ہے نہ صلاحیت۔ نہ سفارش اور نہ وسائل۔ چنانچہ اس نے خوش قسمتی کی لاثری پر سارے خوابوں کی بنیاد رکھی تھی۔ کہیں سے گڑا ہوا خزانہ مل جائے۔ سنے کا نمبر نکل آئے۔ پرائز بونڈ لگ جائے۔ اس کے لیے وہ فقیروں اور مجذوبوں کے پاس جاتا تھا۔ مزاروں پر منت مانتا تھا اور عالموں سے رجوع کرتا تھا۔ اب کمال دیکھو تقدیر کا۔ اس کا پرائز بونڈ لگ گیا۔ پورے دس لاکھ کا۔ یہ بات وہ قہقہے لگا کے ہر ہم سفر کو بتا رہا تھا اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کا بھی اعلان کر رہا تھا کہ وہ دس لاکھ کو دس کروڑ بنانے کے لیے کیا کرے گا۔ سوچو ذرا، ایک کلرک کا ذہن کس حد تک کاروباری ہو سکتا ہے۔ مجھے موقع ملا تو میں نے اسے سمجھایا کہ بزنس کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے دس لاکھ دس دن میں دس روپے رہ جائیں گے۔ وہ میری باتوں سے متاثر ہوا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایم بی اے ہوں۔ اس کے علاوہ بھی جھوٹ بولا تو وہ خاصا متاثر ہو گیا۔ میرے خلوص سے بھی اور میری قابلیت سے بھی۔ کیا یہ اس کے بے عقل ہونے کی دلیل نہیں تھی؟

اس نے مجھ سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کو اعداد و شمار کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھایا کہ وہ چکر اگیا۔ میں نے اسے ایک اسکیم بتائی۔ وہ ایک فنانس کمپنی کھولے۔ لوگوں کا اتنا پیسا آئے گا۔ اتنا جائے گا۔ وہ کہنے لگا کہ پیسا میں لگاتا ہوں۔ لوگوں سے آپ ڈیل کرو۔ حساب کتاب رکھو۔ منافع آدھا آدھا۔ میں مان گیا۔

ہم نے کراچی میں فنانس کمپنی قائم کی اور اخبار میں ایک اشتہار دیا کہ ایک لاکھ پر ماہانہ دس ہزار روپے منافع دیا جائے گا۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے، یہ سالانہ ایک سو تیس فیصد جتا ہے۔ اتنا منافع کسی کاروبار میں نہیں ہوتا۔ مگر لالچی لوگ چکر میں آ گئے۔ کوئی ایک لاکھ دے گیا۔ ہم نے اسے اپنے پاس سے دس ہزار دے دیے۔ اس کے ایک لاکھ جمع ہو گئے۔ دوسرا دس لاکھ لایا۔ ہم نے اسے ایک ماہ بعد ایک



یہ انتقامی رد عمل کا شکار عورتیں ہیں۔ کچھ موٹی اور بد شکل ہو گئی ہیں۔ کچھ زیادہ عمر کی ہیں۔ یہ اپنے شوہروں کی طرح ہونٹوں کلبوں میں جا کے رنگ رلیاں نہیں مانتیں۔ انہوں نے سوشل ورک کے نام پر ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس کے لیے لڑکے لڑکیاں ملازم رکھتی ہیں... لیکن درحقیقت یہ ایک سیکس کلب ہے اگر تم کسی کو پسند آگئے تو بھجوا ایک ٹکٹ میں دوڑے۔ وہ تمہاری ایک ٹیم بنا دے گی۔ اس میں تمہارے ساتھ ایک لڑکی ہوگی۔ اس کے ساتھ مراسم بونس میں... لیکن جب تمہاری باس یا مالکن تمہیں طلب کرے گی تو تمہیں جانا پڑے گا اور اسے ہر طرح سے خوش کرنا پڑے گا۔ یہ ناپسندیدہ کام ہے اور مشکل بھی مگر اس کے بدلے میں جو کچھ تمہیں ملے گا...

قصہ مختصر... مجھے ایک خاتون نے پسند کر لیا۔ میرے ساتھ ٹیم میں جو لڑکی تھی وہ بھی کوئی شریف زادی نہیں تھی۔ یہ کام خلاف ضمیر بھی تھا اور خطرناک بھی۔ مجھے شرم آتی تھی کہ آخر میں کیا کر رہا ہوں، اور کب تک کرتا رہوں گا۔ ایک سال میں مجھے تین مختلف خواتین نے خدمت کا موقع دیا۔ ایک نے دوسری کو پاس آن کیا۔ دوسری نے تیسری کو، بڑے اچھے ریمارکس کے ساتھ۔ لیکن میں نے بھی انہیں خوب لوٹا۔

ایک سال بعد ہم دونوں نے دس دس لاکھ سے اپنا بزنس سیٹ کیا۔ ہم انٹرنیٹ پر اپنا ٹیلی فون ایکس چینج چلاتے رہے اور لوگوں کو سستی انٹرنیٹ پر کال کراتے رہے پھر ہم نے کچھ لڑکیوں کی ایسی گفتگو بھی ریکارڈ کی جو ہماری آمدنی کا ذریعہ بنی۔ ہم نے شو بزنس کے نام پر لڑکیوں کے فوٹو سیشن کیے اور ان کو خوب بلیک میل کیا۔ صرف ایک اشتہار پر کہ عنقریب شروع ہونے والی ٹی وی سیریل کے لیے یا فلم کے لیے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ درجنوں لڑکیاں آجانی تھیں۔

بہت جلد میں اس سے بھی آگے گیا۔ میں نے اپنے پارٹنر سے کہا کہ یا رہیں بیکر بننا چاہیے۔ سامبر کرائم کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ امریکا میں لوگوں کے پاس ورڈ چرانے والے لاکھوں ڈالر اڈھر سے اڈھر کر دیتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے آن لائن بینکنگ تک فراڈ کے ان گنت راستے ہیں۔ ہمیں یہ غیر اخلاقی جرائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اسے میری بات نے قائل کیا۔ ہم غیر قانونی طور پر امریکا پہنچ گئے۔ وہ تو جاتے ہی پکڑا گیا اور واپس بھیج دیا گیا۔ مجھے ایک انڈین نے رکھ لیا۔ اس نے مجھے قانون سے بھی بچایا لیکن میرا استحصال بھی کیا۔ دو سال بعد میں اس کے چنگل سے نکل گیا اور میں نے وہ سب کیا جس کے لیے میں امریکا گیا تھا۔ لیکن بالآخر میں پکڑا گیا۔ مجھے جیل ہو گئی

”ہمیں الزام مت دے فلسفی کی اولاد۔ ہم نے تجھے مجبور نہیں کیا تھا۔ تو نے اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے راستے کا انتخاب کیا تھا۔“

”جب میں اڈھر سے اڈھر دھکے کھا رہا تھا تو میرے ذہن میں بہت سے پلان تھے۔ میں اس قدر ناشائس دنیا کی ایسی تیسری کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے بھی مجھے ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ خالی ہاتھ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ ایک دن میں اکیلا یہی سوچ رہا تھا کہ کیا اب کسی کو لوٹنے کے سوا میرے سامنے کوئی راستہ نہیں رہا کہ میرے جیسا ہی ایک نوجوان میرے ساتھ آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے خود بات شروع کی۔ ہم دوست بن گئے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس کا گھر دیکھ کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ کوٹھی ایک محل تھی۔ اندر دو شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کے لیے دو ڈرائیور تھے۔ دیگر نوکر چاکر اس کے علاوہ تھے۔ کوٹھی کے اندر کی آرائش میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ قالین، پردے، فانوس اور فرنیچر۔ ہر چیز امپورٹڈ اور بہت اعلیٰ تھی۔

میرے پوچھنے پر وہ ہنسا۔ ”بھائی! یہ میرا گھر ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ یہ ایک سابق صنعتکار کی بیوہ ہیں۔ مجھے تم ان کا ویری پرائیویٹ سیکریٹری سمجھ لو۔ آج یہاں ایک میننگ ہے۔ اگر کسی نے تمہیں پسند کر لیا تو سمجھو تمہارے دن پھر گئے۔“

”لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا؟“

”دیکھو، اپنی کمپیوٹر سائنس کی ڈگری کو بھول جاؤ۔ میں بھی فزکس میں ایم ایس سی ہوں لیکن نوکری نہیں ملی تو طوائف بن گیا۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”طوائف...؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں! طوائف۔ اگر تم بھی طوائف بننے کے لیے تیار ہو تو تمہیں تمہاری توقع سے زیادہ پیسے ملے گا۔“

میرا دماغ چکر ا گیا۔ ”یا رکھل کے بات کرو۔“

”رکھل کے ہی بات کر رہا ہوں۔ دیکھو جیسے اپنے حسن اور شباب سے دولت کمانے والی عورت طوائف ہوتی ہے۔ ایسے ہی مرد بھی ہوتے ہیں۔ تم ماشاء اللہ بیٹھم اور جوان ہو، کسی کی داشتہ بن جاؤ۔ ابھی یہاں جو خواتین آئیں گی۔ وہ سب ایسی ہی ہیں۔ انتہائی دولت مند لیکن ٹھکرائی ہوئی۔ نا آسودہ۔ جن کو شوہروں نے چھوڑ دیا، گھر میں رکھ کے بھول گئے اور خود باہر عیش کرتے رہے، دوسری عورتوں کے ساتھ۔

فیصلہ اپنا کمیشن کاٹ کے۔ میری مزید بدبختی کہ مجھے جیل کے اندر ایک شخص مل گیا جس کا سرمایہ ہماری فنانس کمپنی میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنا گھر بیچ کے پیسہ لگا دیا تھا۔ بعد میں اس کی ملازمت چھوٹ گئی۔ گھر پہلے ہی نہیں تھا۔ بیوی بھی اسے چھوڑ گئی۔ وہ اسے لینے کے لیے گیا تو سالوں نے اسے مارا اور ان کے ساتھ مل کر بیوی نے بھی۔ وہ پاگل ہو گیا۔ ایک دن وہ چھری لے کر اپنی سسرال گیا اور بیوی کو ذبح کر دیا۔ جیل میں مجھے دیکھ کر اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے اپنا دفاع کیا۔ اس کے گواہ بہت تھے کہ اگر میں اسے نہ مارتا تو خود اس کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کے باوجود مجھ پر غیر ارادی قتل کا کیس بن گیا۔ میں دس سال بعد جیل سے نکلا تو مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ کیا تم یقین کر دے کہ میں نے ایک دکان پر مٹی گیری بھی کی۔ ایم بی اے ہونے کے باوجود میں ایک آڑھتی کا حساب کتاب رکھتا رہا۔ پھر اس کا بھی دو لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ پنڈی میں ٹیکسی چلاتا رہا۔ ٹیکسی ایک حادثے میں تباہ ہو گئی۔ مری سے واپسی میں اس کے بریک فیل ہو گئے۔ دو مسافر مر گئے۔ میں بچ گیا۔ میری ایک ٹانگ مصنوعی ہے۔“

وہ سب بڑے دکھ سے اس کی ٹانگ کو دیکھتے رہے جو گھٹنوں کے اوپر تسموں سے بندھی ہوئی تھی۔

کمال نے آہستہ سے کہا۔ ”دوستو! کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو ہماری میز کے قریب بہت دیر سے بیٹھا ہے۔“

”بیٹھا ہے تو ہمیں کیا۔“ خاور بولا۔

کمال نے سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری گفتگو سن رہا ہے۔“

موقع ملنے پر ان سب نے باری باری سرگھما کے دیکھا لیکن اس طرح کہ شک نہ ہو۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔ اٹھارہ بیس سال کی عمر کا۔ اس کا رنگ بہت صاف تھا اور چہرے پر اگنے والی ڈاڑھی ابھی اصل حالت میں تھی۔ سفید شلوار قمیص کے ساتھ اس نے سر پر سفید پگڑی باندھ رکھی تھی جس کے نیچے سے اس کے لمبے بالوں کے پٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں مستغرق تھا اور خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے کمال کے خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ وہاں وہ ان کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا تھا۔

”اب تم اپنی داستان غم کہو۔“ حیدر بولا۔

کمال نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ایک وہ چار یار غار تھے۔ ان پر اللہ کی رحمت۔ ایک ہم چار یار ہیں۔ ہم پر خدا کی لعنت۔ ہم نے ایک دوسرے کو تباہی کے غار کی

لاکھ دے دیے۔ ہمارے پاس ایک لاکھ کم ہوئے مگر دس جمع ہو گئے۔ لوگ اب رقم بینکوں سے نکلا کے لانے لگے۔ زیور اور مکان بیچ کے لانے لگے۔ ہم نے پانچ ماہ تک انہیں اسی حساب سے منافع دیا۔ گویا ان کی اپنی رقم کا نصف لوٹا دیا۔ دس فیصد ماہانہ کے حساب سے پانچ مہینے میں وہ آدھے لے گئے مگر ہماری ایمانداری کی دھوم مچ گئی۔ عقلمندوں نے اور ماہرین معاشیات نے اخباروں میں بہت لکھا کہ یہ فراڈ ہے مگر منافع برابر تقسیم ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس پیسہ آتا جا رہا تھا۔ ہم لوگوں کے پیسے انہی کو واپس کر رہے تھے اور ہمارے پاس جمع شدہ رقم بڑھتی جا رہی تھی۔ دس لاکھ کا پرائز بونڈ پانے والا کلرک تو خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں دوسری بہت سی فنانس کمپنیاں بھی وجود میں آ گئی تھیں مثلاً صہ، دادا بھائی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔

ہمارا مشترکہ اکاؤنٹ کمپنی فیننگ ڈائریکٹر کھلاتا تھا۔ وہ چیئرمین، ہمارے اسٹاف میں سات افراد تھے۔ ساتوں خوبصورت لڑکیاں۔ کلرک تو راجا اندر بنا ہوا تھا اور میں بھی پریوں کے اکھاڑے میں تھا۔

ایک دن اچانک مجھے اطلاع ملی کہ حکومت کے کارندے فنانس کمپنیوں پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ میں نے کوشش ضرور کی کہ جتنا مال ہاتھ لگے سب سمیٹ کے نکل جاؤں لیکن مجھے موقع نہ ملا۔ ایف آئی اے والوں نے آدھی رات کو چھاپا مارا اور ساری اکاؤنٹ بکس ضبط کر لیں۔ بینکوں میں ہمارے فنڈ منجمد ہو گئے اور ہمیں گرفتار کر کے لاک اپ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے۔ ان کمپنی لڑکیوں نے سارا پول کھول دیا۔ اکاؤنٹ ہولڈر ہمارے دشمن ہو گئے اور ضمانت پر رہائی کے بعد بھی ہمیں روپوشی اختیار کرنا پڑی۔ ایک طرف تفتیشی ادارے تھے جو ہماری کھال کھینچ رہے تھے۔ ہم سے مال بنور رہے تھے اور ہمیں جیل میں بھجوانا چاہتے تھے۔ ہم بالکل پھٹکے ہوئے تھے اور وہ کلرک بادشاہ اس دن کو رہتا تھا جب اس کی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔ ایک دن ہم عدالت میں پیشی بھگتا کے لوٹ رہے تھے کہ مشتعل لوگوں کے ایک جھوم نے ہم پر پتھر اور شرع کر دیا۔ وہ سب اپنے پیسے واپس مانگ رہے تھے۔ مار مجھے بھی پڑی لیکن میں کسی طرح بچ کے نکل گیا۔ چیئرمین صاحب شدید زخمی ہوئے اور اسپتال پہنچ کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سات سال کی جیل میں نے اکیلے کافی۔ مگر لوگ پھر بھی خوار رہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کو آج تک کچھ بھی واپس نہیں ملا۔ حکومت نے کسی کو چالیس فیصد دیا کسی کو پچاس فیصد۔ لیکن یہ بھی دس



اور اپنی سزا پوری کرنے کے بعد مجھے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ یہاں مجھے ایف آئی اے نے دھریا۔ میں نے شادی نہیں کی۔ امریکا میں شادی کر کے دیسی آدمی پھنس جاتا ہے۔ وہ کاغذی شادی کرتی ہیں اور وہ خوب بلیک میل کرتی ہیں۔ حالانکہ بہت سے پاکستانیوں نے اسی طرح امریکی شہریت بھی حاصل کر لی مگر ساری بات نصیب کی ہے۔۔۔“

”غلط۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ خود فریبی۔۔۔ ساری بات نیت کی ہے۔“ ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا بارش نوجوان چلایا۔ پھر اس نے اپنی کرسی کو کھینچ کر ان چاروں کے درمیان کر لیا۔ ”تم سب بدعتی، فریب کاری، دغا بازی اور مردم آزاری میں ملوث رہے۔ تمہارے ساتھ یہی ہونا تھا۔“

”تو تم واقعی ہم سب کی گفتگو سن رہے تھے۔“ حیدر نے کہا۔ ”یہ ہمارا شک نہیں تھا۔“

”ہاں۔ میں نے سب سنا۔“ اس نے جوش سے اپنے لہجے میں کہا۔ ”جو ایک نے کہا۔ پھر دوسرے نے کہا۔“

”کسی کی نجی گفتگو سننا غیر اخلاقی بات ہے۔“ کامل بولا۔

”غیر اخلاقی؟“ اس نے میز پر مکا مارا۔ ”کس منہ سے تم یہ بات کرتے ہو۔ اخلاقیات کا تم جیسے بدکرداروں سے کیا رشتہ۔ انسانیت کا تم جیسے شیطانوں سے کیا تعلق۔“

خاور نے کہا۔ ”آخر تم ہو کون۔۔۔ خدائی فوجدار؟“

”میں ہوں تمہاری شامت اعمال۔۔۔ اللہ نے مجھے تمہارے اعمال کی سزا کے لیے بھیجا ہے۔ تم کو جو گناہ اور جرائم کرنے تھے۔۔۔ تم کر چکے۔ اب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے۔“

”کامل ہنس۔“ کیا روز حساب آگیا؟“

وہ پھر چلایا۔ ”ہاں، تمہارے لیے آگیا۔۔۔ ہر شخص کے لیے آخرت کے علاوہ بھی اس دنیا میں مکافات عمل ہے۔“

حیدر نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”چلو بس بہت ہو گئی۔ آخر کیا کرو گے تم؟ پولیس کو رپورٹ کرو گے؟“

وقار بولا۔ ”پولیس کیا کرے گی۔۔۔ جو ہم نے کیا یا کہا اور تم نے سنا۔ اس کا گواہ کون ہے، ثبوت کہاں ہے؟“

اس شخص نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ وہ سب خاموشی سے اس کی صورت دیکھتے رہے۔ غالباً وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول کے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں کون ہوں؟ یہی جاننا چاہتے تھے تم۔ تو میں ایک خودکش حملہ آور ہوں۔“

باقی سب لوگوں کی آنکھوں میں بے یقینی۔۔۔ دہشت، خوف اور حیرانی کے طے جلے تاثرات نظر آنے لگے۔

”یہ سچ ہے۔۔۔ مجھے بھیجا گیا تھا۔ کسی اور ٹارگٹ کے لیے۔ اور یہاں میں وقت گزارنے کے لیے آیا تھا۔ اس بس کے گزرنے میں ابھی پون گھنٹا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی شک یا شبہ نہیں تھا کہ اس بس میں سوار سب لوگوں کو مار دینا جہاد ہے، کارِ ثواب ہے۔ شہادت حاصل کر کے جنت میں جانے کا راستہ ہے۔“

ان سب کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ حیدر ایک دم اٹھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ خودکش حملہ آور غرایا۔

حیدر بیٹھ گیا۔ ”کیا تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے؟“

کمال نے کہا۔ ”دیکھو! جب تم یہاں سے گزرنے والی بس کو اڑاؤ گے تو ہم سب بھی اڑ جائیں گے، ہمیں جانے دو۔“

”اس بس کو مجھے یہاں سے دو سو گز کے فاصلے پر اڑانا تھا۔ اگلے موڑ پر جہاں اس کی رفتار کم ہوتی ہے۔“

”آخر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ حیدر نے پوچھا۔

”یہ حکم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں راہِ راست پر ہوں اور حصولِ مقصد کے لیے ایسا ضروری ہے۔“

”بے گناہوں کا قتل؟“

”انہوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا یا ان کے ساتھیوں نے۔ لیکن جب میں یہاں بیٹھ کے تمہاری باتیں سن رہا تھا تو میرے خیالات میں ایک تبدیلی آئی۔ میں نے موازنہ کیا، ان سے تمہارا۔ کون بڑا مجرم ہے، کون زیادہ خطرناک ہے۔ کس کا وجود زیادہ خرابی کا باعث ہے یا کس کے گناہ سنگین ہیں؟ تم اعتراف کر چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ سزا کے زیادہ مستحق تم ہو۔ تم سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، اس کے باوجود تم نے ایسے اخلاقی جرائم کیے۔ میرے دماغ نے اور میرے دل نے متفقہ فیصلہ دیا۔ پہلے تمہی کو مرنے چاہیے۔“

وہ سب ایک دم اٹھ کر بھاگے۔ وہ دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ دھماکا ہوا۔ اس کی آواز دور دور تک سنی گئی لیکن خود ان کے کانوں نے کچھ نہیں سنا جو اپنی موت سے بھاگ رہے تھے۔

عین اس وقت شہر کی میونسپل کارپوریشن نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ برگد چوک ختم کر دیا جائے کیونکہ اس سے ٹریفک میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ برگد کے درخت کو ہٹانے کے اس کی جگہ چوراہے پر ایک ٹریفک سگنل نصب کر دیا جائے۔

